

شاه

پسر

آخرِ شب کے مسافر

قُرَّةُ الْعَيْنِ حیدر

چودھری کسٹمی

۳۱۳۔ ذوالقرنین چیمبرز گنیت روڈ، لاہور

ناشر — محمد خالد چودھری

اہتمام — میاں محمد اسلم

مطبع —

قیمت — پینتیس روپے

مطبوعہ

عبد اللہ سنز پرنٹرز

۱۴ - دربار مارکیٹ - لاہور

پیش لفظ

بنگال کی دہشت پسند اور انقلابی تحریک ۱۹۴۶ء کا اندولن، مطالبہ پاکستان، تقسیم ہند اور قیام بنگلہ دیش کے تناظر میں لکھے ہوئے اس ناول کے تمام کردار قطعی فرضی ہیں۔ ۱۹۳۹ء میں ولیم کینٹ ویل نام کا کوئی انگریز ڈھاکہ کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نہیں تھا۔ نہ اس کے بعد ”چارلس بارلو، بنگال سولیں“ اسی طرح سرایہ ورڈ سے لے کر فوجوان پھر دت تک سارا بارلو خاندان، دیپالی مرکار، ریحان الدین احمد، پادری بنرجی، ادمار لٹے، نواب قمر الزماں چودھری جہاں بیگم، ناصرہ نجم السحر، یاسمین بلونٹ، وغیرہ وغیرہ سارے کردار اور ان سے منسوب واقعات خیالی اور محض افسانہ ہیں۔ اور کسی ہندوستانی، پاکستانی یا بنگلہ دیشی شخصیات سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

اس ناول کے اٹھائیس ابواب ۱۶۶ء ۱۶۷ء میں رسالہ گفتگو (ممبئی) میں شائع ہو چکے ہیں۔

سرورق کی تصویر اسمبلاز میں ناچیز نے بنائی ہے۔ کمران کا جھونپڑا مسجد، کالی باڑی، اہلی راستے اور نوکائیں، عہد الیٹ انڈیا کمپنی کا جارجین کوئٹل مکان اور دخانی جہاز مشرقی بنگال کا مخصوص نظارہ ہے۔ کوئٹل میٹشن انگریز جاکم یا پلانٹر یا بڑے بنگالی زمیندار کی جائے رہائش، مشرقی بنگال کے عظیم دریاؤں پر چلنے والا اور مشرقی بنگال کے ”سہرے ریشے“ پٹ سن کو ملکیت اور اس کا لینڈ لے جانے والا اجازت بنگال کے تین سو سالہ سیاسی، ذہنی اور تہذیبی ریش کنکشن کی علامت بھی ہے۔

قوة العین حیدر

ممبئی ۱۹۷۹ء



الواب

نمبر صفحہ

۹

۱۷

۲۰

۲۲

۲۸

۴۸

۶۲

۶۶

۷۱

۷۵

۸۲

۹۱

۹۴

۹۸

۱۔ چند رکن

۲۔ طوفان سے پہلے

۳۔ ووڈ کینڈز

۴۔ جوار بھٹا کا گیت

۵۔ کھاری اودارائے

۶۔ ریلوے ڈپال مقیم بنرجی

۷۔ نیا عہد نامہ

۸۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا بنک

۹۔ کلثوم آیا

۱۰۔ ویشنو بیراگی

۱۱۔ رلی کاٹج

۱۲۔ شانتی نکیتن

۱۳۔ مس روزی بنرجی اور سولیڈ رٹی

۱۴۔ امار پرائیوٹ آرام موٹیر آئند

- ۱۵۔ سندربن ۱۰۱
- ۱۶۔ ارجسند منزل ۱۲۵
- ۱۷۔ گوڑ ملہار ۱۳۷
- ۱۸۔ میلہ رنجی راگنی ۱۵۱
- ۱۹۔ بھیرلی کا خواب ۱۵۴
- ۲۰۔ ہرے بنگال کا "آئندہ کاغذ" ۱۶۳
- ۲۱۔ اگست اندولن اور سپلز وار ۱۶۸
- ۲۲۔ بدروی ۱۷۱
- ۲۳۔ گنگا اور برہمپتر ۱۸۰
- ۲۴۔ چارلس بارلو، بنگال سولین ۱۸۹
- ۲۵۔ نواب قمر الزماں چودھری ۲۳۲
- ۲۶۔ ریحان الدین احمد ۲۳۷
- ۲۷۔ چیاں آراء سیگم ۲۴۱
- ۲۸۔ رونگیلا ناٹیرانجی ۲۴۷
- ۲۹۔ شرمستی رادھیکا سانیاں ۲۷۳
- ۳۰۔ ڈاکٹر بنوئے چندر سکراد ۲۷۹
- ۳۱۔ دہن کی پاکلی ۲۹۱
- ۳۲۔ محل اور اتمل ۲۹۹

- ۳۳۳ - بر دژ آف پیراڈائز
 ۳۲۳ - ایستفگري بالاسیرجي
 ۳۲۴ - یاسین بلونٹ، "ڈارک ڈانسر"
 ۳۲۶ - پائلٹ آفیسر اکمل مرشدزاده
 ۳۳۲ - ششکری کاناج
 ۳۳۵ - گڈلک ڈائری
 ۳۵۰ - شہر زاد کرینا بلونٹ
 ۳۵۳ - سوای آتم آند ششکری
 ۳۵۶ - جلسہ گھر
 ۳۶۰ - نامہ نجم السحر قادی
 ۳۶۶ - رچرڈ بارلو
 ۳۸۲ - آتار شنائی - ؟
 ۳۸۷ - ونگلہ راگنی
 ۳۹۲ - بھیروراک



چندر کچ

ڈھاکہ شہر کے ایک درمیانی درجے کے رہائشی علاقے میں ام اور کیلے کے درختوں میں جیسی وہ ایک پرانی دمنج کی سفید کوٹھی ہے۔ اس کی دیواریں کاٹی سے سبز ہو چکی ہیں اور روشنی والوں اور کھڑکیوں میں کئی جگہ پریشیوں کی جگہ ٹین کے کنستریٹ ٹکڑے اور رقتیاں لگی ہیں۔ سائے کے برآمدے میں ایک سرے پر باتھا کی مضبوط چٹاٹیاں کھڑی کر کے ایک کمرہ بنا دیا گیا ہے۔ کمرے کے دروازے پر نیلے رنگ کی ادھی ساری کا پردہ۔ ٹنگا ہے۔ اندر ایک بیچ، ایک میز اور طبی معائنے کا ادبنا سا بلنگ بچھا ہے، جس کے گدے کا نیلا چمڑا جگہ جگہ سے اُدھر لگایا ہے۔ دواؤں کی الماریاں اور نام پینے کی چلیپی کا اسٹینڈ ایک دیوار کے برابر لگا ہوا ہے۔ میز کے پیچھے بڑا کیسینڈر آویزاں ہے۔

برآمدے اور کشتادہ ہوادار کمروں کے سرخ و غنی فرش با افراط پانی سے دھوئے جانے کی وجہ سے صاف ستھرے اور چمکیلے ہیں۔ برآمدے میں ایک بیچ اور دو تین موٹے حصے پڑے ہیں اور دو سائیکلیں کھڑی ہیں۔ برآمدے میں سے اندر "بیٹھک خانہ" صاف دکھلائی دینا ہے۔ اس میں مید کا ایک صوف اور چند بے جوڑ کرسیاں رکھی ہیں۔ کونے کی ایک میز پر کامنی غلات سے ڈھکا ہار مونیم اور دیوار کے سہارے ایک ایسراج بھی موجود ہے۔ بیٹھک کی دیواروں پر آئینے سامنے ایک مرد اور ایک عورت کے دو بڑے پورٹریٹ آویزاں ہیں۔ ان پر ایسی دھندلی دھندلی سی کیفیت طاری ہے، جو کسی پراسرار نامعلوم کیسٹری کے ذریعے ان لوگوں کی تصویروں پر آپ سے آپ بھا جاتی ہے، جو مریچکے ہیں۔ عورت نو عمر اور دلکش، لٹمی ساری سے سر ڈھانپے اور ایک انکلی اپنی ٹھوڑی پر رکھے خاصی خوابناک آنکھوں سے کیمرے کو دیکھ رہی ہے۔ دوسری تصویر میں سنیدنتال پیٹے ایک خوش شکل نوجوان سر جھکائے غور سے ایک موٹی سی کتاب پڑھ رہا ہے۔

”بیٹھک خانے“ کے دروازے پہلو کے ددکروں میں کھلتے ہیں۔ دائیں جانب والے

مکرمے میں کھانے کی میز اور نعمت خانے کے نزدیک برابر برابر تین چار بائیاں۔ کونے میں بید کی تین میزوں پر اسکول کی کتابوں کے انبار کھوٹی ریشم کی اور قمیضیں، کینوس کے نئے اور پرانے جوتوں کا ڈھیر ایک کونے میں پڑا ہے۔ ادھر کھلے ٹین کے کس چار بائیوں کے نیچے ٹھہسے ہیں۔ کھانے کی میز کھرکی کے پاس کھیں ہے۔ یہ کھرکی پہلو کے ہرے بھرے احاطے میں کھلتی ہے۔ اسی کمرے کے برابر میں ایک اور جھوٹا کمرہ ہے جس کی ایک دیوار پر کھڑکی کے تختے لگا کر کالس سے بنا دی گئی ہے۔ اس پر دو اڑوں کی شبیاشاں، پُرلے خطیتر، قلم دوات، چند زنانہ بنگالی رسالے اور سلائی کی نوکری رکھی ہے۔ کالس کے نیچے پیسلے سے تخت پر دفعتاً بستر لگا ہے۔ ایک کونے میں مختصر سا مندر ہے۔ صندل کی چوکی پر رکھی ہوئی مورتیوں پر گنبد کے تازہ ہار پڑے ہیں۔ مورتیوں کے سامنے انجلی رکھی ہے۔ ایک پہلو میں ایک جھوٹی تصویر، جس میں ایک وکیل صاحب گاؤں پہنچے ہیں۔ اس تصویر پر بھی تازہ ہار پڑا ہوا ہے۔ چوکی کے سامنے سیتل پائی کھیں ہے جس کے ایک کنارے پر کھڑاؤں کی جوڑی رکھی ہے۔ کمرے کے دوسرے کونے میں ستنی کی انجلی پر بغیر گئی کی چند سفید ساریاں پڑی ہوئی ہیں۔ اس کمرے کا دروازہ پچھلے برآمدے میں رسوئی گھر کے عین مقابل میں کھلتا ہے۔

”بیٹھک خانے“ کے بائیں جانب والے کمرے میں جو مطلب سے ملحق ہے، صرف ایک پلنگ اور ایک آرام کرسی پڑی ہے۔ کونے میں دو ٹرنک رکھے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ اس کمرے کا مکین دنیاوی ضروریات سے خاصے نیاز اور لے رہا ہے۔

اس کمرے کے پیچھے ایک اور کمرہ ہے۔ اس میں سلاخوں والی کھڑکی کے نیچے کھادی کی چادر سے ڈھک پلنگ بچا ہے۔ سر ملنے ایک الماری ایک میز بائیسٹی کی دیوار کے ساتھ ایک ٹرنک اور اس کے اوپر ایک چمڑے کا ایٹھی کیس۔ کھوٹی پر چند سوئی سا رباں۔ الماری کے ایک ...
... فرسیر ایک کونے میں بھی خوش

رنگ دری پر کتبوں اور کابیوں کا ڈھیر۔

پچھلے برآمدے کے ایک سرے پر سوئی گھر اور دوسرے پر گودام ہے، جس کے دروازے
 بس بھاری تالا پڑا ہے۔ غسلخانے برآمدے سے باہر آنکھن میں ایک قطار میں بنے ہیں جن تک پہنچنے
 کے لئے ایک چوبی تختے پر سے گزرنا پڑتا ہے۔ غسلخانوں کے برابر میں سے زمین کو ٹھکی کی چھت پر بنے
 سرے اور مین کے سائبان کی طرف جاتا ہے۔ سرسبز آنکھن کے وسط میں تالاب جس میں ردھو
 پھلیاں پلی ہیں۔ تالاب کے سامنے ننسی کا منقش گملا اور دو ایک گوشے میں آم کے ٹھنے درخت
 بے نیچے جھلیوں والی بند گاڑی کھڑی ہے۔ جس کی کھڑکیوں میں چرمیوں نے گھونسلے بنائے ہیں۔
 لگن کے تین طرف سرخ اینٹوں کی دیوار ہے۔ ڈیوڑھی کے جوڑے دروازے کے باہر اونچی
 بچی گھاس میں سے گزرتی ایک پگھلڈی آگے جا کر پچھوٹے کی سنسان سروٹک سے جاملتی ہے۔
 ان میں کپڑوں کی خالی انگنی پر کڑے ان بیٹھے ہیں۔

فہاڑ ابھی برس کر چکی ہے۔ کوٹھی میں بڑا سنٹا ہے۔ خالی کمروں میں بھگی ہوئی ہوا
 لے دروازوں میں سے گزرتی سنڈلاتی پھر رہی ہے۔ ایک غسلخانے میں سے پانی گرنے کی آواز آرہی
 اور پھاٹک کے باہر ایک کھارا کڑوں میں ٹھکا چلم پی رہا ہے۔ جھٹ پٹے کی نیم تاریکی میں اس کی
 ہ کی روشنی کبھی کبھی تیزی سے چمک اٹھتی ہے پھاٹک کے ایک ستون پر جو برسہا برس کی بارشوں
 دچھاڑ سے ترچھا ہو کر ایک طرف کو دھنس سا گیا ہے۔ ”ڈاکٹر بنوئے چند رسکار ایم بی۔ بی۔
 “ کا بورڈ لگا ہے۔ دوسرے ستون پر سنگ مرمر کے ٹکڑے پر سنگالی میں ”چندر کنج“ نقش ہے۔
 اندر مطلب کی دیوار پر لگے چرخہ کاتے گاندھی جی اور منہم جوان سال نہرو کی بھڑی رنگین
 یروں والے کیلنڈر کے ورق بوڑھی گنگا پر سے آتی ہوئی اس بھگی ہوا میں آہستہ آہستہ بھٹکتا
 ہے ہیں۔

اس روز، دسمبر ۱۹۷۷ء کی اس تاریک شام، جب سارا گھر سنسان بڑا تھا۔ چند کنج کے
 برآمدے والے گودام میں چوری ہو گئی۔
 سیند لگانے والی، اس گھر کی انیس سالہ بیٹی دیپا کی تھی۔

ڈاکٹر بنوئے چند سرکار مطب بند کر کے حسب معمول ہوا خوری کے لئے باہر جا چکے تھے۔ ان کے تینوں لڑکے کھوکھو، شوٹو اور ٹونو ابھی فٹ بال کے میدان سے نہیں لوٹے تھے اور سناٹے میں پانی کرنے کی آواز سے محلوں ہوتا تھا کہ ڈاکٹر سرکار کی بیوہ بہن بھوتارنی دیہی اشناں کے چند منٹ بعد لو جایلں مصروف ہونے والی ہیں۔

اس وقت ڈاکٹر سرکار کی اکلوتی لڑکی دیپالی لالین ہاتھ میں لٹے زینے سے نیچے باغ میں اترے، اُس کے دوسرے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ اور وہ اندھیرا پڑے تک کوٹھے والے کمرے میں جہاں بجلی کی روشنی نہیں تھی "ہوم ورک" کرتی رہی تھی۔ نیچے آکر اس نے لالین نکلی کے گلے کے پیچھے جھپا دی اور دے پاؤں پر آگے کی میٹریاں چڑھ کر اپنے کمرے میں گئی جو میٹھک خانے کے بائیں جانب تھا۔ دروازے کی آڑ سے اس نے دیکھا کہ اس کی بھوپھی بھوتارنی دیہی غسل خانے سے نکل کر کھڑاڑ پیٹے کھٹ کھٹ کرتی چوبلی بل پر سے گزر کے اپنے کمرے کی طرف جا رہی ہیں۔

دیپالی دم سادھے کوٹھے کے پیچھے کھڑی رہی اور چند منٹ بعد بچوں کے بل چلتی بھوتارنی دیہی کے کمرے میں گئی جو سینٹل پانی پر لٹی پاتی میٹھ کر لوہان سلگانے کے بعد آنکھیں بند کر کے دنیا دیکھا ہے بے خبر ہو چکی تھیں۔ ان کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ دیپالی نے چند لمحوں کی چمکا ہٹ کے بعد آگے بڑھ کر کنبیوں کا موٹا گچھا ان کی پشت پر پڑے پتوں سے کھولا اور باہر آگئی۔ نکلی کے پیچھے سے لالین نکال کر گودام تک پہنچی اور دڑتے دڑتے نالا کھولا۔ اندر جا کر لالین ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر رکھ دی اور چلوں طرف دیکھا۔ گودام میں شدت کا جیس اور سیلن تھی۔ آنکھ کے رخ والی تعقل کھڑکی کے شیشوں پر امرت بازار پتریکا کے سپیدے کاغذ چپکے ہوئے تھے۔ متفرق مالتو مسلمان کے علاوہ کوٹھڑی میں ایک بہت بڑا چوبلی صندوق اینٹوں کے اوپر رکھا تھا۔ اس صندوق میں بنارس اور بالوچر بوٹے دار ساریاں اور دوسرا قیمتی سامان مقفل تھا۔ ہر سال جاڑوں میں بھوتارنی دیہی صندوق کھول کر بڑے انتہام سے بالوچر ساریاں باہر نکالیں اور آنکھوں میں چارپائوں پر پھیلا کر ان کو دھوپ میں سکھایا جاتا۔ اس کے بعد یہ بالوچر ساریاں پھر گم کے پتوں کی تہہ دے کر اسی احتیاط سے یکس میں واپس رکھ دی جاتیں۔

دیپالی نے سانس روک کر صندوق کا نالا کھولا۔ اس کے کپڑوں پر کبھی کشمیری شال سر کا کرتہ میں سے ساریاں نکالیں اور ان کو جلدی جلدی فرش پر رکھتی گئی۔ بنارس اور جالاندہ کی کی ساریاں ایک طرف

کر کے اس نے "باؤچر لوٹے دار" ساریاں علیحدہ کیں جو خدا میں نہیں تھیں۔ باہر کی آواز پر کان لگاتے ہوئے اس نے لالٹین کی لواؤچی کر کے ساریوں پر ہاتھ پھیرا۔ ساریاں بیچ پرانی ہونے کے باوجود بالکل نئی معلوم ہو رہی تھیں جیسے ابھی ابھی نوالی کے مرشد آباد کے گڑھوں سے اتری ہوں۔ موقع کی نزاکت کے باوجود وہ ان کے آنچلوں پر بنے نقش و نگار کو دیکھتے میں محو ہو گئی۔ کاستی، نارنجی، فیروزہ۔ کاستی ساری سب سے بیش قیمت تھی۔ اس کے آنچل پر ایک قطار میں مرشد آباد کے نواب بیچوان نوش کر رہے تھے۔ نارنجی ساری کے پلوپر ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگلینڈ ناؤ میں بیٹھے تھے۔ فیروزہ ساری کے آنچل پر منخل سیگمات ہاتھی کے ہودے پر بڑھی گلاب کا پھول سوکھنے میں مصروف تھیں۔ وقت لیشم کے اسٹانے بانے میں الجھ کر ختم چکا تھا۔

اچانک برآمدے میں آہٹ ہوئی۔ دیپائی نے پھرتی سے تیزوں ساریاں سفید مٹل کے ٹکڑے میں بیٹیں۔ باقی سلمان صندوق میں واپس رکھا۔ اور سہم کردروانے کے پاس جا کر کھڑی ہوئی۔ مگر اب پھر ناموشی چھا چکی تھی۔ صحن میں کپدے اور سیتا پھل کی ڈالیاں سرسرا رہی تھیں۔ بہت دور سڑک پر ایک ٹھوڑا گاڑی کھڑکھڑاتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اس گھپ اندھیرے میں نجانے کہاں جا رہی تھی۔

دیپائی نے لمبا سانس لیا اور ساریوں کا بندل اپنے آنچل میں چھپا کر باہر نکلی۔ گودام میں تالا ٹایا۔ بندل برآمدے کی سیڑھیوں پر ڈال دیا اور بھوتارنی دیپائی کے کمرے میں جا کر نہایت صفائی سے کنبیاں ان کے پتوں میں باندھ دیں۔ بھوتارنی دیپائی چڑچڑی اور تنک مزاج ہونے کے علاوہ غیوں کے معاملے میں حد سے زیادہ سخت گیر اور محتاط تھیں۔ وہ ڈولی تنک کا تالا صوف اپنے تھ سے کھولتی تھیں۔ کنبیاں ان کے پتوں میں باندھنے کے بعد دیپائی نے پوری طرح آنکھیں کھول رہی تھیں۔ گھوٹکی کی مورفی کو دیکھا اور دروازے سے نکلی۔ سیڑھیوں پر سے بندل اٹھا کر آنگن میں سے ہانگتی ڈیوڑھی سے تیر کی طرح نکل کے پھیل سڑک پر پہنچ گئی۔ پھاٹک پر بیٹھا کہاں جلم ختم کر کے کہیں اسٹوبوچکا تھا۔ دیپائی نے چاروں طرف دیکھا اور چند قدم آگے بڑھی۔ سڑک کی پیلا کے نزدیک نوجوان سائیکل سنبھالے کھڑے نیاتری سے آسمان کو تنک رہا تھا۔ دیپائی کو دیکھ کر اس نے تھکا لکا سا اشارہ کیا۔

دیپائی دوڑ کر اس کے قریب پہنچی اور اچک کر سائیکل کے پیچھے کمر پر بیٹھ گئی۔

نواب پورے کی ایک گلی کے سرے پر ایک قدیم مکان کی بیٹھک میں چند نوجوان فرش پر بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں اُن میں سے ایک نے نظر اٹھا کر دیکھا دیسیاں سرکار سامنے کھڑی تھی۔ اس نے جھک کر بندل نوجوانوں کے سامنے رکھ دیا۔ اید نوجوان نے بندل کھولا۔

”دادا۔ اس سے زیادہ قیمتی چیز میرے گھر میں نہیں ہے۔“

اس نوجوان نے جسے دیسیا نے مخاطب کیا تھا۔ ساریاں اٹھی بلیٹیں۔ ”باؤچر ساریاں“ اُس کے منہ سے نکلا۔ اس نوجوان نے اپنے شانوں پر زلفیں چھٹکار کھی تھیں۔

”باؤچر۔!“ دوسرے نوجوانوں نے حیرت اور اشتیاق سے ساریوں پر ہاتھ پھیرا۔

”مگر بھائی ان کو خریدے گا کون۔؟ یہیں تو نور اچھے سو روپے چاہئیں۔“

”بیار سو تک میں نہیں بک جائیں گی؟“ دیسیا نے منتظر ہو کر پوچھا۔

”باؤچر ساریاں؟ آج کل دیسیا اپریکلاس لیڈ میز انگریزی جا رہی ہیں۔“

”مگر یہ۔۔۔ یہ تو بے مثلی چیز ہے اور نایاب۔“ دوسرے نوجوان نے کہا۔

”ہندوستان کا بیشتر پرانا فن نایاب اور بے مثال ہے۔ پہلے نے چڑ کر جواب دیا۔“ اس سے

لیا فرق پڑتا ہے۔“ پھر وہ دیسیا سے مخاطب ہوا۔ ”تمہارے پاس اور کچھ نہیں؟“

”دیسیا نے تاسف سے سر ہلایا۔ دفعتاً اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ”ان کو بیچنے یا گروی رکھنے کی

وشش تو کیجئے کتنے دادا۔“

زلفوں والا نوجوان گہرا سانس لے کر فرش پر سے اٹھا۔ ”اچھا۔ تھینک یو۔ دیسیا۔ اب تم لوں بھاگ جاؤ فوراً۔“ اور دفعتاً وہ تینوں نوجوان، جن میں سے تیسرا بالکل خاموش رہا تھا۔ بندل سمیت کوٹھری کے پچھلے دروازے سے نکل کر باہر اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

اب رات کے نوج رہے تھے اور میز پر کھانا چنا جا چکا تھا۔ بھوتارنی دیہی حسبِ عادت بڑ بڑاتی ہوئی رسوئی گھر اور کھانے کے کمرے کے پھرے کر رہی تھیں۔ کھو کھو، شو نو اور گونج سے واپس آ کر تندہی سے کھیل پر بحث کرنے میں مشغول تھے۔ ڈاکٹر سرکار چل قدمی سے لوٹ آئے تھے اور اپنے کمرے میں آرام کری پر نیم دراز حسبِ عادت ایک پاؤں بلانے ہوئے سوچ بچار میں مصروف تھے۔

”دیپالی۔“ انہوں نے آواز دی۔

دیپالی اپنے کمرے سے نکل۔ ڈاکٹر سرکار آرام کرسی سے اٹھ کر بیٹھک خانے سے گزرتے کھانے کے کمرے میں پہنچ گئے۔ وہ ایک بھاری جسم کے متین چہرے اور سوچتی ہوئی آنکھوں والے انسان تھے۔ ان کے چہرے کے سکون سے ظاہر ہوتا تھا کہ خاموشی اور صبر کی دو سرائقہ میں زندہ رہنا انہوں نے سیکھ لیا ہے۔

کھانے کی میز پر جا کر اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے دیپالی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں وہ اسی وقت اندر آ رہی تھی۔ ڈاکٹر سرکار نے ذرا تعجب سے اس کا جائزہ لیا۔

”کیا بات ہے؟ طبیعت خراب ہے؟ اتنی گھرائی ہوئی کیوں ہو۔“

”جی نہیں۔ بابا۔ میں روزی۔ روزی کے گھر گئی تھی۔ واپس آ رہی تھی تو۔“ یلیا کے پاس ایک بھینسہ مل گیا۔ اُس کے در سے دوڑتی دوڑتی آ رہی ہوں۔“ اس نے گلے پر ہاتھ رکھ کر ہنسنا چاہا۔

”اتنی رات گئے روزی کے گھر سے اکیلی آ رہی ہو؟“ ڈاکٹر سرکار نے ذرا درشتی سے اُسے ڈانٹنے کی کوشش کی۔

”جی۔ جی نہیں۔ جو رات ساتھ آیا تھا۔“ وہ دھم سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس کے نینوں چھوٹے بھاٹی شور مچاتے ہوئے کھانا کھانے میں جُٹ چکے تھے۔

”ایک خوش خبری تمہارے لئے۔“ کھانے کے دوران میں ڈاکٹر سرکار نے دیپالی سے کہا۔

وہ دھک سے رہ گئی۔ ”کیسی خوش خبری۔ بابا؟“

”اشیت بابو۔“ ڈاکٹر سرکار نے کرسی پیچھے سرکا کے جواب دیا۔ ”میں ابھی اشیت بابو کے

ہاں گیا تھا۔ وہاں ان کے بہنوئی آئے ہوئے ہیں۔“

”کلکتے والے؟“ جیوتی بابو۔“

”جیوتی بابو۔ وہ تمہارے ریکارڈ بھرنے چاہتے ہیں۔ ایچ۔ ایم۔ دی ریکارڈ۔“

”میرے ریکارڈ؟“ بابا۔ سچ بتائیے۔“

نینوں لڑکوں نے کھانا چھوڑ کر عمل چاٹنا شروع کر دیا۔

”دیدہ کے ریکارڈ میں گئے۔ گھر گھر دیدہ کے ریکارڈ میں گئے۔ کچھ کچھ زنگیہ تار سے اعلان کیا۔
”دیدہ امیر ہو جائے گی۔“ منجھلا شو تو زور سے چلا یا۔

”دیدہ ہم کو پیسے دے گی۔“ ٹوٹو نے سر جھکا کر نرمی سے کہا۔

”پہلے سائٹس ماسٹر شینل بابو کی بڑی دیدہ کے ریکارڈ سارے انڈیا میں بکتے ہیں۔ وہ اتنی
امیر ہو گئی ہیں۔ اُن کے پاس تو موٹر بھی ہے۔“ شوٹو بولا۔

”دیدہ ریڈیو سے جتنے پیسے ملتے ہیں لاکر تم لوگوں پر خرچ کر دیتی ہے۔“ کھوکھو نے ڈانٹ بنائی۔

”دیدہ اتنے پیسے کیا کرے گی؟“ سب سے چھوٹے ٹوٹو نے جو سب سے لاڈلا تھا ملاحظہ کیا۔

”اپنا جہیز بنائے گی، اور کیا تمہارا سر کرے گی۔“ بھوتارنی دیہی نے جواب تک تیوری پر بل

ڈالے چپ چاپ کھانا کھانے میں مشغول تھیں، گرج کر کہا۔

دیپاتی ذرا سی سرخ ہو گئی اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ اس سارے ہنگامے میں وہ شام کی

مہم کو تقریباً بھول چکی تھی۔ وہ میز پر سے اٹھنے لگی تو ڈاکٹر سرکار نے اس سے کہا۔ ”جیوتی بابو۔“

انہوں نے تم سے کل ریڈیو اسٹیشن پر ملنے کو کہا ہے۔ تم کو ریکارڈنگ کے لئے ملکتہ جانا ہو گا۔ تم ریڈیو

اسٹیشن کل کس وقت جاؤ گی؟“

”صبح کو بابا۔ دس بجے۔“

”کالچ پھر ناغہ۔“

”بابا۔ اب تو چھٹیاں شروع ہونے والی ہیں۔ اور درط کے اب ہڑمچاتے یا تھ دھونے کیلئے

باہر جا چکے تھے۔ بھوتارنی دیہی چپ چاپ برتن میٹھے میں مصروف تھیں بابا۔ پروگرام کے پیسے جمع کر

کے پتوں کے کپڑے بنادیتے تھے۔“ وہ ٹھٹھک گئی۔ ”بابا۔ میری ساریاں بھی بالکل پھٹنے والی ہو رہی

ہیں۔“ اُس نے جھینپ کر بات ختم کی۔

ڈاکٹر سرکار نے سر جھکا لیا۔ پھر وہ آہستہ سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔ اور گودام کے نزدیک والے

نل کے پاس کھڑے ہو کر کھانا کرنے لگے۔ دیپاتی چپکے چپکے پیچھے آئی اور گودام کے بند کواڑوں کو نور سے

دیکھا جن میں لگا لو ہے کا وزنی تالا بھد ساکت اور پراسرار معلوم ہو رہا تھا۔

طوفان سے پہلے

”ابانی گنگو پادھیائے۔“

”پریزنٹ۔“

”مولینا گھوشال۔“

”پریزنٹ۔“

”موزی بنرجی۔“

”پریزنٹ۔“

”جہاں آراچودھری۔“

”پریزنٹ۔“

”دیپالی سرکار۔“

”ایبسنٹ۔“

سوکس (civic) کی لیکچرر مسز بوس نے سیکنڈ ایر آرٹس کی حاضری لیتے ہوئے روزی بنرجی اور جہاں آراچودھری کے برابر والی تیسری خالی کرسی پر نظر ڈالی۔

”دیپالی پھر غائب ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”دیکھئے کروٹادی۔“ جہاں آرا نے پتو منہ پر رکھ کر کھلی کھلی کرتے ہوئے سرورسنی چھپا کی کوشش کی۔ ”دیپالی بیمار ہے۔“

”تم کو کیسے معلوم؟ تم تو اس کے گھر سے اتنی دور رہتی ہو۔“

”وہ کل۔۔۔ میرا مطلب ہے، کل مجھے معلوم ہوا تھا کہ بیمار پڑ گئی ہے بے چاری۔“

”لڑکیو۔“ مسز بوس نے کلاس کو بڑے دکھ سے مخاطب کیا۔ ”فائنل امتحان سر پر ہیں اور

تم سب کی سب ہوگی فیمل - اور روزی -

”ایس کردنادی -“

”تم دونوں - تم اور دیپالی ہر وقت ڈر لے کر رہے ہیں جی رہتی ہو ہر وقت - لیکر بیس بنو گی؟“
”کھی کھی کھی -“ روزی اور جہاں آرانے ہنسی روکی -

”کہہ دوں -؟“ روزی نے چپکے سے جہاں آرا سے پوچھا -
”کہہ دو -“

”کردنادی - دیکھ کر کردنادی - اصل میں دیپالی کھٹکتے جا رہی ہے - ایچ - ایم - وی ریکارڈ بھر وائے
”ایچ - ایم - وی ریکارڈ -“ ساری کلاس نے خیر لگایا -

”آج وہ گراموفون کمپنی کے ڈائریکٹر سے ملنے جا رہی تھی تو راستے میں میرے گھر پر چھٹی کی عینی
چھوڑ گئی -“ روزی نے کہا -

”کہاں بے عرضی -؟“

”بھول آئی کردنادی - کھی کھی کھی -“

مسز بوس ایک بینک دل اور شریف خاتون تھیں - انہوں نے ذرا جھٹاکر روزی کو گھورا
اور باقیانہ کلاس کی ماضی لگانے کے بعد فوراً اپنا کلاس روم والا بے رنگ لہجہ اختیار کر کے سامنے
دیکھتے ہوئے کہا - ”صفحہ ۲۱۸ کھولو - گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء -“

”اوہ - سو - سو - اوہ - دیپالی کی خوشی میں کردنادی - آج جلدی چھٹی پلیئر - پلیئر - پلیئر -“

”جاؤ - جاکو - منہ علی چڑھائیں -“ آدھ گھنٹہ پڑھانے کے بعد مسز بوس نے مصنوعی غصے کے ساتھ
کتاب زور سے بند کی - لڑکیاں بھلا بھلا کرتی مگر سے نکل کر باہر گھاس پر کھیر گئیں -

روزی اور جہاں آرا نے ٹھک شاب پر جا کر چاٹ خریدی -

ابانی نے قریب آکر چپکے سے روزی سے کہا - ”چھانک پر کوئی لڑکا دیپالی کو پوچھ رہا ہے -“

”وہی -؟“

”ہاں -“

”میں جاتی ہوں -“

روزی بھاگتی ہوئی دور چھاٹک پہنچی۔ نوجوان جو کل شام دیپالی کو سائیکل پر بھا
نواب پور لے گیا تھا، اطمینان سے درخت کی آڑ میں کھڑا پاؤں چبارہا تھا۔ قریب ہی ایک گائے
س پر کھڑے چاٹ کے خالی دونوں پر منہ مارنے میں مصروف تھی۔

”دیپالی نہیں آئی ہے۔ کوئی پیغام۔؟“

”یاں۔“ لڑکے نے کہا۔ ”اس سے کہنا ۱۹ تاریخ کی شام کو ریڈیو اسٹیشن کی برساتی
ٹھیک سات بجے ضرور پہنچ جائے۔ اور دوسری بات یہ کہ وہ جس کام کے لئے کل گئی تھی وہ امید
ایک دو دن میں ہو جائے گا۔“

”اور کچھ۔؟“

”بس۔۔۔ نو مشکار۔“ لڑکا سائیکل کے پیڈل پر پاؤں مارتا ہوا ہوا گیا۔
روزی جو بے حد تیزی سے دوڑتی چھاٹک پر آئی تھی اب سر جھکائے سوچ میں ڈوبی ملک نشا
پہنچی۔ جہاں بہت سی لڑکیاں اکٹھی ہو کر کسی نئی خبر پر زور زور سے تبصرہ کر رہی تھیں۔
”اور سنا تم نے روزی۔“ ”مندیہا نے کہا۔“ ”مس ہیڈ کے آج کہہ دی تھیں کہ مس اومار
م سے واپس آگئی ہیں اور شاید پھر یہاں پر ہانا شروع کر دیں۔“
”مارے گئے۔۔۔ دیدی کو انہوں نے پڑھایا تھا۔ دیدی کہتی ہیں کہ بس جان نکال لیتی تھیں۔“
قے نے کہا۔

”ہاں تو بھیا مزے ہیں۔ ہم تو انٹر کے بعد گھر بیٹھ جائیں گے۔ ابا نے حکم دے دیا ہے!“
آرا نے کیا۔ ”تم لوگ اپنے مرقی رہو۔“

”تیرا تو۔۔۔ اس کا جہاں آرا کا تو کسی ڈرھیل مولوی سے بیاہ ہو گا۔ جناب مولوی بے نو
مرین احمد صاحب۔!“ ”موٹی مسخری دو مولانے منہ پھاڑ کر مایا کرتے ہوئے کہا۔ اور چنے چھاتی ہو
دارے ہٹ بھاگ۔“

”تو خود بھاگ۔“

سہ منزلہ عمارت میں پانچویں پیرید کی گھنٹی بجی۔

”چلو بھائی۔ آگیا مس گرین فیلڈ کا گھنٹہ۔ یہ روزی نے منہ بنا کر کہا۔“

”وہیں وہیں دیں۔“ روٹولا منہ ٹیڑھا کر کے مس گرین فیلڈ کی نقل کرتی، چپے چھانکتی اُنکے چلنے لگی۔ اس کے پیچھے پیچھے روزی بنرجی اور جہاں آرا چودہری لڑکیوں کے غول میں شامل عمارت کی سمت روانہ ہو گئیں۔

اس وقت جاٹوں کی سہانی دھوپ ہماری زندگی پر بکھری ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ ایڈ گریڈ کالج کی بلند عمارات پڑھائی کی سنجیدہ خاموشی میں ڈوب گئیں۔ جس طرح جہاز آہستہ گہرے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ ان عمارتوں کے روشن مکروں کی دیواروں پر لگی برطانیہ شاہی خاندان اور بنگال کے سابق گورنروں کی سینجیدہ آنکھیں چپ چاپ سامنے کے منظر کو دیکھ رہیں۔ جہاں بھانت بھانت کے سماجی اور اقتصادی پس منظر سے آئی ہوئی، قدیم بنگال کی بیٹیاں اپنی اپنی کتابوں پر جھکی حصولِ علم میں مہمک تھیں۔ اور کون کہہ سکتا تھا کہ باہر بیگم ان پرانی جنگوں کی جھنکار سے گونج رہی ہے۔ ان جنگوں میں لڑنے والے جو زبانیں بولتے تھے، وہ دی گئیں۔ وہ قومیں اور تناسیں ختم ہو چکیں جن وجوہات پر اور جن مقاصد کے لئے وہ لڑا کرتے تھے۔ وہ فراموش کر دیئے گئے۔ پرانے فیصلوں پر نظر ثانی کرنے کی ہمت دنیا کو بہت لیکن سیکر ان زندگی میں ہر آواز، ہر کرب اور وقت کا ہر عکس موجود ہے اور زندہ ہے اور دفعتاً کالج پر پھیلا ہوا سنسٹاٹا گرا ہو گیا کہ اُسے باسانی سنا جاسکتا تھا۔ طوفان

چھانے والا سنسٹاٹا

۳

وِڈِلِسٹِڈز

رہنما کی ایک عالیشان کوٹھی کے ایک پہلو کے کمرے کے فراموشی درجے میں سے م اور نیلا آسمان نظر آسکتا تھا کیونکہ حدِ نظر تک ہریالی کے علاوہ وہاں کچھ اور نہیں تھا۔ اکا دکا پورے

پھولوں کے تختوں میں پیچھے چپ چاپ اپنے کام میں مصروف تھے۔ دریچے کی سیٹ پر جوئریخ ب کے پھولوں والے جھاردار غلاف سے ڈھکی ہوئی تھی، ایک نوجوان خاتون عینک لگائے بیت کے عالم میں بیٹھی خط لکھ رہی تھیں۔ سیزران کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ دریچے کے قریب لکڑی کی رائٹنگ ٹیبل پر چھوٹے چھوٹے بیضوی فریموں میں چند اور اسٹوکر ٹیکنگائی تین کی تصاویر بھلارہی تھیں۔ مگرہ جو انگریزی اصطلاح میں مارننگ روم کہلاتا تھا۔ اس کی دیواروں پر گلاب کی بیل کے ہلکے گلابی اور زرد، اور کاسنی اور سبز پیرٹن والا وال منڈھا تھا۔ اس طرح کا وال پیپر ایک زمانہ میں امرائے کلکتہ خاص طور پر ولایت سے منگوا کر بنے مکروں میں لگواتے تھے۔

دیواروں پر سنہری فرموں والی بڑی بڑی تصویریں تھیں۔ لارڈ بائرن یونان کے ساحل تی سے اتر رہے ہیں۔ کاسٹیل کا ایک دیہاتی منظر۔ آئری پیرڈنلے کی مشہور سلوٹس لروائلڈ والی جو سیاہ کپڑوں میں ملبوس، تھالی میں دھرے یوحنایہ نمبر کے بریدہ، سر کے بال پکڑے ہیں بھر رہی ہے۔ ایک تصویر مسٹر پک وک کی تھی۔

دروازوں پر اور دیوچوں میں موٹی ریشمی ڈوریلوں سے بندھے پھندوں والے دیویشمی پردے تھے۔ آئینش دان پر ڈریڈن چائنا کی چرواہی بیٹھی تھی۔ اس کمرے کا اور سائے گھر کا طرز آرائش، طور پر مغربی اور دکھورین تھا۔

لیکن جو خاتون اس مارننگ روم میں موجود تھیں وہ دکھورین نہیں تھیں۔ وہ ایک جوشیلی باشعور اور سنجیدہ سیاسی کارکن تھیں جس بیڈ پر وہ خط لکھ رہی تھیں اس کے اوپر کے ایک کونے دو ڈیسٹرز، رمنا، ڈھاکہ، گوٹھک پرنٹ میں ثبت تھا۔ مگر مکتوب الیہ لندن اسکول آف انس کا ایک برطانوی یہودی، بکونست پر وفسیر تھا۔

خط لکھتے لکھتے دفعتاً انہوں نے غصے سے توڑ مروڑ کر اسے دور پھینک دیا۔ فری سیزر۔ ذرا سے اٹھ کر اخلاقاً اس کی طرف لپکا۔ لیکن خاتون اسی طرح دل گرفتہ اور جھنجھلائی ہوئی بیٹھی رہیں۔

کہ ان کو باؤا گیا تھا کہ یہ خط سارا کا سارا اس سر کی نذر ہو جائے گا

چند منٹ بعد سر ہاتھوں میں لے کر وہ دریچے سے باہر دیکھنے لگیں اور پھر کرب سے انہوں نے

سوچا۔ اب مجھ پر دورہ پڑنے والا ہے۔ انہوں نے بینک اٹار کر انکھیں زور سے میچ لیں۔ اور اسی طرح
ساکت بیٹھی رہیں۔ اب وہ دانے گیمبریل روز بیٹی کی دامتوزیل معلوم ہو سکتی تھیں۔

جب بیرسٹر مری توش کار رائے نے اپنی وسیع و عریض کوٹلی کا نام ”وڈ بیٹڈز“ رکھا تو وہ آج
رواج کی تقلید کر رہے تھے۔ جس کے تحت ہندوستان کا نیا مغربی تعلیم یافتہ ادبیری طبقہ تقریباً سو برس سے
اپنی کوٹھنوں کے انگریزی نام رکھنے میں مصروف تھا۔ ہمارا کوچ بہار کے ملکے والے محل کا نام بھی وڈ بیٹڈز
تھا۔ مگر بیرسٹر رائے کو یہ نام اس قدر پسند تھا کہ انہوں نے اسے تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔
بیرسٹر رائے برہمچو تھے۔ بنگال کے رائے اور ٹھاکر خاندان چودھری پر یواروں کی مانند زمیندار تھے
اور مذہبی لحاظ سے قدامت پسند ہندو۔ زیادہ تر دت، سیکن اور گپتا۔ غیر برہمن جاتیاں برہمن ہو چکی تھیں۔
بلکہ بیرسٹر رائے کے دادا کیشپ چندر سین کے چیلے بن گئے تھے اور ان کا خاندان اب تقریباً پون صدی
سے برہمنو اور آزاد خیال تھا۔ بیرسٹر رائے کی والدہ اور بھوپھیوں تک نے اسکول اور کالج میں پڑھا تھا۔
بیرسٹر رائے کی بیوی مشہور ”سوشل فکر“ تھیں۔ اُن کا بڑا لڑکا رملیندو، بڑا دیندنی ملکے میں اعلیٰ ایگریکیٹ
اور ”کنفرڈ بیلے“ تھا۔ اور زیادہ وقت ریس کورس پر اور شراب نوشی میں گزارتا تھا۔ بیرسٹر رائے کو فکر تھی
کہ ان کی لڑکی بھی کہیں کنفرڈ اسٹیسر بن جائے۔ اُنہی یہی نظر آتے تھے۔ مگر اس صورت حال کا مداوا
کے پاس نہیں تھا۔ اُن کے باپ کی نسل نے بچپن کی شادی اور دوسری سماجی خرابیوں کے خلاف جہاد
کیا تھا۔ اور آزادی نسوان کا پرچار کرنے میں بڑی حد تک کامیاب رہے تھے۔ اور اب اوماؤن کی لڑکی
اٹھائیس سال کی ہونے کو آئی تھی اور شادی سے منکر تھی۔ اور وہ اور ان کی بیوی اوماؤن کی خلاف ورزی
شادی پر مجبور نہ کر سکتے تھے۔ انقلاب اپنے ہی بچوں کو کھاتا ہے۔ بیرسٹر رائے اکثر دکھ سے سوچ
ہماری ان ”پانیئر“ خواتین کا جن میں اوماؤ بھی شامل ہے، کیا انجام ہوگا؟ مہا بنگال سو برس سے ایک ترقی
یافتہ سماج ہے، مگر پرانی اور نئی اقدار کی اس آویزش کی زد خود اپنی زندگی پر پڑے تو کیا کرنا چاہئے؟
اوماؤ کی شکل بہت مہوئی تھی۔ باپ کی دولت و ثروت کی وجہ سے اچھے رشتے اس کے لئے آ
سکتے تھے۔ لیکن وہ ریاست کے چکر میں مبتلا تھی۔ اوماؤ بی ایک گول مٹول چیرے والی گد بدی سی

رہا مٹی خلیق اور متواضع یکجہ اور نیریز بین۔ لیکن اسے نصہ بہت جلد آجاتا تھا۔ اور ماں باپ سمیت کوئی بھی اس کی خلاف ورزی کوئی بات اس سے کہتا تو وہ فوراً آگ بگولہ ہو جاتی تھی۔ میری بیٹی اپنی زندگی میں ایک ”بیک پنچر“ کبھی نہیں بنے گی۔ پیرسٹر رائے اکثر سوچتے اور مزید فکر مند ہونے لہتے۔ دھاکہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کرنے کے بعد اس نے کچھ عرصہ گریجویٹ اسکول میں پڑھایا تھا اور اسی زمانے میں صوبے کی کمیونسٹ تحریک میں شامل ہو گئی تھی۔ پھر پیرسٹر رائے نے اسے اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھیج دیا تھا۔ وہاں کرشنا مینن کی انڈیا لیگ اور جی پام دت کی برطانوی کمیونسٹ پارٹی کی وجہ سے گروڈا کر بلانیم چڑھ چکا تھا۔ لندن اسکول آف اکنامکس سے ڈگری حاصل کر کے آتا چند روز قبل یہاں دھاکہ واپس آئی تھی اور پیرسٹر رائے کی ملاقات ایک قدرے اجنبی لڑکی سے ہوئی تھی۔ پیرسٹر رائے کھفت بے حد پریشان ہو گئے تھے۔ اب تک انہوں نے ایک ”سفری ذہن پرست رویہ“ سمجھ کر آتما کے سیاسی مشاغل پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ کیونکہ بیٹی کی محبت کے علاوہ وہ خود چالیس برس قبل کے انگلستان سے لبرل ازم کا سبق سیکھ کر آئے تھے (زندگی میں کتنے بہت سے رویے آپس میں گڈ رپتے ہیں) مگر اب حالات بے حد مختلف تھے۔ جنگ جیو جی تھی اور ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی غیر قانونی تھی۔ پیرسٹر رائے کے سارے اور آتما کے ماموں دھرم دے موہن سین ڈی۔ آئی جی پولس نے کئی بار اپنی مین اور بیٹی کو سمجھایا تھا کہ لڑکی کو قانونیں رکھیں۔ مسٹر رائے عرصہ ہوا قیصر ہند کا تمغہ حاصل کر چکی تھیں۔ اور پیرسٹر رائے کو سر کا خطاب ملا چاہتا تھا۔ عنقریب ہائی کورٹ جج بننے والے تھے۔

آتما کی عمر گرمیاں اب دہائی تفریح کی حدود سے آگے بڑھ کر طبی خطرناک صورت اختیار کر سکتی تھیں۔

آتما رائے نے مورزنگ روم کے درپے کی سفید چوڑھٹ پر سے سر اٹھا کر زور سے کینٹیاں دیاں اور دوبارہ عینک لگا کر باہر چھانکا۔ دو کاسٹیل آپس میں باتیں کرتے گھاس پر سے گزر کر سامنے رسائی کی سمیت حاد سے تھے۔ آتما دھرم دے موہن سین ڈی۔ آئی جی پولس

پہنچی تھیں۔ اُن کے ماموں دھرتندر موہن سین ڈی آئی۔ جی پولیس، بھانجی کے سوا گت کے لئے شمالی بنگال سے ووڈ لینڈز ڈھاکہ آئے ہوئے تھے۔ اور اُن کے محلے کے کانٹیل اور پولس انسپکٹ ووڈ لینڈز کے احاطے میں ہر طرف پھلتے پھرتے تھے۔

ابھی ڈائینگ روم میں لیچ کا سر ہلا کھنٹہ بچے گا۔ ماں اور بابا اور ماما کھانے کی طویل میز پر بیدار نشا نشی سے آکر بیٹھیں گے اور کھڑکھڑاتے — سفید نیپکن کھولتے ہوئے اس سے بھری سفر کے حالات دریافت کریں گے۔ جنگ چھڑنے کے بعد اوما کے خیریت وطن واپس آ جانے کی سزا کنبے میں خوشیاں منائی جائیں گی۔ اوما آدھے سر کے درد کی مریض تھیں۔ لندن جانے سے قبل اکثر ڈیوٹی جب درد مرکا دفرہ پڑتا تھا تو وہ تبدیل آب و ہوا کے لئے رائے خاندان کے کارڈن ہاؤس چلی جاتی تھیں۔ جو دریائے میگھنا کے ایک خوبصورت جزیرے پر پلاش کے درختوں میں چھپا کھڑا تھا۔ آج صبح بریک فاسٹ کی میز پر ماموں نے ان کی مصلحت صورت دیکھ کر تجویز کیا تھا کہ وہ سفر کی تھکان دور کرنے کے لئے چند روز کو کارڈن ہاؤس چلی جائیں، لیکن خود ادمارائے کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بہت سخت بیمار پڑنے والی ہیں۔ اور بہت سی متوقع اور غیر متوقع مصیبتوں، کلفتوں اور پریشانیوں کا انھیں بہت جلد سامنا کرنا ہے۔ سفید کشمیری شال کندھوں سے اچھی طرح لپیٹ کر وہ دند و سیٹ پر سے اٹھیں اور آہستہ آہستہ قدم رکھتی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

جوار بھاما کا گیت

ڈھاکہ کے ایک مسلمان رئیس کی دو منزلہ کوٹھی کرائے پر لے کر حکومت نے حال ہی میں اس میں ریڈیو اسٹیشن قائم کیا تھا۔ یہ کوٹھی بھی ڈھاکہ کے کی ساری عمارتوں کی طرح قدیم، دقیانوسی اور ماضی میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جب دیہاتی نے ریڈیو پر گانا شروع کیا۔ ڈاکٹر سرکار بڑی باتا بندی سے اس کے ساتھ آئے تھے اور چھڑی کی موٹھ پر ہاتھ دھرے برآمدے کی ایک کرسی پر چپ چاپ بیٹھے

رہتے تھے۔ لیکن تین چار بار آنے کے بعد وہ اُٹا گئے تھے۔ مطب کے حرج کی پرواہ انہیں نہیں تھی۔ مگر انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ریڈیو اسٹیشن غیر اخلاقی غٹے نہیں ہے۔ ملکتہ شہر میں بڑی آزادی تھی۔ لیکن فیوڈل ڈھاکر ابھی سیدِ قدمت پسند اور بے اندہ تھا۔ اور خود ڈاکٹر سرکار غفار گاؤں صلع مین سنگھ کے جس مفلوک الحال زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس میں لڑکیوں کا تنہا گھر سے باہر نکلنا بہت مایوس سمجھا جاتا تھا۔ مگر اب دیپا کی ایسی ریڈیو اسٹیشن آتی تھی یا کبھی کبھار کھوکھو اس کے ساتھ آ جاتا تھا۔ وہ عباس الدین احمد کی شاگردی میں مشرقی بنگال اور بالخصوص مین سنگھ کی نوک سنگیت کی ماہر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے نغمہ پر پروگرام بھی مقبول ہو چکے تھے۔

۱۹ دسمبر کی شام، وہ اپنا پروگرام ختم کر کے اسٹوڈیو سے نکل رہی تھی کہ برابر کے ایک دروازے پر ڈاکٹر سرکار کے پرانے دوست اور شائقِ نغمیتوں کے پروفیسر، ماہرِ لسانیات سید مرتضیٰ حسین اس سے ٹکرا گئے۔ انہوں نے تیوری پر بل ڈال کر اور چھٹی اٹھا کے گویا ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے بابا کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہیں کا کا!“ وہ تیزی سے پھر آگے بڑھی۔ لیکن سید مرتضیٰ حسین اس کے پیچھے لپکے۔

”اور سنو لڑکی، تم نے ہمارے ہاں آنے کے متعلق کیا فیصلہ کیا؟“ سید مرتضیٰ حسین نے چھٹی ہوا میں لہرائی۔ دیپا نے غینہ لینی انداز میں سر ہلا دیا۔ اور گیلری کے سرے پر آدیزاں کلاک پر نظر ڈالی شام کے سات بج رہے تھے۔ اب وہ دونوں صدر دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ چاروں طرف ایک تار اور البیراج اٹھائے فن کاروں اور ریڈیو کے اراکین کی آمد و رفت جا رہی تھی۔

پروفیسر سید مرتضیٰ حسین جو ہندوستان اور یورپ کی قدیم و جدید نیپے نیپے زبانوں کے ماہر تھے۔ برآمدے میں پہنچ کر ٹھٹھک گئے۔ ”یہ تو فون کی طرح سرکویں ہلا رہی ہو؟“ انھوں نے درستی سے مطالعہ کیا۔

اندر عباس الدین احمد نے گانا شروع کر دیا تھا اور ان کی خوبصورت جان بوا آواز پدما کی لہروں کی طرح سارے میں پھیلتی جا رہی تھی۔ پدما کے مانجھی ماکیت۔ جو ابھی گانا گانہ۔ عباس الدین احمد کی اد سنگیت۔ پھیلتی۔

دیپا نے زبردستی کے ایک دو سے ٹپک کر پل کی پل کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔

”تم خوش قسمت ہو دیپا کی کہ تم کو عباس الدین احمد کی شاگردی میسر ہے۔ زندگی کا یہ لمحہ قیمت جانو۔“

دور پردہ ماکہ تاریک چرسکون لہروں پر سے مینتی سید مرتضیٰ حسین کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ اُس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ یہ میرا دیس، یہ بدلاؤ اور میگھنا اور بہیم بہیم۔ یہ سنگیت۔ یہ حیران کلام۔ یہ سب اسی طرح رہے گا۔ مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تاریک راتوں میں اہم ساز نشین ہو رہی ہیں۔ پروفیسر مرتضیٰ حسین کو جس شاید پوری طرح معلوم تھیں کہ ہم کیا کرتے والے ہیں! وہ خود اور ہم سب کہاں ہیں۔ اس کی ہمت دوبارہ عود کر آئی اور اس نے ذرا ناشتہ سے کہا۔ ”کا کا اب قریح میں ڈانٹے تو۔ یا۔“ ”کیا بات ہے۔ اتنی جلدی میں کیوں ہو۔“ پروفیسر نے دریافت کیا۔ اور اسے بڑے غور سے دیکھا۔ ”کبھی ایسا موقع زندگیاں دے دینا کہ بعد میں پچھتاؤ کہ تم نے اپنے خواب کیوں نہ پورے ہونے دیئے۔“ انہوں نے باہر نظر ڈالی۔ ”وہ دکھو تم کو کوئی بلارا ہے شاید۔ جاؤ۔ بھاگو۔“ اتنا کہ کر وہ چھپا ک سے برابر کے کمرے میں گھس گئے۔

دیپالی سرعت سے برساتی میں اُتری۔ بیجا مہر نوجوان نیم تاریک لان پر مزے سے ٹپل رہا تھا اُسے دیکھ کر وہ سرک پر آگیا۔ وہ دونوں عمارت کے بھاٹک سے نکل کر باہر سڑک پر پہنچے۔ نوجوان نے کرنے کی چیب سے ایک لمبا، موٹا لفافہ نکال کر اُسے نکالا دیا۔ ”ریحان دوا۔ ریحان دوائے کہا ہے یہ خط دیپالی سرکار کے ذریعے کھاری اُدارائے کو پہنچا دیا جائے۔ جلد از جلد۔“

”اُدارائے۔“ دیپالی نے چیپکے سے پوچھا۔ ”لیکن میں تو ان کو جانتی بھی نہیں۔“ ”جان جاؤ گی۔“ نوجوان نے مختصر سا جواب دیا۔ وہ سڑک پر کچھ دور نکل آئے۔ ”اُمارا دیدی، پیار بڑی ہیں۔ ان کے ٹوی آئی جی ماموں اُن کے یہاں مقیم ہیں۔ اس وجہ سے دو ٹویڈ پر پولیس کا بہرہ ہے۔ اُمارا دیدی کے بیڈ روم تک دیپالی صرن تمہاری رسائی ہو سکتی ہے۔“ نوجوان نے پھر بات متروک کی۔ ”چلو تم کو سریندر داسے ملو اُوں۔ میری جگہ یہ اب تم سب سے رابطہ رکھیں گے میں با ریسال جارہا ہوں۔“

وہ دونوں تنگ اور نیم تاریک سڑک پر ذرا اور آگے بڑھے۔ ایک دیوار کے سامنے ایک نوجوان اُن کا منتظر تھا۔ ”ہلو دیپالی۔“ اس نے بے تکلفی سے کہا۔

”سریندر داس۔“ دیپالی نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ ”آپ کھلے خزانے گھوم رہے ہیں کیا معافی مانگ لی۔“ اُس نے غصے سے پوچھا۔

نوجوان ہنس پڑا۔ ”تم نے دیپاتی میرے متعلق غلط افواہ سنی تھیں میں ابھی بلیک لسٹ پر نہیں ہوں۔ تم وہی کلاسیکل ریولوشنریز (REVOLUTIONARIES) کے زمانے کی بات کرتی ہو! اب تکنیک بدل چکی ہے۔“

”میکے کا کلاسیکل ریولوشنری تھے۔“ دیپاتی نے اُداسی سے کہا۔
 وہ تینوں سر جھکائے تیز تیز چلتے گھوڑا گاڑی اسٹینڈ کی طرف بڑھنے لگے۔
 ”وہ ساڑیاں تنہا رہی۔ بیک کیٹس۔ پورے ساڑھے پانچ سو میں۔“ سر تیدر مگر جی نے سیکریٹ سلگانے کے بعد دیپاتی جھٹک کر ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔
 ”اچھا۔“ دیپاتی کا دل ڈوب گیا۔

”ہاں۔“ سر تیدر مگر جی نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”جن صاحب کے پاس ہم یہ ساڑیاں لے کر گئے وہ تو ان کو دیکھ کر بالکل اچھل پڑے۔ کہنے لگے بھائی یہ تو میوزیم میں ہیں۔ فوراً ملکیت میوزیم کے لئے خریدو! انا ہیوں۔ اور مزے کی بات یہ۔“ سر تیدر مگر جی نے سیکریٹ کی راکھ جھٹک کر بات جاری رکھی۔ ”مزے کی بات یہ کہ قیمت۔ جانتی ہو۔ کس نے ادا کی۔؟ خود ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے۔“

”مسٹر کینٹ ویل نے۔؟“

”مسٹر کینٹ ویل آئی۔ سی۔ ایس نے۔؟“ سر تیدر نے جواب دیا۔

”او۔ ماں۔!“ خاندانی باد گاروں کے پکنے کا وقتی غم بھول کر دیپاتی کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔

”روپیہ ریحان دا کو وقت پر پہنچ گیا۔ کام شروع ہو چکا ہے۔“ سر تیدر مگر جی نے بات ختم کی۔
 وہ پانچ گاڑیوں کے اڈے پر چوراسے کے مدھم لمپید کے نیچے پہنچ چکے تھے۔ سر تیدر مگر جی ایک لمخت جھلاوے کی مانند رات کے گھرے میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دیپاتی سرکار جو اس کی طرح جھلاؤں کی عادی ہو چکی تھی۔ سکون سے ایک گھوڑا گاڑی کا دروازہ کھول کر اس میں سوار ہوئی پیچھے نوجوان مقابل کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مسلمان کو جو ان نے نجیعت و نزار گھوڑے پر چابک ہارایا۔ گاڑی چرخ چوڑی کرتی کچی سڑک کے گڑبڑوں پر سے گزرتی دیپاتی کے گھر کی سمت روانہ ہو گئی۔

کھاری آومارائے

دورِ ڈاب کے سبک پیڑوں کی لائقنا ہی قطار سے مزین نارنجی افق پر سید سرخ سورج بہت اہستہ آہستہ اس طرح ڈوب رہا تھا۔ گویا شاہ باغ کی سستان، سایہ دار سڑک پر سے گزرتی بند گاڑی میں بیٹھی دیپاتی سرکار کے مسرور چہرے کا اچھی طرح نظارہ کرنا چاہتا ہو۔ کیونکہ شاید ایسا بے فکر چہرہ اسے دوبارہ دیکھنے کو نہیں ملے گا۔

سال، شیشم اور نیم کے پتے رہتا کی چوڑی سڑکوں پر نرم روی سے اڑتے پھر رہے تھے۔ فضا میں خنکی لگی تھی پکڑ پکڑیوں پر ٹکریاں دوڑ رہی تھیں۔ پھاٹکوں کی سفید بلیوں پر بیٹھے اکا دکا ملازم بیڑیاں پینے میں مصروف تھے۔ کچھ دیر بعد ان سڑکوں پر مدھم مدھم لمپ تھلا اٹھیں گے۔ مکاں، گھاس اور درختوں اور ہواؤں اور چاندنی رات کی نمٹھی سنتے سنتے آرام سے سو جائیں گے۔ گھوڑے کی ٹاپیں سڑک کی کنکریاں پر بڑا پرسکون سا شور پیدا کر رہی تھیں۔ عبد القادر کو چوان سر جھکائے نہ جانے ان بہت ساری دنیاؤں میں سے کون سی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ اُس کی دنیا کون سی تھی؟ (ایک بانٹا کاجھوٹا ایسا ننہر کی غلیظ گلی میں ایک تنگ و تاریک مکان، یا ایک شکستہ شاگرد پیغمبر۔ دس آدمیوں کا کتبہ اور مسلسل فکرِ محاش اور مسلسل غمِ زلیبت) عبد القادر کو چوان جو محکمہ مردم شماری کے لئے ایک عدد اور اہل سیاست کے لئے ایک ووٹ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اُن دیکھے طوفانوں میں گھر ادیپاتی سرکار کو ووڈ لیٹڈز لئے جا رہا تھا۔

موڈ پر سبج کر تھلیوں والی بند گاڑی دوسری سڑک پر اس طرح نمودار ہوئی جیسے کہانی کا نیا باب کھلتا ہو۔ (چاروں طرف زندگی کی کہانیوں کے باب کھلتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں اور کردار صفحات میں سے نکل کر قبروں میں جا لیٹتے ہیں پتھاؤں میں پھونک دیئے جاتے ہیں۔ نیا صفحہ بلیٹ کر قاری آگے بڑھتا ہے)

سے رہنے کے قابل بنایا گیا تھا۔ اس نے اپنے اُجاڑے دل و گنج کا تصور کیا جس کے خالی مطب میں بابا اُنی مریضوں کے انتظار میں صبر سے بیٹھ بیٹھ کر، جو کبھی کبھار اس طرف آنکلتے تھے۔ ڈھاکہ شہر کے بزاروں، لاکھوں نیم تاریک مجلس مکان اور چھوٹی بڑے، جن میں لالٹین اور مٹی کے دیئے ٹٹکار رہے تھے۔ دور غمار گھاؤں میں اس کا آبائی مکان جو تقریباً ڈھسے چمکا تھا۔ ایسا افلاس، ایسی ویرانی اس ملک پر۔ اہل ہندوستان پر طاری ہے۔

مگر وہ دفعتاً ایک نئے جوش اور خود اعتمادی کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ انقلاب آنے والا ہے۔ اس انقلاب کے لانے والے ہم خود ہیں اور ہم کامران ہوں گے۔ اس انقلاب ہی کی عظمت ہے جس کی وجہ سے ووڈ لینڈز کے مالک کی بیٹی دھارے میں فحاش ہو چکی ہے۔ جو ابر لال نہر دہی تو اُسند بھون میں پروان چڑھے تھے۔

پیرے تے باہر اگر پہلی بار اس سے بات کی۔ ”مس صاحب پلنگ میں نہیں اب اندر جائیے“
”کس طرف۔؟“ اس نے دریافت کیا۔

”مس صاحب مارٹنگ روم میں ہیں۔ ادھر۔“
دیپاتی کی سمجھ میں نہ آیا۔ شام کے وقت اگر مارٹنگ روم میں ہیں تو اسے ایوننگ روم کیوں نہ کہنا چاہئے خیر بہر حال۔

پیرے نے بھاری عتابی پردہ اٹھایا۔ وہ اندر گئی۔ پردہ اس کے پیچھے برابر ہو گیا۔ اب وہ اس بڑے کمرے میں کھڑی تھی، جس کے فرانسیسی دریچے کے نزدیک ایک کوچ پر کماری اُومارا شال اوڑھے آنکھیں بند کئے کشنوں کے سہارے نیم دراز تھیں۔

ارے تو یہ ہیں اُومادیہی۔ اُسے ذرا سی مایوسی ہوئی۔ مگر فوراً اس نے اپنے آپ کو گھمایا۔ یہ میری بوڑھو اور دہانت ہے۔ میں کسی ناول کی ہیروئن کی متوقع کیوں تھی۔ اُومادیہی ایک فالتو، رومانی ہیروئن کی بجائے نئے ہندوستان کی نئی عورت ہیں۔ یہیں اپنے نیتاؤں کو خواہ مخواہ کلیمراٹرز نہیں کرنا چاہئے۔

آہٹ سن کر اُومادیہی نے آنکھیں کھولیں اور نظر اٹھا کر سامنے دیکھا۔
بڑے بڑے دریچوں والے کمرے میں شفق کی سُہانی روشنی پھیل گئی تھی۔ مگر ایسا لگتا تھا،

اب دیپائی نے کھڑکی کی جھلی چڑھا کر باہر جھانکا۔ اسی راستے پر آگے جا کر ارجمند منزل تھی جس میں چپاں آ کر رہتی تھی۔ چپاں آ رہی تھی، جو اس دھندلی داستان کے آخری صفحات پر زندہ تھی جس کے مصنفوں نے جہانگیر نگر لے آباد کیا تھا۔ اسی راستے پر، اونچے اونچے معزور درختوں کے پیچھے دیپائی کا بنگلہ تھا۔ اس بنگلے میں رہنے والا ولیم کینٹ ویل اس داستان کا ایک اہم کردار تھا جس کے مصنفوں نے جہانگیر نگر اجاڑا تھا۔ اسی راستے کے اختتام پر ”وڈ لینڈز“ تھا۔ نئی داستان کے مصنفوں نے جہانگیر نگر کے فائین کے تعاون سے اپنے لئے کیسے کیسے ”وڈ لینڈز“ تعمیر کئے تھے۔

دیپائی شادان و فرحان بھی کہ ایک نئے ڈرامے میں حصہ لے رہی تھی جس کے لیکھک ارجمند منزل اور ڈی ایئر ہاؤس اور وڈ لینڈز کی بنیادیں ہلانے والے تھے۔ دیپائی کی آدرش وادی زندگی اس وقت بڑی مکمل تھی جس زندگی میں ہریان، سمجھ دار، دردمند رفیق اور ساتھی موجود تھے۔ سب مل کر خطروں کا جیلج قبول کر رہے تھے۔ آگے قدم بڑھا رہے تھے۔ ادا دہی سے ملنے کی خوشی میں وہ ات بھر سو نہیں سکی تھی۔ ان دیکھے ریمان دانے ایک اہم پیغام رسانی اُس کے سپرد کی تھی۔ ریمان دانہ جیسے بڑے تیتا اسے اب گویا اپنے اندرونی حلقے میں شامل کر چکے تھے۔ خوشی کے مارے اس کا بس نہ چلا کہ پر لگا کر آواز اُٹے کے پاس پہنچ جائے۔

لیکن وڈ لینڈز کے پھاٹک پر کانسٹیبل کھڑا دیکھ کے وہ دھک سے رہ گئی۔ بیگ مضمبوطی سے تھام کر وہ جلدی سے نیچے اتری اور کانسٹیبل سے کہا کہ آواز اُٹے کی پرانی شناگر دے۔ کانسٹیبل نے بے پروائی سے سر ہلایا۔ غالباً دیپائی کو اتنا گھبرانے کی ضرورت نہ تھی۔ عبدالقادر کو کو کر لیا ادا کرنے کے مددہ چند لمحوں کے لئے پھاٹک پر ٹھٹھکی اور گاڑی کو واپس جانے دیکھتی رہی۔ دفعتاً اسے محسوس ہوا جیسے وہ اس اجنبی جگہ پر غیر محفوظ اور تنہا رہ گئی ہے۔ عبدالقادر کو چواں، حکام اور ادا کے اس قافی دنیا میں اسے اکیلا چھوڑ کر نہ جھکائے جھٹ پٹے کی نیم ناریکی میں سچ کرنا دور چلا جا رہا تھا۔ وہ ٹکریا کے سرخ سڑک پر آئی تو سامنے گھاس پر پولس کا وردی پوش اعلیٰ افسر دہند وستانی پر ایک اور پوش اعلیٰ افسر (انگریز) باتوں میں ہنٹک گھاس پر ٹپٹے نظر آئے۔ تین تین جلیبی برساتی میں جی تو میریز اس پر بھونکا۔ اس نے سر اسیکلی سے ”ادمان“ کا بلکا سا تھرہ لگایا تو ایک عالی شان بڑا ہی اس کی سمت پکا۔ اس نے اپنے الفاظ دہرائے: آواز دہی کی پرانی شناگر دیپائی سرکار ملیے

وڈھا کہ کا پرانا مغل نام

کے لئے آئی ہے ۔

چیرا اسکا اندر گیا ۔ اور چند منٹ بعد سفید چپکن اور سبز مٹی والا بیرو باہر آیا اور منہ سے کچھ بولے بغیر سر کی جنبش سے اس نے دیپا کی کو اندر آنے کا اشارہ کیا ۔ وہ ذرا جھکتے ہوئے طویل گیلیری میں داخل ہوئی جس کی دیواروں پر درویش بارہ سنگھوں کے سرائی کا پتہ کی آنکھوں سے ہر آنے جانے والے کو گھور رہے تھے ۔ سیاہ اور سفید ٹائیلوں کے فرش پر سے گزرتے ہوئے دیپا کی کو یاد آیا ۔ پیرسٹر آئے کے متعلق مشہور تھا کہ ان کے موکل اشرافیوں سے بھری قبیلیاں لالا کر ان کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں اور ان کی بیوی سزا چٹا رائے اپنی سینہ لڑیں میرے جڑواں ہیں ۔ دیپا کی سوچنے لگی ۔ اتنی دولت مند اور مادیی تحریک کی مالی مدد کو نہیں کرتیں ۔ جب عزت پڑتی ہے تو ہم جیسے غریب کارکنوں کو اپنے گھر میں سینہ دھ لگانا پڑتی ہے ۔ اکتے دیشیوں کرتے ہیں ۔ سینہ مزدور ہے ۔ محمود الحق پریس میں پر روت رہ رہے اور دن رات اپنی کمزور آنکھیں بھڑکتے ہیں ۔ اس طرح جو کچھ بن پڑتا ہے یہ سب لاکر تحریک کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں ۔ اور رائے ایک محل میں رانیوں کی طرح رہتی ہیں اور ریکان داکسی پراسرار دیوتا کی طرح کہیں چھپے بیٹھے ہیں اور "ادب" سے ریکان داکسی طرف سے جو حکم ملتا ہے ہم سب اسے بجالانے کے لئے مستعد ہیں ۔

اب وہ بیرے کے پیچھے پیچھے ایک ہال میں داخل ہوئی ۔ جس کے وسط میں سنگ مرمر کی گول میز پر کئی بوتلیں دیپا کا مرمرین مجسمہ اسنادہ تھا ۔ فرش پر شیر کی کھالیں اور بنار کے تالین بچھے تھے ۔ دیواروں کے برابر برابر لمبے تنجیم صوفے رکھے ہوئے تھے ۔ دیپا کی نے ایسی شان و شوکت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی ۔ آئینہ مندر میں بھی نہیں ۔ اور چند منزل بھی بڑی عالیشان کوٹھی تھی ۔ مگر وہاں کی ہر چیز بوسیدہ اور مضمحل سمجھا جاتا تھا ۔ اور دیپا کی سے ملاقات کی خوشی نے اسے راتوں میں جس قدر مضطرب کیا تھا اس پر کیف اور حلاکتانے ماحول کو دیکھ کر وہ ایک لخت اتنی ہی دل گرفتہ ہو گئی ۔

کریم خان بیرے نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا تھا کہ یہیں ٹھہر جائے (پیرا ملا تائیوں کی اوقات پہچان کر بات کرتا تھا) اور ہاتھ کو اشاروں ہی پر بڑھاتا تھا) وہ ایک دروازے کا عنبانی پر دہاٹھ کر اندر چلا گیا ۔ دیپا کی ایک کرسی کے کنارے پر ٹپک گئی ۔ اور ہال کی آرائش کو غور سے دیکھنے لگی ۔ انسانوں کی زندگیاں میں اتنا شدید تضاد بھی ممکن ہے ۔ اسے عبد القادر کو چران کا شکستہ قبر ایسا مکان یاد آیا ، جو چند رنج کے کھنڈر ایسے شان گردینے میں ٹٹا اور مین کے ٹکڑوں اور باشا کی بوسیدہ چٹائیوں کی مدد

جیسے باہر باغ میں شامل ہو گیا ہے۔ ہر شے ساکت اور متحیر اور منتظر تھی۔

”نوشکار۔ اوما دیدی۔“

”نوشکار۔ آؤ۔ آؤ۔ بیٹھو۔“

دیپاتی کوچ کے مقابل ایک کرسی پر ٹپک گئی۔

تب اومارائے نے نیپائی پر سے اٹھا کر عینک لگاٹی اور نووارد اجنبی لڑکی کو تنکھی، گہری ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔

”آپ کی طبیعت اب کیسی ہے اوما دیدی؟“

”کیا نام بتایا تھا تم نے۔ دیپاتی سرکار۔؟“

”جی۔“

”تم۔ اسکول میں کون سی کلاس میں تھیں؟“ اومارائے نے عینک اُتار کر ساری کے پلو

سے صاف کرنے کے بعد دوبارہ ناک پر جمائی۔ ”سوری۔ میں تم کو پہچان نہیں سکی۔“

”جی۔ میں۔ اوما دیدی۔ مجھے سرنیدر دانے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ سرنیدر مگر جی نے“

اُس نے اپنے بیگ پر ہاتھ رکھ کر کڑبی آواز میں کہا۔

”اوہ۔“ اوما دیدی چونک کر اٹھ بیٹھیں۔ ہاتھ بڑھا کر کیو پڑ اور سائیکس کے سردوں پر پھیلے سبز

جھاردار شیشہ والا بڑا الیمپ روشن کیا۔ شفق کا اُجا لائیز برقی روشنی میں ڈوب گیا۔ اب باغ میں پرندے

سیرالینے کے لئے چہچہارہ ہے تھے۔

”بڑی سردی ہے۔“ اوما دیدی نے شمال لپیٹے ہوئے کہا۔ ”یہ کھڑکی بند کر دو۔“

دیپاتی نے اٹھ کر فرانسیسی دریچے کے سلسلے وار پٹ بند کر دیئے اور واپس آکر کرسی پر بیٹھ

گئی۔ اوما دیدی اسے بڑے دھیان سے دیکھ رہی تھیں۔

”تم کون ہو۔“

”دیپاتی سرکار۔“

”صرف نام دہرانے سے کام نہیں چلے گا۔ اس نام کے میرے لئے ابھی تک کوئی معنی نہیں

ہے۔ تفصیل سے بتاؤ۔“ اومارائے نے جھنجھلا کر کہا اور انگلیوں سے کپٹیاں دبائیں۔ دیپاتی جو کانٹ

میں اوتا رانے کی سخت گیری کی حکایتیں سن چکی تھی۔ اس انداز گفتگو سے زیادہ ہمیں گھرائی اور اطمینان سے دوبارہ مزاج پُرسی شروع کی۔ ”آپ کی طبیعت کیسی ہے اوتا دیدی؟“

وہ خاموش رہیں۔ پھر کہا۔ ”کوئی پیغام لائی ہو۔؟“

”جی۔ سریندر رداپیر اکوٹھیکٹ ہیں۔ میں کالج میں سیکنڈ ایئر میں پڑھتی ہوں۔ میرے بابا بڑے چند سرکار پرائیویٹ پر یکمٹی کرتے ہیں۔“ اس نے اپنے گھر کا پتہ بتایا۔

”کیا پیغام ہے۔؟“ اوتا دہی نے پوچھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

”ریحان دانے آپ کو خط بھیجایا ہے۔“

”ریحان۔۔۔“ وہ اب چونک کر پھر سیدھی ہو بیٹھیں۔ ”ریحان کا خط ہے تو اتنی دیر سے فضول

باتوں میں وقت کیوں ضائع کر رہی ہو۔ لاؤ۔“

دیا پائی نے بڑے اطمینان سے بیگ کھولا۔

عین اسی وقت عتابی پردے کو جنبش ہوئی۔ سفید ساری میں ملبوس ایک باوقار عمر خانہ نے

اندراجھانکا۔ اور آواز دی۔ ”ہاؤ آریو اوتا۔“

”آئی۔ ایم فائن۔“ اوتا نے خاموشی سے جواب دیا۔ ”میری ایک پرانی شاگرد آئی ہوئی

ہے ذرا چائے بھجوادیتے۔“

”اچھا۔“ لیکن واپس جانے کے بجائے مسز رائے اندراجھانکس۔ دیا پائی نے تعظیم کھڑے ہو کر ان

کو منسکایا۔

”جیتی رہو۔“ دیا پائی پر سرسری سی نظر ڈال کر انہوں نے اوتا کو نظر بندی سے دیکھا۔ ”روا پی

لی۔؟ ڈاکٹر چرچہ کیسے رہے تھے، جب تک مرض کی تشخیص نہیں ہو جاتی۔“

”کتنی بار کہوں گی ماں۔“ اوتا نے چہرہ مسز رائے کی بات کاٹی۔ ”مجھے کوئی مرض و مرض نہیں۔

خالی سفر کی تکان ہے۔ آپ سب جانے کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔“

مسز رائے نے اس تلخ لہجے کی پرواہ کئے بغیر پھر کہا۔ ”ہم لوگ کلب جا رہے ہیں۔ وقت پرکھانا

کھا لینا۔“ اوتا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مسز رائے چند سیکنڈ تک اسی طرح کھڑی رہیں اور پھر کمرے سے باہر چلا گئیں۔

”اوہ۔۔۔ والہین۔!“ اوتا نے پہلی بار مسکرا کر دیپالی کو دیکھا۔ ”تمہارے والدین بھی اتنے

صبر آزمایں۔؟“

دیپالی اوتا دیہی کے مزاج کی اس تبدیلی سے خوش ہوئی اور سنس پڑی۔

”اچھا۔ اٹھو اور دروازہ بند کر کے اندر سے جھنجھٹ لگا دو۔“

”لیکن ابھی تو اوتا دی آپ نے جائے منگوائی ہے۔“

”ارے ہاں۔ بہت سمجھ دلورچی ہو واقعی!“

”بچت۔! اوتا دی، میں اس اپریل میں انیس برس کی ہو جاؤں گی۔“

”صرف انیس برس!“

”ذرا امیر بدلتی ماں سے پوچھئے۔ ان کو یہی غم کھائے جا رہا ہے کہ میری بیاہ کی عمر ہی مکمل ٹی۔!“

دیپالی اپنی رد میں کہنے لگی۔ اوتا دھتتا پھر تیوری پر بل ڈال کر سنجیدہ ہو گئیں اور سرعت سے نفاذ چاک کیا۔

سائے کی طرح بیرے نے اندر آکر چپاؤ کی کشتی میں پیر رکھی اور واپس چلا گیا۔ دیپالی نے چار

بنائی اور دروازہ اندر سے بند کیا۔ اوتا پیانی سے ایک گھونٹ بھر کر طول طویل خط پڑھنے میں محو ہو گئیں۔

اپنی پیالی ختم کر کے دیپالی کرسی سے اٹھی اور ٹپل ٹپل کر دیواروں پر لگی تصویریں دیکھنے لگی۔ لارڈ

بائرن، جی کے عقب میں طوفانی سمندر تھا۔ اور طاح ان کی کشتی کنا لے سے باندھ رہا تھا اور وہ فاح تلوار

اپنی مخروط اور توانا مسکراہٹ کے ساتھ گویا اپنے قدموں پر چھکی ہوئی دنیا کا نظارہ کرنے میں مصروف تھا۔

وینس اور ایڈونس۔ مسٹر پک وک۔ اور سیاہ پوشاک میں ملبوس ایک لرزہ خیز عورت، جو ایک

باریش مرد کا بریدہ سر ہاتھوں میں لئے چیخیں مار رہی تھی۔ یہ بڑی بھیاں ک تصویر تھی۔

دیپالی چند لمحوں تک اس تصویر کو دیکھتے ہی سننے کے بعد ذرا خوفزدہ سی ہو کر اپنی کرسی پر واپس

آ بیٹھی۔ اوتا دیہی خط ختم کر کے گہری نگر اور پریشانی میں مبتلا آنکھیں بند کر چکی تھیں۔ باہر گھپ اندھیرا اٹھ گیا

تھا اور دریچے کے نزدیک الماس کی ڈالیاں سرسرا رہی تھیں۔ دود سے سیر کے بھونکنے کی آواز آئی۔ اوتا

دیہی نے آنکھیں کھولیں اور دیپالی کو بڑی سوختی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

”یہ کس کی تصویر ہے اوتا دی۔؟“ دیپالی نے پوچھا۔

”کون سی؟“

”یہ والی۔“ اس نے اشارہ کیا۔

”ہتیس جانتیں؟ انٹر میڈیٹ میں انگریزی پڑھتی ہو یا گھاس کھودتی ہو؟“
اس ڈانٹ سے واقعی وہ سہم گئی۔

”یہ آسکر وائلڈ کی سٹوری ہے۔“ اومادی نے تشریح سے کہا۔

”یہ کہ کیا رہی ہے اومادی؟“

”تم مجھے بہت بے وقوف معلوم ہوتی ہو۔“ اومادی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ”با بیوقوف ہو یا بن رہی ہو۔“

اترے والی جیسٹی ہو گیاں بہت ہی بُری معلوم ہوتی ہیں۔ انہوں نے دل میں اضافہ کیا اور کہا ”کیا تم کو نظر
میں آیا کہ یہ کیا کر رہی ہے؟“

”مگر اس کی کہانی کیا تھی اومادی۔“

”مجھے یاد نہیں۔ مجھے مذہبی اساطیر سے ملحق دلچسپی نہیں ہے۔“ وہ کوچ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

تم مجھ سے ٹیکسٹ بک تصاویر پر گفتگو کرنے آئی ہو یا کچھ کام کرتا ہے؟“

”جی اومادی!“ ”دیپاتی پھر ہنس دی۔“

یہ لڑکی خوبصورت ہے اور بیوقوف ہے۔ اس نے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ اومادی نے
لو کو جوہر اکر کے مسٹی میں بھتیجا۔ مگر حصول مقصد کے لئے رُسک لینے ناگزیر ہیں۔ انہوں نے ایک گہری سانس
اور رنڈ ویسٹ پر جا بیٹھیں۔

”ادھر آؤ۔ اور غور سے جو کچھ میں کہنے والی ہوں سنو۔“ انہوں نے درستی سے کہا۔

یکایک دیپاتی کو اسی کیفیت نے اُن دلہا، جو اس پر ہال میں طاری ہوئی تھی۔ یہ میری مستانی

ہی نہیں رہیں۔ عین پست بڑی البتہ ہیں۔ مگر مجھ پر اس طرح حکم کیوں چلا رہی ہیں۔؟ اسی لئے کہ

ن ترادی ہیں؟ اس نے بڑی بے خوفی سے جواب دیا۔ ”جی ہاں۔ اومادی، مگر پہلے میں آپ سے ایک بات

پہنچانا چاہتی ہوں۔“

”کہو۔“

”آپ اتنی بے تمنا و متمند ہیں۔ چپکے چپکے تحریک کی مالی مدد کیوں نہیں کرتیں؟“

بیوقوف ہے۔ اسی لئے نڈر اور منہ پھٹ بھی ہے۔ اومانے دل میں سوچا پھر ایک گہرے سانس لے کر اُسے جواب دیا۔ ”دیپاتی یہاں آن کر مچھو۔ ایک ایک منٹ بہت قیمتی ہے۔“ ابھی تک میرے جی پس منظر کو محاف نہیں کر سکے۔ انہوں نے دل میں کہا (کتباے سوال کا سید سا جواب دیپاتی یہ ہے کہ میں تین برس سے لندن میں تھی اور چند روز قبل ڈھاکے واپس پہنچو ہوں۔ اور آئے ہی بیمار پڑ گئی۔ ساقیوں سے میرا پہلا رابطہ اس وقت تمہارے ذریعے قائم ہوا ہے اور ایک انتہائی اہم کام کے سلسلے میں۔ چنانچہ غور سے سنو۔“

”اوہ۔“ دیپاتی نے بے حد نادام ہو کر کہا۔ ”آئی ایم سوری اومانہ دیدی۔“ وہ شرم سے پانی پانی ہوتی دھڑ دھڑ سیٹ پر جا بیٹھی۔

”اب میں چند سوال تم سے کرتی ہوں۔ سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ کیونکہ ایک بڑی خطرناک مہم ہمارے سامنے ہے جس میں برسوں کی جیل کے علاوہ جانیں بھی جاسکتی ہیں۔“ پھر وہ چند لمحوں کی چُپ ہو کر شنائی پر انگلیاں پھیرتی رہیں۔

”بنائیے اومانہ دی۔“

”بہت جلد اس علاقے میں کیونستوں کی عام گرفتاری شروع ہونے والی ہے۔ گرفتاریوں کے متعلق اور دوسرے خفیہ احکام کی خبر لگانے کے لئے ریحان الدین احمد نے لکھا ہے کہ۔ کہ دیپاتی ہر کام کی مدد لی جائے۔“

”میری۔ میری مدد۔؟“ دیپاتی ہکا بکارہ گئی۔ ”مگر ریحان داتو مجھے جانتے بھی نہیں شاید میرے نام سے بھی واقف نہیں ہوں گے وہ۔ اور۔ میں کیا کر سکتی ہوں بھلا۔ اومان۔“

”تم یہ سارا کام کس طرح کرو گی۔ اس کی تفصیل ریحان نے مجھے کچھ بھیجی ہے۔“ اومانے لٹائے پڑا رکھ دیا۔ ”پہلے بتاؤ انگریزی بولنی آتی ہے؟“

”جی ہاں۔“

”انگریزی جب آپ میں تیز تیز لو لیں تو سمجھ لو گی۔؟“

”جی ہاں۔ میں جس جگہ اور مس ہسٹلے ہم کو انگریزی پڑھاتی ہیں۔ اس لئے عادت ہو گئی ہے۔“

”گڈ۔ بہت ہے۔؟“

”جی ہاں۔ کافی ہمت ہے۔“
 ”ابھی تم یہاں آئی تونم کو کس کس نے دیکھا تھا۔ پیرے اور سیری والدہ کے علاوہ۔“
 ”ایک کانسٹبل اور ایک چپراسی نے۔“
 ”میرے مانا کو پہچان سکتی ہو؟“

”شاید وہی بابر شہل رہے تھے۔ ایک انگریز کے ساتھ۔“
 ”ہاں۔ اسپیشل آرڈر کانسٹیبلری والا کرسٹوفر ہیگ بھی ان سے ملے آیا ہوا ہے۔ بویہ خط
 نو۔ بہت غور سے پڑھنا۔“

دیپالی نے ادا کے ہاتھ سے خط لیا اور پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔ ادا دیپالی کے درپے سے باہر دیکھنے
 ،۔ بدن پر جانوں کی دھند چھا چکی تھی۔ دیپالی نے خط دھڑوسیٹ پر رکھ دیا۔ اور چھپکی بیٹھی رہی۔
 نے مڑ کر اس پر نظر ڈالی۔

”مجھے خود تعجب ہے کہ ایک ناخبرہ کار اور کمسن لڑکی پر اتنی بڑی ذمہ داری ریمان نے کس طرح
 ادا کی۔ ریمان کے اس خط سے ظاہر ہے کہ وہ تم کو اچھی طرح جانتا ہے اور اسے یقین ہے کہ صرف
 باہر کام باگسانی کر سکتی ہو۔“

”مگر ادا دی۔ ریمان دا مجھے بالکل نہیں جانتے۔ میں نے تو آج تک ان کی شکل کیا تصویر
 نہیں دیکھی۔“

”تم کو مجھ سے چھوٹ بولنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔“
 ”ادا دی۔ میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ ریمان دا کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“
 ادا پھر جھلا گئیں۔ ”تم مجھے سکھلاؤ گی کہ انڈر گراؤنڈ کا کام کس طرح کیا جائے۔ یہاں ریمان
 طرح کی ہدایات کس کو دے؟ میں ریمان کو بہت قریب سے جانتی ہوں یہ بھی منت ہو چ سبھٹنا
 کوئی دو مینٹک ہیر وہ ہے۔ گو میں جانتی ہوں کہ سارے بنگالی میں کالج کی لڑکیاں بہت دنوں سے
 پر زہر کھا رہی ہیں۔ خیر۔۔۔ تو یاد رکھو کہ وہ دو مینٹک نہیں ہے۔ بویہ پر پکھیل اور انتہائی سمجھ دار
 ناپے۔ وہ کوئی ڈرامہ نہیں کھیل رہا ہے۔ دو مرتبہ اس کے عزیز دوست اس کو خنڈید دھوکا دے چکے
 اس لئے وہ بے انتہا غمناک ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود اس نے تم پر بھروسہ کیا ہے۔ سارے بنگالی کی

فوجوان لڑکیاں۔“ انھوں نے سپاٹ، مضبوط آواز میں دہرایا۔“ ریچان الدین احمد پر عاشق ہیں۔ مگر اس کو جانتی صرف میں ہوں۔ صرف میں اس کی رفیق اور دوست ہوں۔ مجھ سے زیادہ کوئی اسے نہیں جانتا وہ دھاکرہ نیورسٹی میں مجھ سے جو نیر تھا مگر لندن میں بھی ہم دونوں ایک ہی کالج میں تھے۔ اکٹھے ہم نے وہاں کی تحریک میں کام کیا ہے۔ وہ رپورٹر کی حیثیت سے اسپین بھی گیا۔ مجھے یہی افسوس مرتے دم تک رہے گا کہ میں محاذ نہ جاسکی۔ خیر۔ تو اس نے کھلبلیے کہ تم سیدھی اور قابل اعتماد ہو۔ ریچان انسان کو خوب پہچانتا ہے۔ نظر میں آدمی کو پہچان لیتا ہے۔ امید ہے کہ اس نے تم کو پہچاننے میں بھی غلطی نہ کی ہوگی۔“

”مگر وہ تو مجھ سے کچھ۔“ دیپالی نے کرنا شروع کیا اور پھر ڈر کر چپ ہو گئی۔

”وہ تم کو پہچان سکتا ہے۔ مگر یاد رکھو کہ تمہارا اسے پہچانا قطعی ضروری نہیں۔“ اومادی نے بات ختم کر کے کمرے کے رشتہ پر درے آبشاروں کی طرح سرسراہٹے لگے۔ دفعتاً دیپالی کو بڑا بڑے کا خیال اس وقت آیا۔ اومادی کے پاس بھی باتوچر بوڑے دارسایاں ہوں گی۔ ایک سے ایک نایاب۔ خیر کیا کیا جھکا۔ ہے۔ اور میں ایک پرخطر ہم لڑ جا رہی ہوں۔

”مجھے اپنے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔“ اومادی کی آواز دور سے اس کے کان میں آئی۔

”کلاس کی بیک گراؤنڈ۔“

”ہاں۔“

”مڈل کلاس۔“

”اومادی نے خود سے سننا شروع کیا۔ گویا ہسپتال میں کیس، بڑی سس رہی ہوں۔

”تم نے کیا سہہ بتائی تھی۔؟“

”انیس سال اور اب تک سکندریہ میں ہوں۔“ دیپالی نے تاسف سے کہا۔

”وجہ۔۔۔؟“

”میں بارہ سال کی تھی جب ماں مر گئیں۔ ان کو۔۔۔ کینسر ہو گیا تھا۔ بابا پٹنہ لے کر گئے۔

ہسپتال میں مر گئیں۔ میں سب سے بڑی تھی۔ تینوں بھائی چھوٹے ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کے لئے میں اسکول چھوڑ دیا۔“

”ہاں۔ ہاں۔“ کہے جاؤ۔“ اومادی کشتوں پر کہنیاں رکھ کر غور سے سنتی رہیں۔

”بابا ماں پر عاشق تھے۔ ان کے مرنے کے بعد بچہ کر رہ گئے۔“
 ”پو پو مین۔“

ایک نحت دیپاتی نے اوتا پر نظر ڈالی۔ اور اسے خیال آیا۔ بابا کی بقیہ عمر بھی اسی طرح تنہا اور اداس گزر جائے گی۔ کاش انہیں اوتا دی جیسی سمجھ دار اور دردمند عورت کی رفاقت میسر ہو سکتی پھر اس نے بے ساختہ بڑے فخر اور پیار سے کہا۔ ”میرے بابا بہت خوبصورت ہیں۔ دکھوں نے انھیں وقت سے بہت پہلے بوڑھا کر دیا ہے۔ مگر اب بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔ اور میرے کا کا — میرے کا کا تو بابا سے بھی زیادہ —“ پھر اس کی آواز روندھ گئی۔

”انتی جذباتیت سے کام نہیں چلے گا۔ دیپاتی سرکار۔“ اوتا رٹے نے رشتی سے کہا۔
 ”تمہارے کا کا کو کیا ہوا۔؟“

”پھانسی۔“ دیپاتی نے مضبوطی سے جواب دیا۔
 ”اوہ۔۔۔ آئی ایم سوری۔“ اوتا دیپاتی نے آہستہ سے کہا۔
 ”کیا نام تھا تمہارے چچا کا۔؟“

”دنیش چندر سرکار۔“

”گڑ گڑا۔ اوتا دیپاتی سنبھل کر بیٹھ گئیں۔ ”تم۔ تم دنیش چندر سرکار کی بھتیجی ہو؟“
 ”جی ہاں۔ وہ بابا کے اکلوتے چھوٹے بھائی تھے۔ جب اس کے عین ماں ریڈیم ہسپتال میں تھیں تب کا کا کو دہشت پسندوں کے اس مشہور کمپن میں پکڑ لیا گیا۔ بابا نے — بابا نے پٹنے سے فقار کاڑھ کر ساری آبائی کھیت باڑی بیج کھونچ پٹنے کا ایک بڑا بیرسٹر کھڑا کیا (اسے یاد آیا بابا کہتے تھے کہ وہ شری پری تو شری محارادے کو کھڑا کرنا چاہتے تھے مگر ان کی فیس زیادہ تھی) مقدمہ چلتا رہا۔ چلتا رہا۔ مگر وہ بیرسٹر کا کا کو پکڑ لیا۔ اور ان کو پھانسی ہو گئی۔ جس سال ماں مری ہیں، اس کے چھ مہینے بعد ہی کا کا کو پھانسی ہو گئی۔“
 ”تم کو یاد ہیں۔؟“

”خوب اچھی طرح یاد ہیں۔ چھ سال پہلے ہی کی تو بات ہے۔“ دیپاتی کی آنکھوں میں آنسو اٹھ اٹھے۔
 ”میرے کا کا کا ایک ٹیک کزن تھا۔ چند لمحوں بعد دیپاتی نے کہا۔“ اوتا دی بعض دفعہ صبح منہ اندھیرے مری آنکھ کھل جاتی ہے۔ جب ابھی پوری طرح اجلا نہیں پھیلتا۔ اور پلنگ پر پڑے پڑے کھرکی سے باہر اندھیرے

آسمان کو دیکھ کر سوچتی رہتی ہوں، بالکل ایسے ہی وقت میں، پوچھنے کے وقت میں، کا کا انقلاب اور ہندوستان کی آزادی کے نعرے لگاتے تھے پر بیڑا ہل گیا تھا۔ اور میں خوب روتی ہوں اور سوچتی ہوں کا کا اور ان کے ہزاروں ساتھیوں کا خون رائیگاں نہ ہونے دوں گی۔ وہ خاموش ہو گئی۔

سوئس کاٹچ کی شکل کا کلاک ٹیک کرتا رہا۔ اب رات کے پونے دس بج رہے تھے۔ دیپائی نے وقت پر نظر ڈالی اور جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ ”کا کا کی شہادت کے بعد بابا کا دل دنیا سے بالکل اچاٹ ہو گیا۔ اگر ہم بچوں کا بھڑانہ ہوتا تو وہ شاید سیاسی لے لینے۔ مگر وہ مذہبی بھی نہیں ہیں۔ وہ کانگریس میں شامل تھے اور جیل بھی کاٹ چکے تھے، مگر لاڈ لے بھائی کی موت کے بعد سے ان کو ایک عجیب طرح کا رویہ ایجنٹ ہو گیا۔“

”سیاست سے نفرت ہو گئی؟“

”تقریباً۔ اب وہ دن بھر چپ چاپ کمرے میں بیٹھے رہتے ہیں۔ غریبوں کا مفت علاج کرتے پھرتے ہیں۔ پریکٹس چلتی نہیں۔ بس اتنا کمالات ہے کہ گھر چل جائے۔“

”تم ابھی کھیتی باڑی کی کیا بات کر رہی تھیں؟“

”غفار گاؤں کے نزدیک ہمارے یہاں مخلوں کی دی ہوئی زمینداری تھی۔ وہ بابا کے پڑپھوں نے ناچ گانے اور شراب پینے میں اڑادی۔ اس غصے میں کہ لودو لے بنیوں کے آگے نہیں جھکیں گے۔“

”نیوڈل ڈکیمینٹس جو انیسویں صدی کے برطانوی بورڈر وائٹنگ سے مل کر آکر رہا گیا۔“ اوما رائے نے سر ہلا کر کہا۔ دیپائی نے ذرا آنکھیں پھیل کر اٹھیں دیکھا۔

”اب تمہارے کہنے میں کون کون باقی ہے؟“

”تھوڑے سے رشتہ دار ہیں، وہ غفار گاؤں میں چھوٹی موٹی سرکاری ملازمتیں کرتے ہیں۔ بابا کے ایک چچا زاد بھائی ہیں۔ وہ بھی ڈاکٹر ہیں۔ چند سال ہوئے وہ ٹری نیڈلڈ ہجرت کر گئے۔ وہاں ہزاروں کمزور ہیں۔ بس اور کوئی نہیں۔ ٹھاکر ماس کا پچھلے سال انتقال ہو گیا۔ میری ماں کا میکہ سراج کچ میں ہے۔ وہ بھی ملازمت پر مشتبہ لوگ ہیں۔ اور کیا بتاؤں۔ ہاں۔ یہ ”چندر کینج“ ہماری کونٹری کی خوشحالی

کے زمانے میں ٹھاکر دے بنوائی تھی۔ ٹھاکر دے کی زندگی ہی میں بابا اور کا کا قومی تحریک میں شامل ہو کر جیل یا تڑا کے لئے چلے گئے تھے۔ اس زمانے میں ہمارے یہاں ایسی غربت چھائی کہ بعض دفعہ رات کو مٹی کا تیل خریدنے کے پیسے بھی نہیں ہوتے تھے۔ صرف اسی امید نے ہم سب کو زندہ رکھا۔ انگریز سے چھٹکارا ملنے کے بعد دیس کے ان سارے اندھیرے گھروں میں اجالا ہو جائے گا۔

”ایسا ضرور ہوگا۔ دیپالی۔ ایسا ضرور ہوگا۔“ اومارائے نے آہستہ سے کہا۔ ”تم بابو سی کا شکار کبھی نہ ہونا۔“

”میں بابو سی بالکل نہیں ہوں اومادی۔“ دیپالی نے دفعۃً ہنس کر کہا۔

”تم نے دوبارہ پڑھائی کیسے شروع کی؟“

”بابا کی ایک ہی سگی بہن ہیں۔ عمر میں اُن سے بہت بڑی۔ چار سال ہوئے وہ بیوہ ہو گئیں۔ اُن کے شوہر فرید پور میں وکالت کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد پٹنئی ماں ہمارے یہاں آ گئیں۔ وہ لاالہ ہیں۔ انہوں نے اُن کرکھر سنبھال لیا تو میں نے ہائی اسکول پاس کیا اور کالج میں داخل ہو گئی۔ ساتھ ہی عباس الدین احمد کے ہاں جا کر سنگیت بھی سیکھتی رہی۔ میں بابا کی مدد کے لئے ڈاکٹری پڑھنا چاہتی تھی۔ لیکن بابا جانتے ہیں کہ ڈاکٹری کی تعلیم میں میرا جی بالکل نہیں لگے گا، اس لئے انھوں نے سائنس نہیں لینے دیا۔ اب اس جولائی میں وہ مجھے شانتی ٹکیتن بھیج رہے ہیں۔ ان کے دوست پروفیسر رتھی حسین کا بھی منت امرار ہے کہ میں شانتی ٹکیتن چلی جاؤں۔“ دیپالی نے پھر کلاک پر نظر ڈالی۔

”تحریک میں کس طرح شامل ہوئیں؟“ اومارائے کے سوالات ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔

”دیپالی پھر کھل کھلا کر ہنس پڑی۔“

”پھر وہ اسکول گرل لگن۔“ اومارائے نے غصے سے کہا۔

”دیپالی نے گنے پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکی۔“ اس کا قہقہہ بہت دلچسپ ہے اومادی۔ ایک

روز۔ ایک روز شام کے وقت۔“

دفعۃً اومارائے نے اس کی بات کاٹی۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے کا کا اگر زندہ رہ جاتے

تو ہندوستان کے بہت بڑے مورخ بنتے؟“

”جی ہاں۔ میں نے ان کی کتاب کئی بار پڑھی ہے۔ مگر سمجھ میں نہیں آتی۔ بابا کہتے ہیں ابھی میرے سمجھنے کے لئے وہ موضوع ہی بہت ٹھوس ہے۔ بنگال کی اقتصادی تاریخ“

”تم تحریک میں کس طرح شامل ہو گئیں؟“ اداسی نے سوال دہرایا۔

”پچھلے سال میں ایک روز شام کو برآمدے میں اکتائی ہوئی کھڑی اپنے بھائیوں کا انتظار کر رہی تھی، جورات کے کھانے سے ذرا قبل فٹ بال کھیل کر لوٹتے ہیں۔ بستی ماں رسوئی میں بھینیں اور بابا طبیب بند کر کے ہانے کے برائشل خانے میں جا چکے تھے۔ اتنے میں برآمدے میں سے کیا دیکھتی ہوں کہ ایک مسلمان فقیر چلے کر کھڑا ہے۔ ایک تارہ لے۔ مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس نے جھن سے ایک تارہ پھیرا اور بڑی دلدوز آواز میں باؤل گانا شروع کر دیا۔ بستی ماں فقیروں اور سنیاسیوں کو بڑی عقیدت سے دیتی دلاتی رہتی ہیں، اس لئے میں نے اُسے آواز دی کہ کھچو اڑے آنکھ کی ڈیوڑھی پر چلا جائے۔ مگر میری بات سن کر وہ جھپاک سے برآمدے میں آگیا اور کہنے لگا کہ ڈاکٹر سرکار سے ملنا چاہتا ہے۔ میں ابھی کوئی جواب بھی نہ دینے پائی تھی کہ اس کی نظر اندر سیٹھک خانے میں لگی کاکا کی بڑی تصویر پر پڑ گئی۔ اور اس نے جلدی سے کہا کہ اسے اس تصویر کی مددوں سے تلاش تھی۔ اور میری گھبراہٹ اور احتجاج کی مطلق پروا کئے بغیر جھپٹ سے مکرے میں گھس گیا۔ اور دیوار کے پاس جا کر بڑی محویت سے پورٹریٹ کو دیکھنے لگا۔ میں بڑبڑا کر اندر گئی تو اس نے پوچھا ”اس تصویر کی ایک کاپی مل سکتی ہے؟“ اور پھر اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اپنے جھولے میں سے کچھ کاغذ نکالے اور چاروں طرف دیکھ کر بولا۔

”تم کون ہو؟“ دیش بابو کی لڑکی ہو۔“

”میں ان کی بھینسی ہوں، ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔“ میں نے کہا۔ نو کہنے لگا۔ ”اچھا اپنے بابا کو بلاؤ۔“ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں ایک دم بہت ڈر گئی۔ اور پچھلے برآمدے میں جا کر بابا کو آواز دی۔ بابا جلدی آئے، ایک عیب سا فقیر آکر سیٹھک خانے میں بیٹھ گیا ہے۔ بلدی آئی۔ بابا تو لیدکنڈ سے پر ڈالے جلدی سے باہر نکلے اور مکرے میں گئے تو وہ فقیر فوراً کھڑا ہو گیا۔ اور چپکے چپکے ان سے باتیں کرنے لگا۔ بابا اسے دیکھتے رہے پھر اداسی سے مسکرا ڈئے۔ میں دروازے میں سے اندر جھانک رہی تھی۔ انہوں نے مجھے آواز دی کہ چائے بناؤں۔ میں چائے بنا کر لے گئی۔ اب وہ اداسی پرانے دوستوں

کی طرح صوفے پر بیٹھے باتوں پر ہینک تھے۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے تو اس نے اپنا نام نور الرحمن میاں بتلایا۔ اور کہنے لگا کہ بارہ سال میں اس کا تکیہ ہے۔ جب میں اس کا مطلب نہ سمجھی تو ہنس پڑا۔ اور کہنے لگا کہ وہ ایک بنگالی دیہاتی کا ایڈیٹر ہے۔ اور کالاکے متعلق ایک خاص نمبر نکال رہا ہے۔ اور اس سلسلے میں معلومات حاصل کرنے آیا ہے۔ کالاکے نجی حالات، ان کے پرانے مسودے حیل سے لکھے ہوئے خط۔ پرانی تصویریں، یہی سب۔ مجھے اس کی جھاڑ جھنکار دار بھی پڑی ہنسی آئی کہ ایڈیٹر لوگ تو باؤل فقیروں کا حلیہ بنا کر ایک تارہ نہیں بجاتے پھرتے۔

”پھر کیا ہوا۔“ اُمانے جواب بڑے غور سے یہ داستان سن رہی تھیں، سوال کیا۔
 ”تو بابا نے اس سے کہا کہ وہ ساری چیزیں بکسوں میں سے تلاش کر کے اس کے لئے نکال رکھیں گے اور اسے دو دن بعد آنے کے لئے کہا۔ اتنے میں میرے تینوں بھائی آگئے اور ایک عجیب سے جہان کو اندر بیٹھا دیکھ کر کھڑکی میں سے بچھا کتنے لگے۔ توفیق نے یعنی نور الرحمن میاں نے مجھ سے کہا کہ میں دروازے بند کر کے کھڑکیوں کے پردے گرا دوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اور بچوں کو بھگانے کے لئے باہر گئی۔ اتنی دیر میں نور الرحمن میاں۔ یعنی باؤل فقیر بھی ایک تارہ یا نا باہر آکر جھپاک سے جھانک پر پہنچ گیا۔ ہمارے بزرگ اور جھانک کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ دو دن بعد وہ کاغذات اور تصویریں لینے کیلئے اسی وقت اندر پہنچے۔ بابا کو کسی رہنمائی کے لئے باہر جانا پڑ گیا تھا۔ اور وہ ساری چیزیں میرے حوالے کر گئے تھے۔ فقیر پڑی نے تکلف سے سیٹھک خانے میں آگیا۔ اور میں نے جلدی سے دروازے بند کر کے کھڑکیوں کے پردے گرا دیے۔ صوفے پر بیٹھ کر وہ مجھے اس طرح دیکھتا رہا گویا بہت محظوظ ہو رہا ہو۔“ اتنا قصہ سنا کر دیپاک پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”اس قدر سنبتی کیوں ہو؟“ اُمانے ناگوار سے کہا۔ وہ بھول چکی تھیں کہ اس عمر میں بات بے بات ہنسی کے قوارے چھوٹتے ہیں۔

”سوری اُمانی۔“

”تم نے اتنے دیکھ اٹھائے ہیں پھر بھی اتنی سرور اور بشتا نہ ہو۔“ اُمانے کے لہجے میں رشک کی تلخی کے علاوہ بڑی عجیب سی آزر وگی تھی جو دیپاک نے محسوس نہیں کی۔ وہ اپنی بشتا بشت پر نادم نظر آنے کی کوشش میں مصروف ہو گئی۔

”پھر کیا ہوا۔۔۔ اُمانے سمجھتی سے پوچھا۔

”بس پھر میں نے بابا کا دیا ہوا بڑا فائل اس کے حوالے کر دیا۔ اور وہ کہنے لگا کہ مجھے جو کچھ کا کا کے بارے میں یاد ہو اسے بتاؤں۔ میں نے کا کا کا ذکر کیا تو ایک دم رونے لگی۔ وہ بہت گھبرا گیا۔ خیر پھر اس نے جلدی جلدی نوٹ لئے۔ اور اپنے رسالے میں میری دل چسپی دیکھ کر اس نے کہا کہ اگلے مہینے سے پرانا پینٹ کے فلاں مکان میں ایک اسٹڈی سرکل قائم ہو رہا ہے میں اس میں ضرور جایا کروں۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے ایک باؤل گیت سکھاؤ۔ کیونکہ میں نے عباس داسے بہت سے باؤل گیت سیکھے ہیں۔ مگر یہ والا باؤل جو وہ گا رہا تھا میں نے کبھی نہیں سنا تھا اس نے کہا آج تو دیر ہو جائے گی۔ اگر میں اجازت دوں تو وہ کل شام کو اسی وقت آ سکتا ہے۔ میں بے حد خوش ہوئی۔“

”چنانچہ وہ تیسرے روز بھی آیا۔“ اقا دینی نے آنکھیں بند کر کے سپاٹ آواز میں کہا۔

”جی ہاں امدادی۔ اور میں نے حسب معمول جلدی جلدی دروازے بند کئے اور پردے گرا دیئے۔ مجھے بڑی ہنسی آرہی تھی اس نے مجھ باؤل گیت سکھایا اور مجھ سے بھی دو تین گانے سنے۔ اور کہنے لگا کہ وہ ریڈیو پر ہمیشہ جب موقع ملتا ہے تو میرے گانے ضرور سننا ہے۔ بہت ہی سُوئیٹ فیکر تھا امدادی۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ فقیر نہیں۔۔۔ نور الرحمٰن میاں۔۔۔“

”ہوں۔“

”بابا اتفاق سے اس روز بھی باہر گئے ہوئے تھے۔ کیونکہ ان کے مریض کی حالت خطرناک ہو چکی تھی خیر جب وہ واپس آئے تو میں نے ان کو بتایا۔ وہ اچانک ایک دم ادا اس ہو گئے اور کہنے لگے۔ دیپالی۔۔۔ اپنے عزیز ازجان بھائی کا بلیدان دے چکا ہوں۔ اب تم تو اس خطرناک راستے پر نہیں چلو گی؟ میں نے دل میں کہا۔ ماں مجھے معاف کر دینا۔ میں بابا سے جھوٹ بول رہی ہوں۔ اور میں نے بڑی صفائی سے جواب دیا کہ میں اس راستے پر ہم گز نہیں چلوں گی۔ وہ مطمئن ہو گئے۔“

”اس کے بعد نور الرحمٰن میاں ایک مرتبہ اور آئے تھے۔ رات کے وقت۔ یہ بتانے کے لئے وہ کہیں اور جا رہے ہیں۔ انہوں نے جاتے جاتے مجھے ایک مرشدی گان لور ایک وریاچی کا گیت بھی سکھا دیا۔ جو مستحلی میں ہے۔“

”دیدنی میں اگلے مہینے بابا کے ساتھ کلکتے جاؤں گی اپنے گانے ریکارڈ کرنے۔ وہاں وہ مرشدی

گان اور دیا پتہ کالیت بھی ریکارڈ کرواؤں گی۔ آپ کو سناتی مگر اب بہت دیر ہو جائے گی۔
 او۔ ماں۔ دس بج گئے۔“

”بہت خوب۔“ اوماہی نے کچھ اور سوچتے ہوئے بے دھیانی سے جواب دیا۔
 ”مگر وہ رسالہ تو شائع ہوا نہیں اور نور الرحمن میاں بھی غائب ہو گئے۔ اس کے بعد میں پرانا پلٹن اسٹڈی سرکل میں جانے لگی۔ وہاں نور الرحمن میاں کبھی نظر نہیں آئے۔ مگر دوسرے ساتھیوں سے ملاقات ہوئی۔ میں بابا سے کہہ کر جاتی تھی کہ روزی کے گھر جا رہی ہوں اور میں اور روزی سیدھے پہنچے تھے پارتی آفس۔ جب سے میں ہمدردی حینیت سے تحریک میں ہوں۔ اور تھوڑا بہت کام ہو کچھ سے بن پڑتا ہے۔ کرتی رہتی ہوں۔“

”پچھلے مہینے مہینہ دالے تشویشناک خبر دی کہ اس غیر فانی رسالے اور اس کے پریس پرچھاپہ مارکر پولس نے سارے اسٹاک پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور ریکان دا اور ان کے ساتھی راتوں رات اپنے خفیہ مستقر سے فرار ہونا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لئے انھیں فوری دو ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ یہ فوراً فراہم کیا گیا۔ اس میں پانچ سو کی کمی پڑی تھی۔ تو میں نے۔۔۔ میں نے اپنی ماں کی چھوڑی ہوئی باتوں پر بولنے والے ساڈیاں بکوا دیں۔ اب ریکان دانے جانے کون سے گاؤں میں جا کر نیا ہینڈ پریس لگا لیا ہے اور کسانوں کی تنظیم کے لئے پرچے اور پمفلٹ چھاپ رہے ہیں۔ اب جا کر وہ کا کا والا نمبر بھی شائع ہو جائے گا۔ مکھیدی۔۔۔ مجھے تعجب تو یہ بھی ہے کہ ریکان دا مجھ سے آج تک نہیں ملے۔ انھوں نے آپ کو یہ کیسے لکھا ہے کہ مجھ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اور اتنا ذمہ داری کا کام آج میرے اوپر ڈال دیا۔ کمال ہے۔“
 اوما نے بیدارکتا ہٹ کے ساتھ ونڈ و سیٹ پر نیم دراز ہو کر کروٹ بدلی۔ اور چند لمحوں تک خاموش رہنے کے بعد بیزاری سے کہا۔

”دیپالی سرکار۔ تم ایک برس سے انڈر گراؤنڈ کے لئے کام کر رہی ہو اور تم کو یہ تک پتہ نہیں کہ انڈر گراؤنڈ کے بیڈر طرح طرح کے بھیس بدلتے رہتے ہیں۔۔۔ وہ مسلمان بزرگ جنہوں نے تم سے خلوص بڑھایا۔“ اوما کی آواز پر ماب علیہ دیکان غالب تھی۔۔۔ ”ریحان الدین احمد تھے۔“
 ”او۔۔۔ ماں۔۔۔“ دیپالی گم سم رہ گئی۔ چند لمحوں تک بالکل حواس باختہ رہنے کے بعد

اس نے آہستہ سے کہا ”لیکن انہوں نے تو اپنا نام نور الرحمن بتلایا تھا۔“

”اکثر کلہاڑے موقع پڑنے پر باری باری ایک فرضی نور الرحمن میاں بیٹے رہتے ہیں۔“
 ”اوماں —“ ”دیپالی مزید کچھ نہ کہہ سکی۔ اسے لگا، جیسے اس کی زبان گنگ ہو گئی ہو۔ اوما
 نے کڑوٹ بدلی۔ بڑے دھیان سے اس کی صورت دیکھی اور خشکی سے انگریزی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
 اور دفعتاً کاروباری اور کرخت آواز میں پوچھا ”تم نے اپنی اس ہمارا سہیلی کا کیا نام بتایا جو تمہارے ساتھ
 تحریک میں شامل ہو گئی ہے۔؟“

”روزی بزرگی۔“

”قابل اعتماد ہے؟“

”بہتر قابل اعتماد۔ ریحان دا — اس کے متعلق جانتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے انہوں نے
 یہ اسکیم بنا کر آپ کو بھیجی ہے۔“

”ہوں — اچھا آئیے کے سامنے جاؤ۔“

دیپالی نے تعمیل حکم کی۔

اوما رائے نے سر نہ ہونٹا کر اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔

”اب اپنے مین سنگھ کے دیہاتی لیے میں بولو تو — میں شام کو تمہیں سب سمجھا چکی ہوں
 ریحان نے لکھا ہے تم بہت بڑھیا ایکٹر لیس ہو۔ یہ ہم کامیابی سے سر کر لو گی۔“
 وہ چپ رہی۔ کوئی تعجب نہیں کہ باؤل فقیر نے کسی اور بھیس میں جا کر اس کے کالج کے ڈرائے بھی
 دیکھ لئے ہوں۔ آئیے میں اس نے دیکھا کہ اس کا چہرہ سرخ ہوتا ہے۔

”یک نام ہے —؟“ اوما رائے نے اسٹیج ڈائرکٹر کی طرح ڈپٹ کر دریافت کیا۔

”جی — جی — ہم — ہم — ہم کلثوم بی بی۔“

”کہاں سے آئی ہو۔؟“

”جی — مین سنگھ ضلع سے —“

”سر تعینات ہیں؟“

”جی نہیں۔ ہمارے خالو نواب صاحب بوگرہ کے خاندان ہیں۔ انہوں نے بھیجا ہے۔
 ”شہباز — مگر نواب صاحب بوگرہ نہ کہہ دینا۔ آفت آجائے گی۔“ اوما رائے نے

دفعتاً ہنس کر کہا۔

”سوری۔۔۔ کچھ امداد سوچ لوں گی۔ آگے پوچھئے۔“

”بس ٹھیک ہے۔ ریٹائن۔۔۔ نے غلط نہیں کہا۔ ہاں۔۔۔ اور برقعہ۔۔۔؟“

”کل حاصل کروں گی۔۔۔ عبدالقادر کی بی بی سے۔۔۔“

”عبدالقادر کون ہے؟“

”گٹاڑی والا۔۔۔ ہمارا کو جوان نہیں۔ ہماری گاڑی تو کب کی ٹوٹ پھوٹ کے برابر ہوئی۔“

بابا نے اسے ہاراشاگرد پیشہ دے رکھا ہے۔ مجھے کہیں جانا ہو تو بڑے خیال سے لاتا ہے جاتا ہے۔“

”جولی کڈ۔ فائن۔ اوہو۔ بہت رات ہو گئی۔ بابا سے کیا کہہ کر آئی تھیں؟“

”بیابادوزی اور جہاں آگے گھر سے میرے دیر سے لوٹنے پر کچھ نہیں کہتے۔ اور ہمیشہ وہاں کا کام

مجھے گھر پہنچا آتا ہے۔ ڈھاکے میں میری ہی دعوے پر سہیلیاں ہیں۔ اُودا دی۔ میں ان کے علاوہ اور

کسی کے گھر نہیں جاتی۔“

”رائیٹ۔۔۔“ اُودا نے برقی گھنٹی کا سوپٹ دیا۔ ”یہ بھی اچھا ہوا کہ یہاں سب لوگ اس

وقت کلب گئے ہوئے ہیں۔“ سیزر نے بند دروازے پر دستک دی۔ اُودا بی بی نے آگے بڑھ کر جھنجھی

لھولی اور جھک کر میز سے باتیں کرنے لگیں۔ ”بیرہ آیا۔“ ڈرائیور سے کہو۔ ٹھرو۔ کون سی موٹر ہے؟“

”میم صاحب کی۔“

”اچھا۔ گویاں سے کہو برساتی میں لگا دے جلدی۔ ایک دم۔“ سٹوئے کی تصویر پر غیر ارادی

لہو سے ایک اچھٹی ہوئی نظر ڈال کر دیپالی اُودا کے ساتھ مارننگ رووم سے باہر نکلی۔ محل کے دروازے

پر پہنچ کر ادا رائے نے کہا۔ ”موٹر اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر رکوانا۔“ پھر انہوں نے دیپالی کی پیٹھ جھک

کر کامیابی کی امید ظاہر کی اور سر جھکائے گیسٹری میں جلی گئیں۔

دیپالی برآمدے میں نکلی۔ اور برساتی میں اتر کر موٹر میں بیٹھ گئی۔ موٹر ایک جھونک کے ساتھ طویل

رائٹو کا چکر کاٹ کر پھاٹک پر پہنچی۔ اب اس لمحے سے میں اپنی ہی ذمے داری کی معیت میں بالکل تنہا

ہوں۔ اس نے سوچا۔ موٹر تیزی سے رمتا کی چوڑی ہنسناں مرٹک پر آئی۔ روشن دوڑ لینڈ زاجانک

ندھیرے میں ڈوب گیا۔

دیپالی نے آگے جھک کر ڈرائیور سے کہا: "ڈرامشن کیا ڈنڈ کی طرف سے ہوتے چلی"

۶

ریورنڈ پال متھیو بنرجی

مشن کیا ڈنڈ کے ویسی گرجا گھر کے اندر کرسمس کی تیاریوں کے سلسلے میں تیز رفتاری ہو رہی تھی۔ بڑے دن میں صرف چار و ذرہ گئے تھے۔ کیا ڈنڈ میں سخت گہا لگی اور دینی محسوس کرسمس کے دوران میں ویسی مشینوں کی سالانہ کانفرنس منعقد ہونے والی تھی جس میں شرکت کے لئے ارا آباد، سینٹ پال، مگرہ، شاہجہانپور، لدھیانہ، انبالہ، لاہور اور دوسرے بڑے بڑے مشنری مراکز سے نمائندہ مبلغین ڈھاکے آن پہنچے تھے اور کیا ڈنڈ میں لگے خیوں میں پھہرے ہوئے تھے۔ اس وقت گرجا گھر میں نمائندوں کی ٹولیاں اپنے اپنے کرسمس گیر رتی مشق میں جٹی تھیں۔ ڈھاکہ مشن کیا ڈنڈ کے انچارج ریورنڈ پال متھیو زمنوہ میں بنرجی گرجا کے اندر اپنے دفتر میں بیٹھے دوات میں غیب ڈھونڈ کر کرسمس کا وعظ لکھنے میں مصروف تھے۔ گرجا کے عقب میں ان کا مکان جو "بلی لاٹج" کہلاتا تھا عبادوں کا ذخیرہ بچوں اور مصروفی ستاروں سے سجایا جا رہا تھا۔ مسٹر بنرجی کچن میں فرش پر بیٹھی کرسمس لیکچر لکھ کرسمس پڈنگ کے لئے خشک میوہ صاف کرنے میں مہمک تھیں۔ باہر بارش میں بارش کے سائباں کے نیچے کیا ڈنڈ کی عورتیں اور لڑکے بالے سب مل کر مٹا سا اطفال تیار کرنے میں لگے تھے۔ ولادت سیک کے ٹیبلو کے لئے حضرت مریم، سینٹ جوزف، چرواہوں اور سیل گاؤں کی مٹی مٹی صورتیاں منواری جا رہی تھیں۔ ریڈ کاہو یعنی یسوع مسیح بڑی احتیاط سے بھوسے کے ننھے سے ڈھیر پر رکھ دیا گیا تھا۔ اچانک گرجا کے دل میں لدھیانہ مشن کی ٹولی نے اونچی باویک آوازیں ایک پنجابی حمد شروع کر دی۔ ریسرڈنٹ وادشاہ ہے۔ اوجلال دابادشاہ ہے۔ اے خداوند۔ اپنی راہ اپنے بندے توئی دکھا۔ آ۔ آ۔

پادری بنرجی نے اپنے دفتر میں وعظ لکھتے لکھتے قلم ایک طرف رکھ دیا اور عینک ہاتھ پر

چڑھا کر چھت کو دیکھنے لگے۔ الماریوں میں مشن کے رجسٹر اور موٹی موٹی کتابیں رکھی تھیں۔ سامنے دیوار پر ایک بڑی سی سیاہ صلیب آویزاں تھی۔ میز پر بھولوں سے بھرا لکڑی رکھا تھا۔ باہر سے کانوں اور ہار مونیم اور بچوں کے ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ بڑا پرسکون اور سہانا وقت تھا۔ خدا کے خوف سے ہر وقت ڈرنے والے، نیک دل پادری بنرجی نے آنکھیں بند کیں اور زندگی کی نعمتوں کے لئے خدا باپ کا شکر ادا کیا۔ پھر انھوں نے اٹھ کر الماری میں سے ایک رجسٹر نکالا اور وعظ کے کاغذات ایک طرف رکھ کر مشنری کافر نس میں پیش کرنے کے لئے رپورٹ مکمل کرنے کا ارادہ کیا۔ پچھلے چند برسوں میں پستیمہ لینے والوں کی تعداد میں کمی آتی جا رہی تھی بہت عرصے سے قحط نہیں پڑا تھا۔ اور ہندو تجدیدیت اور مسلم تجدیدیت نے الگ الگ اوجھم مچا رکھی تھی۔ مسلمان تو خیر لوں بھی شاذ و نادر ہی عیسائی ہوتے تھے۔ یہ بھی بڑی ہتیلی اور غولہ بند قوم تھی۔

پچھلی صدی میں سیرام پور مشن نے کلکتہ میں بڑا عہد آفریں کام کیا تھا۔ وہ جغادری، دھن کے پائے عظیم مشنریوں کا دور تھا۔ بشپ ریجنالڈ مہیر۔ ولیم شیس۔ کیری اور مارش یکن۔ ان لوگوں نے اس دیس کی کتنی خدمت کی۔ پریس کھولے۔ کتابیں چھاپیں۔ تعلیم پھیلائی۔

جواں مرگ بشپ مہیر پادری بنرجی کا محبوب کردار تھا۔ وہ انگلستان سے آیا ہوا روحوں کا جیالا رکھوالا جو اسی سنہرے بنگلہ کی دھرتی پر گھوما تھا۔ رجسٹر کی ورق گردانی کرتے ہوئے پادری بنرجی کو دقت خیال آیا کہ وہ کرمس کے وعظ میں بشپ مہیر کی مختصر لیکن درخشندہ زندگی کی مثال پیش کریں۔ انھوں نے بنگلہ میں تحریر شدہ اپنے وعظ کے کاغذات اپنی طرف منسوب کر کے دوبارہ لکھ شروع کیا۔ ”وہ مبارک زمانہ جب آج سے سو سو سال قبل، مادر کلیسا کا لاڈلا سپوت پرنس نفیس ڈھا کے آیا تھا۔ وہ جواں سال خوب صورت، پادری شاعر و مددگار کے کنارے کنارے ٹہل کر، میرے کچھ، تمہاری روحانی نجات کی دعا میں اگتا تھا۔ اور تمہارے غم میں گھلتا تھا۔“

پادری بنرجی نے اٹھ کر ایک اونچی الماری میں سے ”ہیر و آف آورانڈین ایمپائر“ نکالی۔ بشپ مہیر کا باب کھولا۔ اور اس شاعر پادری کی تحریر کا ایک اقتباس پڑھنے لگے۔ ”دریا کے کنارے سے ہندو میری ناؤ۔۔۔ رات میں مہکنے والے پھول۔۔۔ تار کے پتوں کی مدھم مہر سہرا ہٹ۔ کوئل کی پکار بانس کے تاریک جنگلوں میں بنگمنا تے جگنو۔۔۔ عظیم دریا کی سطح پر منعکس استوائی چاند۔۔۔“

اور میں نے محسوس کیا کہ اس دلیں میں موجود ہونا بہت خوب ہے۔

پادری بنرجی نے ورق اٹھا۔۔۔ اور ان کی نظر شپ میسر کی ایک نظم پر پڑی۔ ”اپنی بیوی سے۔۔

اگر تم مسیرے ساتھ ہو

تو سرسبز جنگال کے آئندہ کان میں

شام کا اندھیرا جڑی تیزی سے چھا جائے

پادری بنرجی نے کتاب ایک طرف سرکادی اور بھودوں پر انگلیاں رکھ کر انھیں بند کر لیں۔

لشپ میسر کو بھول کر وہ یکایک دور شمال کے رنگ پور ضلع میں اپنے دور افتادہ گاؤں پہنچ گئے تھے۔ جہاں
بائس کے جھنڈ میں چھپے کالی کے مندر کے پیچھے کوئلیں چلا رہی تھیں۔ اداں کی پڑوسن اور محبوبہ شونا اُن
کی ماں کے ساتھ پوچا کے لئے مندر آتی تھی اور وہ سامنے دیرا پر اپنے نو کے میں چھپے اس کے منتظر رہتے تھے۔

وہ وقت اور یہ آج کی رات۔۔۔ یہ مطمئن برہمایا۔۔۔ یہ محفوظ خانہ خدا۔۔۔ سکونِ قلب۔

انہوں نے پرانے خواب بھٹک کر اپنی ماں کو یاد کیا۔ نجات جس کی قسمت میں نہ تھی۔ ماں۔ تو توبت پرستی
کی گمراہی میں مبتلا ہی دوسری دنیا کو چلی گئی۔ اب تیری روح اس اندھیرے میں۔ اس اندھیرے میں

جانے کہاں ہو گی؟ سب کیا ہے؟

اسرارِ الہی۔

پادری بنرجی پھر کام کی طرف متوجہ ہوئے۔ مگر مہرمن کے الفاظ اور سالانہ رپورٹ کے اعداد و

نثار میں ان کا دل نہ لگا۔۔۔ روحوں کے اعداد و شمار۔ نجات یافتہ روحیں۔ گمشدہ روحیں۔ انہوں نے جمہور

سے بند کیا اور قریب کی الماری میں سے ایک اور پرانی کتاب اپنی طرف کھینچی۔ ”انگلستان میں راجہ رام موہن رائے

کے آخری ایام۔ از میری کار پٹھر“ انہوں نے بے دھیانی سے ورق گردانی کرتے ہوئے ضمیمے کے آخری صفحات کھولے

”چار قابلِ قدر نوٹس“۔

۱۔ سرجکار چکر برنی۔ اونچی ذات کا برہمن۔ خود اپنی درخواست پر لندن میں بستہ حاصل کیا۔

یونیورسٹی سے ڈگری لینے کے بعد کلکتہ میڈیکل کالج سے وابستہ ہوا۔ ۱۸۵۹ء میں لندن واپس گیا۔ وہ پہلا نیٹو

تھا جو کمپنی کی ٹی کوڈینٹ میڈیکل سروس میں شامل کیا گیا۔ ۲۔ بھوونا تھ داس۔ موکرستلیج کے مروجہ برہمن کی افواج

کا اسٹنٹ سرجن تھا۔ بعد میں ڈھاکہ کا سول سرجن بنا۔ ۳۔ دوارکاتھ پوس۔ بکاٹہ نا۔ کسٹریٹھا

۱۔ گوپال چندر سیل۔

آخری نام پر بیچ کر پادری بنی جھٹک گئے۔ اور گزشتہ صدی میں مس کارینٹری لکھی ہوئی کتاب میں مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ رام موہن باپو دراصل عیسائی ہو گئے تھے، آہستہ سے بندھوئی یہ محض اتفاق تھا یا اسی کو ہندو کرم اور سنسکار کہتے ہیں! اور مسلمان نوشتہ تھوہرہ ریسکون ہمسم بسائی اُس حسن اتفاق کو گریس آف گاڈ کہیں گے۔

لیکن — زندگی کا دھارا اچانک، ایک دم کس طرح اپنا رخ بدل لیتا ہے۔ ایک انسان کے یہ ایک مخصوص سمت قدم اٹھانے سے اُس کی ساری آنے والی نسلوں کا مستقبل مختلف ہو جاتا ہے۔ مستقبل کیا ہے؟

اس غیر اہم، بھولے ہوئے نام ”گوپال چندر سیل“ کو دیکھو۔ یہ آج سے سو برس قبل میرے گاؤں پیدا ہوا تھا۔ وہ عیسائی ہو کر ڈاکٹری پڑھنے ولایت گیا۔ اور وطن واپس آکر بے چارہ نوجوان رہا، ڈوب کر مر گیا۔

اور ایک روز میں، منموہن بنرجی۔ ایک مفلس سولہ سالہ طالب علم لال منیر ہاٹ سے اپنے گاؤں اہل تھا۔ جب اسٹیمبر ایک بوڑھا انگریز مشنری مجھے ملا۔ اور اس نے مجھ سے میرے گاؤں کا نام پوچھا اور بڑی سرت سے بتایا کہ اسی گاؤں کے ایک قابیل فرنیٹو نوجوان گوپال چندر سیل کو اس کے باپ نے بپتسمہ دیا تھا۔ فی میں نے اس نوجوان کا کبھی نام بھی نہ سنا تھا۔ (پادری بنرجی عادتاً دل میں اس انداز میں سوچنے لگے، جس رج وہ منبر پر وعظ کہتے تھے) برسمیتر کے طویل سفر کے دوران اس بہریان مشنری نے پہلے صفحہ پر اپنا پتہ لکھ کر بیل مقدس مجھے دی اور جب میں گاؤں پہنچا، میری ماں بستر مرگ پر پڑی تھی — اور دیکھو اس کے بت لے نہ اسکے۔ اور میں، جو انجیل مقدس سے بیدار تھا، جو چکا تھا۔ میں نے اپنے باپ کو بنگلہ انجیل پڑھنے کو دی۔ اور سال بعد میں، میرا باپ، چچا، بہن بھائی، سارا کنبہ رنگ بورا اس انگریز مشنری کے ہاں بیچ کر اس کے ہاتھ پر امن مانے۔ چنانچہ (پادری بنرجی نے کرسی پر پہلو بٹا دیا اور اپنے غیر مرئی سامعین سے مخاطب رہے) ایک سچا بیٹو میں، جو آج سے مدتوں قبل موالیہ اُن دیکھے اور بالواسطہ طریقہ سے میرے خاندان کے یسوع تک پہنچنے وسیلہ بنا۔

اگر میں اس روز اس اسٹیمبر پر اس مشنری سے نہ ملتا۔ یہ کرم تھا۔ یا محض اندھا اتفاق —

یورنڈنبرجی نے سر ملہا ادا متحیر سے بیٹھے دوا زسے سے باہر مشن کپاؤنڈ کا نظارہ کرنے لگے۔

ہندوستان کے ہر ضلع میں ایک مشن کپاؤنڈ موجود ہے۔ بلکہ مختلف پکھساؤں کے مختلف مشن کپاؤنڈ موجود ہیں۔ جس میں ڈیڑھ دو سو سال سے سفید نام مشنری خواتین سفید سائے اور سفید سولہا بیٹ پیسے پا میں بائبل لے کر نیٹو لوگوں کی مدد میں کو بچانے کے لئے دلدات کو شمل رہی ہیں۔ اور کالا پادری ہندوستانی سما کے ایک کنارے پر اپنی انجیل لے کھڑا ہے۔

شروع شروع میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت مشنریوں کو ایک نیو منس سمجھتی تھی۔ سیرام پور میں بیٹش مشن کی طرف سے شائع ہونے والا انتہائی دلا زارہ لٹریچر سچے غورٹ ولیم میں سنسکریٹ جاتا تھا۔ کہ ابھی ہندوستان میں مسیحی مشن کو یونین جیک کی سرپرستی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ لارڈ منٹون نے سیرام پور کے لٹریچر کے متعلق کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کو مطلع کیا تھا۔ کہ یہ ہندوؤں کے لئے سیداشتعال انگیز ثابت ہو رہا ہے۔ اس کے جواب میں سیرام پور کے مشہور مشنری ڈاکٹر ایش میں نے لکھا تھا کہ ہندوستانی انتہائی کمزور اور احمق کردار کا مالک ہے۔ اور اس کمزوری کی وجہ سے ہمیشہ کسی نہ کسی غیر قوم کا حکوم رہے گا۔ اور اس کے اس بعد سے پن کو عیسائیت بھی دور نہیں کر سکتی۔ لیکن برطانیہ کے زیر سایہ زندگی میں اس کے لئے برکت الہی کا موجب ہے۔ اس وجہ سے جو ہندو یا محمد بن عیسائی ہو جائے وہ اپنے تحفظ کی خاطر برطانیہ کا انتہائی وفادار ثابت ہو گا۔ کیونکہ محض اس ایمپائر کی سلامتی اور توسیع پر اس کے وجود کا انحصار ہے۔

سیرام پور والوں کو راجہ رام موہن رائے کی طرف سے بڑی امیدیں تھیں۔ مگر انھوں نے عیسائی ہونے کے بجائے اٹلے ان سے مناظرے شروع کر دیئے کہ آخر گوڈ کو برہما ہی کیوں نہ کہا جائے؟ مشنری مار کی روح کو بالآخر نہ بچا سکے۔

یہ انگریز مشنری۔ واقعی بہت بھولے تھے۔ بشپ ہیرس ۱۸۲۵ء میں ہندوستان کے دورے کے بعد لنکا گئے اور کنیڈی کے شاہی محل کے دربار میں ڈیوائن سروس منعقد کی۔ اور ان کے ساتھی مسٹر روئینس نے اس موقع کے متعلق بعد میں لکھا۔ ”سروس کے بعد میں اور بشپ ہیرس گھر لوٹے اور میں نے بشپ سے کہا۔ عبادت کے دوران میں مجھے خیال آیا کہ صرف چند سال قبل اسی ہال میں ایک جابر الہیائی بادشاہ اپنی مظلوم رعایا کو درشن دتا تھا۔ اور آج اس میں ایک عیسائی بشپ بیٹھے دین کا پیغام سناتا تھا۔“

ب میں نے یہ کہا تو لجنسپ سیر نے سر جھکا لیا اور دوڑ پڑے۔

ان مشنریوں نے کابلے مبلغ اور پادری تیار کئے۔ ۱۸۵۶ء کے بعد عیسائیت کو حکومت کا مکمل تعاون ہو چکا تھا۔ (انگریزوں کا عبادت خانہ۔ گر۔ جا۔ بے چارے مسلمان جل کر کہتے تھے کالا پار کی راہوں اور سڑکوں پر تبلیغ کرتا پھردا تھا۔ اور مولویوں سے مناظرے کر رہا تھا۔ ہندو اور مسلمان، دیسی عیسائیوں کا لٹیں، چریشین اور پٹیلی صاحب کہہ کر خوش ہو لیتے تھے۔ لیکن تبدیلی مذہب کے بعد مظلوم اچھوتوں کا افلاس زدہ تعلیم یافتہ افراد کی زندگی بدل جاتی تھی۔ سری رام کرشن کے چیلے اور سوانح نگار ہندو رانا تھہر نے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ ایک مرتبہ انھوں نے اسٹیکل مھو سودن دت سے دریافت کیا کہ وہ عیسائیوں کو ہونگئے۔ تو انھوں نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ اس کی خاطر۔

جھوک کے علاوہ ذہنی بچی بھی بنگال میں عیسائیت کے فروغ کی ایک وجہ تھی۔ اٹھارویں صدی میں نال کا اور سائے ہندوستان کا ہندو سماج تنزل کی آخری حدود تک پہنچ چکا تھا۔ رام موہن رائے نے ۱۸۲۰ء میں ہندو کلیج قائم کیا۔ اس کے طلباء اپنے مذہب سے برگشتہ ہوتے جا رہے تھے۔ متعدد انگریزی تعلیم نہ برہمن خاندان عیسائی ہو گئے۔ عیسائیت ایک نافع، عقلیت پرست، حیرت انگیز، شاندار قوم کا بڑا بقول مذہب تھا۔ نئے بنگالی مصلحین، ہندو، برہمو، عیسائی سبھی انگریز کے حامی تھے، جو اس اندھیرے میں نئی روشنی پھیلا رہا تھا۔ صرف بنگالی مسلمان جن کو انگریز نے کچل دیا تھا، اور جو اس کے باوجود اہلین کی صفوں میں شامل ہو کر اُس سے لڑے جا رہے تھے۔ انگریزی دور اور انگریزی تعلیم کے من تھے اور بنگال کا پسماندہ طبقہ بن چکے تھے۔

گنگنہ، پو، جھدرالوگ، کرانی اور بالو لوگ کی ایک نئی دنیا آباد ہو چکی تھی۔ اور انگریز بنگالی بالو کالیے رح مذاق اڑاتا تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں ایک انگریز طنز نگار نے انڈین ایمپائر کے متعلق اپنی ایک باب ”سر علی بابا کا سفر نامہ“ میں لکھا تھا۔ ”ہم بالو لازم کو ایمپائر میں کتنا ہی فروغ دیں۔ بالو کے وجود میں آنسو بہانا چاہئیں کہ بالو ایک سخت قابلِ رحم شے ہے۔ یہ بالو نئے مذہب، نئی موسیقی، آرٹ، رسائیٹنس سے خوب پیٹ کھجے جب موٹا ہو جائے گا تو ایسی دولتیں بھڑے گا کہ ہم اس کا مذاق اڑانا محو ایسے۔ اس کے پیٹ لیدر جوتے، اس کی ریشمی چھتری۔ اس کے دس ہزار ہارس پاور کے انگریزی الفاظ۔ جیسے۔ اس کی مغربی خیالات کی جنگالی۔ یہ سب ایک روز بے حد خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔

سائنس، مغربی فلسفے اور مشنریوں نے اس کے دماغ کو اتنا چکا چوند کر دیا ہے کہ اب اس کا اپنی پرانی حیثیت پر واپس جانا مشکل ہے۔“

”سر علی بابا کے سفر نامے“ کا یہ مضمون پادری بنرجی کو ایک مرتبہ ارجمند منزل میں نواب قمر الزماں چودھری نے اپنے کتب خانے کی ایک الماری میں سے نکال کر دکھلایا تھا۔

”یہ دیکھئے بنرجی بابو۔ ہمارا صاحب بہادر ہم ہندوستانیوں کا کس بے پناہ حقارت سے ذکر کرتا ہے۔“ نواب صاحب نے کہا تھا۔

ارجمند منزل —

پادری بنرجی ارجمند منزل میں سیاسی بحث مباحثے سے ہمیشہ احتراز کرتے تھے لیکن جب کبھی دہاں جاتے ڈرائنگ روم میں مسلم لیگ اور صوبائی سیاست کا تذکرہ چھڑا ملتا، اور لیورنڈ بنرجی چپکے بیٹھے سنا کرتے، ارجمند منزل ڈھاکے کی پرانی مسلم تہذیب، لہجہ و شاعری، تفسیر، راگ رنگ کے جلسوں، قدامت پرستی اور مسلم سیاست کا مرکز بنتی۔ اور پادری بنرجی کو مسلم سیاست یا ہندو سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ صدق دل سے انگریزی حکومت کے وفادار تھے۔

ارجمند منزل — یہ بھی کیا اتفاق تھا کہ ان کی قابلِ قدر لائق احترام اور نیک بخت بیوی ایشور اُن کو ارجمند منزل کے وسیلے سے ملی۔ خداوند خدا کے وسیلوں کے اسرار کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

نواب قمر الزماں چودھری ضلع فریدپور کے زمیندار تھے اور گری بالاجٹھو پادھیائے ان کے علاقے کے ایک غریب برہمن کی لڑکی بنتی لہجہ پنج برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد پندرہ سال کی عمر تک اس نے سسرال میں ہر طرح کے ظلم سہمے اور ایک رات چپکے سے فلو میں بیٹھ کر ڈھاکے بھاگ آئی اور ارجمند منزل پہنچ کر نواب قمر الزماں کی والدہ بیگم فوراً الزماں سے فریادی ہوئی۔ بڑی بیگم حاجہ نے اسے فوراً اپنی پناہ میں لیا اور کچھ عرصے تک اسے ارجمند منزل کے نانا خانے میں رکھا۔ جب نوجوان نواب زادوں نے اس میں دلچسپی لینا شروع کی تو بیگم صاحب نے سوچا کہ کلمہ پڑھا کر زمینداری کے کسی اہلکار کے ساتھ اس کا نکاح کرادیں۔ مگر تقسیم بنگال کے بعد ہندو مسلم تعلقات بید کشیدہ ہو چکے تھے اور گری بالاکے تبدیلی مذہب سے فوراً فرقہ وارانہ فساد کا خدشہ تھا۔ (گویہ بات بید دلچسپ تھی کہ عیسائی ہو جانے پر ہندو عیسائی فساد نہیں ہوتے تھے) اس موقع پر ڈھاکے کے انگریز بڑے پادری رائٹ لیورنڈ ولفورڈ براؤن کی ایم آرٹ

ابن۔ میم صاحب بیٹھے میں دو مرتبہ نواب زاد یوں کو انگریزی پڑھانے ارجمند منزل آیا کرتی تھیں۔ جڑی بیگم نے گڑی بہا
 نو میم صاحب کے ذریعہ ان کے مشن اسکول میں داخل کروادیا۔ بڑے پادری وافرڈ براؤن صاحب نے اُسے
 پتسمہ دے کر اپنی بیوی کے نام پر اس کا نام ایستھر میرین رکھا اور جب اس نے میٹرک کر لیا تو اس کی شادی پل
 یستھو بن موہن بنرجی سے کر دی۔ پل بنرجی ایستھر سے عمر میں بیس برس بڑے تھے۔ مگر ایستھر بے حد خوش تھی کیونکہ
 اسے عمر میں پہلی بار عزت اور آرام ملا تھا لہذا ایسا شریف شوہر۔

رنگ پور میں پتسمہ لینے کے بعد من موہن بنرجی ایک چوہنار مبلغ ثابت ہوئے تھے اور انھیں
 شن کی طرف سے برٹش اینڈ فنانس بانیل سوسائٹی میں ٹریننگ کے لئے لندن بھیجا گیا تھا۔ اور واپس آکر
 وہ صوبے کے مختلف دیسی پروڈسٹنٹ گرجاؤں میں کیوریٹ رہے تھے اور اب ڈھاکہ میں اس دیسی گرجا
 کے پادری تھے۔

ریورنڈ بنرجی نے کھڑکی کے شیشے میں اپنا عکس دیکھا۔ شمالی بنگال کے ایک گاؤں کا وہ سو رسالہ
 برہمن لڑکا۔ گھسا ہوا سیاہ کوٹ چٹلون پہنے، بغیر فریم کی عینک لگائے، سنجیدہ، نوجوان مبلغ۔ جو کبھی اپنی
 سائیکل پر مسلمان بستیوں کی طرف نکل جاتا تو نوٹڈے اس کے پیچھے دوڑ کر تالیاں بجاتے اور وہ یسوع
 کہ خاطر یہ سب ذلتیں سہتا۔ اور آج، ۲۰ دسمبر ۱۹۳۹ء کی رات، ڈھاکہ چرچ کا یہ بزرگ پادری
 ۔ خداوند خدا کی برکتوں کا مشکور پال میستھو بنرجی۔ راستہ طے کرتے کرتے ایک وقت
 ایسا آتا ہے، جب انسان پیچھے مڑ کر اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہے اور اپنے ماضی کو سکھ اور دکھ کے ترازو
 تولتا ہے اور کہتے لوگ ہیں، جن کے ہاں سکھ کا پلاڑ بھاری ہو؟

ریورنڈ بنرجی نے عینک اتار کر پلکوں پر انگلیاں پھیریں۔ خداوند خدا نے مجھے کیا کچھ نعمتیں
 نہیں دیں۔ ایک سعادت مند گلا۔ ایک محبت شعار بیوی۔ ایک پیاری اور فرماں بردار بیٹی۔
 انہوں نے ایک گہرا سانس لے کر دوبارہ قلم اٹھایا اور نب دوات میں ڈبو کر کرسمس کا وعظ
 لکھنا شروع کر دیا۔

پادی بنرجی کی اکلوتی لاڈلی بیٹی روزی بی کاٹج کے سنگ روم میں بیٹھی مریم کی مورتی کیسے
 نئی سی نیلی سا رنگ پر سیا لچکا ٹانگ رہی تھی۔ جو وہ کالج سے لوٹتے میں جہاں آرا کے گھسے لیتی آئی تھی کہ

ارجند منزل کے زنا خانے کی الماریوں میں سچے گوٹے لچکے کی افراط تھی۔ یوں وہ ارجند منزل بہت کم جاتی تھی۔ وہ جہاں آرا کی بڑی پکٹی سہیلی تھی۔ مگر جب سے وہ بڑی ہوئی تھی اور اس کی ایک پھوپھی نے اُسے اس کی ماں کی زندگی کی داستان سنائی تھی اُسے ارجند منزل جاتے ہوئے تھینپ سی آتی تھی۔ جہاں آرا نے کبھی اس سے اس داستان کا ذکر نہیں کیا تھا اور وضعداری کی وجہ سے کالج میں بھی اس نے ردی کی ماں کا وہ المناک پس منظر کسی کو نہیں بتایا۔ اس کے باوجود ردی کو لاٹمنوری طور پر لڑکھوں اور زمینداروں کے مسلمان معاشرے اور قدیم وحشیانہ رسوم سے جکڑے تنگ نظر ہندو سماج سے نفرت تھی۔ ساتھ ہی اسے اپنے دیسی عیسائی طبقے کی مضحکہ خیز حیثیت کا بھی خاصا احساس تھا۔ ہندو سماج نے اُس کی بھولی ماں کو تین سال کی عمر میں بیاہ کر اور پانچ سال کی عمر میں بل و دھوا بنا کر اس پر ظلم توڑے تھے۔ مسلمان زمینداروں کے لونہالوں نے یعنی خود جہاں آرا کے باپ اور چچاؤں نے اس کی بے سہارا ماں کو اپنا کھلونا بنانا چاہا تھا۔ لیکن اس کے برعکس عیسائی سوسائٹی نے اُس کی ماں کو عزت، تعلیم و تربیت اور گھر عطا کیا تھا۔ ان سارے آپس میں اُلجھے ہوئے حقائق کے باوجود بیس سلاہ حساس اور ذہین معنی بنرجی خدیا کی اور ذہنی طور پر خود کو ایک دور اپنے پر موجود پارہی تھی۔ وہ خود کو خالص ہندوستانی کلچر اور قومی سیاسی علم کے مسائل کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کا عیسائی سماج انگریز کا تخلیق کردہ تھا اور انگریز کا نمک حلال تھا۔ اور یہ باتیں وہ اپنے شفیق اور نیک طینت باپ سے کسی طرح نہ کہہ سکتی تھی۔ کسی سے نہ کہہ سکتی تھی! اور اس کی ماں استھگری بالابنرجی عیسائی ہونے کے باوجود ایک خالص بنگالی تھی جتنا گھریلو عورت تھی۔ جسے ان مسائل سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

تبدیلی مذہب کے باوجود جنوبی ہند کے عیسائیوں کی مانند بنگالی عیسائیوں پر بھی اپنے صوبے کی کلچر کا گہرا اثر باقی تھا۔ منرا استھگری کی سسرالی عورتیں بنگال کی بیشتر برہمن ماؤز و دوسری اونچی ذات کی عیسائی خواتین کی طرح مانگ میں سینہ در لگاتی تھیں اور مذہبی رسوم کے علاوہ ساری پرانی ریت و رسوم کی پابند تھیں۔ ردی اسکول کی اسٹوڈنٹس کلاس سے دیپائی سرکار کی ہم جماعت تھی۔ بڑی ہوئے پر تھپی کے گھنٹوں میں درختوں کے نیچے بیٹھ کر وہ سینئر لڑکیوں سے سیاسی گفتگو سنتی۔ تحریک آزادی کا ہر طرف چرچا تھا۔ بہت سی باتیں ابھی پتے نہیں پڑتی تھیں لیکن بنگال انقلابی تحریک کا پرانا گڑھ تھا۔ اور ان نوعمر لڑکیوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی کہ انگریز کو مارا کر بھوسہ بھر کے دیس سے نکال دو۔

برانی دہشت پسند پارٹی انوشیلین کے ہیڈ کوارٹر زبردوان ضلع سے آئی ہوئی آبائی اپنے ماں باپ سے
سنے ہوئے اور بند و گھوش اور سوامی دویکانند کے انقلابی بھائی بھوپندر دت کے قہقہے چھڑتی۔ اس صدمہ
کے مشرور میں ہندوستانی انقلابی آرگنیزنگ کے SIN FEIN روس کے سوشل ڈیموکریٹس اور میننی
کے "ینگ اٹلی" سے متاثر ہوئے تھے۔ جنہوں نے اسی زمانے میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ وہ ڈبلیو بی ایس آرگنیزنگ
— ایس جوا اپنے ملک کی آزادی کا نقیب تھا اور ساتھ ہی عارفانہ نظمیں لکھتا تھا۔ اور جو ہندوستانی
روحانیت کا مدافع تھا۔ ویرکانند - ٹیگور - ایس — وہ بھی کیا زمانے تھے۔ رومینٹک اور ولولہ
غیر اور دلکش۔ روزی ان سب باتوں کو سن کر سوچا کرتی — اور ۱۹۰۵ء کے ان انقلابیوں نے
لیفٹسٹ گورنر کو مارنے کے ارادے سے ریلوے لائن پر ایک جھوڑے تین تین بار بار دیکھا ہی تھی۔ اور علی پور
سازش شروع ہوئی تھی۔ اور سی۔ کے۔ واس نے اور بند و گھوش کا مقدمہ لڑا تھا۔ اور دوسری وقت برین گھوش
نے کہا تھا۔ ہم انگریزوں کو مار کر آزادی حاصل کرنے کے خواب نہیں دیکھ رہے۔ ہم صرف یثابت کرنا چاہتے
ہیں کہ ہم میں مارنے اور مرنے کی ہمت ہے۔ یورپ میں ہندوستانی طلباء نے انقلابی گروہ بنائے
تھے۔ سکھ کسانوں نے امریکہ اور کینیڈا میں ہند پارٹی قائم کی تھی۔ ۱۹۰۹ء میں سرگزین دلی کو جو ہندوستان
کے خلافت قانون بنارہا تھا۔ لندن میں ایک ہندوستانی طالب علم مدن لال نے گوئی کا نشانہ بن لایا تھا
اور پھانسی پر چڑھا تھا۔ دہلی میں لارڈ ہارڈنگ پر بم پھینکا گیا تھا اور چار نو جوان دار بھائی کے تھے۔
آج سے پچیس سال پہلے مغربی سامراجیوں نے آپس میں اسی طرح کی ایک بھیانک جنگ شری تھی۔ اور
اس زمانے میں ہندوستانی انقلابیوں نے برین کیٹی بنائی تھی۔ جس میں سر فحشی دلیوی کے بھائی ویریندر
چٹوپادھیائے، اور راجہ چندر پر تاب اور بھوپندر ناتھ دت اور سون سنگھ اور برکت اللہ اور چپکے من
پلے اور ایم۔ ایلمائے شامل تھے۔ بنگالی۔ پنجابی۔ مدراسی۔ ہندو۔ مسلمان۔ سکھ۔ کوئے کہتا ہے کہ ہندوستانی
قوم متحد نہیں ہو سکتی۔ ؟ اور غدار پارٹی کے اراکین امریکہ سے ہندوستان پہنچے تھے۔ اور ۲ فروری ۱۹۱۵ء
سنہ کی تاریخ مقرر ہوئی تھی اور فوجی سپاہی یو۔ پی اور پنجاب میں غدار شروع کرنے والے تھے جب کسی
میر جعفر نے پھر حکومت سے خبری کر دی۔ پھر سینکڑوں کو پھانسی لگی۔ سینکڑوں کا لے پانی گئے۔
عدم تعاون اور خلافت کی تحریک کی ناکامی کے بعد ۱۹۲۲ء میں تشدد پسند تحریک دوبارہ شروع ہوئی۔
اور پھانسی کی کوٹھڑیاں آباد ہوئیں۔ یو۔ پی میں انقلابیوں نے کاکوری میں سرکاری خزانہ لوٹا اور اشتقاق اللہ

اور اس کے ساتھی پچاسی پر چڑھے۔ آندھڑ میں اوری سینا رام راجو کے گوریلا دستے حکومت سے لڑتے پھرتے اور مارے گئے۔ مراد بھگت سنگھ نے مرکزی اسمبلی میں بم پھینکا اور کہا کہ ان کا مقصد ملک میں اشتراکی حکومت قائم کرنا ہے اور پچاسی پر چڑھے۔ ہندوستانی سوشلسٹ ری پبلکن آرمی کے کمانڈر الہ آباد میں پولیس سے لڑے اور مارے گئے۔ چانگام میں ۲۲ اپریل ۱۹۳۷ء کو کرلینڈ کے ایئر سٹنڈے کی طرح کی موٹر آرائی ہوئی اور انقلابیوں کی نئی "نوجوان ترک پارٹی" جنگا نتر نے سرکاری اسلحہ خانے پر حملہ کیا اور جنگا نتر کے لیڈر سودیہ سین اور ان کے ساتھی جلال آباد کی پہاڑیوں پر برطانوی فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے مشین گنوں سے شہید ہو گئے۔ نوجوان کلینڈات کو قید کر لیا گیا اور کالج گریجویٹ پرتیوتا، چانگام کے یورپین کلب پر مسلح حملے کی قیادت کرتی ہوئی پکڑی گئی اور پولیس نے قبضہ میں آنے سے پہلے اس نے خودکشی کر لی۔ نوجوان شانتی دیوی اور ممتی دیوی کو کومیل کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو پستول کاٹ نہ ماننے کی سزا میں کالے پانی بھیج دیا گیا۔ کمار میناداس نے بنگال کے گورنر پر گولی چلا دی۔ چند سال قبل ہی کی بات ہے کہ بنگال کے اسپیکٹر جنرل پولیس، اسپیکٹر جنرل آف پرنسز اور سیشن جج علی پور سب کو موٹ کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ضلع مدنا پور کے تین انگریز جج ایک کے بعد ایک مارے جا چکے تھے۔ یورپین ایسوسی ایشن کے پریذیڈنٹ، سٹیشن کے ایڈیٹر اور سر چارلس ہنگارٹ پر قاتلانہ حملے افسوس کہ ناکام رہے تھے۔

جنگا نتر کا ہیڈ کوارٹر چانگام کے نزدیک دھول گھاٹ میں آج بھی موجود تھا۔ سودیہ سین، یعنی ماسٹرو آج بھی بنگال کے ہیرو تھے۔ خودی رام باسوسے لے کر دیپالی کے چچا دیش چندر سرکار کے زمانے تک ملک میں پچاسیوں کے سیاہ درختوں کا کتنا بھیاں کہ جنگل کھڑکھڑا رہا تھا۔ جس کے ایک طرف کالا پانی تھا اور دوسری طرف اونچے قید خانے۔ اور یہ سارے انقلابی نوجوان بنگال کے ہیرو تھے۔ بھدرالوگ۔! متوسط ہندو بنگالی طبقے نے ایسے ایسے بہادر نوجوان پیدا کئے تھے! بھدرالوگ۔!! اور روزی سوچا کرتی کیا میں کلپنا دت۔ پرتیوتا شانتی۔ سمتی اور میناداس جیسی ہیروئن نہیں بن سکتی؟ کچھلے چند برسوں میں سارے دہشت پسند انقلابی کمیونسٹ ہو گئے تھے۔ اور اب کالج میں لڑکیاں ان نئے انقلابیوں کا تذکرہ کرتیں۔ ریحان الدین احمد اور اکٹھے مکر جی اور اودامارائے۔ لڑکیوں کے دل دماغ میں ماسٹرو کی جگہ اب ریحان الدین احمد لے چکے تھے۔

سال بھر قبل دیپالی نے بڑے مضطرب لہجے میں روزی سے کہا تھا۔ "روزی۔ سنو تو۔۔۔ کل میں ایک خفیہ اسٹڈی سرکل میں گئی تھی۔ اب کے سے تم بھی میرے ساتھ چلو۔ وہاں بہت اچھی اچھی باتیں

معلوم ہوتی ہیں۔ " روزی چپ رہی تو دیپالی نے کہا تھا۔ تلپے پایا سے کہہ دینا میرے گھر جا رہی ہو۔ کالج کی پڑھائی کرنے۔ "

آئندہ اتوار کو روزی دیپالی کے ہمراہ پرانا پٹن کے اس پڑا سرکار مکان میں گئی۔ اور چند ہفتوں بعد یہی الا تو ایلا شتر کی تحریک کی جڑی سخت حامی ہو گئی تھی۔ خود اپنے وجود کے متعلق بہت سے پریشان کن سوالوں کا جواب اُسے مل گیا تھا۔ سیدھی سی بات یہ تھی کہ برطانیہ کی اقتصادی بالادستی کی وجہ سے جب ملک میں قحط پڑتا تھا اور کساد بازاری چھاتی تھی اور بے روزگاری پھیلتی تھی تو مشنری لوگ بھوکے ننگے ہندوستانیوں کو عیسائی بناتے تھے۔ پھر اس ستمبر میں جنگ چھڑی تو اسٹڈی سرکل میں اکتے دانے روزی کو سمجھایا کہ مغربی سامراجیوں کی اس جنگ کو ہندوستان میں خادہ جنگی میں تبدیل کرنا ہمارا فرض ہے۔ تاکہ سرخ انقلاب فی الغور آسکے۔ اب ہم اس منصوبے کے حصول کے لئے کام کریں گے اور اس جنگ کے خلاف اور خادہ جنگی کے پرچار کی خاطر خفیہ طور پر لٹریچر چھاپ کر ہندوستان میں تقسیم کریں گے۔ روزی اس مجوزی خادہ جنگی کے لئے بھی بخوشی تیار ہو گئی تھی۔

ہادی منہجی کے فرشتوں کو بھی خبر تھی کہ روزی اتوار کے بعد کہاں غائب ہو جاتی ہے۔ " کہہ دو بھائی روزی تم نے شہر کے ایک محلے میں سنڈے اسکول کھولا ہے۔ " پھیلی مرتبہ اکتے نے ہنس کر اس سے کہا تھا۔

لیکن ابھی چند روز قبل وہ خفیہ اسٹڈی سرکل ٹوٹ گیا۔ ساتھیوں کے ہل میں انڈر گراؤنڈ ہو گئے۔ دیپالی بید خاموش رہنے لگی۔ اب وہ روزی کو کچھ نہ بتاتی تھی۔ شاید یہ لوگ بھڑپوری طرح بھروسہ نہیں کرتے۔ کیونکہ میرا سارا خاندان انگریزوں کا پروردہ ہے۔ دھماکا موجودہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ولیم کینٹ ویلے پایا کو بید مانتا ہے۔ مینر کینٹ ویلے بھی کبھی کبھی لٹی کالج آتی رہتی ہیں۔ میں ساتھیوں پر کبھی یہ ثابت نہیں کر سکتی کہ میں برٹش راج کی وفادار نہیں ہوں۔ شاید وہ یہی سمجھتے ہوں کہ میں ان کی مخبری کر دوں گی۔ روزی کو کچھلے روز سے اندازہ تھا کہ دیپالی کے پاس انڈر گراؤنڈ سے اہم پیغام آئے ہیں۔ مگر دیپالی نے اس سلسلے میں بالکل چپ سا دھ رکھی تھی۔

حضرت مریم کی ساری پرلچکاٹاٹانک کردار سلیمی ستائے کا منسا سالتاج بنا کر روزی ایک لمبا سانس لے کر کوچ پر سے اٹھی۔ اور مثال لیٹ کر باہر مہن میں آگئی۔ سائبان کے، اندھ ٹیلو تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ روزی در میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ کہاؤنڈ کی غریب بنگالی عیسائی عورتیں کتنی شہر و محلے مورتیاں سجا نے میں مہنک ہتھیں اندر جا کر اس نے مریم کی مودی کو کپڑے پہنائے اور تاج سر پر رکھا۔ اور نکلیت اس نے سوچا۔ اس سائبان اور ڈرگا پوجا کے پینڈال میں کیا فرق ہے ہاں غریب عورتوں کے لئے کیا مریم بھی لاشعوری طور پر ڈرگا کی مانند ایک ادیبی

نہیں؟ اور کیا ہم عیسائی لوگ بت پرستی نہیں کرتے؟ پھر ہندو کافر اور گمراہ کیوں ہیں؟ اگر خدا فاختہ کا روپ
دھار کر دنیا میں آسکتا ہے تو کچھوے اور مچھلی میں اوتا کر کیوں نہیں لے سکتا؟ مسیح بے چارے پاپا۔ ہائے
یرے پیارے بیچارے بوڑھے پاپا۔ تم نے ساری زندگی ان بے معنی بحثوں میں کیوں لڑائی کی؟ فاختہ اور
روح القدس۔!

وہ لیک ایک سید دل گرفتہ ہو کر آہستہ آہستہ قدم رکھتی گرجا گھر کی طرف بڑھی اور ہال میں جھانکنے لگی۔
ہال کے ایک کونے میں پنجابی ٹوٹی زونڈ سے گاری تھی۔

رب خداوند بادشاہ اے۔ اور جلال و آباد شاہ اے

اُچھے کرو سر جان جلال و آباد شاہ آوے۔

وہ دبے پاؤں اندر پہنچی۔ لڑھکانہ مشن کے پادری ریونڈ ہنری بسواس کا نوجوان بیٹا مسٹر لو تھر بسواس
بڑل دالے ہارونیم پر بیٹھا تندی سے حمد کی سنگت کر رہا تھا۔

”اے خداوند اپنی راہ اپنے بندے کو دکھا۔ آ۔ آ۔“ روزی کو اپنے قریب کھڑا دیکھ کر مسٹر لو تھر بسواس
برالراٹھ کھڑے ہوئے۔ کبھی منڈلی بھی چپ ہو گئی۔ چند لڑکیاں سفید شلواریں، سرخ سوئیٹر اور سفید
پٹوں میں ملبوس شہر کا کبھی بھی نہیں پڑیں۔

مسٹر لو تھر بسواس ذرا جھینپ کر مسکراتے ہوئے روزی کو دیکھنے لگے۔

یہ لوگ سب کسی دوسری دنیا کے باشندے تھے۔ روزی اخلاقاً مسکراتی۔ سوئی۔ میں نے آپ کو
کی پریکٹس کو ڈسٹرب کر دیا۔ پلیز کیری آؤن۔“

”آپ۔ آپ۔ آپ بیٹھیں ناروزی سیمٹر۔“ ایک پنجابی لڑکی نے کہا۔

”نہیں بھئی۔ مجھے ابھی بہت کام کرنا ہے۔ گڈ نائٹ۔“

مسٹر لو تھر بسواس کے سامنے مسکرا کر سر ذرا سے خم کرتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئی۔ اور دواڑے پر
پہنچ کر اس نے محسوس کیا کہ گو بھین منڈلی نے دوبارہ کانٹا شروع کر دیا تھا۔ لیکن مسٹر لو تھر بسواس کی زونڈ
نکلیں اس کا تعاقب کر رہی ہیں۔ اور وہ بے طرح شرمارہے ہیں۔

ادامی کاڈ۔ اُس نے ایک گہرا سانس لیا اور عمارت کا چکر لگا کر پادری ہنری کے دفتر کی کھڑکی
کے نیچے پہنچی اور اندر جھانک کر دیکھا۔ پاپا عینک ناک کی لوک پر رکھے میز پر جھکے ٹیپ کی روشنی میں تندی سے

دعنا لکھے میں معدود تھے۔ اے اپنے بوڑھے باپ پر بے اختیار پیارا گیا۔ خدایا ان کو زندہ رکھ۔ خدایا ان کو میرے سر پر زندہ سلامت رکھ۔ اس نے دعا مانگی! دروازے کی طرف جا کر چپکے سے کمرے میں داخل ہو گئی۔

قلم سرعت سے چل رہا تھا۔ سر۔ سر۔ سر۔

روزی کمرے کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ اور جھانک کر پڑھنا چاہا۔ اور دل میں مسکرائی۔ گڈ اولڈ پاپا۔ پاپا اور اُن کے سالانہ کرسمس سرمن۔

”کفارے کی نسبت جو ہمارے خداوند یسوع نے اے لوگوں! تمہارے لئے کیا۔ اُس نے جان کھوئی کہ تم اس کو دوبارہ حاصل کرو۔ گہووں کا دانا جو مرنے کے بعد۔“ قلم کی رفتار تیز ہو گئی۔ ”وہ جو مسیح پر ایمان لائے۔ خداوند تیری برکت تیرے بندوں پر ہے۔ وہ روح القدس میں غوطہ دلائے جاویں گے کہ وہ جو ہمارے لئے مٹوا اور بدخون ہوا۔ اور جی اسنا اور وہ خداوند خدا کا اکلوتا بیٹا جو ہماری تمہاری بنیاد پر صلیب پر لٹک گیا۔ اس کا مبارک یوم ولادت منانے ہم آج جمع ہوتے ہیں اور اس خداوند خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم اس ملک میں امن و امان کی حکومت کے زیر سایہ۔“

”دیدنی۔“ کھڑکی کے نیچے سے کپاؤنڈ کے ایک بچے نے اُسے آہستہ سے پکارا۔ وہ سرعت سے باہر نکلی۔ بچے نے اس سے کہا۔ ”بھانگ پر یہ بڑی کالی موٹر کھڑی ہے۔ اس میں دیپالی دیدنی بیٹھی ہیں۔ آپ کو جگہ رہی ہیں۔ ایک دم جلدی۔“

”دیپالی موٹر میں بیٹھی ہے؟“ روزنی نے حیرت سے دُہرایا اور چاروں طرف نظر ڈال کر تیزی سے بھاگی۔

اومارائے کی موٹر اندھیرے رنگ کے نیچے کھڑی تھی۔

”روزنی۔ تمہارے ہاں تو بڑا ہنگامہ ہے۔“ دیپالی سرکار نے کار کی کھڑکی میں سے جھانک کر گھبراتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ مکرمت کرو۔ کیا بات ہے؟“

”بے حد میریس۔ تم کب سے میرے گھر پہنچ جاؤ۔ وقت بالکل نہیں ہے اور بالکل خاموش رہو۔ ٹوپ سیکرٹ۔ گڈ نائٹ۔“ دیپالی نے سرگوشی میں جواب دیا۔ کار زن سے آگے چلی گئی۔

روزنی چپ چاپ اور متعجب بھانگ کے اندر دھپیں آتی ہو کر نکلیں کو پیروں سے ٹکراتے ٹکراتے

پلی کالج کی صحت روانہ ہو گئی۔ سامنے گرجا گھر میں سے پنجابی ٹولی کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

اے خداوند میرا دل اک پاسے کر۔ تاں میں رکھاں تیرا ڈر۔

اور اب تو کھربسواس کی بھاری آواز حمد میں شامل ہوئی۔ ہارمونیم زور زور سے بجنے لگا۔
تسے گاؤ تسنا۔۔۔ گاؤ۔۔۔ تسنا تسے رب دی۔۔۔ سیمیاں دی ٹولی وچ دل نال گاواں۔۔۔ تسنا سناواں
رب دی۔۔۔ رب خداوند بادشاہ لے۔ او جلالی رابا دشاہ لے۔ اے خداوند اپنی راہ اپنے بندوں نوں
دیکھا۔۔۔ آ۔۔۔ آ۔۔۔ آ۔۔۔

۷

نیا عہد نامہ

چندر کج کے کوٹھے والے سانبان میں کھڑی دیپالی سہارا صبح کے ناشتہ کے بعد سے روزی کا انتظار کر رہی تھی۔ دھڑسٹک کے موڑ پر روزی کی سائیکل آتے دیکھ کر وہ تیزی سے نیچے اتری اور میٹھا خانے کا اندازہ لگھوٹا۔ جوں ہی روزی اندر آئی دیپالی نے اسے اپنے کمرے میں لے جا کر جھٹ پٹ دروازہ بند کیا اور چٹنی لگادی۔ اور بڑے ڈرامائی انداز سے الماری پر سے بائبل اتار کر (جو ایک مرتبہ پارٹی پر سب نے اسے دی تھی) روزی کے ہاتھ میں ٹھونس دی۔

”آنکھیں بند کرو روزی۔“

حیران و پریشان روزی نے آنکھیں بند کیں۔

”کہو۔۔۔ ملک و قوم کی خاطر حلف اٹھاتی ہوں۔ گوڈی فار۔ گوڈی سن اور گوڈی

ہولی گھوسٹ کے نام پر۔“

روزی نے ایک آنکھ کھولی۔ ”مس پیڈلے نے پرسوں ہی بتلایا ہے کہ صحیح تلفظ گھوسٹ

نہیں گوسٹ ہے۔“

”اچھا۔ اچھا۔ ہولی گوسٹ کے نام پر۔ چلو۔ بوہو تو۔“

روزی نے دونوں آنکھیں کھولی لیں اور ہلکے ہلکے کہیں۔ ”دیپالی۔ میرے پاپا پر تو کوئی آفت نہیں

آئے گی؟ وہ بہت بوڑھے ہیں۔“

دیپالی چپ ہو گئی۔ اسے بھی کچھ معلوم نہ تھا۔ ”یہ۔ میں مستقبل کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ روزی۔ مگر۔ مگر تم سچی ہندوستانی ہو کہ نہیں۔“ اس نے لمحہ بھر کے بعد کہا۔

”ہاں۔“ (میں کالمین نیٹو کر سچیں سچی ہندوستانی ہوں۔ اس نے دل میں تلخی سے کہا۔ پھر اس نے فوراً اپنے آپ کو ڈانٹا۔ اس خود رجمی کی کیا ضرورت ہے۔ تحریک آزادی میں ان گنت عیسائی شامل ہیں۔ ایک سے ایک بڑے محبت وطن۔ حب وطن کیا کسی ایک ہی فرقے کی میراث ہے؟ اس واقعے میں دیپالی سانس روکے توقع نظروں سے روزی کو دیکھ جا رہی تھی۔ اگر اس نے انکار کر دیا تو۔؟ تو کیا ہوگا۔؟ دیپالی کو محسوس ہوا جیسے ہندوستان کا سارا مستقبل اس وقت محض روزی بنرجی کے ہاں یا کرنے پر منحصر ہے۔ دیپالی کو کپکپی سی محسوس ہوئی۔ اتنے میں روزی نے فرش پر دوڑنا بیٹھ کر زیرب حلف ڈھرایا اور بائبل سر اور آنکھوں سے لگا کر کہا۔ ”سو ہیپ می گوڈ۔“

دیپالی اطمینان کا گہرا سانس لے کر اپنے بنگ پر جا بیٹھی۔

”روزی۔ ادھر آؤ۔“ اب گویا وہ گرو یا لیڈر تھی۔ روزی اس کی جیسی تھی۔ ”غور سے سنو روزی بیپالی کی آواز میں حکم آگیا تھا۔ اومارائے کی طرح اقتدار اور احساس ذمہ داری انسان کو پل کی پل میں بدل دیتی ہے۔“

”روزی۔ ڈی ایم کے بنگلے پر تمہارے کپاؤنڈ کا کوئی آدمی ملازم ہے۔ تم نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا؟“

”سنرکنیٹ ویل کی آیا ہمارے ہاں کی عورت ہے۔ لیسا۔۔۔ مجی نے ہی اسے وہاں رکھوایا تھا۔“

”کہاں کی رہنے والی ہے؟“

”پالا تو مجی نے اسے کپاؤنڈ میں ہے۔ مگر اس کی نانی نرسنگھ دی میں رہتی ہے۔“

دیپالی چند لمحوں تک سوچا کی۔ پھر پوسٹ کارڈ اور قلم نکال کر روزی سے کہا۔

”یہ اس کی نانی کی طرف سے تمہاری ممتی کو خط لکھ رہی ہوں۔ نانی بہت سخت بیمار ہے۔ لہذا

دیپالی ایک ہفتے کے لئے فوراً نرسنگھ دی پہنچے۔ ان کو کوئی نہ سگھڑیں ہائے گا اور یہ کارڈ وہاں ڈاک میں

لے دے گا۔ اچھا ٹھہرو۔ جونت جید قابل اخبار ہے۔“

”تم دیپالی جونت کو برسوں سے دیکھ رہی ہو۔“

”اچھا۔ جوزف ایک لغائفہ لے کر لیلا کے نام ڈی۔ ایمرٹاؤس جائے گا اور اس سے کہے گا کہ گاؤں سے آدمی یہ چھٹی لایا ہے۔“ وہی نانی کی بیماری والی۔ اور کہے گا کہ ہفتے بھر کی عیوضی کا انتظام بھی کرتا آیا ہے۔ یہ لیلا جو ہے تمہاری۔ یہ میم صاحب سے چھٹی مانگے گی۔ میم صاحب کیسی آدمی ہیں؟“

”اچھی خاصی ہیں۔ مثلاً عورت ہیں۔“ روزی نے جواب دیا۔ مگر انھیں سی محسوس ہوئی۔ میں سرکلنٹ بنی سے واقف ہوں۔ ان سے ملتی رہتی ہوں۔ اور اب ان کو دھوکا دینے جا رہی ہوں۔ ”اچھی خاصی ہیں۔“

س نے دہرایا۔

”اُس کے بعد شام کو ایک برقعہ والی ملازمہ کلثوم بی بی ڈی ایمرٹاؤس پہنچ جائے گی۔ لیلا کی عیوضی۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ خط لے کر تم جاؤ اور لیلا کو چھٹی دلادو اور بعد میں کلثوم بی بی کو سپنا دو۔ تو منٹوں میں کام بن جائے گا۔ مگر پھر خیال آیا کہ تم کو مصیبت میں رڈالوں۔“

”کیوں۔؟ روزی نے غصے سے پوچھا۔ ”پھر حلف کس لئے اٹھوایا ہے؟“

”تم خود چلی جاؤ گی؟“

”اف کدس۔“

”ادہ۔ دینڈر فل۔ روزی۔“ ”دیپالی خوشی سے اچھل پڑی۔

”مگر دیپالی۔ یہ سب کس لئے۔؟ تم سرکلنٹ دیں پریم تو نہیں پھینکو گی؟“

”روزی۔ تم کو پتہ ہے، ہم لوگ ہم نہیں پھینکتے۔“

”ہم لوگ۔“ ”دیپالی نے بڑی بے نیازی سے کہا۔ اور روزی مرعوب ہوئی۔ مگر اچانک اس نے کہا۔

”ایک بڑا سخت ٹوپہ ہول ہے تمہاری اسکیم میں۔ پوچھو کیا۔؟ لیلا ایک ہفتے کے لئے کہاں جائے گی؟ خط تو فرغی ہے۔“

”اس کا انتظام بھی کر لیا گیا ہے۔ فکر مت کرو۔ یہ بہت معمولی بات ہے۔ اچھا۔ روزی۔ آج ہے

ہوتا۔“ ”۲۴ دسمبر سے پہلے کلثوم بی بی کا ڈی۔ ایمرٹاؤس میں پہنچ جانا لازمی ہے۔“

”مگر کیوں آخر۔؟“

”یہ تمہیں نہیں بتایا جاسکتا۔“

”کیوں؟“

”روزی بھرجی۔ تم نے اندر گراؤ میں کام کرنے کے لئے حلف اٹھایا ہے نا۔ اب زبان بند رکھئے اور والہ کرنے کی عادت ڈالو۔“

”تم تو واقعی ڈکٹیٹر بن گئیں۔ روزی نے منہ لٹکا کر کہا۔

دیپالی بچوں کی سی کھائی میں یلپاتی آیا کی نانی کی طرف سے مسز ایسٹھرن بھرجی کو پوسٹ کارڈ لکھنے میں مصروف ہو گئی۔

۲۴ دسمبر کی صبح روزی اپنی کالج کے برآمدے میں بیٹھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور لاٹ پادری کے ہاں سے نئے ہوئے کھلونوں اور گرم کپڑوں کے پارسل بنانے میں مصروف تھی جو کیاؤنڈ کے یتیم بچوں میں تقسیم کئے جانے والے تھے۔ اُسی وقت ڈاک نے ایک پوسٹ کارڈ لاکر دیا۔ پڑھ کر روزی نے اپنی والدہ کو آواز دی، جو کانفرنس کے مندوبوں کی صبح کی چائے کے انتظام میں سرگوداں بھر رہی تھیں۔

”ممتی — بے چاری یلپاتی کی نانی کا خط آیا ہے۔ بڑی سخت بیمار ہے۔“

”ارے کیا ہوا؟“ مسز ایسٹھرن بھرجی نے پوچھا۔

”یہ نہیں لکھا۔ یہ دہاتی لوگ تو صرف ایک ہی بات جانتے ہیں۔ پران بکھنے والے ہیں فوراً پہنچو۔“

”خدا باب رحم کرے“ ایسٹھرن بھرجی نے کہا۔ ”روزی تم خود جا کر مسز کینٹ ویل کو خط دکھاؤ۔ روزی نے

شاید جھپٹی نہ دیں۔ یلپا مجھ سے کئی بار کہہ چکی ہے کہ گاؤں جانا چاہتی ہے۔ مگر میم صاحب ابھی جھپٹی نہیں دے رہی ہیں۔“

”کیوں؟ اُن کے ہاں آیا کا کام ہی کیسے ہے؟“

”نہیں، مگر اُن کے ہاں بھان آنے والے ہیں۔ پرسوں چیرٹی بازلر کے لئے آئی نہیں تھیں تو مجھے

رہی تھیں۔“

”کون بھان آنے والے ہیں۔ مانا؟“

”مجھے کیا معلوم۔ مسز کینٹ ویل سے میری اتنی بے تکلفی نہیں ہے کہ مجھے تفصیلات بتائیں۔ ہوں

لے کوئی۔“

روزنی نے پارسل کٹ کر کے اندر سنگ روم میں کرسمس ٹری کے پاس رکھ دیئے۔ چند لمحوں کے لئے چپ کھڑی رہی۔ پھر غیر ارادی طور سے عیسیٰؑ کی تصویر پر نظر ڈالی، جو آئینہ دار کے اوپر لگی تھی (کرسمس کی ایک دیوار پر شپ بہر کی تصویر بھی آویزاں تھی) باہر آکر اس نے سائیکل بھالی اور رمانا کی سمت روانہ ہو گئی۔

۸

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا بنگلہ

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پُر فضا بنگلے کا وسیع باغ موسم سرما کے روشن پھولوں سے جگمگا رہا تھا۔ بنگلے کے اندر چھوٹا حاضری کے بعد ملازمین بڑے دن کی تیاریوں میں سرگرمی سے مصروف ہو چکے تھے۔ روزنی بنجی نے سائیکل ایک گلی آہر کے نیچے کھڑی کی اور برآمدے میں جا کر ڈرائنگ روم کے درپچے سے اندر بھاگتا۔ بیرو گول میز کی جھاڑ پونچھ کرنا نظر آیا۔ روزنی نے ذرا ڈرتے ڈرتے درپچے پر دستک دی۔ غفور بیرو روزنی مس صاحب کو پہچانتا تھا۔ اُس نے باہر آکر کہیں تکل دیں۔ مگر جھک کر سلام نہیں کیا کہ بڑے صاحب کا بیرو تھا۔

”میم صاحب ہیں؟“ روزنی نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔ اس کا خلق سوکھ رہا تھا۔

”اندر ہیں۔“

”اور صاحب۔؟“

”صاحب کچھ ہی جانے والا ہے۔“

اندر سے بوٹوں کی چاپ اور ہلکی سی سیٹی کی آواز آئی۔ اور کسی نے پکارا۔ ”ڈرائنگ۔“

”یس ڈیر۔“ یہ مسز کینٹ ویل کی آواز تھی۔

بجلی کے کوندے کی طرح روزنی کو خیال آیا کہ واپس چلی جائے۔ وہ کس زبردست حماقت میں پھنس گئی تھی۔ قوم پرستی وغیرہ بالکل ٹھیک ہے۔ مگر یہ خطرناک سازشیں — وہ ایک دم سمجھے ہوئی۔

کراتے میں فریڈا کینٹ ویل کتے کو آواز دیتی خود ہی باہر نکل آئیں۔

”گڈ مارننگ مسز کینٹ ویل۔“

”گڈ مارنگ۔ گڈ مارنگ۔ ہاؤ آر یو روزی۔؟“
 ”فائن۔ تھینک یو۔ مسز کینٹ ویل۔ ہاؤ آر ڈسکی۔؟“
 ڈسکی کتا تھا۔ جو بھاگت ہوا برآمدے میں آیا۔

”یس روزی۔۔؟“ مسز کینٹ ویل نے سوالیہ انداز سے اسے دیکھا۔ انہوں نے اسے بیٹھنے کے لئے نہیں کہا۔ اُسے ڈرائنگ روم میں نہیں لے گئیں۔ وہ اس سے اس طرح مخاطب تھیں۔ جس طرح ڈاکٹر پھری والے یا اخبار فروش سے کھڑے کھڑے بات کی جاتی ہے۔
 ”ہاؤ از دی اولڈ پاردرے۔؟“ فریڈ اکیٹ ویل نے جھک کر ڈسکی کو گود میں اٹھاتے ہوئے دیا
 کیا۔ ”تم کسی خاص کام سے آئی ہو۔؟“

میں۔ روزی شریلا نجر۔ ریلوینڈ پل تھو۔ نجر جی کی بیٹی۔ انسان۔ محض ایک حقیر ہندوستانی ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ حقیر ہندوستانی جہاں آ رہی ہے۔ مگر خواب قمر الزماں چودہری اور پیرسٹر پری تو ش رائے اعلیٰ طبقہ کے افراد ہیں اور ڈی۔ ایم سے برابری سے ملتے ہیں۔ جہاں آ رہی ہیں اور امارائے کو فریڈ اکیٹ ویل اپنے ہاں ڈر پر بلاتی ہیں اور ان کے گھر جا کر ڈر رکھاتی ہیں۔ اور میں محض ان کے پروردہ بیٹے باری کی لڑکی ہوں۔

چند سیکنڈ قبل روزی نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ یہ کہہ کر کہ انھیں ”میری کرسمس“ پیش کرنے آئی تھی۔ واپس بھاگ جائے گی۔ جہنم میں جائے انڈر گراؤنڈ۔ مگر اب اس نے یکجہت سہرا اٹھا کر پڑے دھڑکے سے آہیں بواب دیا۔ ”جی ہاں ایک ضروری کام ہے۔ بڑی خود اعتمادی کے ساتھ اس نے پوسٹ کارڈ سوئیٹ کی جیب سے نکالا اور بولی۔ ”لیلا بتی کی نانی کا کارڈ مالکے پاس آیا ہے۔ وہ بوڑھی عورت بہت سخت بیمار ہے۔“
 ”اوہ۔ ڈیم۔ عبدالغفور۔ آیا کو بلاؤ۔“ فریڈ اکیٹ ویل نے کہا اور شملٹی شملٹی جا لڑکھوں کے پاس کھڑی ہو گئیں۔

آیا باہر آئی۔ روزی نے اسے بنگالی میں نانی کی خبر سنائی۔ اور پوسٹ کارڈ اس کے ہاتھ میں دے کر چاری عورت کانگ فٹ ہو گیا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”گھبرانے کا باٹ نہیں آیا۔“ فریڈ اکیٹ ویل نے مڑ کر کہا۔ ”جیاستی بیار ہوتا تو بیٹی گرام باراگریٹ مدر۔ ڈونٹ یو تھنک سوروزی؟“

”ہم کو جیسی دے گا میم صاحب۔“ لیلانے کہا۔

”جاؤ۔ مگر عیوضی کا انتظام پہلے کرنا انگلتا۔“ مگر یہ بات باندھے پیچھے کھڑے عبد الغفور نے

سہ دیا۔ ظاہر تھا کہ عبد الغفور میم صاحب کے منہ چڑھے ملازم ہیں۔

”عیوضی۔“ اداں۔ مس صاحب۔ ادھر کیا ڈنڈیں ڈیری یا موٹیلابھی ہیں گی؟“

لیلانے گہرا کر پوچھا۔

”ادھر نیلے پر ٹرینڈ آیا انگلتا مس صاحب۔ عیوضی میں۔“ عبد الغفور نے رضی سے کہا۔

کینٹ ویل معاملہ عبد الغفور پر چھوڑ کر مالی کو بیانات دینے کے لئے برآمدے کے دوسرے سرے پر چلی گئی۔
آدیزیل گیلے کے نیچے کھڑی لئے کھڑا کچھ سطر سطر کر رہا تھا۔

رضی ان کے پیچھے پیچھے گئی۔ ”سٹر کینٹ ویل۔“ لیلانے لیلانے کو اپنی اولاد کی طرح پالا ہے

اس لئے ان کو اس کی بڑی شکر ہے۔ ابھی یہ کارڈ آیا تو ماکو بھی عیوضی کا خیال آیا تھا ہمارے دروازے
کی بھانجی آیا کا کام جانتی ہے۔ اگر آپ کہیں تو بھیج دوں۔“

فریڈ اکیٹ ویل روزی کی طرف حریں۔ یہ نازک ترین لمحہ تھا۔

”درزی کی بھانجی۔“ کون سادرزی۔ ہمارا حسن علی؟“ انہوں نے پوچھا ظاہر تھا

مگر فریڈ اکیٹ ویل ایک خالص گھریلو بی بی یعنی ماؤس وائف تھیں اور درزیوں اور نوکروں کے
سلسلے سے انھیں گہری دلچسپی تھی۔

اب روزی بڑھرائی۔ ”جی نہیں۔“ مشن کا ایک پرانا درزی تھا۔ کریم اللہ۔ وہ اب چلا

گیا ہے۔ اس کی بھانجی کلثوم کچھ روز جوئے ماما کے پاس کام کی تلاش میں آئی تھی۔ انگریزی نہیں

جانتی، مگر بڑی ایماندار لڑکی ہے۔ بیوہ ہے۔“ لاشعوری طور پر روزی نے اپنی ماں کی کہانی دہرا

”اگر تم اُس کی ذمہ داری لیتی ہو تو بھیج دو۔ میرے کمروں میں سارا سامان کھلا پڑا رہتا ہے۔ یہاں کے

بکس تک کھلے رہتے ہیں۔ ہمیں اپنے نوکروں پر اتنا بھروسہ ہے۔“

”اچھا۔ لیلانے جو زف کے ساتھ کلثوم کو بھیج دیں گی۔ تم اسے سارا کام سمجھا دینا۔“ روزی

نے آیا کو مخاطب کیا۔

”اچھا۔ روزی بابا۔ گاڈ بلیس یو روزی بابا۔“ لیلانے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

فریڈا کینٹ ویل اب میڑھیاں اتر کر کرستھم کی ایک کیاری کا معائنہ کر رہی تھیں۔ روزی
 ن کو "بانی" کہا اور سائیکل پر بیٹھ کر فرارے سے باہر نکلی۔
 جب وہ سڑک پر پہنچی تو پسینہ پسینہ ہو رہی تھی
 اُس وقت صبح کے گیارہ بجے تھے۔

چندر کنج جاکر دیپالی کو تفصیل بتانے کے بعد روزی کپاؤنڈ واپس آگئی اور اس کے جانے کے
 یک گھنٹہ بعد اومارائے کی کار چندر کنج کے پھانگ پر آکر رکی۔ اومارائے شال پیٹے نیچے اتریں۔ وہ
 سب معمول بہت مضحل نظر آرہی تھیں۔

ڈاکٹر سرکار برآمدے میں کھڑے اخبار پڑھ رہے تھے۔ اجنبی ہمان خاتون کو دیکھ کر ذرا
 ہراسے گئے اور نمسکار کیا۔ اومارائے نے مسکرا کر سلام کا جواب دیا۔ اور اپنا تعارف کرایا۔
 ڈاکٹر سرکار ان کو بیٹھک خانے میں لے آئے۔ دیپالی کو اوٹ کے پیچھے سے جھانک رہی تھی۔
 مانے آواز دی۔

"دیپالی۔"

"جی اومادی۔"

"وہ جو مضمون میں نے تم کو لکھنے کو دیا تھا۔ کچھ کامیابی ہوئی۔؟"

"جی اومادی۔ پوری کامیابی۔"

"گڈ۔" اومارائے نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر وہ ڈاکٹر سرکار سے مخاطب ہو گئیں اور کچھ
 بیک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد بولیں۔ "بنوئے بابو۔ میں آپ کے پاس ایک درخواست لے کر
 آئی تھی۔ دراصل۔"

"کہئے۔"

"میں ہفتہ بھر کے لئے کو میلا میں اپنے گاؤں جا رہی ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو دیپالی کو اپنے
 تھلے جاؤں۔ اس کا کالج بند ہوا ہے۔ ذرا یہ بھی سیر تفریح کر لے بے چاری۔"

ڈاکٹر سرکار چپ ہو گئے۔ مگر اپنی قدامت پسندی کے باوجود وہ ایسی اعلیٰ خاندان اور بلند سیرت

خاتون سے انکار کر سکتے تھے۔ انھیں یہ بھی احساس تھا کہ تلکدستی کی وجہ سے وہ دیپالی کو کسی قسم کی ہیر تفریح نہیں کرا پاتے۔

اب تینوں لڑکے اندر آچکے تھے۔ اور کان لگا کر مکالمہ سن رہے تھے۔
”ہم بھی چلیں گے۔“ چھوٹے دونوں نے شور مچایا۔

”تمہارا میچ ہے۔ کیسے جاؤ گے؟“ دیپالی نے اندر سے نکل کر ڈانٹا۔
”تو گویا پردگرم پہلے سے بن چکا ہے۔“ ڈاکٹر سرکار نے کہا۔

”پرسوں نرسوں اومادی نے ذکر کیا تھا۔“ دیپالی نے ذرا گھبرا کر جواب دیا۔ ”میں چلی جاؤں بابا؟“
”جاؤ۔ ہواؤ۔ کیا آج ہی جا رہی ہو؟“

”جی ہاں۔ رات کے اسٹیمر سے داؤد کندی پہنچنے کا ارادہ ہے۔ اچھا۔ دیپالی۔ تم تھوڑا سا سامان باندھ لو۔ میں قمر پور کو کار بھیج دوں گی۔“ اومانی نے کہا اور ڈاکٹر سرکار سے باتوں میں مصروف ہو گئیں۔

دیپالی نے اچانک اپنے باپ پر نظر ڈالی۔ بابا بدلتوں بعد، خلاف معمول ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ اتنی آسانی سے اجازت دیدی! بابا۔! تم پر اومادی کا جادو چل گیا!

کوسٹیا کی رہنے والی ہیں۔ ضرور کوئی مترجماتی ہوں ہوگی۔ مہارے کامیڈ ان کی غیر حاضری میں بھی ان کا وظیفہ پڑھتے تھے۔ اب دیکھو کس طرح بابا کو منتوں کے اندر شیشے میں اتار رہا۔ بے چارے

بابا۔ اس نے تاسف سے پوچھا۔ اومادی کی زندگی میں سیاست کے علاوہ اور کسی بات کی گنجائش بھی ہوگی؟ اُس نے سر اٹھا کر اپنی ماں کی تصویر کو دیکھا، جس کے نیچے اومارائے کرسی پر بیٹھی ڈاکٹر سرکار سے

مخاطب تھیں اور بار بار حسب عادت عینک اتار کر آنکھیں جھپک کر ڈاکٹر سرکار کو دیکھتی تھیں اور بھر عینک پلو سے صاف کر کے لگا لیتی تھیں۔ اومادی کی آنکھیں بڑی بڑی اور ترنگیں تھیں۔ کاش بابا اور اومادی

دی۔ لیکن کوئی ٹنگ نہیں ہے۔ اومادی بڑی سخت دل معلوم ہوتی ہیں۔ حالانکہ اتنی نرم دل بھی ہیں۔ اومارائے کے جانے کے بعد اپنے کمرے میں لپٹی کیس پیک کرتے ہوئے وہ دیر تک یہی سب سوچنے

میں ایسی کھوئی رہی کہ آنے والے دنوں کے خطرے اور نزاکت کا خیال بھی اس کے دل میں نہ آیا۔ ٹھیک ساڑھے تین بجے اومارائے کی کار آگئی۔ دیپالی درری کا چھوٹا سا بستر اور لپٹی کیس اٹھائے

چند رکج سے نکلی اور کار میں جا بیٹھی۔

کلتوم آیا

سارے چار بچے شام مشن کمپاؤنڈ کا بوڑھا اور معتبر چوکیدار جو ذلت اپنے ہمراہ کلتوم آیا کو لے ڈی ایمر ہاؤس پہنچا۔ میم صاحب ابھی سو رہی تھیں۔ صاحب کچہری سے نہیں آیا تھا۔ لیلا بتی سامان سے زائن گنج جانے کے لئے تیار بیٹھی تھی۔ اُس نے کلتوم بی بی کو اندر بلایا۔ اور کام سمجھانے میں مصروف تھی۔ کوٹھی کے سامنے کمرے دکھائے اور اس کے فرائض سے روشناس کیا۔

”شام کے ٹیم“ لیلا بتی اپنا انگوٹھا اٹھا کر منہ تک لے گئی۔ ”صاحب، میم صاحب دھت ہو تا ہے۔ اس کے بعد چھٹی۔ میم صاحب رات کو کپڑا خود بدلی کرتا ہے۔ بچہ کوئی ہے نہیں۔ صاحب، صاحب دونوں بہت شریف آدمی ہے۔ تم خوش رہے گا۔ ہفتہ دس روز کا تو بات ہے۔“ لیلا اسے بے برآمدے کے سرے پر اپنی کوٹھری میں لے گئی۔ کلتوم نے اپنا اچھی کیس چار پائی کے نیچے سرکا دیا۔ کوٹھری، سر کے تیل کی عجیب سی بو لسی تھی۔ اُسے اُبکانی سی آئی۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔

شام کی چائے کے وقت میم صاحب نے طلبی کی۔ لیلا اسے اپنے ساتھ لے کر گئی۔ صاحب صاحب لان پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ کلتوم نے جھک کر سلام کیا۔

”پہلے کہیں کام کیا ہے؟“ میم صاحب نے انٹرویو شروع کیا۔

”کلکتے میں میم صاحب۔“

”کہہ کر رہنے والا ہے؟“

”میں سگھ۔ ادھر لال باغ میں ہمارا ماموں ہے۔ اس کے پاس رہتا ہے۔“

”ہل۔ پادرے کی لڑکی نے یہ آیا بھی ہے۔ آئی تھنک شی دل ڈو۔“ منز کینٹ دیل نے

بہر کو مخاطب کیا۔

ولیم کینٹ دیل نے بے پرواہی سے سرخم کیا اور اسٹیشن میں پڑھنے میں مصروف رہے۔

مٹوم بی بی نے اپنی مستعدی اور خدمت گزاروں سے فریڈا کینٹ ویل کو مٹوں میں رام کر لیا اور فریڈا کینٹ ویل کو خاصی سیدھی تھیں۔ فوراً اس کے آگے لیلابتی کی شکایتیں کرنے لگیں۔ کاہل اور کام چور ہے۔ دن بھر سوئی ہے۔ یاد دے کی بیوی کی سفارش پر اتنے دلوں سے رکھا ہوا ہے۔ اگر وہ گاؤں سے واپس نہ آئے تو تم ہمیں رہنا کھل ستم۔

کلثوم نے اقرار میں سر ہلایا۔ اور میم صاحب کے پاؤں دبا دی رہی۔

وہ پردے کی وجہ سے شاگرد پیشے کی طرف بالکل نہیں گئی۔ بوڑھے عبدالغفور میاں ہم مذہبی کے ناطے اس کے متعلق خاصی دلچسپی لے رہے تھے۔ اُن کا بڑا لڑکا نواب پورے میں سائیکلوں کی دوکان پر نوک تھا۔ مگر آوارہ ہوتا جا رہا تھا۔ عبدالغفور چاہتے تھے کوئی نیک بے زبان لڑکی ملے تو دو بول پڑھادیں چنانچہ کلثوم کے گھر کے حالات اور اس کی بیوگی کی المناک داستان سن کر انھیں اس سے اور زیادہ ہمدردی ہو گئی اور وہ اس کی خاطر مدارات میں لگے رہے۔

”کرسمس ایو“ کی وجہ سے وہ شام ہی مصروف اور منہنگام خیر گزری۔ کلثوم رات گئے تک کام میں لگی رہی۔ دوسری صبح بڑا دن تھا سویرے ہی سے سامنے کا برآمدہ ڈالینوں سے بھر گیا۔ اور سلام کے لئے آنے والے ہندوستانیوں کا تانتا بندھ گیا۔ شام کو صاحب لوگ آئے۔ وہ دن بھی مصروف گزرا۔ تیسرے روز کلکتے سے مہمان آنے والے تھے۔ عبدالغفور بڑے دن اور مہمانوں کی آمد کی وجہ سے کام کی زیادتی کا شکوہ کرتے ہوئے بڑبڑا رہے تھے تو کلثوم نے ان سے کہا۔ ”چچا لاؤ جھاڑ پونچھ میں کئے دیتی ہوں۔ اتنے میں تم کٹلری صاف کروالو۔“ بنگلے پر ان گنت طازم تھے۔ مگر گول کمرے صاحب اور میم صاحب کے کمرے اور کھانے کے کمرے کی صفائی عبدالغفور خود کرتے تھے جھاڑن کندھے پر ڈال کر عبدالغفور پیچھے پر ہاتھ رکھے جھکے جھکے پیٹری کی طرف چلے گئے۔ پیچھے واپس آکر انہوں نے کلثوم سے کہا۔ ”سب چیز سبست اچھی طرح جھاڑنا۔ میم صاحب گرد کا ایک ذرہ بھی دیکھ لیں تو مار ڈالیں گی۔“

میم صاحب صبح کے ٹیم ملنے ملانے باہر جا چکی تھیں۔ کلثوم ڈرائنگ روم کی صفائی کرنے کے بعد سب سے پہلے صاحب کے دفتر کے کمرے میں گئی۔ جس کے سب دروازے اندر سے بند تھے۔ اس نے صاحب کی میز کے کاغذات سنوارے، فائیل سلیقے سے رکھے۔ ایک آدھ دروازہ کھلی پڑی تھی اُن

بھی ٹھیک کر دیا۔ اور آدھ پون گھنٹے تک کمرے کی جھاڑ پونچھ میں مصروف رہی۔
میم صاحب کی واپسی سے ذرا قبل وہ ان کے ڈرلینگ روم میں آکر ان کے کپڑوں پر استری کرنے
میں مشغول ہو گئی۔

ہمان کلکتے سے رات کو پہنچے۔ اس وقت کلثوم اپنی کوٹھری میں جا کر سو چکی تھی۔
بریک فاسٹ کی میز پر اس نے سٹر گلبرٹ پلومر انسپکٹر جنرل پولس اور ان کی میم کی جھلک دیکھی۔ مگر
ڈائٹنگ روم میں اس کا کوئی کام نہ تھا۔ ناشتے کے بعد میم صاحب نے اس سے کہا کہ مسز پلومر کے پاس
بٹائے۔

چنانچہ وہ گیسٹ روم میں پہنچی اور جھک کر سلام کیا۔ مسز پلومر ادھیڑ عمر کی خوش مزاج خاتون
تھیں۔ انہوں نے اپنے کپڑے نکال کر کرسی پر رکھے۔ سٹر پلومر کا ردی ابھی کمرے میں نہ آیا تھا۔ کلثوم نے
بھوبی کو بلایا۔ سفر کے کپڑے دھوبی کو دینے کے لئے مسز پلومر نے گنگنائے گنگنائے سارا سامان تلبٹ
رہا۔ بہت سے سرکاری کاغذات تہہ بہہ ہو گئے۔ کلثوم نے سلیقے سے ان سب کو سمیٹ کر ایک طرف
بکھ دیا۔

”گڈ گرل۔“ مسز پلومر نے کہا۔ ”ہمارے ساتھ کیل کٹا چلے گا؟“ (مسز کینیٹ ویل نے
ان کو بتا دیا تھا کہ یہ آیا عارضی ہے)

کلثوم نے شرم کر منہ میں پلوٹھو لیس لیا۔ ”میم صاحب ہمارا سادی ہونے والا ہے۔“
”سادی! دیر ہی گڈ۔“ کوکھل سم۔ یہ صاحب کا بکسا ادھر رکھو۔ اس میں بڑا جوری کا گج
بکھا ہے۔ صاحب اس کی چابی مانگے گا تو ہم کو آکر لوٹنا۔ چابی ہمارے اس نیلے بیگ میں ہے بھیک بابے؟
”ٹھیک ہے میم صاحب۔“ کلثوم نے جواب دیا۔

رات کو کھانے کے بعد سٹر کینیٹ ویل اور سٹر پلومر شراب کے گلاس ہاتھ میں لے کر ڈرائنگ
روم کے دروازے اندر سے بند کئے آہستہ آہستہ گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ اتفاق سے کلثوم برابر والے
نڈھیرے کمرے میں ہی موجود تھی جس کا دروازہ پہلے سے کھلا رہ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد صاحب نے پکارا۔ ”کوئی ہائے۔“ عبدل۔
کلثوم دیے پاؤں پیڑی میں گئی۔ جہاں عبدالغفور عشار کی نماز میں مصروف تھے (میم صاحب

اور مسز پٹو مر اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو چکی تھیں) صاحب نے دوبارہ آواز دی تو کلثوم بھاگی بھاگی ڈرائنگ روم کے گیسٹری والے دروازے پر پہنچی اور دستک دی۔ صاحب نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اور اس پر اس طرح نظر ڈالی جیسے اُسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ وہ ذرا جھینپ گئی۔ مگر اس نے فوراً کہا۔ ”صاحب عدل نماز پڑھ رہا ہے۔ کیا کام ہے؟“

”تم اب تک کیوں جاگ رہی ہو کھل سُم۔“ مسٹر کینٹ ویل نے پوچھا۔ ان کا چہرہ متماثر تھا۔

”میں میم صاحب کے پاؤں دبا رہی تھی۔ صاحب۔“

”اوہ اچھا۔“

کلثوم نے ایٹش ٹرے خالی کی۔ سیکرٹ کانسٹبل کھول کر مہمان کے قریب تپائی پر رکھا۔ اس دوران میں دونوں صاحب لوگ پھر گفتگو میں محو ہو چکے تھے۔ لیکن جب وہ کمرے سے باہر نکل رہی تھی تو دفعۃً مسز پٹو نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اور شگفتگی سے کہا۔ ”آئی سے آئی۔ دس اے پڑی گئی۔“ کلثوم ہڑٹا کر گیسٹری میں پہنچی اور سر پٹ دوڑتے ہوئے اپنی کوٹھری میں جا کر کھاٹ پر لیٹ رہی۔

مسز پٹو مصلوبے کے اعلیٰ پولیس اور رسول حکام کی ہنگامی کانفرنس کے لئے ڈھاکے آئے تھے۔ ایک روز ایک اہم میٹنگ ڈی۔ ایم کے بنگلے پر بھی ہوئی۔ جس میں سر سٹرائے کے سالے دھرنیدر مومہن سین ڈی آئی جی بھی شامل تھے۔ بنگلے پر پولیس والوں اور سی آئی ڈی والوں کی ریل پل تھی۔ کلثوم مستعدی سے اس دوران میں مسز پٹو مرمی کا حشری میں رہی اور بڑی تندہی سے مہانوں کی خدمت میں مصروف رہی۔

کلکتے واپس جاتے وقت مسز پٹو نے اس کو دس روپے بخشیش دیئے۔

دسویں دن لیلا بتی اپنے گاؤں سے واپس آگئی۔ آتے ہی اس نے کلثوم کے کان میں کہا۔ ”مافی یار نہیں تھی۔ مجھے بیان سے بلوایا تھا۔ ورنہ میم صاحب جتنی دیتیں۔“

جس دن لیلا بتی ڈی۔ ایم کے بنگلے پر اپنی ڈیوٹی بجانے واپس پہنچی۔ اسی روز شام کو امارائے کی موٹر دیپا آئی سرکار کو پہنچا۔ ہندوڑ گئی۔ دیپالی نے ڈاکٹر سرکار کو بتایا کہ اس نے گومیلا میں امارائے کے گھر کی ہاؤس میں بیدار خوشگوار وقت گزارا۔

۹ جنوری ۱۹۳۷ء کو پولیس نے دریائی راستوں کی ناگر بندی کر کے ریحان الدین احمد اور اس کے
 اقبیوں کے خفیہ مستقر اور خفیہ پولیس پر چھاپہ مارا۔ مگر ریحان الدین احمد اور اس کے ساتھی وہاں سے غائب
 چکے تھے۔ اور اب کی مرتبہ وہ ایسے نائب ہوئے تھے کہ پانچ اضلاع کی پولیس اُن کو تلاش کرنے کرتے تھے حاج
 ی۔ مگر ان کا سراغ کہیں نہ ملا۔ یورپ میں جیسے جیسے جنگ نے زور پکڑا اور برطانیہ کمزور پڑنا گیا۔ ہندوستان
 پولیس کی سرگرمیوں میں تیزی آگئی۔ جنگال میں ریحان الدین احمد اور ان کے ساتھیوں کی تلاش بھی تیزی
 سے جاری رہی۔ مگر وہ سب شاید فضا میں تحلیل ہو چکے تھے۔
 لیکن جنگ کے خلاف اور خانہ جنگی کے پرچار میں ان کا طریقہ اسی طرح خفیہ ٹھکانوں سے چھپتا
 تقسیم ہوتا رہا۔

۱۰

ویشنو بیراگی

کلب ترودو یا لاکا فہ درخت ہے جو سمندر منتقن سے نکلا تھا اور اس کے پھولوں میں اپنی
 مٹی کے مطابق کوئی سی بھی خوشبو سونگھی جاسکتی تھی اور جو ہر خواہش پوری کر دیتا تھا۔
 شامی نکیتن میں برہمندر کے پاس ایک پرانا برگد کھڑا ہے۔ دیپالی نہر کار سے اپنا کلب ترودو نکیتی
 ہے۔ کیونکہ ایک روز اس درخت نے بڑے انوکھے اور غیر متوقع انداز میں اس کی ایک خواہش پوری کر دی۔

ایسٹرن ریوے کی صاحب گنج لوپ رائن پر کلکتے سے شومیل کے فاصلے پر سنھال پرگنہ کے
 نزدیک بولپور ایک جگہ کا نام ہے۔ بولپور آج سے سو برس پہلے اپنے ڈاکوؤں کے لئے مشہور تھا۔ کیونکہ
 اس علاقے کی کنکر ملی زمین میں کھیتی باڑی نہیں ہو سکتی تھی اور یہاں کے باشندے ڈاکے ڈال کر اپنا بیٹ
 لاتے تھے۔ وہ چھری جس سے یہ ڈاکو مسافروں کا گلا کاٹتے تھے بول کہلاتی تھی۔ اور اسی وجہ سے اس دیوانہ
 نام بولپور پر گیا تھا۔

ہمالیہ پر شامی کی تلاش سے ناکام ہو گئے کے بعد ایک مرتبہ بارشی دیو میدر ناٹھ ٹیگور زمیندار سہما سے

ملنے پالنے میں بیٹھے رائے پور جا رہے تھے۔ جب بولپور کا یہ مسلمان سپہرہ راستے میں پڑا۔ اس میدان میں ہمارے
کو ایک بڑا سایہ دار درخت نظر آیا۔ انہوں نے پالکی وہیں رکوائی اور درخت کی چھاؤں میں ٹالین بچھا کر راقیہ
میں مصروف ہو گئے۔ وہاں انہوں نے ”یو دیو دگر دیو پستو شوم بھون ما دیویشھ یہ او شدھی شو پو پستو
شو تسمی دیو ابھونماہ۔“ والی ویدک حمد پرائی اور ہمارے کو اس درخت کے نیچے وہ شانتی مل گئی جس کا
کھوج ہمیں وہ سارے ہندوستان میں کھٹے تھے۔

انہوں نے رائے پور جا کر زمیندار سناہ سے یہ علاقہ خرید لیا۔ درخت اور باغ لگوائے۔ ڈاکوؤں
نے ڈاکہ ڈالنے سے تو یہ کی۔ اور ۱۸۶۳ء میں ہمارے نے اپنی آرام و آسائش کی زندگی تیاگ کر یہاں شانتی نکیتن
آشرم قائم کیا۔ شانتی نکیتن ولا تعمیر کردائی اور یہاں رہنے لگے۔ برگد کے اس درخت کے نیچے انہوں نے ایک
مرمرین معبد بنوا کر اس کے چھاؤں پر رکھوایا۔

آمار پرانیر آرام

مونیر آئند

آمار شانتی

اس درخت کے نیچے ہمارے کو خدا مل گیا تھا۔

آج یہ شانتی نکیتن ہندو قدیم کی جھلک کی درمگاہوں کی طرز پر بنے ہوئے دارالعلوم و شوا بھارتی
انٹرنیشنل یونیورسٹی کے نام سے دنیا میں مشہور ہے۔ دوسری جنگ عظیم نے گاندھی اور وار دھما
آشرم، نہرو اور آئند بھون اور ٹیگور اور شانتی نکیتن والے ہندوستانی کو قومی جدوجہد کے ایک انتہائی
نازک موڑ پر لاکھڑا کیا ہے اور گو شانتی نکیتن کی فضا میں ہمیشہ کی طرح پُر سکون اور نغمہ بار ہیں۔ اور گرو
دیو ابھی زندہ ہیں۔ اور ڈاکٹر نند لال بوس اور اپندر ناتھ ٹیگور اور ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کے دوسرے
عظیم مصوٰر کلا بھون میں موجود ہیں۔ مگر بیرونی دنیا کے معاملات تیزی سے بدلتے جا رہے ہیں۔

آمار پرانیر آرام

مونیر آئند

آمار شانتی

ستمبر ۱۹۴۲ء کی ایک شام شانتی نکیتن کی ایک نئی طالب علم تھرڈ ایئر کی دیپالی سرکار برگہ
بچے بیٹھی مرمیں بھانگ پر منقش ان سمر انگیز الفاظ پر نظر ڈال کر سوچ رہی تھی۔ کمال ہے ہمارے
آسانی سے یہ کچھ حاصل ہو گیا تھا۔ مگر مبارشی کبھی بیس برس کے بھی تو رہے ہوں گے۔
اپنی نوٹ بک بند کر کے وہ برگہ کے پتوں کی ناؤ بناتے بناتے سوچنے لگی۔ کلپ ترواز زندگی
پتے گرنے جا رہے ہیں۔

”اکھ زمن۔“ دور سے آواز آئی۔ اُس نے چونک کر جگل کی طرف دیکھا۔ دور ایک
ادی پر چند دیشو بیراگی لغو لگاتے تیز چلے جا رہے تھے۔
اور دیپالی کو یاد آیا کہ یہ بیرتھوم ہے۔ چنڈی داس کی سرزمین۔ اس نے جبک کر مرنے والی پر لٹھ
دیا۔ چنڈی داس کی سرزمین۔

وہ کتابیں سمیٹ کر ہوٹل واپس جانے کے ارادہ سے اٹھنے لگی۔ مگر اچانک سامنے پگڈنڈی پر
کھڑکھڑائے۔ اس نے نظریں اٹھا کے دیکھا۔ ایک لمبی سیاہ دارمھی اور سیاہ زرخوں والا دیشو سنیا کی
اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی اور سنیا سی کو پر نام کیا۔ تب اُس فوجوان بیراگی نے جڑی
تگی سے کہا۔ ”دیپالی۔ ہم یہاں تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جائیں؟ میں گلتا ہے تمہیں روحانیا کے
ن کی اشد ضرورت ہے۔“

دیپالی کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ جوتے پر بیٹھ گیا۔ اور چاروں طرف نظر ڈالی۔ پھر اس نے
لے میں سے بیگٹ نکال کر جلایا مگر فوراً ہی بجھا دیا۔

”بچہ۔ ہم تجھ سے بہت زیادہ خوش ہیں۔ تو نے ہماری بہت سیوا کی ہے۔ اور ہم تیری پیادری کے
ت قائل ہو گئے ہیں۔ تو واقعی کمال کی لڑکی ہے۔“

دیپالی نے بھوس جوڑ کر کہا۔ ”آپ۔؟“

”ہاں بیا۔“

دیپالی سر اسیم ہو گئی۔ ”آپ کو اس قدر ریک لیس نہ ہونا چاہیے۔ اب میں کسی کی ایادیا بننے نہیں
سکتی۔“

”ریک لیس۔؟ یہ شانتی نکیتن تو اپنا پرانا اٹھ ہے بچہ۔“

ہر گد کے نزدیک مر مر میں عبادت گاہ میں کسی نے چراغ جلادیا۔ پھر قدموں کی چاپ دور ہو گئی۔
 ”تو پوچھا پارٹ نہیں کرتی بٹیا۔“

دیپالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سنیا سی نے پھاٹک پر لکھے ہوئے الفاظ پر نظر ڈالی اور انہیں
 آہستہ سے دہرایا۔ پھر وہ بھی کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ اب شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔
 ”آپ۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں اس وقت یہاں مل جاؤں گی؟“ چند لمحوں بعد دیپالی
 سناٹھا کر اس سے پوچھا۔

وہ اپنے خیالوں سے چونکا اور دفعتاً ہنس پڑا۔ ”اپنے علم کے زور سے۔“ پھر کچھ توقف
 بعد اس نے کہا۔ ”میں تیرے متعلق سب معلوم رہتا ہے۔ بچہ ہم جانتے ہیں کہ تو روز شام کو یہاں بیٹھ کر
 بوم درک کرتی ہے۔“

”تو بتلائیے اب میرے لئے کیا کام ہے۔“ دیپالی نے ذرا درشتی سے کہا۔
 ”کیا ہم کسی کام کے بغیر تجھ سے نہیں مل سکتے؟“

سنیا سی نے اطمینان سے جواب دیا اور چپو ترے پر اکی پاتی ماسے بیٹھا رہا۔ اندھیرے میں اُس
 کی شکل صاف نظر آرہی تھی۔

ہوا کے ایک جھونکے نے شران میں لگے ایک درخت کے سُرخ پھول چپو ترے پر بکھر دیئے۔
 دو برس کے درختوں کے ایونٹوں میں گرو دیو کسی سے باتیں کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔
 ”گرو دیو جا رہے ہیں۔“ سنیا سی نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ دیپالی بھی چپو ترے پر
 سے اٹھی۔ گرو دیو اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

دفعتاً دیپالی کو محسوس ہوا کہ یہ شام سفر دہے۔ پھر کبھی واپس آئے گی۔
 سنیا سی نے جھولے میں سے نکال کر گھڑی دیکھی اور پہلی دفعہ بخیرگی سے کہا۔ ”شوکتی، تو تمہیں
 ایک کام بتا ہی دیں۔“

دیپالی نے تیوری پر بل ڈال کر اسے دیکھا۔ ”میرا نام دیپالی ہے۔“
 ”ہاں، لیکن تم میری شوکتی ہو۔ دیپالی میں تمہیں شوکتی ہی پکاروں گا۔ چلو جلدی سے ایک اور کا“

رد و تھوڑا سا۔

دیپالی گم سم کھڑی رہ گئی۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ ”کہئے۔“ اُس نے پچھانک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہمیں کہیں سے میگریٹ لادو۔ ہمارے پاس ہی ایک سگرٹ بچا ہے اور بہت دور جانا ہے۔“

”بہت اچھا۔ لیکن آپ محض میگریٹ لینے۔“

”ہم نے کہا تو ہم تمہیں درشن دینے آئے تھے بچہ۔“

”سگرٹ کے علاوہ اور کچھ تو نہیں چاہئے۔“ دیپالی نے فکر مندی سے دریافت کیا۔ اور سنباہی

کے سنجیدہ لہجے سے بید گھرائی۔

”فی الحال نہیں۔“ وہ پھر جو ترے کے کنارے پر ٹپک گیا اور بڑی گنجیم آواز میں کہنے لگا۔

’دیپالی میں اس لئے آیا تھا کہ میں تمہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اب تک تم میرے لئے تحفے ایک اور رابطہ“

تحفے ایک اور نام رہی ہو۔ یاد دھند لکے میں سُنی ہوئی ایک اور آواز۔ تمہارے گھر پر بھی۔“

”میں آپ کا سگرٹ لے آؤں۔“ دیپالی نے گھبرا کر اس کی بات کاٹی۔

”ہم سے ڈرو مت بچہ۔ ہم ایک بہت مشرّف سادھو ہیں۔“

دیپالی ہنس پڑی اور ایک لخت اسے اُمارائے کی ڈانٹ یاد آئی۔ اسکول گرل گلگز۔ اور

وُمارائے کے خیال نے اسے اچانک بید دل گرفتہ اور پریشان کر دیا۔

”تمہارے صاحب اور میم صاحب کیسے ہیں؟“

”اُن کا تبادلہ ہو گیا۔ ان کی جگہ چارلس بارلو آئے ہیں۔ ریلوے مینجر کی ان سے بھی بہت اچھے

تعلقات ہیں۔ کیونکہ مسٹر بارلو کی بڑی بہن بارلیساں میں مشنری ہیں۔ چانگام سے تبدیل ہو کر آئے ہیں۔“

”روزِ خیریت سے ہے؟“

”جی۔“

”کس کو اس کے متعلق کوئی شبہ تو نہیں ہوا ہے؟“

”جی نہیں۔“

”اسے خط لکھ کر پوچھو کہ چارلس بارلو کھلنا کس روز پہنچ رہا ہے۔ چارلس بارلو کے نام کا کوڈ یاد

ہے۔ ”وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”جی ہاں۔“

”بتاؤ تو۔“

دیپالی نے بتلایا۔

”وڈر فل۔“ سنیاسی نے خوش ہو کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر گھر اگر چل دی سے

بٹالیا۔

”اوما سے کب سے نہیں ملیں؟“ سنیاسی نے دیپالی کا رنگ بدلتے نہیں دیکھا۔ اس نے اوما

کا نام جس انداز سے لیا تھا۔

”آپ لوگوں کے غائب ہونے کے دوسرے ہفتے ہی تو وہ کلکتہ چلی گئی تھیں۔ ابھی تک وہیں ہیں

میں گرمیوں کی چھٹیوں میں بابا کے ساتھ کلکتہ گئی تھی۔ گانے ریکارڈ کر دانے۔ مگر اوما دی سے ملاقات نہ ہو

سکی۔ ان کا پتہ معلوم نہیں تھا۔ اور انہوں نے مجھے کوئی خط پتہ بھی بھیجا نہیں۔ وہ کلکتہ میں کسی کالج

میں پڑھا رہی ہیں۔ اپنے بھائی کے ساتھ بالی گنج میں رہتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ چونکر پارٹی کی باقاعدہ نمبر

اس نے۔ انڈر گراؤڈ میں گئیں نہ جیل۔ بھیک ہے نا؟ اور سنا ہے کہ ان کے ڈکا آئی جی ماموں نے گورنمنٹ

کونسلٹ دی ہے کہ وہ گڑ بڑ نہیں کریں گی۔ آپ کو تو یہ سب معلوم ہی ہوگا۔“

”ہاں۔ معلوم ہے۔“ پھر اس نے ذرا توقف سے کہا۔ اچھا جاؤ۔ بھاگو۔ سگریٹ لے کر آؤ۔ جو

بھی ملیں۔“

”آپ اس راستے پر جائے۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

”اچھا۔“ سنیاسی چلنے لگا۔ پھر ٹھٹھک گیا۔ ”ایک بات اور۔ کینٹ ویل تازہ وارد اور

تاجر بہ کار نو جوان تھا۔ بارہ تو پرانا گھاگ ہے۔ اس کے باپ دادا تک بنگال سولین تھے۔ اس چیز کا تم لوگ

خیال رکھنا۔ بڑا سخت گیر افسر ہے۔ ٹریسٹ تحریک کے زمانے میں کئی نوجوانوں کو پھانسی کے تختے پر بھجوا

چکا ہے۔“

دیپالی کو کپکپی سی آئی۔ سنیاسی کہتا رہا۔ ”روزی سے کہنا بچا احتیاط سے کام لے کر میں اطلاعات

پہنچوائے اور اپنے باپ کو کسی طرح ناراض یا ناخوش نہ کرے۔ یہ سید موزی ہے۔“

”بہت اچھا۔“ دیپالی نے جواب دیا۔ سیاسی پگڈنڈی پر آگے بڑھ گیا۔ دیپالی بھاگتی ہوئی
اس کی طرف چلی گئی۔

چند منٹ بعد وہ واپس آئی اور برگد کے سسنان چبوترے پر ایک نظر ڈال کر سال کے انویو
رنا شروع کر دیا۔ سیاسی سر جھٹکے آہستہ آہستہ کلا تھون کے سامنے والی سڑک پر چلا جا رہا تھا۔

نے بھولی ہوئی سانس سے اس کے قریب جا کر کہا۔ ”لیجئے۔“
سیاسی نے ہلٹ کر دیکھا۔ ”اوہ تعینکس۔“ اس نے بڑی خوشی سے سیکرٹوں کے سپکٹ
جھولے میں گواہی دیتے اور مسکرایا۔

اب چاند طلوع ہو رہا تھا۔
بہت دور سے ”اکھ نرنجن“ کی آواز آئی۔ سڑک کے کنارے سمندر کے سریلے شور کی مانند
بیہار دلاتی جھاڑ کی نازک ڈالیاں ہوا میں سرسراہی تھیں شیشم کے جھنڈ کے پرے طلباء کے جھینڑوں
بشنایاں جھلکائیں۔

دیپالی سر جھٹکا کر سڑک کو دیکھنے لگی۔ مٹی میں کانچ کی سرخ چوڑیوں کے چند ٹکڑے چمک رہے
اس نے انگوٹھے کی نوک سے ایک ٹکڑے کو جھٹکا اور ایک قدم پیچھے ہٹی۔ باڈ پھیلی سیل پر سے ایک
اچھل کر پتوں کے اندر چلا گیا۔ دوسری سدا میں چند لڑکیوں نے گانا شروع کر دیا تھا سرتائی ڈانکے
نی گورڈ ڈانکے آئی آئی۔

”یہاں اوٹل کمارد اس مہ سے رابطہ رکھے گا۔“ سیاسی کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔
”بہت اچھا۔“

”سنتھال پر گنہ سناس لینے کے لئے آئیڈیل جگہ ہے۔ مگر ہم یہاں سے بھی ڈیرا ڈنڈا اٹھا کر
کر گئے ہیں۔ اگر ہمیں ہتھاری مدد کی ضرورت پڑی تو تیار رہنا۔ شوکتی۔“
”بہت اچھا۔“

قریب سے چند سنتھالی عورتیں سر پر ٹوکڑے اٹھائے گزر گئیں۔ ان کے پیچھے طلباء کی ایک ٹولی ٹپلتی
ا رہی تھی۔

”اچھا۔ جیتی رہو۔ خوش رہو۔ ہم جاتے ہیں۔“ سیاسی نے منانت سے اسے آشیرواد دی اور تیزی

سے آگے بڑھ گیا۔

دیپالی اُسے چانغنی کے خشک دھندلکے میں غائب ہوتے دیکھتی رہی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ واپس ہوئی۔
برگد کا چبوترہ اب بھی سفسان پڑا تھا۔ آج شام۔ آج شام میں سوچ رہی تھی کہ کاش۔ اُس نے
ایک پتہ اٹھا کر ناک سے چھووا۔ اور اپنے آپ سے کہا۔ کلب ترد!

پھر اس نے درختوں کے اس جھنڈ کا جھکڑ لگایا۔ برہمہ معبد میں چراغ سکون سے جل رہا تھا۔

آمار پرائیر آرام

مونیہ آئند

آتما رشتا

اس نے چپکے سے دل میں دہرایا۔ اور دل ہی دل میں مسکراتی مسرور رندہ بنی بھرجی کو خط لکھنے
کے لوازم سے اپنے کمرے کی سمت روانہ ہو گئی۔

۱۱

ہلی کا ٹیج

ہلی کا ٹیج میں سہ پہر کی چائے کے انتظامات بڑے زور و دل پر کئے جا رہے تھے۔ الیستھر منرجی کی کرک
پر سفید اور گلابی آئینا کر رہی تھیں۔ ڈیزری آیا سینڈوچ بنانے میں مشغول تھی۔ گلابیوں میں تازہ بھول لگے
تھے۔ سنگ روم میں کرکس اسٹیم کی نفیس کرکھٹ کے دھلے ہوئے ٹیبل کلا تھ میزوں پر پڑے تھے۔ چائے کا نیا
سیٹ سلہٹ کی سید کی کشتی میں سجاوٹ میز پر رکھا تھا اور اس پر ہری کانچ کے مٹوں کی جھالروالی بڑی
جالی ڈھانپ دی گئی تھی۔ ٹی کوزی اور گشتیوں کی کشیدہ کاری قابل دید تھی۔

پادری منرجی سیاہ سوٹ پہنے ذرا متفکر سے برآمد ہوئے۔ وہیں رہے تھے اور بار بار واسکٹ کی
جیب سے زنجیر والی گھڑی نکال کر دیکھ لیتے تھے۔

روزی اپنے کمرے میں دروازے بند کئے پچھتخیاں لگائے قلعہ بند بیٹھی تھی۔

ٹھیک چار بجے گھوڑا گاڑی سامنے آن کر لگی اور پادری ہنری بسواس، مسز میری بسواس، اُن کا خزیہ

مسٹر لو تھر لسواس اور چھوٹی لڑکی ایڈتھ لسواس نیچے اترے۔ ایڈتھ لسواس نے ایک اٹچی کیس اٹھا دکھا تھا۔

ایسٹھر بنرجی لپکی ہوئی باہر آئیں۔ اور دونوں میاں بیوی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور سنگ دروم میں لے کر آئے۔ لسواس خاندان ذرا سیلف کانشس سا ہو کر کرسیوں پر گرکا۔ پادری اور مسٹر لسواس اور مسٹر لو تھر لسواس صوفے پر ایک قطار میں اس طرح سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ جیسے پہلے زمانے میں لوگ تصویر کھینچوانے کے لئے فوٹو گرافر کے سامنے بیٹھتے تھے۔ ایڈتھ البتہ اطمینان سے گراموفون کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ مسٹر لسواس نے ناقدانہ نظروں سے گھر پر نظر ڈالی جو گھر کی عزت، مگر سیلف کا آئینہ دار تھا۔ دونوں کالے پادریوں نے آپس میں ادھر ادھر کی باتیں شروع کیں۔

”یکشن میری روزی نے کاٹھے ہیں۔“ ایسٹھر بنرجی نے مسٹر لسواس کو صوفے کے کشوں کا ردیو نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے دیکھ کر فوراً کہیا

مسٹر لسواس اخلاقاً سکرائیں۔ انہوں نے یہ بھی نوٹس لیا کہ ایسٹھر بنرجی گلے میں ایک سید تیلی سنہری زنجیر کے علاوہ سونے کا ایک بھی زیور نہیں پہنتے ہیں۔ اور سرخ کنارے والی سفید رنگالی ساڑھی میں ایک جگہ پر باریک کھونپ بھی بھری گئی ہے۔ خود مسٹر لسواس کردشیا کی چوڑی لیس والے سفید پٹی کوٹ کے اوپر تیز گلابی جازا کی ساری باندھ کر اور سیاہ ساٹن کا بلاؤن پہن کر آئی تھیں اور سونے کی چوڑیاں ان کے ہاتھوں میں چھاپ رہی تھیں صبح سا روال ایک آستین میں گھس رکھا تھا۔ کانوں میں ایک ایک بوقی والے بوندے پہنے تھیں ہندو سالہ ایڈتھ اودے ریشمی فراک میں ملبوس تھی۔ سفید موزے، کالے جوتے بن بیا ہی دیسی عیسائی شریف زادوں کی مانند فراک پر ڈوپٹہ بھی اڈتھ رکھا تھا۔ پادری لسواس سیدھے سادے آدمی معلوم ہونے لگے اور ظاہر تھا کہ بیوی ان پر حاوی ہیں۔ لو تھر لسواس ایک منحنی مسکین صورت اور شرمیلے نوجوان تھا۔ دونوں باپ بیٹے پورے سوٹ میں ملبوس تھے۔ پچھلے کرسمس دیک میں آل انڈیا مشنری کانفرنس ختم ہونے کے بعد جب لو تھر لسواس پنجاب واپس گئے تو روزی بنرجی پر عاشق ہو کر واپس گئے تھے۔ وہ لدھیانہ میں مشن اکول میں سائنس ماسٹر تھے۔

ایک دو سال بعد سینٹ جانز کالج آگرہ میں لیکچرر ہو کر جانے کا ”چانس“ بھی تھا۔ انہوں نے لدھیانہ واپس جا کر کچھ عرصے بعد اپنے باپا پور بند بنری لسواس کے ذریعے پادری بنرجی کو شادی کا پیغام بھیجایا تھا۔

ایسی عیسائی فرقہ میں اچھے لڑکوں کی ہمیشہ سے کمی رہی ہے۔ عیسائی لڑکیاں عموماً اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اساتذہ ہو جاتی ہیں۔ بیشتر عیسائی لڑکے ایٹنو گرافیا سائنس میں سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ اس وجہ سے عیسائی لڑکیاں عام طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں سے شادی کرتی ہیں۔

چنانچہ جب لوہٹر بسواس کا پیغام آیا تو پادری بنرجی خوش ہوئے۔ جب سے روزی بڑی ہوئی تھی انہیں اس کے بیاہ کی فکر نے آگھیرا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی زندگی میں ان کی جیسو میٹیلپنے گھر ملی جائے۔ انھوں نے روزی سے تذکرہ کئے بغیر اپنے بیوی سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد خالص ہندوستانی ناں باب کی طرح پیغام منظور کر لیا۔ وہ یہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ان کی فرماں بردار اور سعادت مند بیٹی کو ان کے انتخاب پر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے۔ پادری بنرجی کی خواہش تھی روزی کا رشتہ کسی ہم پلہ برہمن کرسمین خاندان میں ہوتا۔ روزی ماں اور باپ دونوں ہی طرف سے نجیب الطرفین کٹین برہمن زادی تھی۔ مگر آج کل خاندانی لڑکے طے کہاں ہیں۔ اور پادری بسواس بھی اچھی ذات کے آدمی تھے (حالانکہ بسواس عموماً خٹو ولڈ کاسٹ والوں کا نام بھی ہوتا تھا) ان کے مشنری باپ دادا بکال سے جا کر لہیانے میں سیٹل ہو گئے تھے۔ پادری بسواس کو سنگالی زبان بھی نہیں آتی تھی کیونکہ ان کی ماں پنجابی تھیں۔ خود تیری بسواس بھی پنجابی تھیں اور واقعی اپنے انداز اور وضع قطع سے کچھ حیرت انگیز معلوم ہوتی تھیں۔ مگر بہر حال بہت معقول خاندان تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ مشنری کانفرنس کے نانے میں پادری بنرجی، لڑکے کی عادات و خصائل سے خود واقف ہو چکے تھے۔ لڑکا انہیں پسند آیا تھا۔ شریف، حلیم الطبع اور سید مذہبی نوجوان تھا۔ روزی کو بڑے آرام سے رکھے گا۔ پچھلے ہفتے پادری بسواس کا خط آیا تھا کہ وہ اور ان کی بیوی لڑکی کو دیکھنے اور بات چیت کرنے کے لئے ڈھاکہ آ رہے ہیں۔ اور روزی کو جب البیٹھر بنرجی نے یہ اطلاع دی تھی تو ایسا لگا تھا، جیسے اس کے اوپر ہم کا گولہ آن گرا ہو۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ لیکن اس لمحے سے بالکل چپ سا دھلی تھی۔ (دیپالی اتنی دد رشتہ اتنی نکیتن بھی تھی۔ جس سے وہ اپنا دکھ درد کہہ سکتی۔ جہاں آرا کے پاس وہ اپنا دکھ اڑے کر جانا نہ جانتی تھی) اس کی اس خفا موٹی کو اس کے والدین نے بچپن کی شرم و حیا پر محمول کیا تھا کس لڑکی کو میکے سے اتنی دیر کا لے کو سوں بیلہ جانے کا غم نہ ہو گا۔

لیکن آج جبکہ بسواس میل و واقی آن پہنچی تھی۔ روزی نے بڑا ہی عجیب اور غیر متوقع رویہ اختیار کر لیا تھا۔ ایک تودہ ساری رات روتی رہی تھی۔ اور پھر صبح سے اپنا کمرہ اندر سے بند کر کے بیٹھ گئی تھی۔ پادری بسواس نے اپنے

خاندان شہر میں اپنے کسی دور کے رشتے دار کے یہاں اترے تھے۔ اور ٹھیک چار بجے لپٹی کا ٹیچ پیچ گئے تھے۔ اور سب پادری اور سز بنرجی کو روزی کے متعلق پہلی بار گھبراہٹ شروع ہوئی۔

ڈیزری چائے دانی لے کر کمرے میں آئی اور الیٹھر بنرجی نے رس گئے اور چم چم ملائی جواہروں نے دوبا۔ تم تھے ہمانوں کو پیش کئے۔ وہ بے چاری ہونے والے دامادی بے انتہا خاطر کر رہی تھیں اور ابھی سے اُن واس کے بھونے پن اور شرافت پر ماتا بھرا پیار آنے لگا تھا۔ مگر سز بسواس بڑی خوفناک ساس ثابت دل گی۔ اس کی انھیں پریشانی تھی۔

روزی کا کمرہ ڈائینگ روم کے دوسری طرف تھا اور سنگ روم میں سے اس کا بند دروازہ نظر آ رہا تھا۔ روزی بنرجی مہمانوں سے باتیں کرنے کرتے بچینی سے اس دروازے پر نظر ڈال لیتے۔ دروازے پر پڑا سیلا پردہ ہوا میں رائے جا رہا تھا۔

”روزی سسر کیاں ہیں؟“ ایڈتھ بسواس نے نزاکت سے سینڈ وچ اٹھا کر تعینک یو آٹھی کہنے کے سز بنرجی سے دریافت کیا۔

”ابھی آتی ہے۔ ذرا اس کی طبیعت —“ الیٹھر بنرجی نے یک محنت ذرا ہٹلا کر بے بسی سے اپنے ہر کو دکھایا۔

”کیا ہوا اُسے۔؟“ سز بسواس نے ابرو اٹھا کر سوال کیا۔

”کچھ نہیں بہن۔ دن رات پڑھائی میں لگی رہتی ہے۔ آج صبح سے سر میں درد ہے۔“

پادری بنرجی نے فوراً پادری بسواس کو میا طلب کیا۔

”لدھیانے میں جہنگائی کا کیا حال ہے؟ یہاں تو وار کی وجہ سے۔“

لوٹھر بسواس نے مائی ٹھیک کرتے ہوئے سرگھا کر دزدیدہ نظروں سے نیلے پردے والے دروازے کھا۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ روزی کا کمرہ ہے۔ اور مشنری کا نفرنس کے دونوں میں روزی نے اسی سنگ میں بیٹھ کر ان کے ساتھ کیرم بھی کھیل رہا تھا۔ اور کیرم کے پاؤڈر کا ڈبہ لانے کے لئے وہ اس کمرے میں بھی ہو تھے۔

”او۔ آٹھی۔ میں یہ ریکارڈ دیکھ سکتی ہوں؟“ ایڈتھ نے چائے کی پیانی ختم کر کے گراموفون کی طرف مڑتے

تھے کہا۔

”مزدور ضرور۔“ مسز بنرجی نے کہا۔ وہ بے ساختہ یہ بھی اضافہ کرنا چاہتی تھیں کہ روزی کو میوزک کا بہت شوق ہے۔ مگر وہ چپ ہو گئیں۔ ایڑھ فرش پر اکڑوں بیٹھ کر میز کے نچلے خانے میں رکھے ہوئے ریکارڈ ملٹے پلٹے لگی۔ زیادہ تر وہ گھیسے پلٹے پرانے ریکارڈ تھے۔ جو ایک مرتبہ ڈھاک کے ایک انگریز افسر نے ولایت جاتے وقت مشن کیاؤنڈ بھجوا دیے تھے۔

ڈیزی نے جا کر روزی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ جواب نہیں ملا۔

اب چھ بجنے والے تھے۔ مسز بنرجی اٹھیں۔ ڈانگ روم اور سنگ روم کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازے پر نو سے دستک دی۔ ”روزی۔ روزی بیٹے۔ بات تو سنو۔ وہ اب روم لٹی ہو رہی تھیں۔

مسز بنرجی چند منٹ تک دروازے پر کھڑی رہیں۔ پھر سر جھکائے سنگ روم میں واپس آگئیں اور شوہر کا ملبیانہ نگاہوں سے دیکھا۔ پادری بنرجی آہستہ سے اٹھے اور اپنے پیچھے سنگ روم کے کواٹر بند کرتے ہوئے رفا کے دروازے پر پہنچے اور دھیرے سے دستک دی۔

”روزی۔ روزی بیٹا۔ دروازہ کھولو۔ میں ہتھاراپا ہوں۔ بات تو سنو۔“ انہوں نے سیدھا جوتے لہا۔ روزی نے دروازہ کھولا۔ پادری بنرجی اندر آ گئے۔

روزی کندھوں پر بال بکھرائے سفید ساری پہنے تصویر کی مانند سامنے چپ کھڑی تھی۔ اچانک اُن کی آنکھوں کے سامنے ایک اور تصویر آگئی۔ بالکل اسی طرح انہوں نے پہلی بار نوجوان ایسٹھری بالاکو دیکھا تھا۔ کندھوں پر لمبے لمبے بال بکھرائے سفید ساری پہنے رائٹ ریورنڈ وافرڈ براؤن کی کوٹھی کے برآمدے میں خاموش کھڑی تھی، جب وہ اس سے ملنے کے لئے بلائے گئے تھے۔ اُس ایسٹھرا اس روزی میں اتنا فرق کیوں؟ کیا زمانہ تبادلہ گیا تھا؟ اُس ایسٹھری آنکھوں میں محض لاج تھی اور سپردگی۔ اس روزی کی آنکھوں سے ہمد اور اس اور خود سری کی چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ اس خود سری کو آج کل کے زمانے میں خود اعتمادی کہا جاتا ہے۔ مگر وہ تو اپنی ملاؤٹی جی کی بھلائی ہی تو چاہتے ہیں۔ وہ اپنے بوڑھے باپ سے اس قدر خفا کیوں ہو گئی؟ ایک بیک روزی آگے بڑھی اور اُن کی ٹانگوں سے لپٹ کر کہنے لگی۔ ”پاپا۔ پاپا۔ مجھے لے کر دیاس ڈیوڈ بھیجئے۔ مجھے مار ڈالئے جانے۔ مگر میں اس چفندے۔ اس۔ اس کا لٹین سے ہرگز نہ نہیں کروں گی۔ مجھے وہ بالکل پسند نہیں ہے پاپا۔“ ابدہ سسکیوں سے رد رہی تھی۔

کا لیٹن۔ پادری بنرجی ہکا بکارہ گئے۔ ”روزی بیٹا۔“ انھوں نے ہڑا کر کہا۔ ”میری
کا تو خیال کرو۔ میری بیٹی۔ لوتھر بڑا اچھا لڑ۔“

”نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔“ روزی نے بچوں کی طرح بچل کر دیتے ہوئے ان کی بات کاٹی۔
”پھر گیا کرے گی۔“ احمق۔ ”پادری بنرجی کو ایک دم غصہ آگیا۔ ”کسی ہندو سے شادی کرے
؟ یہ ارادہ ہے تیرا۔؟“ مسلمان سے بیاہ رہ جائے گی؟ اپنی ماں کا حشر بھول گئی۔ بد بخت۔؟“ انہوں نے
رج کر کہا اور ان کو بالکل خیال نہ رہا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے اور سنگ روم تک آواز جا رہی ہے۔ انہیں
پر سکون زندگی میں ایسا قیامت خیز وقت بھی دیکھنا پڑا۔ اور اپنی اولاد کے ہاتھوں۔ خداوند۔ میں نے
ایک گناہ کیا تھا۔ خداوند۔؟

پادری بنرجی کو پتہ بھی نہ چلا کہ مسز میری بسواس بچے آن کھڑی ہو گئی ہیں۔ اور باپ بیٹی کا سارا مکالمہ
سجی ہیں۔ ایستھر بنرجی سمجھی ہوئی ان کے عقب میں کھڑی تھیں۔ مسز بسواس کو دیکھ کر روزی فرشتہ سے اٹھی اور
ایک طرح غنائی نے میں گھس کر دروازہ زور سے بند کر لیا۔ پادری بنرجی نے مڑ کر مسز بسواس کو دیکھا اور سکتے
ہاں میں کھڑے رہ گئے۔

چند لمحوں تک مکمل سکوت طاری رہا۔ اس کے بعد مسز بسواس نے زہر میں بھی ہوئی آوازیں کہا۔ ”اچھا
ہم کا لیٹن ہیں۔ ہنری۔“ انہوں نے سنگ روم کی طرف مارچ کرتے ہوئے لٹکا رہا۔ ”ہم اپنی انسلٹ
لے لے لے دھیانے سے آئے تھے۔ چلو اٹھو۔“

ایستھر بنرجی روتی ہوئی ان کے پیچھے لپکیں۔ سنگ روم میں آکر انھوں نے کہا۔ ”میں خدا باپ کے
ہیں معاف کر دیجئے۔ روزی بڑی ضدی لڑکی ہے۔ آج کل کی اولاد ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ
میں کیا کہوں۔“

اس دوران میں پادری ہنری بسواس اور مسز لوتھر بسواس ”مٹ مٹ“ کھڑے باقی لوگوں کو تنگ رہے
۔ مسز بسواس بلاؤز کی آستین میں سے رمال نکال کر ناک سنکتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ اور شعلہ بار
ہوں سے میزبان خاتون کو گھورا۔ پادری بنرجی اس انتشار میں سنگ روم سے گزرتے ہوئے جا کر بائیں
ایک دریں کھڑے ہو گئے تھے اور مڑھکا کر فرش کو دیکھ رہے تھے۔

اب مسز بسواس نے رمال آنکھوں پر رکھ لیا اور آنسو بہانے پر آمادہ ہوئیں۔

”چلو ڈیر۔ واپس چلیں۔“ پادری بسواس نے آگے بڑھ کر نرمی سے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ مسز بسواس نے غصہ سے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور چلاتے ہوئے بولیں۔ ”ہم امیر لوگ نہیں ہیں۔ لدھیانے سے چل کر راجکمار کی کو دیکھنے آئے۔ آپ نے خود بنا یا تھا۔ چار آدمیوں کا انٹرکلاس کرایہ۔“

”اوہ شٹ اپ مائی ڈیر۔“ پادری بسواس نے کوفت کے ساتھ کہا۔ لو تھر بسواس چھن کو تک رہا تھا۔

”چار آدمیوں کا انٹرکلاس کا کرایہ۔ لدھیانے سے ڈھاکے۔ ہم امیر نہیں ہیں۔ آپ کی طرح چرچ فٹ کاروپہ نہیں کھاتے“

”اوہ کیپ کو اٹ ماما۔“ لو تھر بسواس نے انتہائی خفت اور جھنجھلاہٹ کے ساتھ والا کو خاموش کرنا چاہا۔

”تم چپ رہو جی۔ میں ان سے مسز بنرجی سے بات کر رہی ہوں۔ آپ نے ہمیں خط لکھا۔ آر نے مسز برکت مسج کے ذریعے ہمیں کہلویا کہ اگر لڑکی دیکھ جاؤ۔“

”اوہ شٹ اپ۔ ماما۔ پلیز۔“ لو تھر بسواس نے پسینہ پسینہ ہوتے ہوئے دوبارہ استد کی۔

”یوشٹ اپ ایڈیٹ۔ ڈیم فول۔“ مسز بسواس اب ہٹرکل ہونے والی تھیں۔ ایڈیٹھ نے ”اٹ وا ز ان دی آئی ل کیپری ریٹ آئی فاؤنڈ ہیر۔“ کا دقیا نو سی ریکارڈ کر گراؤ نو پر لگا رکھا تھا۔ جو ریں ریں کئے جا رہا تھا۔ لو تھر بسواس نے اٹھ کر غصے کے ساتھ ریکارڈ پر سوئی ہٹادی اور بہن کو گھور کر دیکھا ہوا کرسی پر آن بیٹھا۔

”ہم نے انگوائری کی۔“ مسز بسواس کہے گئیں۔ ”میں ڈھاکے اپنی سسٹرن لا کو۔ ہنری کے کزن برادر کی دانت کو خط لکھا کہ لڑکی کے حالات معلوم کرو۔ انہوں نے ہم کو لیٹر لکھا۔ میں ہنری کو بولا۔ میں نے بولا۔ مارجرئی سسٹرن نے لکھا ہے لڑکی کی شہرت ابھی نہیں ہے۔ لڑکی کے ہندو تو زینڈ ہیں۔ لڑکی کانگریسی اور کمیونسٹ ہو گئی ہے۔“

”اوہ ماما۔ پلیز۔“

”مگر یہ گدھے کا بچہ — مس صاحب پر لٹو ہو چکا تھا — کیا اگر تم کیا میا کوٹ — کیا لاہور —
 بچہ سے اس کے لئے رشتے آدھے ہیں۔ مسٹر ایڈورڈ منور خاں تو ڈپٹی کلکٹر ہیں میرے گھر میں۔ اُن کی لڑکی آئی۔
 فی میں پڑھ رہی ہے۔ اس تک کی بات آئی تھی۔ ایسا میرا بیٹا ہے۔ آپ کی لڑکی میں ہے کیا — ذرا
 شنوں تو —“

پادری بنجی کر کے پیچھے ہاتھ باندھے برآمدے میں کھڑے رہے۔ ایک دم اُن کی کمر تھک سی
 گئی تھی۔

مسز بسواس کی تقریباً جاری رہی — ”ہم تو اس گدھے کے بچے کی ضد پوری کرنے اتنی دور چلے
 آئے۔ ہے کیا آپ کے پاس۔ یہ فیض گھر — میرا بیٹا تو سینٹ جانز کالج میں لیکچرر ہونے والا ہے۔ اے
 ایس۔ سی پاس ہے۔ کسی خیر پادری مشن اسکول میں نہیں پڑھاتا۔“ (حالانکہ وہ خیر پادری مشن اسکول ہی میں
 پڑھا رہا تھا۔)

”مائی ڈیر۔“ پادری بسواس نے کہنا چاہا۔

”اما —“ ایڈتھ نے آواز نکالی۔

”دیکھو تو کون سا آئی سی۔ ایس مل جائے گا آپ کی لڑکی کو، جو ان کے لپٹے ہیں ڈھاکے آکر
 سٹھ لئے۔“

”میری — کیوں اپنی جیب خراب کرتی ہو۔“ پادری بسواس نے پھر احتجاج کیا۔

”بڑا الٹی کاٹج کا شہرہ مٹا تھا۔ دیکھنی آکر ملی کاٹج — میں تو اپنے گھر میں ایک دن بھی ایسا سڑا

یو افریجنز رکھوں اور بھی ہم کوئی دیسی پادری کی تنخواہ پر گزارے ہو سکتے ہیں۔ ہماری تو گھر کی زمینداری بھی
 ہے۔ خدا باپ کا ہر طرف سے فضل ہے۔ مس صاحبہ اگر آتیں ہمارے ہاں۔ نصیب کھل جاتا۔ رانی بن کر رہیں۔“
 مسز بسواس یہ بالکل بھول گئیں کہ صرف چند منٹ قبل انہوں نے اپنی عزت کا شکوہ کیا تھا۔ مگر اب پھر انہیں
 یہ نامی نقصان یاد آگیا۔ اور انھوں نے چلا کر کہا۔ ”پانچ سو روپیہ خرچ ہو گیا ہمارا۔“ اتنے میں تو پھر بسواس
 جلدی سے باہر جا کر گھوڑا گاڑی لے آیا تھا۔ اس نے اندر آکر کھلی بار غصے سے بات کی۔

”اما — کم آن — ڈونٹ کری ایٹ لے سین۔ جی۔ میو یور سیلف پلیز — ایہ بس کرو۔“

اپنی اما کا ہاتھ پکڑ کر انھیں تقریباً کھینچتا ہوا وہ باہر لے گیا اور گاڑی میں بیٹھا لی دیا۔ یاد سی ہنری بسواس

مرجھکائے ان کے پیچھے پیچھے باہر آئے۔ ایڈتھ بسواس نے میز پر سے اٹیچی کس اٹھایا، جس میں سنہری سیل لگی
 رشی ساری اور سنگتی کی انگوٹھی مقفل تھی۔ باہر اکروہ آپک کے گاڑی میں سامنے کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ پادری
 بسواس واپس بیٹھے اور برآمدے کے درمیں کھڑے پادری بنرجی سے ہاتھ ملایا۔ ”سوری ریورنڈ۔ آئی ایم
 ویری سوری۔ ناٹ یور فالٹ۔“ انہوں نے رساں سے کہا۔ پادری بنرجی ہاتھ پیچھے باندھے سر جھکا
 خاموش کھڑے رہے۔ البتھر بنرجی سنگت روم کے دروازے سے لگی کھڑی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے
 آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا۔ لو تھر بھی جچے تلے قدم رکھتا برآمدے کی سیڑھی پر آیا اور سر خم کر کے کہا۔
 ”آئی ایم سوری اٹل۔ پلزز ڈونٹ مائیڈ مائی مدر۔ گڈ بائی۔“

”گوڈ بلیس یو مائی سن۔“ پادری بنرجی نے آہستہ سے جواب دیا۔

لو تھر جلدی سے واپس لوٹا اور گاڑی میں ایڈتھ کے برابر بیٹھ گیا۔ مشن کپاڈنڈ کے سارے بچے
 اور عورتیں گاڑی سے ذرا فاصلے پر جمع ہو گئے تھے۔ ڈربزی کے ذریعہ خبر سارے کپاڈنڈ میں پھیل چکی
 تھی۔ کل تک ڈھاکے کی ساری نینٹو کر سچپی سو سائٹی میں نشر ہو جائے گی۔

گھوڑا گاڑی لپی کاٹج کا چکر کاٹ کر پھانک کی طرف بڑھی۔ لو تھر بسواس کھڑکی میں سے سر
 نکال کر تیارہ ہوا شخصوں میں داخل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب گاڑی کپاڈنڈ سے باہر جانے لگی تو
 اس نے دیکھا کہ روزی بنرجی لپی کاٹج کے پچھواڑے اپنے غسٹوانے کی سیڑھیوں پر سنگی مورت کی
 مانند ساکت بیٹھی ہے۔ لو تھر بسواس نے احمقوں کی طرح ہاتھ اٹھا کر اُسے دیو کرنا چاہا۔ مگر ہاتھ
 مفلوج سا ہو گیا تھا۔ گاڑی چرخ چوں کرتی کچی سڑک پر آگئی۔

لپی کاٹج کے اندر پادری بنرجی اپنے کمرے میں جا کر ایک کونے میں مٹھے چھوٹ چھوٹ کر
 رو رہے تھے۔ انہیں روزی کے انکار سے زیادہ اس انکشاف سے دھکا لگا تھا کہ انہیں معلوم بھی
 نہیں ہوا مگر دنیا بدل چکی ہے۔ ہمیشہ کی طرح صابر و شاکر گری بالا بنرجی آنسو خشک کر کے جار کا
 سامان سگوانے میں مصروف ہو گئیں۔

شانتی نکیتن

اپریل ۱۹۳۷ء۔ دیپالی سرکار سری سدن کے سامنے گھاس پر بیٹھی تھر ڈائیر کے آخری پرچے کی تیاری میں مصروف تھی۔ جب ایک لڑکی نے قریب سے گزرتے ہوئے چند لفافے اس کے سامنے گرا دیئے۔ روزانہ جب ڈاک آتی تھی۔ اس کا دل دھڑک اٹھتا تھا۔ اس شام کے بعد سے وہ ایسا غائب ہوا۔ اس کی طرف سے نہ کوئی خط آیا۔ نہ کوئی مندریش۔ نہ کوئی بادل۔ نہ کوئی راج ہنس اور جب اہل مکہ داس نے چار اس بار لو کے متعلق دریافت کیا تو وہ کچھ نہ بتا سکی۔ کیونکہ روزی ہنرجی نے ڈھاکے سے کسی خط کا جواب نہ دیا تھا۔ اس کے لئے اتنا غم، اتنی فکر، اتنی پریشانی سب بیکار ہے نا۔ آج لتے پیٹے گزر گئے۔ ستمبر میں اس شام کو چھہ چہینے گزر گئے۔

دیپالی نے پہلا لفافہ کھولا۔ جہاں آرا کا خط تھا۔ درگاپو جاکي چھٹیوں میں جب وہ ڈھاکے گئی۔ جہاں آرا اپنے علاقے پر فرید پور گئی ہوئی تھی۔ روزی کے متعلق معلوم ہوا تھا کہ پادری صاحب نے اسے چھٹیاں گزارنے اپنی بہن کے پاس لال میراٹ بھیج دیا ہے۔ اومادی کلکتے میں تھیں۔ دیپالی نے ساری چھٹیاں اپنے بھائیوں کے ساتھ لوڈ کھیلنے میں گزار دی تھیں۔ اب امتحان کے بعد گرمیوں کی تعطیلات شروع ہوں گی۔ اور پھر وہ چند رکنج واپس جائے گی۔ جولائی میں کالج کھلے گا۔ پھر یہاں آجائے گی۔ اگلے سال بی اے کرے گی۔ اس کے بعد کیا ہوگا۔؟

جہاں آرا نے لکھا تھا:-

”روزی کا قصہ تو اب خاصا پرانا ہو گیا۔ جب ملوگی تو پوری داستان سناؤں گی۔ ستمبر ہنرجی اہلی کے پاس آکر رونارور ہی تھیں۔ روزی تو اس بات کا بالکل ذکر ہی نہیں کرتی۔ لال میراٹ سے واپس آکر پڑھائی میں مصروف ہو چکی ہے۔ خیر تھر ڈائیر کی ایسی پڑھائی بھی کیا۔ تم لوگ مجھ پر خواہ مخواہ رعب بھاڑتے ہو۔ بڑی آئیں بے چاریاں بی اے اسٹوڈنٹس۔ اور بھی ہم نے جو کہا تھا انٹر کے بعد گھر بیٹھے منہ کر رہے ہیں۔ مزے کیا کر رہے ہیں دیپالی، یہ تو بالکل غلط ہے۔ آبا کا حکم کیسے ٹالا جاسکتا ہے۔ آبا اعلیٰ تعلیم کے

حامی نہیں تو پھر ایف اے تک ہی کیوں پڑھایا تھا۔ پچھلے سال مارچ میں جب ابا مسلم لیگ کے اجلاس کے لئے لاہور گئے تھے نا جب پاکستان ریزولوشن پاس ہوا تھا۔ تو لاہور سے واپسی پر علی گڑھ پہنچے آئے تھے۔ اور اگر کہنے لگے کہ میں تم کو بی۔ اے کے لئے علی گڑھ بھیج دوں گا۔ مگر اس کے بعد پھر ارادہ بدل دیا۔ جانے ابا کے دل میں آئے کیا پروگرام ہے۔ ان سے کون پوچھ سکتا ہے۔

”مگر روزی نے کمال کر دیا۔ سسرلو پھر بسوا اس بے جا بے کوہری جھنڈی دکھادی۔ میں نے روزی سے کہا کہ تم بی۔ اے دونوں اپنے اپنے ماحول کے پروردہ ہیں۔ تم بغاوت کر کے کہاں جاؤ گی۔ اور یہ اونچی ذات کے بنگالی کرسمین آقا قدامت پرست ہونے پر آمیں تو ان کا کوئی جواب نہیں۔ کہنے لگی۔ سولیڈرٹی مجھے سہارا دے گی۔ میں نے اپنے آپ کو سولیڈرٹی کے لئے وقف کر دیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اور روزی کس قسم کی باتیں کرتی ہو اور کیا کرنے والی ہو۔ اللہ تم لوگوں کی عقلیں ٹھکانے پر رکھے۔

”باقی ڈھاکہ کے حالات بدستور ہیں۔ تمہاری اوارائے کلکتہ ہی میں ہیں۔ ایک خبر یہ ہے کہ نیر بھائی کی منگنی ہو گئی۔ وہ شمسہ خاں نہیں ہیں۔ امی کی پڑائی سہیلی۔ جو سنگس گیلچے میں رہتی ہیں ان کے جیٹھ کی لڑکی سے۔

”ہاں اس پر یاد آیا کہ شمسہ خاں کے پڑوس میں جل پائے گوری سے ایک مولوی صاحب آکر رہے ہیں۔ مولوی عبدالمجید خاں۔ ان کی لڑکی یاسمین میٹرک میں پڑھ رہی ہے تو بیگم عبدالمجید نے خاں سے کہا کہ یاسمین کی انگریزی کمزور ہے کوئی استانی اس کے لئے لگا دیں شمسہ خاں نے مجھ سے ذکر کیا تو مجھے ایک دم روزی کا خیال آیا۔ اور میں نے روزی سے ان کی بات چیت کرادی۔ یاسمین میرے ہاں آئی تھی۔ خاصی دلچسپ لڑکی ہے۔ مگر مجھے کچھ خبطی سی معلوم ہوتی ہے۔ جب اس کی امی کمرے سے چلی گئیں تو مجھ سے چپکے سے بولی۔ آیا۔ یہ امی اور بابا بے کار نبھے آگے پڑھانے کی فکر میں ہیں۔ میں تو ڈانسرنہوں کی۔ میں بسو چکی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ اور میں نے کہا۔ بی بی۔ اتنا قدامت پرست خاندان تو تمہارے باپ کا ہے تم کس طرح ڈانسرنہو گی۔ ذرا یہ تو بتاؤ۔ اور ڈھاکے میں جہاں ایک ہزار مسجدیں اور بیس ہزار مولوی ہیں یاسمین بی بی تمہیں ناچ سیکھ بھی یا، تو ناچو گی کہاں جا کر۔ مگر وہ سر ہلا کر کہنے لگی۔ آیا۔ دیکھ لینا۔ ایک دن میں ڈانسرنہ کر ہی دکھا دوں گی۔ میں سمجھتی ہوں اگر اس کے بابا یہ بات سن لیں تو اس کا گلہ ہی گھونٹ دیں۔ واقعی۔ مگر یہ آج کل کی لڑکیاں ہیں بھائی۔ بہر حال خواب روزی بھتیجے میں چار دن سنگس گیلچے جا کر یاسمین کو انگریزی پڑھا رہی ہے۔ اچھا ہے اس کا حبیب خرچ نکل آیا۔ روزی کے لئے بڑا دل دکھتا ہے۔ چپ چپ سی رہتی ہے اور اکثر بہت پریشان نظر آتی ہے۔

اب تم امتحان دے کر آؤ۔ تو اطمینان سے گپ شپ رہے گی۔“

تمہاری ۔ جہاں آرا

اس خط سے دیپالی کو کچھ اندازہ ہوا کہ اب تک روزی نے اس کے خط کا جواب کیوں نہیں دیا تھا۔
دوسرا خط بابا کا تھا۔

”میں خیریت سے ہوں۔ کھو کھو۔ شو نو۔ تو تو بھی اچھی طرح ہیں۔ تمہاری گھر سے فیروز حاضری کی وجہ سے
رنگرانی رکھنے والا کوئی نہیں رہا۔ اس لئے وہ بے حد شیطان ہوتا جا رہا ہے۔

”تم کو پیسوں کی ضرورت ہو تو فوراً لکھ دیا کرو۔ کبھی نہ سوچو کہ میں تمہیں پیسے نہ بھیجوا سکوں گا۔
”کل ایک بڑی افسوسناک بات معلوم ہوئی۔ تم کو بھی معلوم ہو کر رہے ہو گا۔ دیدی نے گو دام
کر دھوپ میں سکھانے کے لئے پرانے کپڑے باہر نکلے۔ ڈیڑھ دو سال سے بڑا صندوق نہیں کھولا تھا۔
حالا تو تمہاری ماں کی تین بالوچر ساڑھیوں کا غائب تھیں۔ چور کدھر سے آئے، کب چوری ہوئی۔ کچھ کچھ میں
تائے مجھے بھی بے حوصلہ رہا۔ کیونکہ یہ میری ماں کی ساریاں تھیں۔ جو انہوں نے تمہاری ماں کو دی تھیں
یاں تمہیں معلوم ہو گا۔ پرانے خاندانوں میں دلہنوں کو دی جاتی تھیں۔ اور تمہارا بچہ چوری ماں نے
وہ بہوؤں کے لئے رکھ چھوڑی تھیں۔ انھیں بننے والے مرشد آباد کے سلمان کارمگر کب کے مرکھپ گئے۔
ن بھی ان کے ساتھ گیا۔ اب یہ ساریاں ملتی نہیں ہیں۔ دیدی تو چوری کے علم اور دہشت سے تقریباً بیمار
۔ تم جانتی ہو وہ پہلے ہی سے اعصاب زعہ ہیں۔ ان کو فکر ہے کہ چوروں نے گھر دیکھ لیا تو باقی سامان
بچائے گا۔ اور مجھے یہ اطمینان ہے کہ ہمارے گھر میں اور کوئی شے چوری کے لائق ہے ہی نہیں۔“

بابا کا خط لکھنے میں واپس رکھ کر دیپالی گم سم سر جھٹکائے بیٹھی رہی اور گھاس کی پتیاں توڑا کی۔
نے گھڑی دیکھی اور لا بریری جانے کے ارادے سے یونیورسٹی کی طرف روانہ ہو گئی۔

شام تک دیپالی لا بریری میں اپنی مخصوص چھوٹی سی کھڑکی میں بیٹھی پڑھنے میں مہمک رہی کھڑکی کی
باہر اونچی اونچی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ کتابوں کی اماویوں میں پرانے کاغذوں کی ہمک رچی تھی بیشتر
ہال سے باہر جا چکے تھے۔ دیپالی کتاب بند کر کے سوچنے لگی۔ صبح ڈاک خانے جا کر ٹکٹ خریدے گی۔
لکھے گی۔ (جہاں آرا کا خط غوری طور پر جواب طلب نہیں تھا) ساریوں کے چوری کے متعلق اپنے
لہار کرے گی۔ مگر یہ دوہری زندگی جو وہ دوڑھائی برس سے گزار رہی ہے۔ اس کا انت کیا ہے؟

وقت جوش و خروش گذر جانے کے بعد جب ضمیر طاعت کرتا ہے کہ بابا کو اس طرح دھوکے میں رکھ کر تو اس ضمیر کا کیا علاج کیا جائے؟ ضمیر کیا ہے؟ میں کون ہوں۔؟ دشوا بھارتی کی کھڑکی میں بیٹھ ہوئی یہ لڑکی کون ہے؟ ریمان دادا کون ہیں؟ امارائے اور روزی ہنرجی کون ہیں؟ گرد دیو اور اکشے اور جیہاں آزار۔ ڈاکٹر جوئے چند سرکار؟ آتامیں؟ پچھلے سنسکاروں کے بنائے ہوئے ذہن؟ کیا ایک ایک قدم ایک ایک حرکت پہلے سے مقدّر ہے یا محض حادثے کا نتیجہ ہے۔ "اقتصادی، سماجیاتی تاثر" خواص۔۔۔؟

ایک مور نہایت غرور سے سر اٹھائے کھڑکی کے نیچے سے گزر گیا۔ عرفانیت اور رومان اور فلسفہ کے اس گرو تھیں۔ یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر اس سرخ آرنشک مکان کے اندر گرد دیو ابھی بڑے سوالات کا جواب دینے کے لئے موجود ہیں۔

لیکن راستہ کیسے معلوم ہے؟

سولیڈرٹی۔! سولیڈرٹی میں جواب۔ شاید۔ موجود ہے۔

اٹھو۔ دیپالی۔ وہ اکثر، چوبیس گھنٹے وقت کے اندر دینی سفر میں خود سے کہتی رہتی۔

اٹھو۔ اب یہ کام کرنا ہے۔ اب یہاں سے جانا ہے۔ اب یہ پڑھنا ہے۔ اب اس سے بات کرنی ہے۔ محکومت۔

وہ کھڑکی میں سے اٹھی اور کتابیں سمیٹ کر باہر نکلی۔

۱۳

مس روزی ہنرجی اور سولیڈرٹی

روزی ہنرجی بسواس فیملی کی کاٹھی کیا ڈنڈ سے باہر نکل جانے کے بعد غسل خانے کی سیڑھی پر ساکت و صامت بیٹھی رہ گئی تھی جس وقت میز بسواس سبنگ روم میں دھاڑ رہی تھیں وہ غسل خانے کے کواڑ سے کان لگائے کھڑی تھی۔ اور اس نے سنا تھا کہ ہم نے انگریزی کی۔ میری سسٹر ان لائن لکھا لڑکی کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ اسی کے ہندو بوائے فرینڈز ہیں۔ لڑکی کانگریسی کیونسٹ ہو گئی ہے

وہ دھک سے رہ گئی۔ یہ خبر کس طرح پھیلی؛ اب باپا اس کا کس طرح قیہ اور بھرتہ بنائیں گے۔ اُسے بڑا تعجب ہوا جب اس نے رات کو اپنے کمرے سے باہر نکلی کر دیکھا کہ باپا اور ماما دونوں نے اس ایک لفظ نہیں کہا۔ باپا روتے رہے تھے (یہ دیکھ کر اس کا دل کٹ کر رہ گیا) اور ماما کی بھی آنکھیں دھجی ہوئی تھیں۔ مگر وہ دونوں خاموش تھے۔

بادری بنرجی کی یہ خاموشی وقتی نہیں تھی۔ اس روز کے بعد سے انہوں نے اپنی اکلوتی لڑکی سے ل چال تقریباً بند کر دی۔

ریورنڈ بنرجی کی خفگی روزی سے محض اس بنا پر نہیں تھی کہ اس نے لو تھر بسواس اور اس کے ندان کے سامنے ان کو اس بُری طرح شرمندہ کیا۔ انہوں نے دوسرے ہی روز مختلف ذرائع سے روزی سرگرمیوں کے متعلق معلوم کر دیا تھا۔ اور ان کو پتہ چلا تھا کہ مسٹر بسواس کی ناوجہ سیسٹر کی اطلاع تھی۔ روزی بنرجی اکثر اہل برات شہر کے کولون کھدروں میں بند ٹھنڈ، قہنہ پرداز اور حکومت باغی اور غدار ہندو اور مسلمان نوجوانوں کے ساتھ دیکھی گئی تھی۔ اس اطلاع نے ریورنڈ بنرجی کا جھکا دیا تھا۔

اسی دوران میں چارلس بارلو کے متعلق دیپالی کا خط پہنچا۔ روزی نے وہ خط پڑھ کر بے پرواہی سے کرکے آتش کر دیا۔ اور لڑ کر سوچا۔ مجھے جیل بھیجا جاسکتا ہے۔ مگر کسی کو معلوم ہو جائے کہ میرے لیے دیپالی آیا کے بھیس میں کینٹ ویل کے جنگل پر پہنچی تھی تو مجھے جیل ہو سکتی ہے۔ میں اپنے سیدھے نیک دل باپ کو کس قصور میں سزا دے رہی ہوں؟ کیا یہ ان کا تصور تھا کہ ماما کو بال و دھوا بٹا پڑا۔ پانے پیٹ کی خاطر مذہب تبدیل کر لیا۔ میری سمجھ میں یہ چند باتیں آگئی ہیں، تو کیا دنیا کے حالات بدل جائیں گے؟

وہ اب خاموشی سے کالج جاتی اور واپس آ کر اپنے کمرے میں پڑھتی۔ تعطیلات میں البتہ بنرجی نے شوہر کو سمجھا بچھا کر اس کے لئے لال میسرماٹ کا ٹکٹ منگوادیا۔ شمالی بنگال سے واپس آ کر وہ پھر اپنی اہلی میں لگ گئی۔ کبھی کبھار جہاں آوارہ کے اصرار پر ارجمند منزل چلی جاتی۔ مگر ارجمند منزل کی امارت اور آتش اسے اور زیادہ مضطرب کرتے۔ یہ لوگ اتنے امیر اور باعزت ہیں۔ میں غریب اور کم حیثیت ہوں۔

نیا چرنین لوگ میرے گھر آ کر میرے ماں باپ کو ان کے افلاس کا طعنہ دے کر چلے جاتے ہیں اور میرا

باپ میری خاطر آنسو بہاتا ہے۔ آخر یہ سب کیوں۔ میں اس کا حل کس طرح تلاش کروں۔ پھر جہاں آرا نے اس کے لئے مولانا صاحب کے ہاں سگن گئیے میں ٹیوشن لگا دیا۔ (دوہ لڑکی یاسین بھی خاصی باؤلی سی تھی۔ جانے ہم لوگوں کا کیا حشر ہوگا) اور وہ شام کو وہاں جانے لگی۔

ایک روز وہ ٹیوشن کا شکریہ ادا کرنے کے لئے جہاں آرا کے یہاں ارجمند منزل گئی تو جہاں آرا نے بڑی حیرت سے اُسے دیکھا۔ شمالی بنگال کی برہمن عورتیں بیہ گوری ہوتی ہیں! اور روزی بھی اپنے سفید اور حسین رنگ دروپ کے لئے مشہور تھی۔ جہاں آرا نے اس سے کہا۔ "روزی۔ تم تو بالکل پسلی پڑ گئیں تم نے ان کو چلتا کیا۔ بہت اچھا کیا۔ اب گیوں بکس رہی ہو؟ سوچو، تم میں اتنی ہمت ہے کہ انکار کر دو۔ مگر جب میری اس طرح شادی طے کی جائے گی تو میں سر جھکا کر ہاں کر دوں گی۔"

"تمہاری شادی۔ جہاں آرا۔؟" روزی نے پوچھا۔

اچانک جہاں آرا کاؤٹیکہ میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

"جینز کرائسٹ۔ تم کو کیا ہو گیا جہاں آرا۔" روزی نے گھبرا کر کہا۔

"کچھ بھی تو نہیں۔" جہاں آرا نے آنسو پوچھ کر کہا! اور سیدھی ہو بیٹھی۔

روزی نے پہلی بار جہاں آرا کو تعجب سے دیکھا۔ یہ خوش قسمت، باعزت، پردہ نشین عیسوی رادی جو بیرونی دنیا کے خطروں اور مصیبتوں سے محفوظ و امون اپنی مجلسِ ایں آرا سے بیٹھو ہے۔

اسے کیا فکر ہے، صرف یہی کہ جانے کیسے آدمی سے شادی ہوگی۔ ساری پردہ نشین لڑکیوں کا نقص

یہی ایک مسئلہ تھا۔ جہاں آرا۔ روزی اور دیپالی دونوں سے بڑی تھی۔ اور روزی کو یاد آیا۔ کچھ سال

ایک مرتبہ ماما کہہ رہی تھیں۔ بیگم قمر الزماں اس فکر میں گھلی جا رہی تھیں کہ جہاں آرا چھوٹے سال کی ہو گئی۔

اپنے ہم پیر دوستوں کے لڑکے جاہل اور نکمے ہیں۔ متوسط طبقے میں بیاہ دینے سے ناک کٹ جائے گا۔ اس کے

علاوہ جہاں آرا کی شادی کے سلسلے میں اور کیا مسائل تھے۔ ان کا ذکر بیگم قمر الزماں نے سسر بزرگ سے نہیں

کیا تھا خود جہاں آرا نے اپنے نجی معاملات کے بارے میں اپنی سہیلیوں سے آج تک کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا

میں! ماما کی اچھی خاصی شکل تھی گودہ دیپالی کی طرح رنگش اور روزی کی طرح گوری نہ تھی۔ لیکن وہ سمجھ

دار حساس اور خاموش طبیعت لڑکی تھی۔ اس کا ایک بڑا بھائی اور دو چھوٹی بہنیں تھیں۔ لیکن وہ اس

میں مختلف اور علیحدہ معلوم ہوتی تھی۔

روزی نے آج تک جہاں آرا کی ذاتی زندگی کے متعلق نہ سوچا تھا۔ اسے اور دیپالی کو کالج کے
 رازموں اور اب سیاسی مسائل ہی سے فرصت نہیں تھی۔ ہم سب اپنی اپنی دلچسپیوں اور اپنے اسٹڈیز کے سلسلے
 میں کتنے خود غرض ہیں۔ روزی کو اس وقت پہلی بار خیال آیا۔ اس نے دوبارہ جہاں آرا پر نظر ڈالی، جو اپنی شاندار
 نوابگاہ میں مسند پر نیم دراز پھر چپکے چپکے رو رہی تھی۔

”جہاں آرا —“ روزی نے انھیں سے کہا۔ وہ کچھلے چند ہینوں میں بڑی ہو گئی تھی اور خود کو بوڑھو
 عورت سمجھنے لگی تھی۔ چند ماہ قبل اگر وہ جہاں آرا کو اس طرح روتے دیکھ لیتی تو فیوڈل روڈ میٹک میر دین، کہہ کر
 اس کس طرح لے نہ چڑھتی۔

پھر روزی نے سوچا۔ میں اور دیپالی خوش قسمت ہیں کہ ہمارے پاس سولویڈرٹی موجود ہے۔ جو ہمارے
 ذاتی اور جذباتی مسائل سلجھانے میں ہماری مدد کرے گی۔ مگر بے چاری جہاں آرا، واقعہ یہ ہے کہ اپنے جاگیر
 مذہبی رجعت پسند تمدنی حصار میں قید ہے۔ اور اسے سہارا دینے والا کوئی نہیں۔ نہ یہ کچھ سمجھنا چاہتی ہے۔
 پھر جہاں آرا مسند سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اپنی جاہدانی کی ساری کے پتوں کو ایک بازو
 پر لپیٹے ہوئے اس نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ ”روزی — ذرا اپنی صورت دیکھ آئیے میں۔
 اتنے دنوں میں ایسی زرد پڑ گئیں تو ابھی سے سوچ لو کہ کس حد تک بغاوت کر دو گی۔“
 ”سولویڈرٹی —“ روزی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”وہ کس ہلاکا نام ہے۔ جہاں آرا نے غصے سے کہا۔ پھر اس نے طازمہ کو چائے لانے
 کے لئے آواز دی۔

”میں نے سولویڈرٹی کے لئے خود کو وقف کر دیا ہے۔ وہی مجھے سہارا دے گی۔“ روزی
 نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

جہاں آرا نے اسے اچنبھے سے دیکھا۔

”تم کو کچھ معلوم نہیں جہاں آرا یہ کہہ کر دنیا میں کیا ہونے والا ہے۔“ روزی نے اب ذرا باہر
 آواز میں کہا۔

”تمہیں معلوم ہے؟“

روزی خاموش ہو گئی۔

ملا نفرتی کشتی میں چائے لے کر حاضر ہوئی۔ جہاں آرا کی چھوٹی بہنیں انجم آرا اور اختر آرا شور مچاتی اندر آ گئیں۔ جہاں آرا فوراً ہنس ہنس کے اور مصنوعی ہنساشت سے ان کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ روزی چپ چاپ کشتی کے گنگا جہنی نقش و نگار کو دیکھتی رہی

”اور سناؤ روزی۔“ جہاں آرا نے چائے بنا کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری شاگرد اور مستقبل کی مشہور رقاصہ یا سمین عجید کے کیا احوال ہیں۔“

۱۴

آمار پرانیر آرام مونیر آئندہ

بی اے پر لویس کے امتحان ختم ہو چکے تھے۔ مگر دیپالی موسیقی کے ایک اعلیٰ امتحان کی تیاری کے سلسلے میں مزید چند ہفتوں کے لئے شانتی نکلیتیں میں ٹھہری ہوئی تھی۔ ساری درسگاہ تقریباً مسلمان ہو چکی تھی۔

آخر می کی ایک گرم شام وہ کلا بھون کے باغ میں گھاس میں ڈولے گوتم بدھ کے مجسمے کے نیچے بیٹھی قدیم راگوں کے ایک ”شجرے“ پر سر رکھا رہی تھی۔ جب درختوں میں سے نکل کر اس کا داس اُس کے سامنے نمودار ہوا۔ اہل ایک خوش مزاج لڑکا تھا۔ ہر وقت باجھیں کھلیں رہتی تھیں۔ سامنے آکر نمسکار کرنے کے بعد اس نے ایک کتاب دیپالی کو دی۔

دیپالی نے کتاب کھولی۔ اس میں سے حسبِ توقع ایک پرچہ نکلا۔ دیپالی کا دل بڑے زور سے دھڑک اٹھا۔ پرچے میں لکھا تھا۔

”پیاری بچی۔“

معاف کرنا تم کو اتنے طویل عرصے تک کوئی خیر خبر نہ بھیجوا سکا۔ (اندازِ تحریر کیس قدر غیر شخصیت تھا۔ کمال کی تکنیک ہے۔ واقعی دیپالی نے سوچا، تم نے اس بار ہیں خاصی بری طرح لیٹ ڈلوں کہ دیا۔ مگر ظاہر ہے کوئی زبردست مجبوری رہی ہوگی۔ بہر حال۔ اب اہل تم سے جو کہتا ہے اس پرچہ۔ از جلد عمل کرو۔ اس میں تمہارا بہت فائدہ ہے۔ فقط۔“

”ریحان داد سمبر کے مہینے سے کھلنا اور اس کے بعد سے نوا کھالی میں تھے آج کل وہ خاص الخاص
میں ایک جگہ چھپے ہوئے ہیں۔ میں اُن کے پاس سے کل ہی واپس آیا ہوں۔ ریڈیو کی نئی میٹری
ساتھا۔“ اُن اطمینان سے گھاس پر بیٹھ گیا۔

”مگر ریحان دانے مجھے کیا کرنے کو کہا ہے؟“ دیپالی نے پوچھا۔
”بتا ہوں دیدی۔ بتاتا ہوں۔ میں تو سمجھا تھا کہ آپ دھاکے واپس گئیں۔ مگر راستے میں معلوم ہوا
ابھی۔“

”اٹل بات بتاؤ۔“ دیپالی نے ذرا جھنجھلا کر کہا۔
”بات۔ بات کچھ بھی نہیں۔“ اُن نے کھیسیں نکال کر جواب دیا۔ ”ریحان دانے آپ کو
بنا بلایا ہے۔“

”کیا۔؟“

”ہی۔ دیدی۔؟“

”مجھے سندرن کیوں بلایا ہے؟ وہاں پہنچنا آسان ہے؟ اور کس لئے؟“
”پہنچنا آسان بالکل نہیں ہے۔ بڑا خطرناک سفر ہے، دیدی اور کیوں بلایا ہے۔ یہ مجھے کیا معلوم۔
نہی کہا تھا۔“ اپنی دیپالی دی کو فوراً یہ سندریہ دو ایک سیدھا ہم میٹنگ میں ان کی شرکت ضروری ہے۔
”اور کون کون جارہا ہے۔“

”دادا نے کہا تھا دیپالی دی کو بتا دینا کہ سریندر دا، محفوظ الرحمن میاں، لودران کی بیوی عائشہ
گے۔ باریال سے۔ یہاں سے آپ ہوں گی اور محمود الحق دا۔ دھاکے سے پہنچیں گے۔ کافر نس ہے۔
ن نے تھوڑی سی چیزیں بھی منگوائی ہیں۔ لیتی جائیے گا۔“ اٹل نے کرتے کی جیب سے ایک فہرست نکال
ن۔ فہرست میں چند نئے اخباروں اور بھانوی رسالوں کے نام لکھے تھے۔

”دادا کو بس ان کتابوں کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہئے؟“ دیپالی نے تعجب سے پوچھا۔ ”اُن کا دل
کھانے کھانے کو بھی تو چاہتا ہوگا۔ میں۔۔۔“
”یہ کچھ نہیں بتایا۔ لے جائیے ایک آدھ اجارہ خنی۔“

”اور میں جاؤں گی یہاں سے کس طرح؟“

”آپ یہاں سے رانا گھاٹ اسٹیشن تک اکیلی جائیے۔ ریحان داکا ایک آدمی آپ کو رانا گھاٹ اسٹیشن پر ملے گا۔ وہ آپ کو جیسور کے راستے سے کھلنا تک پہنچائے گا۔ وہاں سے ایک اور آدمی کو باگھیراٹ تک لے جائے گا۔ باگھیراٹ سے۔“ اگلے پندرہ منٹ اس نے دیپالی کو ریحان پہنچنے کا پتہ دار راستہ سمجھانے میں صرف کئے اور ایک تنکے سے مٹی پر دریاؤں اور ٹرینوں کا نقشہ بنایا۔ دیپالی آنکھیں پھیلنے لقمہ سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔

پھر اہل جلدی سے اٹھا اور مداری کی طرح جیب سے نکال کر دوستو کے نوٹ اسے تھما دیئے۔
 ”یہ کیا ہے؟“

”ریحان دانے بھجوائے ہیں کرائے کے لئے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ دیپالی سے کہنا آج کل ہم بہت سخت رئیس ہو رہے ہیں۔ اسی لئے تم لوگ جلدی سے آکر جنگل میں تھوڑا سا جشن منا جاؤ۔ پھر پیسے ہو جائیں گے۔ اور اس کے بعد اور بھی نہ جانے کیا ہو جائے۔“

”یہ بیکار کی بات ہے۔“ دیپالی نے متانت سے کہا۔ ”تمہارے ریحان والے بعض مرتبہ ایسی ڈرمٹک باتیں کیوں کرنے لگتے ہیں۔“ اُس نے نوٹ اپنے بیگ میں رکھ لئے۔

”اچھا اب میں بھاگتا ہوں دیدی۔ آپ کو جس دن روانہ ہونا ہو، مجھے ایک پوسٹ کارڈ ڈال دیجئے گا۔ میں آپ کو یہاں سے رانا گھاٹ جانے والی ٹرین پر بھٹال دوں گا۔“ اہل سر سے اوپر ہاتھ اٹھا کر اسے نمسکار کرتے ہوئے لمبے لمبے ڈگ بھرتا سر کی طرف چلا آیا۔ دیپالی گوتم بدھ کے کا اونچے مجسمے کے پیروں کو غور سے دیکھنے لگی۔ کلا بھون کے جس فنکار نے یہ مجسمہ بنایا تھا وہ دانا بڑا زبردست ماہر اناٹومی تھا۔ کیوں کہ پاؤں کی ایک ایک انگلی کا ایک ایک جوڑا اور ناخن بے حقیقی معلوم ہو رہا تھا۔ سامنے دوسرے شیا علی مجھنیروں کی دیواروں پر بنے ہوئے سیاہ مجسمے بڑے جاندار سے دکھائی دے رہے تھے۔ ایسا الگ رہا تھا۔ جیسے وہ میگھ دوست کے اسٹیج پر رو رہے۔ کھڑی ہے اور ڈیکور کی مورتیاں اُسے گھور کر دیکھ رہی ہیں۔ اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سیاہ بادل خلیج اور سندربن کے اوپر سے بہتے بیرجھوم کی سمت بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ اس نے آنکھوں پر زور ڈال کر دھیان سے دیکھا تو سیاہ بادلوں میں ایک سفید لنگر اوپر اڑتا جا رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خوب ہو سکرائی اور اس کا چہرہ بھی مبسم تھا۔ پھر اس نے جلدی جلدی ہوسٹل کی سمت قدم بڑھانے شروع

رات کو اپنے کمرے میں لیمپ کے سامنے بیٹھ کر خود سے کہا۔ اب میں اپنے باپ کو ایک اور
 ست دھوکا دیتی ہوں۔ اُس نے لکھا۔ بابا۔ یہاں سے لوگ گیت جمع کرنے والوں کی ایک ٹولی
 ل پرگنہ کے گاؤں میں جا رہی ہے۔ انہوں نے مجھے بھی ساتھ چلنے کے لئے کہلایا ہے۔ کیونکہ یہ ٹو مری
 بی آن میوزک کے دوسرے پرچے کے لئے بہت کارآمد ثابت ہو گا۔ میں جلد ہی گھر پہنچنے کی کوشش
 مگی۔ آپ فکر نہ کیجئے۔ آپ کی بیٹی، دیپالی
 خط بند کر کے وہ باہر آئی۔ نیم تاریک روضوں اور سنسان باغ میں سے گزرتی مڑھک تک پہنچی
 نکھیں بند کر کے خط لیٹر بکس میں گرادیا۔

۱۵

سندربن

سندربن کا سلسلہ جنوبی بنگال میں چھوٹے پرگنہ سے لے کر باترگنج اور کھلنا کے اضلاع تک پھیلا
 ہے۔ ان گھنے اور پرخطر جنگلوں میں مشہور عالم رائل بنگال ٹاؤن شپ اور چیتے اور ہرن دوڑتے پھرتے ہیں۔
 ان کے وقت رات کا سا اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ لاتعداد ندیوں اور جزیروں اور سمندری کھاڑیوں
 لہلوں اور سمندری درختوں کی اس لرزہ خیز حسین و جمیل کائنات میں، اکاد کا پھیروں اور کھڑا روں کی
 ان گھنے جھرمٹوں میں پوشیدہ ہیں۔ سندربن کا یہ وسیع و عریض علاقہ دنیا کے حسین ترین اور خطرناک ترین
 مابین سے ہے۔

دیپالی سرکاری کشتی باگھیراٹ سے روانہ ہو کر ایک نامعلوم منزل کی طرف بہتی جا رہی تھی۔
 چاروں طرف کے مٹیباگ حد خوبصورت مناظر کو دیکھ دیکھ کر سکتے میں بیٹھی تھی۔ اور اس کا دل دھڑک
 رہا تھا۔ وہ ریکان دا سے ملنے جا رہی ہے۔

ریکان دا — چیوٹوں کی چپ شپ اور کائنات کی اس آبی اور سبز سمفنی میں یہی نام مرتعش
 — وہ ریکان دا سے ملنے جا رہی ہے۔

دن بھر چلتے رہنے کے بعد کشتی شام کو ایک گاؤں کے گھاٹ پر پہنچی۔ سنسان جیٹی پر ایک بوڑھا

مسلمان جس کی سفید دادرھی ہو ایں لہر رہی تھی لائین لم تھ میں لئے کھڑا تھا۔ دیپالی اپنا اٹیچی کیس (یہ تارک اپنی کیس!) اور تھیلا اٹھا کر بانس کی جٹی پر اتری۔ لاج لئے کھٹنا کی ساحلی جنگہ میں بوڑھے مولوی سے کوئی کہی۔ مولوی نے لائین اٹھا کر دیپالی سے کہا۔ ”میرے ساتھ آؤ بیٹی۔“

کشتی بانی پر واپس چلی گئی۔ دیپالی اب بھوکے عالم میں اس ازلی جنگل میں تنہا کھڑی تھی۔ میں کہاں سے کہاں آگئی۔ اس نے جبرت اور خوف کے ساتھ سوچا۔ لیکن دیکھان اس راستے کے سرے پر موجود ہیں۔ محفوظ ہوں۔

بوڑھے نے اس کا بکس اور تھیلا اٹھا کر کندھے پر رکھ لیا۔ وہ اس کے ساتھ جٹی پر سے اتر کر پگڑی بڈی آگئی۔ بوڑھا بلا کی پھرتی سے قدم اٹھا رہا تھا شاید اس بوڑھے نے اپنی ساری عمر اسی جگہ پر گزاری ہے اور اسی جگہ اسی حالت میں مر جائے گا۔ ہم نے اس کے لئے کیا کیا ہے اور کیا کر پائیں گے؟ یہ سوچ کر دیپالی حسب عادت نئے جوش کے ساتھ اپنی رفتار تیز کر دی۔

”باقی لوگ آگئے؟ دیپالی نے بوڑھے سے پوچھا۔

وہ چپ رہا۔ دیپالی کو تکلیف ڈر سالگا۔ پھر اس نے سوچا۔ شاید یہ میرا شہری لہجہ نہیں سمجھ سکا۔ اس نے اپنا سوال دہرایا۔ ”دوسرے لوگ جو آنے والے تھے۔“

بوڑھے نے نفی میں سر ہلادیا۔ دیپالی متفکر ہو گئی۔ مگر — کیا ہو سکتا تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکا تھا۔ مگر میں اتنی دہشت زدہ کیوں ہو رہی ہوں۔ حد ہے۔ اگر میں نے کوئی حماقت کی ہے تو۔ تو اُسے بھگتنا پڑے گا۔ اوماں — اوماں — اوماں — دیپالی نے بے طرح ہڑ بڑا کر دیوی سے دعا کرتے مانگنا شروع کر دیں۔

آدھ گھنٹے میں وہ لوگ درختوں کے ایک جھرمٹ میں پہنچ گئے۔ جس کے ایک طرف ندی رہی تھی۔ سائیکلوں کے تعبیر طروں سے شکستہ لیکن خوبصورت بانس کا جھونپرا سامنے کھڑا تھا۔ برآمدے پر پھولوں کی بلیس جڑھی تھیں اور طاق میں دیا جل رہا تھا۔ مولوی نے کبس اور تھیلا برآمدے کے کچے فرش پر رکھ کر آواز دی۔ ”زینب!“

ایک بوڑھی عورت پیوندوں سے بھری اودی ساری پیٹے اندر سے نکلی۔ اس نے جھک کر دیپالی کو غور سے دیکھا اور مسکرائی۔ ”آؤ — آجاؤ —“

دیپالی نے اسے نمسکار کیا اور اس کے پیچھے پیچھے تین کردوں کے صاف تھرے جھونپڑے میں داخل ہوئی۔
 ”تمہاری کھاٹ میں نے اپنی کوٹھری میں بچھا دی ہے۔ برابر والے کمرے میں مولوی صاحب اور میرے
 فوں بیٹے رہتے ہیں۔ وہ دونوں کام سے کھٹنا گئے ہوئے ہیں۔“
 دیپالی کھاٹ پر بیٹھ گئی۔

”تم کو بھوک لگی ہوگی۔ راستے میں کچھ کھایا تھا۔ یہ لو۔“ بوڑھی عورت نے بیٹے ہوئے
 دل کے بیٹھے لڈو ایک رکابی میں رکھ کر اُسے پیش کئے اور پانی کا گلاس اس کے سامنے رکھا۔ یہ غربت اور
 بے خاننوازی۔ دیپالی کے حلق میں کوئی چیز آگئی۔ اس کی جھپکی ہٹ دیکھ کر بوڑھی عورت نے کہا۔
 ”جان میاں باہر عی پر بیٹھے ہیں ادھر۔“

دیپالی نے غربت کا دور سے مطالبہ کیا تھا۔ وہ سفید پوش طبقے کی ناداری سے واقف تھی جو اس
 اپنی ناداری تھی۔ اس نے شہر کے غریب کا افلاس دیکھا تھا مگر ایسی غربت اسے آج تک نظر نہیں آئی تھی۔
 نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ مولوی صاحب زینب بی بی کے شوہر برآمدے میں چٹائی بچھا کر مغرب کی نماز
 محو ہو چکے تھے۔ اس نے زینب بی بی سے چند باتیں کیں۔ ایک لڈو دانتوں سے کتر اور لالٹیں ہاتھ میں لے
 پچھلے برآمدے میں نکلی جس کے عین نیچے ندی بہاواں تھی۔

ندی کے کنارے جھونپڑے کی طرف پشت کئے وہ بیٹھا تھا۔
 وہ آہستہ سے نیچے اتری اور اس کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔ وہ کہتی پر سر رکھے اپنی سوچ میں ڈوبا ہوا
 ۔ آہٹ پر اس نے سر اٹھایا اور مسکرا کر کہا۔ ”شوکتی آگئیں۔“

”ہاں۔“

وہ آہستہ سنجابی دینے کے انداز میں مسکرایا۔ ”گو گرل۔ بریو لٹل گرل۔“
 اُس کے چہرے سے داڑھی غائب تھی۔

”آپ نے۔“ دیپالی نے اپنے چہرے پر اٹکھٹا اور انگلی پھیری۔

”ہاں بھائی۔ دوڑھائی برس سے کسی طرح اس کجخت داڑھی سے پیچھا ہی نہیں چھٹتا تھا۔ مسلمان
 ہی۔ ہندو داڑھی۔“ جید جھاڑ جھنکار ہو گئی تھی۔ ”میاں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آزادی سے سارے

میں گھومتا ہوں آج صبح تہلے آنے کی تقریب میں مولوی صاحب کے بڑے لڑکے سے استراے شیو کیا۔ دیکھو ٹھیک ہے نا۔ "اُس نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے ایک بائیں رخسار پر اُسٹری کا خفیف سا زخم تھا اور خون کی بوند جم گئی تھی۔ خون کے اس قطرے کو دیکھ کر وہ چاہا کہ بے حد مضطرب ہو گئی۔

ندی کا رنگ سرخ ہو گیا۔ دور سے شیروں کے گرجنے کی آواز آرہی تھی۔ ریمان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر کہا۔

"ابھی تمہارے آنے سے پہلے میں سوچ رہا تھا۔" پھر اس نے ٹھٹھک کر پوچھا۔ تم نے علاؤل پڑھا ہے؟

"تھوڑا سا۔"

"کوئی نظم یاد ہے؟"

"راتِ سرخ اور تاریک تھی۔"

"ہاں۔ ادھر دیکھو۔" ریمان نے دھڑاؤ کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں سمندر اور دریا اور جنگل ایک ہو گئے تھے۔

"سرخ اور تاریک رات میں ایک بہری ناؤ۔" اس نے پانی میں انگلیاں ڈبو کر آہستہ آہستہ اپنی خوبصورت آواز میں کہنا شروع کیا۔ "بہتی۔ ڈوبتی، طوفان زدہ، میجر خائف، ارکان کے ساحل کی طرف بڑھ رہی تھی۔"

"لیکن طوفان آیا۔" دیپالی نے مسکرا کر کہا۔

"لیکن طوفان آیا۔" ریمان کہتا رہا۔ "اور ناؤ ساحل کے بجائے ایک دور دراز جزیرے سے جا لگی اور ناؤ میں سے وہ نوجوان نکلا۔ بھوکا، زخمی، نڈھال۔ وہ ریت پر پڑا تھا۔ جب وہ لڑکی وہاں پر آئی اور اس نے کہا۔"

"اُس نے کہا۔ میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گی۔ انسان کو بے آسرا اور مایوس نہ ہونا چاہیے۔" دیپالی نے کہا۔

"تم انسان ہونا۔ تاکہ ایک تنہا غصہناک سمندر کی روج تو نہیں؟"

سلہ سید علاؤل۔ سترہویں صدی بنگال کا عظیم شاعر جس کی کئی پرتگالی قزاقوں اور طوفانوں کا مقابلہ کرتی اداکان پہنچی

وہ ٹھٹھک گئی اور ریکان کو دیکھ کر علاؤل کے الفاظ میں سوال دہرایا۔

ریکان نے اقرار میں سر ہٹایا۔

”کیونکہ —“ دیپالی کہتی رہی۔ ”سمندر اپنے غیظ میں مبتلا سارے کرۂ ارض کے ساحلوں سے ٹکراتا ہے۔ مگر زمین تک نہیں پہنچ پاتا۔ زمین مضبوط ہے۔ اس نے انسانیت کے مظالم کا بوجھ اپنے اوپر اٹھا رکھا ہے۔ سمندر تو ایک چھوٹی سی نوکا کو بھی سمہارا نہیں دے سکتا۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے بڑے بڑے میورینگی جہاز چاہئیں۔ ایسے بکرے، جن کو چودہ چودہ ماٹھی کھیتے ہیں۔“

”اور اس لڑکی نے علاؤل سے کہا تھا — دھرتی پر گھر بنے ہیں۔ آسمان خود بصورت ہے۔ چاند خوب صورت ہے۔ مگر چاند نیں گھر نہیں ہے۔ گھر ناریل کے سائے میں بنتے ہیں۔ میں تمہارا گھر بنوں گی۔“
ہوا ساکت رہی۔ کائنات ہنسم گئی۔ ندی نے مہنا بند کر دیا۔ ایک ازلی، ابدی لحظے کے لئے سارا وجود غلامیں تحلیل ہو گیا۔

پھر ہوا چلی۔ سمندری کے درخت سرسرائے۔ ندی پسنے لگی۔ دیپالی اپنی گودی میں ہاتھ رکھے اسی طرح ساحل پر بیٹھی رہی۔

”پھر کیا ہو سکتی؟ علاؤل نے اسے کیا جواب دیا؟“ ریکان کی آواز سناتے میں لہروں کے ساتھ گونجی۔
”مجھے پتہ نہیں آگئے مجھے یاد نہیں آ رہا۔“ دیپالی نے جواب دیا۔ پھر اس نے سادگی سے پوچھا ”آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے۔“

”ایک اہم کانفرنس کے لئے۔“ ریکان نے سنجیدگی سے کہا۔

”باقی لوگ ابھی نہیں پہنچے۔ سرنیدر دا وغیرہ ادھلا لٹہ آیا۔“

”نہیں، بس اب آتے ہی ہوں گے۔“

”میں آپ کی ساری چیزیں جو مشکواتی تھیں لیتی آئی ہوں۔“
”گڈ۔“

”دیپالی نے بیگ میں سے دو سو کے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔“ یہ آپ کے پاس کہا
سے آگئے تھے۔“

اس نے چونک کر نوٹوں پر نظر ڈالی۔ ”ہیں! اپنی کتاب کی رائٹنگ ملی تھی۔ مگر تم کیسے آئیئر

یہاں تک ۔

”ہم بھی رئیس ہو گئے ہیں۔ ہمیں اپنے ریکارڈوں کی رائٹی ملے تھی۔“

”افوہ۔ تو اس وقت گویا دوسرا یہ دارسند بن میں آؤٹنگ کر رہے ہیں۔“ اس نے شلفگی سے ایک کنکریاتی میں پھینکا۔

دیپالی پھر بڑی متفکر نظر آئی۔ ”ریجان دا۔“

”کہو۔“ وہ کنکراٹھا اٹھا کر ندی میں پھینکنا۔

”باقی لوگ کہاں ٹھہریں گے؟“

”ارے بھئی۔“ اس نے چونک کر جواب دیا۔ ”کیا باقی لوگ باقی لوگ کر کے پور کر کھلے۔“

”کیوں؟“

وہ قبضہ لگا کر منہ ا۔ اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

دیپالی نے بھونچکی ہو کر اسے دیکھا۔ ”تو آپ نے اوئل سے جوٹ بولا تھا۔“

”بالکل۔“

”اور آپ کا خیال تھا۔ میں چلی آؤں گی۔“

”میرا خیال صمیع تھا۔!“

”دیپالی عینتے سے دوسری طرف مڑ گئی۔“

”شوکتی۔!“

اس نے جواب نہیں دیا اور ندی کے کنارے کنا رے چلنے لگی۔

”شوکتی۔!“

وہ اور آگے بڑھ گئی۔

”ایسے ہی چلتی چلی جاؤ تو سیدھی ڈھاکے پہنچ جاؤ گی۔ مگر ذرا خیال رکھنا۔ وہ تمہارے سامنے ایک عدد

آدم خور گھڑیاں بٹھا ہے۔“ ریکان نے بشارت سے آواز دی۔ سامنے ندی کی سطح پر ایک سیاہ لکیر نظر آرہی تھی۔ ایک گھڑیاں تیزی سے دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دیپالی چیخ مار کر واپس پٹی۔

ریکان کھلکھلا کر ہنستا ہوا سیڑھی پر بٹھ گیا۔ دیپالی اس سے کچھ فاصلے پر دوسری سیڑھی پر آ بیٹھی۔

ندی کا پانی سیاہ ہو چکا تھا اور دوسرے کنارے پر بندری کے جھنڈ سرسرا رہے تھے۔ ریحان نے سر اٹھا کر دیپالی کو دیکھا۔ پھر وہ یکلخت سید سنجیدہ ہو گیا اور اس نے آہستہ سے کہا، "شاید مجھے کوئی حق حاصل نہیں تھا کہ میں تم کو اس طرح۔ اس طرح زحمت دوں۔"

وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ ریحان نے گھبراواڑ میں کہا۔

"دیپالی۔ میں تین برس سے مسلسل متواتر تین برس سے جرائم پیشہ لوگوں اور ڈاکوؤں کی طرح چھپتا پھر رہا ہوں۔ بدلتوں سے مجھے چین کی نیند اور ذرا سی ذاتی مسرت نصیب نہیں ہوئی۔ تمہیں معلوم ہے چارلس بارلو نے قسم کھائی ہے کہ زندہ یا مردہ مجھے گرفتار کر کے رہے گا۔؟ تم۔ تم مجھے کیا سمجھتی ہو۔ میں انسان ہوں آخر۔ فولاد کی مشین گن تو ہوں نہیں۔ یا ہوں۔ بتاؤ۔؟" اس نے دوبارہ شگفتگی کو شش کی۔ پھر اس نے کہا "نہیں۔ دیپالی میں تم سے ملنا چاہتا تھا۔ شاید مجھے اس طرح غلط ہٹا کر کے تم کو اتنی دور نہ بلانا چاہئے تھا۔ مگر میں بے حد خود غرض انسان ہوں اور ہر حال اب تو تم آ ہی نیں۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟" اس نے پھر ہنسنے کی سعی کی۔

دیپالی آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھنے لگی۔ مختصرے گھاٹ کی شکستہ سرسری پر بیٹھا وہ ایک جھوٹے سے بڑکے کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ اسکول کا جھوٹا ماسٹر کا جو استانی کے سامنے اپنی شرارت کی معافی ادا ہو مگر ساتھ ہی کسی دوسری شرارت پر بھی تلا تھا۔ دیپالی کو یکلخت ہنسی آ گئی۔

اسکول گرن گنگلرو۔ اس کے کان میں گونجا اور اس گونج کو شکست دیتے ہوئے ایک ایف جھک کر بھرپور مسرت کے ساتھ دوسری نندی میں پھینک دی۔

"کھامائے گا اگر گھڑیاں۔" ریحان نے کہا

وہ زور سے ہنسی۔ اوما دیدی۔ میری اس ہنسی کو اسکول گرن گنگلز کہتی ہیں۔ اس نے کہا اور سرے لمحے اس نے سوچا میں یہ نام کے قسمت کو tempt کر رہی ہوں اور میں دہمی بھی سنتی جا رہی ہوں۔

دیرے اس ذہنی زوال کا ذمے دار یہ شخص ہے۔ ہا ہا ہا۔ اس نے زور سے پانی اٹھا لیا

"اوما دیدی۔ ریحان نے ٹیگٹ جلاتے ہوئے بے پرواہی سے کہا۔ "بڑی اچھی آدمی ہیں۔ ان کی غفلت رہو گی تو تمہارے اندر بھی عقل آ جائے گی۔"

"ابھی نے عقل ہوں؟"

”بے حد۔ ایک اجنبی آدمی کے بلانے پر تنہا اس کے پاس بنوں میں آگئیں۔“

”مجھے اس اجنبی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔“

”قطعی نہیں!“

”اور ایسے ناقابل اعتبار آدمی کے ہاتھوں میں صوبے کی تحریک کی باگ ڈور ہے۔ جب ہی تو یہ گت

بن رہی ہے تحریک کی۔ اہم اہم۔“

اہم اہم۔ وہ بھی خوب ہنسا۔

اب چاند لدلی جنگلوں کے سیاہ افق پر اُمتہ آہستہ اوپر آ رہا تھا۔

”چلو تم کو اپنے میزبانوں سے ملو ایں۔“

وہ اس بوڑھے جوڑے کے مسکین اور باصبر چہرے کو یاد کر کے فوراً رکھی ہوئی۔

”یہ لون لوگ ہیں؟“

”مولوی ابوالہاشم۔ ماہی گیر ہیں اور اس گاؤں کی مسجد کے پیش امام۔ ان کے لڑکے بھی پھیر

میں درجہ سے ورکر بھی ہیں۔ میں ان کیسہاں دو مہینے سے مقیم ہوں۔ کھانا میں کافی کام ہو رہا ہے۔ گو

رفتار سست ہے۔“

آپ نے ان دونوں میاں بیوی کو میرے متعلق کیا بتایا ہے؟“

”تمہارے متعلق۔؟ کچھ نہیں۔ ان سے کہہ دیا تھا کہ اس ہندو لڑکی کو مسلمان کر کے شادی کرنے

والا ہوں۔“ ریحان نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”مشرم تو نہیں آتی آپ کو۔“ دیپالی نے غصے سے سرخ ہو کر کہا۔

”بالکل نہیں۔ چلو۔ اٹھو۔“ ریحان نے ڈیرے تکلف اور شائستگی سے اس کے کندھے

پر ہاتھ رکھ کر کہا اور لالہ شین اٹھالی۔ وہ بالسن کی میڑھیاں چڑھ کر جھونپڑے میں داخل ہوئے

زمین بنی نے مچھلی بھات ان کے سامنے رکھا۔ دیوار پر پھیلے چھنی پکڑنے کے جال کے نیچے

وہ دونوں چٹائی پر بیٹھ گئے۔ ان دونوں کا سایہ دیوار پر بڑا عجیب سالک رہا تھا۔ اتنے میں مولوی

درمختی والا جھکا جھکا سایہ بھی پر چھائیوں میں آ شامل ہوا۔

”بابا۔۔۔ غار۔۔۔“ ریحان نے دونوں بوڑھے پر چھائیوں سے کہا۔ ”میرے ہماری کو لٹم ہے۔“

کو ٹنٹم دیپالی ۔

مولوی نے سر اٹھا کر لڑکی کو دیکھا ۔ اور سر ہلایا ۔

ریحان ہتارتا ۔ ”یہ ہمارے لئے کو ٹنٹم بھی ہے اور دیپالی بھی ۔ کسی طنز میں تم کو سمجھاؤں گا کہ اس دیس میں کو ٹنٹم اور دیپالی ایک کیسے ہو سکتی ہیں ۔“

بس شروع ہو گئی تبلیغ ۔ ایک منٹ کو بھی پارٹی لائن چلانا نہیں بھولتے ۔ دیپالی نے ذرا الجھن سے سوچا اور یکلیخت لے ایسا لگا کر سامنے پر چھائیوں میں بنوئے چند رسکار کا سایہ بھی اُڑکھڑا ہو گیا ہے ۔ یہ میں کیا کر رہی ہوں ۔ وہ سر جھکا کر تند ہی سے کھانا کھانے میں مہمک ہو گئی ۔

کھانے کے بعد ریحان نے کہا ۔ رات بہت آگئی ہے ۔ تم اتنا طویل سفر کر کے آئی ہو دیپالی ۔ ب آرام کرنا چاہو گی ؟

”جی ہاں ۔“

”گڈ نائٹ“ ریحان نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا ۔

”گڈ نائٹ ۔“

ریحان اور مولوی ابوالہاشم کمرے سے باہر چلے گئے ۔

اُس رات ، سندھ بن کے غریق مسئلے میں ، زینب بی بی کے برابر والی کھاٹ پر لیٹ کر دیپالی نے موزا ندگی کی کوئی تاگ بھی ہے ۔ بہت جلد سے نیند آگئی ۔

دوسرے روز صبح سویرے وہ جھونپڑے سے نکلتی ہوئی ایک قریبی کینچ میں چلی گئی جہاں دوسرے ایسے گلداز ہرنوں کی ایک ڈار چوڑیاں بھرتی گز رہی تھیں ۔ وہ ایک درخت کی شاخ پر ہاتھ کھ کر ان خوبصورت نون کا نظارہ کرنے میں محو تھی ۔ جب کسی نے پیچھے سے کھنکھارا ۔

”ہوئی غریب شکستہ ، اس وقت اس پوز کو دیکھ کر فوراً بے ہوش ہو جاتی اور کالیداس کو میں دوبارہ کھنکھارتا ۔“

دیپالی نے پلٹ کر دیکھا ۔

”ریحان ۔ آپ اس قدر نون سیریں ہو گئے ہیں کہ مجھے آپ کی طرف سے فکر ہو چلی ہے ۔ آئیے ۔

میں آپ کو آپ کے رسلے دے دوں۔“

”اجی بڑھ لیں گے رسالے“ وہ آرام سے ایک درخت کے کٹے ہوئے تنے پر بیٹھ گیا۔

”مجھے آپ سے جنگ کی تازہ ترین صورت حال ڈسکس کرنا ہے۔“

”وہ بھی کر لی جائے گی۔“

”اچھا تو چل کر ناشتہ تو کر لیجئے۔“

”ناشتہ۔ اودہ۔ آج کا مینو کیا ہے ہمارے بریکفا سٹ کا؟“ ریمان نے شان سے پوچھا۔

”مرغ مسلم اور پلاؤ۔ یا جو کچھ بھی آپ مسلمان لوگ کھاتے ہیں صبح کو۔“

”اری یوقوف۔ مسلمان ناشتے میں مرغ مسلم نہیں کھاتے۔“

”واہ۔ جیسا آرام کے ہاں میں نے ایک مرتبہ مرغ مسلم اور پراٹھے کھائے تو اس نے کہا

کہ صبح پکے تھے۔“

”جیسا آرام کون۔؟“ وہ دونوں ٹپلتے ہوئے اب جھونپڑے کی طرف لوٹ رہے تھے۔

”میری دوست ہے۔ نواب قمرالزماں چودھری کی لڑکی۔ سخت فیوڈل۔ لیکن بیکریوٹ۔“

”اودہ۔“

وہ جھونپڑے میں داخل ہو گئے۔ زینب بی بی نے رات کا بیکایا ہوا ہینٹھا بھات سامنے رکھا۔

”میں آج ٹاٹ جا کر آپ کے لئے کھانے پینے کی سامان خرید لادوں گی۔“ دیپالی نے ریمان سے

انگریزی میں کہا۔

”دیپالی تم چند روز یہاں رہ کر میرے لئے بہتر کھانا پکا دو گی۔ مگر ان دونوں کو تو ساری زندگی

اس کے علاوہ کچھ میسر نہیں ہوا۔“

”اودہ۔“ دیپالی نادام ہو کر المونیم کی رکابی پر جھک گئی۔ زینب بی بی چولے پر چائے اوٹھنے میں

مصرود تھیں۔ چار پیسے کے بعد وہ دونوں دوسرے کمرے میں گئے جس میں ریمان کی چار بابائی کچی تھی۔

فرش پر کاغذات کا ڈھیر لگا تھا۔ ایک کونے میں اس کے ٹرنک کے اوپر میٹری کارڈ لیو رکھا تھا۔ ریمان نے

صبح کی خبروں کے لئے ریڈیو اون کیا۔ اے۔ آئی۔ آر۔ دہلی سے میلون ڈی سیلو کی آواز گونجی۔

خبریں سننے کے بعد ریمان نے کہا۔ چلو باہر چلیں۔ وہ دونوں باہر نکلے۔ جھونپڑے کے نیچے گھاٹ

مولوی کی ناؤ بندھی ہوئی تھی۔ مولوی صاحب دن بھر کے لئے کسی کام سے گاؤں جا چکے تھے اور پانی سطح پر بکری عقاب مچھلیوں پر چھپتا مار رہے تھے۔

”میں وہ چکرے ہرن دیکھنا چاہتی ہوں، جو صبح اتنی تیزی سے بھاگ گئے۔ آگے جا کر جنگل زیادہ خوب رت ہو جاتا ہے۔“

”زیادہ خوب صورت اور زیادہ خطرناک۔“

”مگر میں وہ ہرن ضرور دیکھوں گی۔ اتنے حسین ہرن میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ مگر سیتا کے انجام سے واقف ہو؟“

وہ ہنستی ہوئی اتر کر کشتی میں بیٹھ گئی۔ ریمان نے کشتی کھول کر دھارے پر چھوڑ دی۔ وہ اس اور اس منظر اور اس ماحول کا ایک لازمی اور فطری جزو معلوم ہو رہا تھا۔ دیہاتی کو ایک بیک خیال ایک نئی زندگی کے پس منظر سے بالکل واقف نہیں۔

ناؤ پانی کی سطح پر روانی سے بہہ رہی تھی۔ ریمان نے آہستہ آہستہ نیک ساری گان گنگنا نا شروع کیا۔ پھر چپ ہو گیا۔

کنارے پر جھکے سُدری درختوں پر رنگ برنگے پرندے چکر کاٹ رہے تھے۔
”تم کو احساس ہے شوکتی کہ ان دریاؤں اور لا دھرتی نے کیسے کیسے دکھ دیکھے ہیں؟ میں ان دکھوں پر ہنسنے ہوں۔“

”کپ۔ آپ بھی ناؤں کے روپے دلے ہیں؟“

”ہاں، تم نے مولوی ابوالہاشم کو دیکھا۔ میرے بابا مولوی ابوالہاشم کا نمونہ ہیں ایسے ہی صابر۔“

اور بولے۔

”اوہ۔۔۔ وہ چپ ہو گئی۔ وہ۔۔۔ گریڈ نہ کرنا چاہتی تھی کہ ایک غریب کسان کا لڑکا لندن اسکول آف سنج گیا۔ یقیناً وہ اس کے متعلق کچھ بھی نہ جانتی تھی۔“

چند لمحوں بعد اس نے آہستہ سے کہا۔ ”آپ لندن کیسے گئے تھے۔“

”لندن؟“ ”ریمان نے چونک کر دہرایا۔ ”لندن کا یہاں کیا ذکر ہے؟ یہ اپنا ملک دیکھو اور دیکھو
میں نے اس کے ساتھ کیا کیا؟“ وہ خاموش رہا۔ ”میں ۱۹۳۵ء میں لندن گیا تھا۔۔۔ تم میرے حالات زندگی

جاننا چاہتی ہو؟ میں نے علی گڑھ سے ہائی اسکول اور ایف اے کیا تھا۔

”علی گڑھ۔“

”ہاں یہ تمہارے لئے تقریباً اجنبی نام ہے۔ گریہ ملک اور قوم کی ایک اور بیدار ہم داستان کا ایک حصہ ہے اور اس داستان سے تم کو واقف ہونا چاہئے۔ پھر میں نے ڈھاکہ کے لوٹ کر بی اے اور کلک سے ایم۔ اے کیا۔ اسی زمانے میں میں نے تمہارے چچا کی کتاب ”بنگلہ کی اقتصادی تاریخ“ پڑھی تھی۔ وہ رک کر کسی سوچ میں کھو گیا۔ اور پھر جتو جلا نے شروع کئے اور کہنے لگا ”اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ ان کی ہتھیجی۔ کوئی برقی سی لونڈیا کسی اسکول میں پڑھ رہی ہے اور ایک دن میری زندگی میں سائیکہ کی طرح داخل ہوگی۔ دیکھو کھٹن کی مناسبت سے کیسی بر محل تشبیہ دی ہے۔ وہ اداسی سے ہنسا۔“

”میت خوب آگے چلے!!“

”اس کے بعد ایک۔ ایک وظیفے پر لندن چلا گیا۔ وہاں میں اور ادا اور رکتے اور بہ سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ہمارا بڑا ہی تاریخی قسم کا گروہ تھا وہ!“

”اور واپس آتے ہی کووڈیڈ سے انقلاب کے شعلوں میں؟“ ویپالی نے کہا۔

”وہ کھلا کھلا کر ہنسا۔ پھر اس نے کہا۔“ کلکتہ میں چند سال ہوئے پروگریسیو راء خیز زندگی دوسرا کالفرنس ہوئی تھی۔ اس میں تمہیں آنا چاہئے تھا۔ بڑا بولہ خیز تجربہ تھا۔“

”آپ بھی لکھتے ہیں؟“

”ریحان نے اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔“ ارے تم کتنی جاہل ہو۔ یہ رائٹی مجھے ابھی کس شے کی ہے اور وہ جو میں نور الرحمن بنارس لائبریریٹ کر رہا تھا تو کیا لکھا اس کو درم تھا؟ ویپالی کیا تم نے وہ میری کتاب نہیں پڑھی؟ ادا نے تم کو نہیں دی پڑھنے کو؟“

”کیا افسانے لکھتے ہیں؟“

”ریحان نے چپو چھوڑ کر آسمان کی طرف احتجاجاً ہاتھ پھیلائے۔“ اوہ لڑکیاں۔ لڑکیاں۔ اس نے فریاد کی۔“

”نہیں سچ بتائیے۔“

”میں افسانے نہیں لکھتا ہوں۔ شاعری کرتا ہوں۔ شعوس کا کام کرتا ہوں۔“

”تھوڑا سا انکسار آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائے گا۔“ دیپالی نے ہنس کر کہا۔ ”آپ کا کتاب کا کیا نام ہے؟“

”انیسویں صدی میں بنگال کی زندگی حالت۔“ ریحان نے منہ لٹکا کر کہا۔ ”ارے دیپالی تم بڑی جاہل نکلیں۔“

”اور یہ پروگرام کیسے پڑھ کر لیا ہوتا ہے؟“

ریحان نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے اور کہا۔

”نہیں بلیز۔ بتائیے نا۔“

”ابھی جب کالج واپس جاؤ گی تو گرد دیو نے جو پیغام کانفرنس کے نام بھیجا وہ پڑھ لینا، سمجھ میں آجائے گا۔“

”گرد دیو نے کیا کہا تھا۔؟“

”انہوں نے کہا تھا کہ میری طرح گوشہ نشین بن کر کام نہیں چل سکتا۔ اومادی کو چاہئے تھا کہ تمہیں سب باتیں بتاتیں۔“

اومادی۔ اومادی۔

”آپ نے بہت سے لوگوں کو آئیڈیلائز کر رکھا ہے۔“

”ہاں۔“

”کون کون۔“

”بہت سارے ہیں۔ ان میں سے ایک تم بھی ہو۔ دیپالی تم کلچرل فرنٹیئر کام کر چکی؟“

”آپ جو کہیں گے کروں گی۔“

کشتی اب درختوں کی سڑنگ میں سے گزر رہی تھی۔

”مغرب میں بھی یہی صوبہ ہو رہا ہے؟ جدید؟“ دیپالی نے پوچھا۔

”مغرب میں۔؟ اسپین میں ایک خونریز جنگ لڑی جا چکی ہے دیپالی۔“

”مجھے اور بتائیے۔ لندن کے متعلق۔ جب آپ وہاں طالب علم تھے۔“

”جب ہم وہاں طالب علم تھے۔“ ریحان چوتھ ایک طرف دکھ کر نیم دراز ہو گیا۔ وہ واقعی ”ری گیس“

”لٹھا۔“ اس زمانے میں وہاں بڑے معقول لوگ جمع تھے۔ ایک راج آئندہ اور تیار ظہیر نے مل کر پی ڈبلیو اے

قائم کی تھی۔

”آپ انگلینڈ ہی میں تحریک میں شامل ہو گئے تھے؟ دیپالی نے بات کاٹی۔

”ہاں۔ اور واپس آکر دیکھا کہ ہمارے ساتھی۔ علی گڑھ اور لکھنؤ۔ اور جامعہ ملیہ اور کلکتہ اور سب

جگہوں کے نوجوان ہمارا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو چکے ہیں۔ پرانے دہشت پسند بھی اب ہماری طرف آچکے

تھے۔ شوکتی۔ ہم لوگ خوش قسمت ہیں جو اس زمانے میں پیدا ہوئے اور ملک کیلئے کچھ کر سکنے کے اہل ہیں۔“

سرنگ کے اختتام پر بیچ کر ریمان نے کشتی موڑ لی۔ ”آگے گھڑیا لوں گی راجدھانی ہے۔ اب واپس

چلتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

والپی میں ریمان خاموشی سے بتوار چلانے میں مصروف رہا۔ بادل گھرائے تھے اور سورج کبھی کبھی

بادلوں میں سے نمودار ہو کر چمکنے لگتا تھا۔ لعلتق اور رام چڑیاں سارے میں اڑتی پھر رہی تھیں۔

گھر پہنچ کر انہوں نے کھانا کھایا اور اپنے اپنے کمروں میں آرام کرنے کے لئے چلے گئے۔ تیسرے پہر

کوریمیاں نے دیپالی کے دروازے پر آن کر آواز دی۔ ”شوکتی۔ یہاں آنا تو۔“ دیپالی کھاٹ پر ساری بچھا

کر اور اپنے تھیلے کا ٹیکہ بنائے بے خبر مورہی تھی۔ زمبابی بی گھڑائے کر شام کے پکانے، رینڈھنے کے لئے پانی

لینے ندی پر گئی ہوئی تھیں۔ ریمان ذرا جھکنا ہوا اندر آگیا اور کواڑ سے لگ کر خوابیدہ دیپالی کو دیکھنے لگا۔

”شوکتی!“ اس نے چند منٹ بعد پھر آہستہ سے آواز دی۔ وہ ہڑڑا کر اٹھ سیٹھی۔

”وہ رسالے کہاں ہیں؟“ ریمان نے یونہی بے مقصد سوال کیا۔

”ابھی لاتی ہوں۔“

ریمان ذرا احمقوں کی طرح کھڑا سر کھجاتا رہا۔ پھلپنے کمرے میں چلا گیا۔ دیپالی اخبار اور رسالے

اُس کے پاس لے گئی۔

”آؤ باہر روشنی میں بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔“ ریمان نے کہا۔ وہ یہ رسالے حاصل کر کے واقعی بے

خوش نظر آ رہا تھا۔ جیسے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا ہو۔

برآمدے میں چٹائی کچھا کر وہ سورج ڈوبنے تک رسالوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ ریمان دیپا

و مختلف مضامین کے نکات سمجھاتا گیا۔

سامنے گھاٹ پر ناؤ آکر رکھی۔ مولوی صاحب اترے۔

زینب بی بی نے اندر سے آواز دی۔ ”کھانا تیار ہے۔“

کھانے کے بعد دیپالی پھر برآمدے میں جا کھڑی ہوئی۔ اور افق پر قہر تے ہوئے چاند کو دیکھنے لگی۔
نزدیک کے کھمبے سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔ رات کا اندھیرا سیلاب کی طرح بڑھتا آ رہا تھا۔

زندگی کا۔ ایک اور دن ختم ہو گیا۔ ایک انمول دن گزر گیا۔ ایک شعر پڑھا جا چکا۔
نے آہستہ سے اپنے آپ سے کہا۔ پھر اس نے مڑ کر دیپالی کو آواز دی۔

”گٹنا بس۔ دیپالی۔“ اور وہ اپنے کمرے میں گھس گیا۔

دوسرے دن وہ پگڈنڈیوں پر سے گزر کر گاؤں میں گئے۔ کسانوں اور چھیروں سے باتیں کرتے۔
اور رات گئے واپس آئے۔ راستے میں دیپالی کی ساری ایک جھاڑی میں الجھ گئی۔ ریحان اس کی
نے کسے لئے زمین پر دو زانو بیٹھ گیا۔ کانٹے نکالتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر دفعتاً پوچھا۔ ”ساری
آیا۔ تمہاری چوری کا پتہ چل گیا۔؟“

”جی ہاں۔“ وہ ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ اور چاند کی روشنی میں ساری کے چاک میں گرہ لگانے
نش کرنے لگی۔

”مجھے ان ساریوں کے کہنے کا بڑا سبب ہوا تھا۔“ ریحان نے کہا۔ ”میں نے سر چاہا تھا، جو لڑکی اتنی
بانی دے سکتی ہے۔“

”میں نے کیا قربانی دی ہے۔“ دیپالی نے ہنسنے لگا کر بات کاٹی۔

”کیوں۔ کیا میں جانتا نہیں کہ لڑکیوں کو اپنی ساریوں اور گہنوں سے کتنی وابستگی ہوتی ہے۔“ وہ
خاموش رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”اتنی کے پاس بھی دو باجوہ ساریاں تھیں۔ جب وہ بیاہ

تھیں تو میری دادی ماماں نے ان کو دی تھیں۔ وہ ساریاں میں تم کو دوں گا دیپالی۔“

دیپالی سکے میں رد گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ وہ گھبرا کر پتھر پر سے اٹھی۔

”کیوں۔ کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟“ ریحان نے پریشانی سے دریافت کیا۔

”کچھ بھی تو نہیں۔ گھر چلیے۔“

وہ اونچے نیچے ٹیلوں، اور جھاڑیوں کو پھلانگتے پھرنے کی طرف رواد ہو گئے۔ دیپالی نے

ایک دم چپ سا دھلی تھی۔

تیسرے روز وہ دونوں ٹھلکتے ہوئے ندی کے ساحل پر کافی دور نکل گئے جب ، اچانک دور
ایک لانچ نظر آئی۔ دیپالی ہم کرایک درخت کی اوٹ میں چھپ گئی۔ یہ سرکاری لانچ تھی۔ غالباً معمول کے دو
پراس طرف سے گزر رہی تھی یا شاید کچھ سرکاری افسر شکار کے ارادے سے ادھر آئے تھے۔ لانچ شور مچاتی پانی پر
گزر کر درختوں کی سرنگ میں غائب ہو گئی۔ دیپالی کا رنگ فق ہو چکا تھا۔

مارے شوکتی۔ ایک ذرا سی سولین لانچ سے ڈر گئیں۔
دور سے گویاں چلنے کی آواز آئی۔

”ادماں۔“ دیپالی نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

ریحان ہنسنے لگا۔ ”گھبراتی کیوں ہو بھائی۔ افسر لوگ شکار کھیلنے آیا ہے۔ ہم لوگ یہاں بالکل
ہیں۔ یہ دنیا در جنگل ڈیڑھ سو سال سے اپنے بچوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔“ ریحان چند لمحوں تک جنگل کے
اور گنجان ستائے کی آواز سن رہا اور پھر کہنے لگا۔ ”کل ہم جن کسانوں سے ملے تھے۔ اُن کے پُر کھے ستوں سالہ
فرانسیس تحریک میں لڑے تھے۔“

”ریحان۔ آپ کو اپنے راستے کے بارے میں مطلق کوئی شبہ، کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے؟“ دیپالی
تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

”نہیں جب اپنے اصل دشمن اور اس کے ایجنٹوں کو ہم پہچان چکے ہیں تو پھر الجھن کیا ہو سکتی
وہ آگے جھک کر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا۔ ”سنو دیپالی۔ یہ یاد رکھو کہ برطانوی سربراہ داری ہندوستان
تخطا، غلامی، قرضے، ذات بندی اور فرقہ وارانہ کشمکش کی بنیادوں پر کھڑی کی گئی ہے جنہیں معلوم ہے
کھلنا اور نوا کھائی، جواب ڈاکوؤں اور مفلس ماہی گیروں کا دس ہے۔ مغلوں اور نوابوں کے عہد میں کتنے
تجارتی علاقے تھے، یورپ میں جو ۲۰۰ برس تک سب سے زیادہ خونریز لڑائیاں لڑی گئیں وہ ہندو
کی تجارت پر قبضہ کرنے کے لئے لڑی گئی تھیں۔“

وہ اب درختوں کے نیچے سے نکل کر ساحل پر آگئے چاروں طرف پھولوں کی روشنی نے بڑی سہانی
عجیب سی خوشبودار پھیلا رکھی تھی۔

”تم جانتی ہو نا کہ سترھویں صدی میں ہندوستان کے قولاد کا پروڈکشن سارے یورپ کے فو
پروڈکشن سے برتر تھا۔“

دفعاً دیپالی کھلکھلا کر منہں پٹری۔

”کیا ہوا۔؟“

”کچھ نہیں! کوئی اس وقت یہاں آن کر دیکھے کہ اس شدید دھانی ماحول میں ریان الدین احمد تڑپوں صدی کے فولادی پروڈکشن کے متعلق سمجھا رہا ہے۔ اگر میں یہ بات واپس جا کر لوگوں کو کسی کو یقین آئے گا۔؟“

”ہماری جدوجہد کا تدارک کرنے کے لئے۔“ ریان کہتا رہا۔ ”پچھلی صدی میں برطانیہ نے یہ ثابت کر دیا کہ امپریزم کے سائے میں اس نے ہندوستان کو کتنا ترقی یافتہ بنایا ہے۔ انگریزی تعلیم اور ہسپتال اور لڑیاں۔ اور مشن کالج۔“

”یورنڈ بنرجی۔“ دیپالی نے زیر لب کہا۔

”کیا۔؟“

”کچھ نہیں۔“

”وہ خود کھیل ہندوستانی موسیقی جو مہابھارت کے زمانے سے لے کر مغل عہد تک قائم رہی تھی۔“ انگریزی سرمایہ داری نے تباہ کر دیا۔ کیا سوچ رہی ہو۔؟“ ریان نے ٹھٹھک کر پوچھا۔

”کچھ نہیں اور بتائیے۔“

”ہاں قومیں یہ کہہ رہا تھا۔“ ریان نے سر کھجا کر بات دو بارہ شروع کی۔ ”مگر یورپ میں سرمایہ داری نے نئی سماجی طاقتیں بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ جو ہمارے ہاں پیدا نہیں ہوئیں۔“

”لیکن کل تو آپ کہہ رہے تھے ہندوستانی گاؤں کی اکونومی کی برطانیہ کے ہاتھوں تباہی کو کارل مارکس۔ سماجی انقلاب بتا رہے۔ کیونکہ ذات بندی کی بنا پر ہمارے گاؤں رجعت پسند تھے۔ اور ان میں ہاکی گنجائش نہ تھی۔“

”گڈ کولیشن۔“ ریان نے کہا اور جھونپڑے کی طرف لوٹتے ہوئے دیپالی کو ان دقیق مسائل کے کات کھلنے میں مصروف رہا۔

جو تھا دن۔ ریان نے دیپالی کو برطانوی سرمائے کے تین ادوار۔ کمپنی کے مرحلے، سرمائے، انیسویں صدی، ٹریڈ سرمائے اور جدید فنانس کے سرمائے اور نئے ہندوستانی سرمایہ داروں کے متعلق سمجھانے میں صرف کیا۔

پانچویں دن جب وہ کشتی رانی کے لئے نکلے تو اچانک بید طول ہو کر اس نے دیپالی سے پوچھا۔
”شوکتی۔ تم کتنے دن یہاں رہ سکتی ہو۔“

”لوگ گیت جمع کرنے میں جتنے دن بھی لگ جائیں۔“ اس نے ہنس کر جواب دیا۔

چھ دن وہ ناؤ کھیتے کھیتے بہت دور نکل گئے۔

پھولوں کے ایک کنع میں سے ناؤ گزر نے لگی تو اس نے اوپر جھکی ہوئی ڈالیوں میں سے چند کھڑکیاں تو کراس کے بالوں پر برسا دیئے۔ ناؤ ایک گھاٹ کے قریب پہنچی۔

بنگال کے ہندو عوام کا عقیدہ ہے کہ جب رام اور سیتا نے بن باس لیا تو انہوں نے کافی عرصہ سندربن میں بھی گزارا تھا۔ کاٹھیاواڑ، وسطی اور جنوبی ہند سے لے کر چائینگام تک ان علاقوں کے لوگ اپنے اپنے جنگلوں کے متعلق یہی عقیدہ ہے۔ ان جنگلوں میں رام اور سیتا انھیں اب بھی چلتے نظر آئے۔ سندربن کے اسی تقدس کی وجہ سے نو اکھالی اور کھن کے جنگلوں اور دریاؤں اور سندپ جزیروں میں پرانے مندروں، مٹھوں اور سنیاسیوں کے جھونپڑوں کی بہتات ہے۔

ریحان نے ناؤ جس جگہ کن سے سے باندھی تھی اس کے قریب بھی جنگل میں ایک پرانا مندر نظر آ رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر گاؤں کا بازار تھا۔

”بھوک لگ رہی ہے۔ آؤ کچھ کھالیں۔“ ریحان نے کہا۔ کھارے پر اتر کر وہ جنگل داخل ہوئے۔ دفعاً مندر ان کے سامنے آگیا۔

دیپالی نے غیر ارادی طور پر آنچل سے سر جھک لیا۔

”دسویں صدی“ ریحان نے کافی آلود معبد پر نظر ڈال کر ماہر انداز میں کہا۔
”او فوہ۔“ اس کے حالت خراب۔ ”دیپالی نے مسکرا کر کہا۔

”آؤ۔“ ریحان نے کہا۔ یہ تو بہت ہی تاریخی عمارت معلوم ہوئی ہے۔ یہ اسلچر دیکھ

صری سیتی پیرٹ۔“

ایک بوڑھا اندھا دھند پجاری اندر سے پرچھائیں کی طرح برآمد ہوا۔ ریحان چلوں سمیت پرچھ کر مورتیوں کی فرنی کا مطالعہ کر رہا تھا۔ پجاری کو اپنی طرف تاکتے دیکھ کر اس نے دیپالی سے کہا۔ ”اگر کچھ اعتراض کرے تو کہہ دینا میں تمہارا بتی دیو ہوں۔ روہن سرکار۔“

”شٹ اپ“

پجاری نے نذرانے کی امید میں مسکرا کر دیپالی کو اندر بلا لیا۔ اور ریحان کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔
دوسرے لمحے وہ دونوں درگاہ جھوانی کی مورتی کے سامنے کھڑے تھے۔ ریحان نے چہرے پر مصنوعی
عقیدت طاری کر لی۔

پجاری نے دونوں کی پیشانیوں پر تنک لگا کر انھیں پرشاد دیا اور دیوی کے چرنوں میں پڑے گیند
کے دوہار ان کے گلے میں ڈال دیئے اور جھکا جھکا ٹٹول ٹٹول کر لوہان سلگانے میں مصروف ہو گیا۔
”لو بھئی مبارک ہو۔ شادی ہو گئی۔“ ریحان نے چلا کر انگریزی میں کہا۔
دیپالی شرم سے لال بھوکا ہو رہی تھی۔

ریحان نے جیب سے نکال کر پجاری کو کچھ روپے دیئے اور دیپالی کا بازو تھام کر اسے باہر لے آیا
— ”ارے بھائی۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہر انڈین فلم میں دیکھا ہے کہ میرا دور ہیراؤن مندر میں
جا پہنچتے ہیں اور پجاری عین اسی طریقے سے ہار پہنا کر ان کا سیاہ کر دیتا ہے۔ بھئی کمال ہو گیا۔“
”ریحان۔ ول یو پلزز شٹ اپ۔“ دیپالی نے کہا اور چند قدم چلنے کے بعد ایک شکستہ ستون پر
بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ریحان حیرت سے اُسے دیکھنے لگا اور جب اس ہندو لڑکی کی جذباتی کیفیت اور موقع کی نزاکت
کا اسے اندازہ ہوا تو وہ گھبرا کر اس کے قریب دوڑا تو جھک گیا۔ اور بجاعت سے کہنے لگا۔ ”ارے بیوقوف۔
نہیں ہوا سیاہ۔ کون گدھا کہتا ہے کہ سیاہ ہو گیا۔ عجیب بیوقوف لڑکی ہو۔ ارے تم ابھی تک مذہبی
توہمات کی قائل ہو۔ مندر اور پجاری۔۔۔ اور۔۔۔ کمال ہے۔“ وہ سر کھچنے لگا۔ ارے جتنی
لڑکی۔ شادی صرف کورٹ میں ہوتی ہے۔ تم اور میں مندر اور مولوی کے قائل ہی کہاں ہیں۔ اور۔
اور کوئی۔ تنگ بھی ہے بھلا۔ چلو اٹھو۔ عجیب بے قوف لڑکی ہو بھئی۔“

وہ اس کا ہاتھ تھام کر پکڑ پکڑی پر لے آیا۔ گاؤں پہنچ کر وہ ایک چائے خانے میں گئے اور کھڑی
کی بیچ پر بیٹھ کر کھانا کھایا اور چائے پی۔ دیپالی بالکل چپ رہی۔ ریحان اسے بار بار پریشانی سے دیکھتا
تھا۔ پھر وہ چائے خانے میں جمع لوگوں سے باتیں کرنے لگا۔ مکھنوت اسے خیال آیا کہ وہ سید غیر محتاط
ہو گیا ہے۔ یہ گاؤں کھلنا شہر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اور پولیس کے سپاہی بھی زیادہ دُور

نہیں ہوں گے۔ چائے ختم کر کے وہ دونوں گھاٹ پر آئے اور کشتی میں بیٹھ کر گھر روانہ ہو گئے۔
 ”دیپالی“ کشتی ندی کے دھارے پر آئی تو ریمان نے آہستہ سے کہا: ”مجھے افسوس ہے میں نے
 مذاق کیا تھا۔ اگر تم کو برا لگا ہے تو مجھے معاف کر دو۔“
 وہ ایک دم پھر رونے لگی۔

”اومائی گاڈ۔۔۔“ ریمان نے بازو پھیلا کر آسمان کو دیکھا۔ ”حد ہے۔“
 وہ ہنس پڑی۔ اب وہ دروہی تھی اور ہنس رہی تھی۔ ریمان خاموش رہا۔ اسے احساس ہو
 چکا تھا کہ اُس کی اور اس لڑکی کی زندگی اس لوہا کی مانند طوفانوں سے بے پرواہ، دریا کے پُرسور دھارے
 پر کسی نامعلوم ساحل کی طرف بہہ رہی ہے۔ اب وہ ایک دوسرے کے رجم و کبجہ پر زندہ رہیں گے۔

اب چاند بہت دیر میں طلوع ہوتا تھا۔ سندر بن پر گھٹپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس رات
 جب جھونپڑے میں سب لوگ سو گئے تو دیپالی چپکے سے اٹھی۔ طاق میں رکھے خالی دیوں میں سے ایک دیا
 نکال کر اُس میں تیل ڈالا۔ اور تپتی لگائی۔ پھر دیا اور کاندکا ایک ٹکڑا لے کر باہر چلی گئی۔ اور ندی کے کنارے بیٹھ
 کر اس کاغذ کی چھوٹی سی ناؤ بنائی۔ دیا جلا کر اس ناؤ میں رکھا اور اُسے پانی میں بہا دیا۔ اور گھاٹ پر
 گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بے صدھیان اور مسکرتہ مندی سے اُسے دیکھنے لگی۔ دیا دریا کی دھار پر دو رنگ
 بہتا چلا گیا اور پھر تاریکی میں غائب ہو گیا۔ اچانک دیپالی کو احساس ہوا کہ ریمان اپنے کمرے سے نکل کر آئے
 ہیں کھڑا اُسے ندی میں چراغ بہاتے دیکھ رہا ہے۔ وہ جلدی سے اٹھی اور سیڑھی چڑھ کر بھاگتی ہوئی اپنے
 کمرے میں چلی گئی۔

دوسری صبح وہ چوہے کے پاس بالکل نارمل اور بتاش نظر آنے کی کوشش میں مصروف تھی۔
 ریمان نے قریب آ کر بیٹھتے ہوئے کہا ”گڈ مارننگ۔“
 ”گڈ مارننگ۔“

زمین بلبلی اور بولای صاحب اس سے باتیں کرنے لگے۔ مولوی صاحب اس سے لڑائی کی خبریں
 بوجھ رہے تھے۔ ریمان نے چائے ختم کرنے کے بعد اپنے کمرے میں جا کر ریڈیو لگایا۔ دیپالی زمین بلبلی کے

کے ساتھ کھانا پکانے میں مشغول ہو گئی۔

اچانک ریحان کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ ”دیپالی۔
”کیا ہوا؟“ وہ ڈوٹی لئے لئے برآمدے میں گئی۔
”بھٹلر نے سودیت یونین پر حملہ کر دیا۔“

لوک گیت جمع کرنے کی مدت ختم ہوئی۔ دیپالی اور ریحان گھاٹ پر کھڑے تھے۔ قرب و جوار کے
ادوں میں بجی ہوئی دکنش حیر چٹائیاں فروخت کے لئے منڈی لے جانے والے چھتریاں لگائے کاریگروں
ہجوم ساحل پر جمع تھا۔ ماہی گیر اپنی کشتیاں لے کر مکمل رہے تھے۔ مولوی ابوالہاشم حسب عادت خاموش
سے سر جھکائے اپنی کشتی کے بادبان درست کرنے میں مہمک تھے۔ وہ دیپالی کو باگھیر گھاٹ تک پہنچانے
لے تھے۔ بہت لمبا سفر تھا۔

رات وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں بالکل چپ چاپ کھڑا اندھیری نندی پر سے گذرتی ہوئی کشتیوں
دیکھ رہا تھا۔ دیپالی اس کے ٹرنک پر ریڈیو کے پاس بیٹھی تھی۔ اس نے ریحان سے کہا تھا۔ ”آپ کو اب
ڈاکٹر ٹرنر سے رابطہ قائم کرنا چاہئے۔ اس نئی جگہ کی وجہ سے سچویشن بدلنے والی ہو گئی نا۔؟“
وہ چونک اٹھا۔ ”جنگ۔؟ کیسی جنگ۔؟“ اس نے جھنجھلا کر پوچھا۔

دیپالی نے تعجب اور ادا سی سے اس پر نظر ڈالی۔ ”آپ حقیقت سے اتنی آسانی سے کٹ جاتے ہیں۔“
”ایسا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا شوکتی۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا اور اسی طرح کھڑاندی
بیکھتا رہا۔

”کل۔ اب میں واپس جانا چاہتی ہوں۔“ دیپالی نے کہا۔

”کیوں۔؟“ اس نے غصے سے پوچھا۔

”اُسرے۔ ریحان۔ میں یہاں ہمیشہ تو نہیں رہ سکتی۔“

”وہ اس کی طرف مڑا۔ ”ہاں تم ٹھیک کہتی ہو، تم یا میں ہمیشہ تو یہاں نہیں رہ سکتے۔ شاید کہیں

نہیں رہ سکتے۔“ پھر چند لمحوں بعد اس نے برآمدے میں جا کر مولوی ابوالہاشم سے دیپالی کی واپسی کے متعلق
تعلق بات چیت شروع کر دی تھی۔

یہیں دن پہلے کی بات تھی۔ آج وہ سندربن سے واپس جا رہی ہے باگھیراٹ پہنچ کر وہ اسٹیمر کے ذریعے بار لیرال اور فرید پور کے دریاؤں پر سے گزرتی نارائن گنج چلی جائے گی۔

ریحان اب پریشانی کے ساتھ کلکتے کے خفیہ ہیڈ کوارٹرز سے کسی اطلاع کا منتظر تھا۔ پارٹی کے نمائندے بڑے بیڑے پر دروہ تپتے ہوئے راجستھان کی دیو لی جیل میں بند تھے۔ ان کے پاس سے اسکل ہو کر کسی نئے ڈائریکٹو کا کلکتہ ہوتے ہوئے سندربن پہنچنا مہنتوں کا نسخہ تھا۔ سندربن پر بارشیں شروع ہو چکی تھیں میں یہاں جانے کب تک رہوں گا۔" ایسا لگتا ہے کہ جیسے کلکتے کے ساتھ مجھے بھول ہی گئے ہیں۔" اس نے صبح بڑی طول آواز میں دیپالی سے کہا تھا۔

اور اب دیپالی چھتری کے نیچے چھپی گھاٹ پر کھڑی تھی اور کچھ فاصلے پر چھتریوں کا میلہ سا لگا تھا صوبہ ماو بار آسمان کو دیکھ رہے تھے۔ چھتری لگتی ہے تو سندربن کے جنگل اور کھال اور دریا اور سڑا اور سمندر سب پانی میں ڈوب جاتے ہیں۔ جیسے کسی نے ایک بڑے سے واٹر کرکٹ لینڈ اسکیپ کو واش کرنے بعد پانی کی چلمی ہی میں چھوڑ دیا ہو۔ اور سارے رنگ پانی میں پھیل کر آپس میں لگدٹ ہو جائیں۔

ریحان چھتری لگائے دیپالی کے قریب کھڑا تھا۔ اچانک اس نے بڑے غصے سے کہا: تم بھی جا رہی ہو چلو بیٹی کو لٹم۔" مولوی ابوالہاشم نے اسے آوازی دے دی وہ اور زینب بی بی لے کر باضابطہ کلکتہ ہی لپکارتے تھے۔ انھیں یقین کامل تھا کہ بہت جلد یہ لڑکی ریحان کے ہاتھوں پر مشرف بہ اسلام ہو کر اس سے نکاح کرے گی۔ جانے ریحان نے ان دونوں بھولے میاں بیوی کو کیا ٹی پڑھا رکھی تھی۔ زینب بی بی نے تو ایک رات ریحان سے بڑی رازداری سے کہا تھا کہ کلثوم کو مولوی صاحب کلمہ پڑھا دیں اور شربت کے پیا لے پر نکار ہو جائے۔ لیوں بھی یہ برسات کا زمانہ اور شادیوں کا موسم تھا۔ ان بیچاری نے برسوں سے سینے کر رکھ ہوئی ایک نئی سوئی ساری بھی نکال کر ریحان کو پیش کر دی تھی۔ یہ ساری انہوں نے اپنی بیوی کے لئے رکھی تھی اور جب ریحان نے ان کو سمجھایا کہ پہلے اسے گاؤں جا کر اپنے باپ سے بھی اجازت لینی ہے تب ہم وہ یہ ساری اپنی طرف سے تحفہ دینے پر مصر رہی تھیں۔ ریحان کے انکار پر انہوں نے کہا تھا۔ ہمیں غریب کو کرم نہیں ہے یہ تحفہ نہیں لینا چاہتے ہو بھئی اور روئے لگتیں تھیں۔ لیکن ریحان بے حد سٹپٹا یا تھا۔ اس مندرجہ ذیل واقعے کے بعد اب دیپالی سے یہ کس طرح کہے کہ یہ سرخ ساری بھی لے لو، جسے پہنا کر زینب بی بی تمہیں دلہنا بنا چاہتی ہیں۔ عجب گھپلا ہو رہا ہے یہ خدا کی قسم۔ اس نے پیدا کچھ کر سوچا تھا۔ مگر زینب بی بی کا دا

رکھنے کے لئے وہ ساری ان سے لے کر ٹرنک پر رکھے ہوئے اخباروں کے نیچے چھپا دی تھی۔ زینب بی بی کے جانے کے بعد دیپالی بیڈ لو سننے کے لئے اس کے کمرے میں آئی اور ٹرنک پر بیٹھنے کے لئے اس پر سے اخبار اٹھائے تو نیچے سرخ ساری پر اس کی نظر پڑی اور ریحان خود شرم سے سرخ ہو کر فوراً کمرے سے باہر بھاگ گیا تھا۔

دیپالی چھتری ذرا اونچی کر کے اس کی طرف مڑی۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اتنے میں دونوں یکا دیکھتے ہیں کہ زینب بی بی اپنی خاکستہ چھتری لٹکائے بغل میں ایک بندل دالے اقبال و خیزاں پگڈنڈی پر سے بھاگتی چلی آ رہی ہیں۔ نزدیک آ کر انھوں نے اجنبی میں لپٹی ہوئی سرخ ساری دیپالی کے ہاتھوں میں ٹھونس دی اور کچھ کہنے سے بغیر اسی سرعت سے گھاٹ کی بھیڑ میں غائب ہو گئیں۔

چند قطرے ٹپ ٹپ بندل کے کاغذ پر گرے۔ دیپالی نے اوپر دیکھا۔ شاید بارش آگئی۔ مگر وہ ریحان تھا جو اس کے قریب کھڑا تھا۔ یہ آنسو اسی کی آنکھوں سے گرے تھے۔

وہ دونوں چپ چاپ کھڑے دریا کے کنارے منظر کو دیکھتے رہے۔ کشتیوں نے لنگر اٹھا دیئے تھے۔ بادبان کھول دیئے گئے تھے۔ قسم قسم کی کشتیاں سطح آب پر بکھر چکی تھیں۔ مولوی ابوالہاشم نے اپنی کشتی جیٹی سے لگادی اور دوبارہ پکارا۔ ”کوئٹم بیٹی۔ اللہ کا نام لے کر آ جاؤ۔ اللہ تم دونوں کا نگہبان۔“ اللہ۔۔۔ دیپالی نے چپکے سے دل میں دہرایا اور سرخ ساری کا بندل مضبوطی سے بازوؤں میں جکڑ کر آگے بڑھے اور کوڈر کشتی میں بیٹھ گئی۔ مولوی صاحب کا چھوٹا لڑکا جواب تک چٹائی کی چھت کے اندر دیپالی کا سامان رکھنے میں مشغول تھا باہر نکلا اور دونوں باپ بیٹوں نے چپو منبھالے۔ ریحان نے گھاٹ کی میڑھیوں پر آکر اوداع کے لئے ایک ہاتھ اٹھایا اور پھر گر ادیا۔

عین اسی وقت ایک نوک کشتیوں کی بھیڑ میں سے تیزی سے نکلتی سامنے آکر مولوی صاحب کی کشتی سے لگ گئی۔ مولوی صاحب کا ہم شکل ایک دائرہ صی دالا نو جوان کوڈر گھاٹ پر اتر آ۔ اس نے اپنے باپ کو اور دیپالی کو آداب کیا اور ریحان کے پاس جا پہنچا۔

”ریحان بھائی۔۔۔“

ریحان جواب تک سر جھکائے کھڑا تھا چونک پڑا۔

”تم اس وقت کیسے؟“

ابوالقاسم نے اپنی ہمد پر بندھی بیٹی کے نیچے سے ایک کاغذ نکالا اور آہستہ سے کہا: ”او ماری

نے آپ کو کلکتے فوراً بلایا ہے۔ کل رات میرے پاس مقننہ —
 دیہاتی نے صرف اتنا ہی سنا۔ اُمادی نے آپ کو کلکتے بلایا ہے۔ اُمادی نے آپ کو فوراً —
 اُمادی نے آپ کو — اُمادی نے آپ کو فوراً — اُمادی نے —
 کشتی گھاٹ سے الگ ہو کر باقی میں پہنچ چکی تھی۔
 اُمادی نے آپ کو فوراً بلایا ہے۔ اُمادی نے —

”شوکتی —“ گھاٹ پر سے ریمان کی آواز آئی۔ ”بھڑو۔ میں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں؟“
 ”میں میدھی ڈھاکے جاؤں گی۔“ اس نے یکلفت ذرا خشکی سے جواب دیا۔
 ”ہاں۔ ہاں۔ لیکن کچھ دور تک —“
 ریمان تازہ انگریزی اخباروں کا پلندہ الباقی اسم کے ہاتھ سے لے کر اس کے ساتھ آہستہ آہستہ گفتگو
 میں مصروف ہو گیا۔ اب وہ دیہاتی کے وجود سے بالکل بے خبر ہو چکا تھا۔

وہ چند منٹ تک اسی طرح کشتی میں بیٹھی رہی۔ پھر مولوی ابوالہاشم نے آنکھوں آنکھوں میں اسے
 اشارہ کیا کہ وہ گھاٹ پر اتر آئے۔
 بوڑھے مولوی صاحبہ نیا دیکھ چکے تھے۔

ارجمند منزل

نواب قمر الزماں چودھری کا کتب خانہ ارجمند منزل کے بیرونی، طویل برآمدے کے ایک سرے پر تھا۔ اس کمرے کے سیاہ و سفید ٹائلوں کے فرش پر بیش قیمت کشمیری تابلین بچھا تھا۔ جس میں بنا ہوا "شجر حیات" کا ایرانی نمونہ اب کافی گھس چکا تھا۔ دیواروں کے برابر لحیم شحیم الماریاں استادہ تھیں۔ ایک طرف آئینوں کی بڑی میز پر چاندی کا قلعہ لائن اور کاغذ اور کتابیں لفافست سے موجود تھیں۔ بڑے درجے کے نیچے، جو پہلو کے باغ میں کھلتا تھا۔ نواب صاحب کی آرام کرسی بھی تھی اور چاندی کی نقشیں پتر چڑھی نیچی چوکی پر سچوان دھرا تھا۔ دیواروں پر سرسبز، جالی، سرسليم اللہ اور شیر بنگال لے۔ کے بفضل انجی کی نقادیر اور نزل تھیں۔ ڈھاکے کے مغل قلعے ملال باغ کا بڑا دلآویز وائرکٹر، آتش دان کے اوپر اور بوڑھی گنگا کے کنارے شائستہ خاں کے دور میں بنی صحت گنبد مسجد کا دائرہ مقابل کی دیوار پر سجا تھا۔ بی بی پری کے مقبرے اور حسینی والوں کی مختصر تصاویر ایک الماری کے اوپر رکھی تھیں۔ جناح صاحب کا دستخط شدہ پورٹریٹ نیز کی عقبی دیوار پر آویزاں تھا۔ مسلم بنگال کے پرانے اور نئے بنگلہ اخبار شہکار، نوبو توڑ، بنگو ستانیر شائبہ پریکا، اسلام پرچارک، المسلم اور ہیر کے مجلد فائل اور الہ سال، پیسہ اخبار، ہیم میندا، اور ڈھاکے سے شائع ہونے والے پرانے اردو رسالوں جادو اور المشرق کے فائل ایک الماری میں مقفل تھے۔ دوسری الماریوں میں بنگلہ، فارسی اور اردو کی کتابوں اور قدیم نسخوں کا اچھا خاصہ خیرہ موجود تھا۔ انگریزی کتابوں کی تعداد مقابلہ کم تھی۔

جوانی سلسلہ کے ایک اتوار کی صبح نواب قمر الزماں چودھری اپنی آرام کرسی پر نیم دراز پوچھا اپنے منہ میں لگائے صوبائی مسلم لیگ کے ماہانہ جلسے کے لئے جو تیسرے پہر کو ارجمند منزل کے بڑے ہال، منعقد ہونے والا تھا، اپنی تقریر لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ تازہ اخبارات کا اخباران کے نزدیک اخروٹ

کی کشمیری مینر موجود تھا۔ نواب صاحب آنکھیں بند کئے اپنی بلند پیشانی پر انگلی پھرتے ہوئے تقریر کا افسانوی پیرا گراف سوچ رہے تھے۔ چند منٹ بعد انہوں نے فائنل سنسین اپنا اٹھا کر منگلیں تعسیر لکھنی شروع کر دی۔

نواب قمر الزماں چودھری بڑی بڑی آنکھوں والے ایک وحیدہ و صلح پچاس سالہ ثقہ، مضبوط اور کڑھ تھے۔ ان کے والد نواب نور الزماں مرحوم ضلع فرید پور کے بہت بڑے زمیندار تھے۔ انھوں نے اور چند منزل تعمیر کروائے ایسٹنی لینڈلارڈ کی حیثیت سے ڈھاکے میں اقامت اختیار کی تھی۔ نواب صاحب مرحوم نے خود کو نوابین ڈھاکہ کے توڑکار کہیں سمجھنے کے شوق میں راگ رنگ حقیر اور دوسرے رئیسانہ مشاغل پر بے تماشہ روپیہ اٹھایا تھا۔ اس وجہ سے اب بھی ان کے جانشین نواب قمر الزماں کاشمیر کے چوٹی کے مسلمان رؤسا میں شمار ہوتا تھا۔ نواب نور الزماں مرحوم کو سیاست سے بھی دلچسپی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں ڈھاکے میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تو وہ اس کے اولین اراکین اور سرپرستوں میں شامل تھے۔ ڈھاکے کے اکثر مسلمان رئیسوں کی مانند نواب صاحب مرحوم کے یہاں بھی اردو کا حرجا تھا۔ اور بچوں کو گھر پر بنگلہ کے ساتھ ساتھ اردو پڑھائی جاتی تھی۔ نواب قمر الزماں کی ولادہ نور الفسار بیگم دہلی اور لاہور کے زمانہ رسالوں، محنت اور تہذیب نسوہ کی خریدار تھیں اور ”مسلم لیگ نور الزماں چودھری ڈھاکہ بنگال“ کی طرف سے کبھی کبھی اصلاح معاشرت پر ان کے مضامین ان جریدوں میں شائع ہوا کرتے تھے۔ ان کی بیوی یعنی سلیم قمر الزماں کشتیا ضلع کے ایک خالص ”بنگالی اسپیکنگ“ زمیندار کی بیٹی تھیں۔ انھیں اردو بالکل نہیں آتی تھی مگر جہاں آراء اور اس کے بھائی اور بہنوں کو گھر پر اردو پڑھائی گئی تھی اس وقت جبکہ نواب قمر الزماں اپنی خاموش اسٹیڈی میں سکون سے بیٹھے تقریر لکھ رہے تھے۔ بالکافی شور مچ رہا تھا۔ کوٹھی کے وسطی ہال میں لیگ کے جلسے کے لئے ایک قطار میں کرسیاں بچھائی جا رہی تھیں پوربنی مالی رولم سٹریٹ کی میز پر رکھے گلدان میں پھول سجا رہا تھا۔ باقی دوسرے ملازمین کمرے کی صفائی میں لگے تھے۔

لیکن اندر تانائے میں جس قدر جہل پہل اور رونق تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ تین دن بعد نواب قمر الزماں چودھری کے فرزند اور جانشین نواب زادہ نیر الزماں کی بارات چڑھنے والی تھی۔ شادی کے جوڑے سب رہے تھے جو بھری پھیرے لگا رہے تھے گیت گائے جا رہے تھے۔ فہریر سے رشتہ دار آنے

دفع ہو گئے تھے۔ بارات دینا ج پور جائے گی۔

تقریر لکھتے لکھتے نواب صاحب نے اٹھ کھڑے سالوں کی الماری میں سے المشرق کا فائل نکالا۔
 ابانہ رسالہ تقسیم بنگالہ کے بعد جب لارڈ کزن نے آسام اور مشرقی بنگال کو ملا کر مسلم اکثریت کا ایک
 پر بنا دیا تھا، مسلم بنگال کی ایک مشہور ہستی، حکیم حبیب الرحمن نے ۱۹۰۶ء میں نکالا تھا، تاکہ اردو
 ذریعہ بقیہ مسلمانان ہند سے ذہنی اور سیاسی رابطہ قائم کیا جاسکے۔ یہ پاکستان کی اولین داغ میل
 ۶۔ نواب قمر الزماں نے اپنی تقریر میں اس رسالے کے پہلے شائع کے ایڈیٹوریل سے ایک اقتباس نقل
 کیا۔ "۱۹ اگست ۱۹۰۶ء اگر غور سے دیکھیں تو کیسی سعید تاریخ ہے کہ اس دن ہم کو زندگی اور موت
 مرض و صحت کا پورا پورا احساس ہوا اور ہم خواب اور نیم خوابی سے گھبرا کر چونک پڑے۔ مسلمانوں کے
 اب کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ بحیثیت برٹش انڈیا کے ایک مستقل آرمینازین قائم کریں۔ بنگالی اخبار
 اور تحریر اور درشت لہجے سے اب ہمارا کیجہ منہ نک آگیا ہے۔ اور ہم کچھ نہیں جانتے کہ آخر ہماری حالت
 ہوگی؟ ہم اپنے لیڈروں کے متعلق کون سی بھیتی ہے جو رد وادہ نہیں سنتے۔ ہمارے لیڈر کیوں بڑے ہیں۔
 لئے کہ وہ بہت سادہ ذاتی نقصان برداشت کر کے صحت اس لئے پارٹیشن کے موید ہوئے ہیں کہ یہ مسلمانوں
 لئے مفید ہے۔ اس لئے کہ انھوں نے باوجود ملکی ہمدردی ہونے کے نام نہاد سودیشی تحریک میں جو پارٹیشن
 سزا دے لئے ایک آرہے، شرکت گوارا نہ کی کہ اس سے اپنی قوم کھٹے میں رہتی۔"

اقتباس کا بنگالی ترجمہ کرنے کے بعد انھوں نے فائل بند کیا اور ۱۹۰۶ء سے لے کر اب تک کی
 اسی جدوجہد کا مختصر تذکرہ قلمبند کرنے کے بعد مزید لکھتے ہوئے اخباروں میں مسلم لیگ کے نسخہ
 اخبار ڈان کا تازہ شمارہ تلاش کرنے لگے۔ اس شمارے میں مجوزہ پاکستان کا تفصیلی نقشہ شائع ہوا
 اور نواب صاحب اس نقشہ کے حوالے سے بنگال و آسام کے متعلق چند اہم نکات اپنی تقریر میں شامل
 فرماتے تھے۔ جب وہ پرچہ نہیں ملا، جو کل شام کی ڈاک میں دہلی سے آیا تھا۔ تو انھوں نے ذرا بے داغ ہو کر
 عجباتی۔

ایک ملازم کتب خانے کے دروازے کا ادواٹھیں پر وہ سرکار لہند داخل ہوا۔
 "تازہ ڈان اخبار۔" نواب صاحب نے کہا۔ "نیرمیاں سے پوچھو۔ وہ تو نہیں اٹھا نے
 ان سے کہنا ہیں پاکستان کا نقشہ چاہئے۔"

”حضور۔ پاکستان کا نقشہ تو نیر میاں نے اس میں سے کٹ کر باہر برآمدے میں دیوار پر
 لگا دیا ہے۔ فرمائیے تو آنکھیں لڑاؤں۔ مگر دیوار خراب ہو جائے گی۔“
 ”ادہ۔۔۔ اچھا۔ ٹھیک ہے۔ رہنے دو۔ جاؤ۔“
 ملازم باہر چلا گیا۔ نواب صاحب پھر لکھنے میں مصروف ہو گئے۔

اور اُس وقت عبدالقادر کو چوان کی کھڑکھڑاتی ہوئی گھوڑا گاڑی، حاجب منظر کی برساتی
 میں داخل ہوئی۔

دیپالئی سرکار گاڑی کے دروازے کی چٹخی کھول کر نیچے اتری عبدالقادر کو کرایہ ادا کیا۔ عبدالقادر
 حسب معمول سر جھکائے گھوڑے کو ہٹکا تا آگے بڑھ گیا۔ سر جھکائے دیپالئی برآمدے کی سیڑھیاں چڑھا
 لیکن اندر جاتے ہوئے اس کی نظر صدر دروازے کے برابر والی دیوار پر پڑ گئی جہاں پام کے گلے کے اوپر
 نیر الزماں نے مجوزہ پاکستان کا نقشہ ڈرائنگ بنوں کے ذریعہ لگا دیا تھا۔

دیپالئی متحشک گئی اور آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھنے لگی۔ پنجاب، آسام، بنگال، کشمیر و سرحد و
 مندر۔ بلوچستان۔ وہ تیوری پر پڑ ڈال کر بڑے غور سے اس نقشے کو دیکھ رہی تھی۔ اس وقت تک
 ملازم ہال میں کرسیوں لگا کر جا چکے تھے۔ اور طویل برآمدہ خاموش پڑا تھا۔

اتنے میں ایک گلیہیر ورم آواز نے اسے چوز کا دیا۔

”دیپالئی بیٹی۔۔۔ اتنے دھیان سے کیا دیکھ رہی ہو۔“

اُس نے سر کر دیکھا۔ نواب قمر الزماں اپنے کتب خانے کے دروازے میں کھڑے شفقت سے
 مسکرا رہے تھے۔

اُسے جہاں اُرا کے بابا بہت اچھے لگتے تھے۔ اس قدر مہذب اور نفیس اور خوش اخلاق گو
 ان سے باتیں کرنے کا بہت کم اتفاق ہوتا تھا۔ لیکن وہ خوراپنے باپ کی اتنی منہ چڑھی اور لاڈلی تھی۔ اس
 لئے نواب صاحب سے بھی بے تکلفی سے بات کر لیتی تھی اور ان سے ذرا خالفت نہ تھی۔ اب اس نے آنکھیں
 پھیلا کر انہیں دیکھا اور پوچھا۔ ”یہ کیا ہے۔ کاکا۔“

”بیٹی، تم کو تو جانا چاہئے۔ ایک روز ہجرت جلد۔ انشاء اللہ عجب پاکستان بن جائے گا تو

اکستانی ہوگی۔

”میں۔ کاکا۔“ اُس نے اسٹڈی کے دروازے کی طرف چلتے ہوئے دریافت کیا۔

نواب صاحب نرمی سے ہنسنے۔ اپنی نساہری اولاد میں جہاں آزار ان کو سب سے زیادہ
ری تھی۔ اس وجہ سے جہاں آزار کی سہیلیوں کا وہ بڑا خیال کرتے تھے۔ علاوہ ازیں دیپالی ان کے
نے دوست کی لڑکی تھی

”اتنی دیر میں کیوں آئیں۔ تمہارا صبح سے انتظار کیا جا رہا ہے۔“ انہوں نے کہا۔ اب جاؤ جلد
۔۔ جہاں آزار تمہارے لئے بہت سا کام لئے بیٹھی ہے۔“

”ابھی جاتی ہوں کاکا۔ مگر پہلے آپ سے کچھ پوچھنا چاہوں گی۔“ دیپالی نے سنجیدگی سے کہا۔
”ہاں۔ ہاں پوچھو بیٹی۔ آؤ۔“ نواب صاحب نے پردہ ہاتھ سے ایک طرف کو اٹھا دیا۔ دیپالی
اسٹڈی میں داخل ہوئی۔ نواب صاحب جا کر اپنی آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ دیپالی قریب ایک صوفے پر
۔ گئی۔

”تمہارے باپ کیسے ہیں۔“

”اچھی طرح ہیں۔“

”اچھا ذرا سی۔ کاغذ پتر سمیٹ لوں، پھر تم سے بات کرتا ہوں۔“ نواب صاحب نے عینک کس
ر رکھ کر کاغذات تھیک کرتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر سرکار اسکول میو، نواب قمر الزماں کے ہم جماعت تھے۔ ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد کچھ عرصہ
ہارجند منزل کے فیملی ڈاکٹر رہے۔ مارے دوستی کے فیس نہیں لیتے تھے۔ اس لئے نواب صاحب نے
بس کے بجائے تحفے تحائف اُن کے گھر بھجوانے شروع کئے۔ ڈاکٹر سرکار نے ارجمند منزل ہی آنا چھوڑ دیا۔
اب صاحب کو اُن کی مالی حالت کا خوب اندازہ تھا۔ ڈرگاہو جا اور عید کے مواقع پر جہاں آزار نے
دیپالی کو ساریاں تحفے میں دیں تو اُن کو دیکھ کر ڈاکٹر سرکار کا منہ تر گیا۔ انہوں نے دیپالی سے کہا۔ جب
تم اس کو کچھ دے نہیں سکتیں تو اس سے لیتی کیوں ہو۔ لہذا یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔

”بھئی ہم کیا کریں۔“ نواب قمر الزماں نے اخباروں کا پلندہ ایک تپائی پر سرکاتے ہوئے کہا۔
”ہمارے یہاں تم جانتی ہو۔ بیماری کا سلسلہ کتنا ہلکا ہے۔ جہاں آزار کی ماں اختلاجِ قلب کی مریضہ ہیں۔“

آئے دن ڈاکٹر کی حاجت۔ مگر تمہارے باپ ایسی الٹی کھوپڑی کے آدمی ہیں۔ مجبوراً ہم نے ڈاکٹر کھوش کو لگا لیا۔ بتاؤ بھلا اگر ڈاکٹر اور وکیل دوستوں سے فیس لینا چھوڑ دے، تو کسے کیا۔“

”آپ ان کو سمجھائیے۔“ دیپالی نے کہا۔

”خفیہ ہیں۔ اُن کو کون سمجھا سکتا ہے۔ تم بتاؤ بیٹی۔ ایسی پریشان سی کیوں نظر آرہی ہو

اور تمہارا شانتی نکھیٹنی کیسا چل رہا ہے؟“

”ٹھیک ہے کا کا۔“

”ہوئے بالو ایک روز ملے تھے، بتلا رہے تھے کہ تم چھٹیوں میں گھر آنے کے بجائے لوگ گیت

جمع کرنے سنتھال پر گنہ چلی گئیں۔“

”جی ہاں۔ کا کا۔“ دیپالی نے بڑی بے چینی سے مجرموں کی طرح صوفے پر پہلو بدلا۔

”بے چارے ہیئت سخت پریشان تھے کہ برسات کا زمانہ ہے۔ جانے کہاں ماری ماری پھر رہی ہوگی

کہیں بیمار نہ پڑ جائے۔“

دیپالی اپنے آپ سے نظریں چڑا کر دریچے سے باہر دیکھنے لگی جہاں کا سنی پھول کھلے تھے۔ کیہ

پرسکون سہانا اتوار کا دن تھا۔ مگر نہ جانے کیوں دل کو پچھکے سے لگ گئے اور پاکستان کا نقشہ۔۔۔

اس نے بابا کو اتنا بڑا دھوکا دینے کے احساس کو نظر انداز کرنے کی سعی کرتے ہوئے دوبارہ نواب صاحب

کو مخاطب کیا۔ ”پاکستان واقعی بن جائے گا کا کا؟“

”انشاء اللہ۔۔۔“ اب وہ کاغذات ایک طرف رکھنے کے بعد آرام کر رہا پر نیم دراز ہو کر کسی سوچ

میں کھو چکے تھے۔ دیپالی نے اُن کے خیالات میں خلل ہونا مناسب نہ سمجھا اور دیوار پر لگے دائرہ کلرنگ

دیکھنے لگی۔۔۔ ڈھاکے کے آٹارالہ ضلعا دید۔ قلعہ لال باغ۔ ست گنبد مسجد۔ بی بی پری کا مقبرہ۔

حسینی دالان۔

نواب قمر الیاں بنگال کے اس اسلامی ماضی کے وارث ہیں۔ دیپالی نے سوچا۔ اور اسے یاد

آیا۔ اُس کی جنم بھوم سمن سنگھ کے وسیع و عریض، سرسبز علاقے میں۔ ہندو اور بودھ بنگال کے پرسوں اور

لرزدہ خیز، کھنڈر بھی موجود ہیں تو میں صرف اس ہندو ماضی کی وارث ہوں؟ اس ماضی اور اس اسلا

ماضی کی وراثت کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں۔؟

لیکن ریحان نے سندھ میں ایک روز اس سے کہا تھا۔ تاریخ آپ سے آپ میں سمجھا دیتی ہے ہم خود تاریخ ہیں۔ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیاں تاریخ کی مجموعیت کی سب سے بڑی تصویر ہیں۔ نواب صاحب آنکھیں بند کئے، سمجھوان کے آہستہ آہستہ کش لگا رہے تھے۔ اور غالباً دیہاتی لی سے بے خبر ہو چکے تھے۔ دیہاتی نے انھیں دیکھ دھڑ، نیک نفس، شریف انسان، مسلم لیڈر۔ لیکن اپنی نیک نفسی اور خلوص نیت کے باوجود ان کو عبدالقادر کوچوان کے مسائل ساس ہے؛ عبدالقادر کوچوان پاکستان کے قیام سے مستفید ہوگا۔؛ مجھے یہ سب کون ہے؟

ریحان نے کہا تھا۔۔۔ دیہاتی۔۔۔ ہندوستان کے نوے فیصدی انسان مخلص ہیں اصحاب کی کی تلخی، کم مائیگی، کمتری اور بے عرقی کے احساسات کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ زندہ رہنے کی لہجہ اور اخلاق اور مذہب احد فلسفے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ انسان کو جھوٹا اور گھٹیا اور کمینہ اور عاری بنادیتی ہے۔ ہم ہندوستانی اسی لئے جھوٹے اور کمینہ اور کردار سے عاری اور بے ماضی سنہرا تھا کیونکہ آبادی کم اور گیموں اور چاول وافر تھا۔ لیکن کوئٹہ اور مہار آبادی نے ملک کا یکدم نکال دیا۔ ہندوستان والوں کو جھوٹا اور بے ایمان بنادیا۔ ہر کوئی ملک سے لامحالہ گھٹیا اور کردار سے عاری ہو جاتے ہیں۔ غلامانہ ذہنیت بے معنی اصطلاح نہیں ہے۔ مورج اب نصف النہار پر پہنچنے والا تھا۔ کتب خانے کے وسیع دریکوں میں سے آتی ہوئی۔ ل نے شہنشاہ اور نگزیب عالمگیر کے بیٹے، صوبے دار بنگال، شہزادہ محمد اعظم کے بولے قلعہ بڑی پینٹنگ کو جھللا دیا۔ دیہاتی مسخوڑ ہو کر اس پینٹنگ کو دیکھا کی۔ ریحان نے کہا تھا۔ (نہ) سوچ رہی تھی۔ جس طرح پادری بھرجی بات بات پر اس سے کہا کرتے تھے۔ "یسوع"۔ ("ریحان نے کہا تھا،۔۔۔ ہمارے بنگال کی، ڈھاکے کی مسجدیں۔ قلعے، پرائے محلات، عات، ہماری سنگیت اور سنگتراشی، یہ سب اس سنہرے، رومانی ماضی کی یادگار ہیں۔ ہمارے شہر کا موجودہ فرقہ وارانہ کھنچاؤ اور افلاس، برطانوی کوئٹہ مینڈم کا ثبوت ہیں۔ بکھانے کو کم ملے گا وہاں فرقہ وارانہ کشمکش ناگزیر ہے کہ سب ایک دوسرے کے منہ سے اپنے پیٹ کی آگ بجھانا چاہتے ہیں۔ یہ جنگ کا قانون ہے۔ برطانوی نظام ایک ایسی بدکار

ہے۔ جس کے سامنے کھڑے ہوئے قطار اندر قطار مختلف ہندوستانی فرقے اپنے اپنے کھنکول
 جھولیاں پھیلانے ایک دوسرے کو دھکیل کر آگے بڑھنا چاہ رہے ہیں۔ اور سر پھٹول میں مصروف
 اندھے بھوکے غرغر شریڈ، اب نارمل عوام آپس میں فساد کر کے ملک کی قسمت کا آج کل فیصلہ کر رہے
 ہیں۔ —

”ہاں بھائی دیپائی۔ کیا پوچھنا چاہتی تھیں۔“ نواب صاحب نے ایک دم زور سے
 گڑ گڑا کر آنکھیں کھولتے ہوئے دریافت کیا۔

دیپائی چونک پڑی۔ پھر اس نے کہا۔ ”کاکا۔ آپ کیوں چاہتے ہیں کہ ملک تقسیم ہو جا۔
 نواب صاحب چند سیکنڈ تک سچوآن گڑ گڑاتے رہے اور پھر رومان سے کہا۔ ”بیٹی تم
 حلوں سے کہہ رہے ہندوستان کے مسلمان تباہ حال ہیں، ایک وقت تھا کہ اسی بنگال کا مسلمان
 حال اور آسودہ تھا۔ صرف اس صوبے میں ایک لاکھ اسلامی مدارس تھے۔ بیٹی۔ ایک لاکھ مدرسے
 اب یہاں مسلمانوں کی عزت اور حیالت کی کیا حیالت ہے؟ خود تمہارے گرد دیو شیکور بنگالی
 کی اقتصادی پسماندگی اور ان کے ساتھ سماجی بے انصافی کا اعتراف کر چکے ہیں۔“

”مگر کاکا۔ آزاد متحدہ ہندوستان میں بھی تو مسلمان خوشحال ہو سکتے ہیں۔“

”متحدہ ہندوستان میں۔؟ ہرگز نہیں۔“ انہوں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ”اور سب
 متحد کب تھا۔ اسے انگریزوں نے متحد کیا۔ دیپائی تم میری بچی ہو۔ میں تم سے کیا بحث کروں۔
 اب تمہارے بابا سے بھی بحث نہیں کرتا۔ جوانی کے زمانے میں ہم دونوں خوب جھگڑتے
 جب وہ الحق الدین اپنے باپ دادا کی کچی کھچی زمینیں بیچ کر کانگریس میں گھس گئے تھے۔ جیل
 گئے تھے۔“ انھوں نے پھر سچوآن کی منہ سے لگائی۔

”کاکا۔ میں بچی نہیں ہوں۔“ دیپائی نے اٹھ کر کہا۔ ”میں آپ سے یہ باتیں ڈسکس کرنا چاہتا

نواب صاحب نے ذرا اداسی سے مسکرا کر اسے غور سے دیکھا اور کہنے لگے۔ ”میں بھی

تھا تم اس سر پھرے سچاے دینیش بابو کی بھتیجی ہو۔ تم بھی سر پھری ہوگی۔ مگر آج ایک نصیحت کرتا
 قومی جدوجہد کے چکر میں تم کسی آفت میں نہ پھنس جانا۔ تمہارے باپ پہلے ہی ایک بہت بڑا

سے چکے ہیں۔“

”قربانی۔۔“ دیپالی نے ہنس کر کہا۔ ”تیاگ اور قربانی تو اس دیس کی پرانی روایت ہے۔
 قوم بدھ سے لے کر مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو تک سب قربانیاں دیتے آئے ہیں۔ تیاگ اور
 ۔۔ تیاگ اور قربانی۔۔“

”ہوں۔۔“ نواب صاحب ذرا مسکرا کر چپ ہو رہے۔

”نہیں کا کا۔“ دیپالی نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”ملک کو تقسیم نہ ہونے دیجیے۔“

”بیٹی۔۔“ نواب صاحب نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ ”میرا اور تمہارا نقطہ نظر بالکل
 نہ ہے۔ میں تم سے کیا کہوں۔“ پھر انہوں نے کرسی پر پہلو بدلا اور قریب کی میز پر سے اپنی ناکل
 ٹھاکر لے دھیا نی سے اس کے اوراق پلٹتے ہوئے دہرایا۔ ”بالکل جدا گانہ ہے۔ ہم ۱۹۰۶ء کی تقسیم
 سے خوش تھے۔ کیونکہ اس میں ہمارا اقتصادی فائدہ تھا۔ تم لوگوں نے اسے اپنی سیاسی عزائم پر فرض
 سمجھا اور اس کو ختم کرنے کے لئے تشدد کی تحریک شروع کر دی اور ہم پھینکے گئے۔ یہ ہم پھینکنے
 تمہارے ہیرو قرار پائے بیٹی معاف کرنا۔ تم نے ہی یہ ذکر چھیڑا ہے اور تم کہتی ہو کہ تم اب بڑی ہو گئیں
 سمجھ رہی ہو۔ اس لئے میں تم سے کہہ رہا ہوں۔ اسی دھاکے میں تقسیم کے خلاف احتجاج کرنے کے
 لہزوں پر ہم پھینکے والوں کے پانچ سو خفیہ گروہ تھے۔“

”پانچ سو۔۔ کا کا۔“ دیپالی نے آنکھیں پھیلا کر دہرایا۔ اور سوچا۔ میں اس ہم پھینکنے و
 روہ کی روایت کی پیروی ہوں۔ اور نواب قمر الزماں چودھری مخالف کمیپ میں ہیں۔ ایسا کیوں

۔۔؟

”بنگال کی مسلم اکثریت کا لھینا اس تقسیم سے فائدہ تھا۔ تم نے تو بیٹی گاؤں میں ہندو
 ان اور ہندو زمیندار کے بچے میں پھنسنے مسلمان کسان کی حالت نہیں دیکھی۔“

”آپ بھی تو زمیندار ہیں کا کا۔“

”ٹھیک ہے۔“ نواب صاحب نے ذرا ہنچھلا کر بچپان کی لالٹ کی اور گٹنی بجائی۔
 ”میں ملازم ایک تابع فرمان جن کی طرح نمودار ہوا۔ نواب صاحب نے ابرو سے بچپان کی طرف
 دیکھا۔ ملازم چلم تازہ کرنے کے لئے باہر لے گیا۔ نواب صاحب دیپالی کی طرف متوجہ ہوئے۔ ”کیا
 ہی کا گھریس میں زمیندار اور سرمایہ دار شامل نہیں۔؟“

”میں کا کچھ ایسی نہیں ہوں کا کا۔“

”پھر۔ پھر کیا ہو۔؟“ وہ دفعتاً چونک اُٹھے۔ ”تم بیٹی کہیں کیونسٹ تو ہو گئیں؟ بنگال میں آج یہ تھی دبا پھیل رہی ہے۔“ انہوں نے بڑی آرزوئی اور تردد سے نظر ڈالی۔

”جی نہیں۔ میں کیونسٹ نہیں ہوں کا کا۔“

نواب صاحب کو اس انکار کا قطعی یقین نہ آیا۔ وہ تاسف کے ساتھ سر ہلایا کہ دیپالی نے ذرا بے خوفی سے کہا۔ ”کا کا میں تو محض دلش کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔“

آنا دی کی خاطر۔“

”ضرور خدمت کرو بیٹی۔ آزادی حاصل کرو۔ مگر یہ آزادی مسلمانوں کے لئے نہیں ہوگا اتنی تلخی ان کے خیالات میں ہے۔ دیپالی نے لرز کر سوچا۔ تو ہم لوگ، ریحان اور سائے، محض ایک مصنوعی، غیر حقیقی، خیالی دنیا آباد کر رہے ہیں۔؟

جن تازہ چہلمے کراندہ آیا۔ چلم پچوان پر رکھی اور چند قدم پیچھے ہٹ کر دروازے باہر نکل گیا۔ کہ نواب صاحب کی طرف پیٹھ کر کے نہ جاسکتا تھا۔ دیپالی نے نواب صاحب سے در کیا۔ ”کا کا۔ یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ مسلم لیگ صرف نوابوں اور راجاؤں کی جماعت ہے راجہ محمود آباد۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں۔ اور جیسے نواب قوام الزماں چودھری۔“ وہ کھا کر ہنسنے لگی۔ نواب صاحب نے تپائی سے ہلکی ہوئی چاندی کی موٹھ والی چھڑی اٹھا کر اسے گویا پیٹے ارادہ ظاہر کیا اور پچوان کا ایک کش لگا کر بولے ”بنوئے چندر نے اپنے لاڈ پیار میں تجھے بالکل برباد نہیں بتائیے کا کا۔“ وہ پھل کر بولی۔

نواب صاحب تیوری پر بل ڈال کر اسے دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے آہستہ آہستہ کہا۔ ”دیپالی۔ تمہارے ٹھاکر دادا بھی زمیندار تھے اور ان کی اور میرے والد مرحوم کی آپس میں خاصی دوستی دونوں کے ہاں ناچ گانے اور ناٹک کی محفلیں جیتی تھیں اور عیش ہوتے تھے اور یہ دونوں بزر میرے ابا مرحوم اور تمہارے ٹھاکر دادا انگریزوں کے وفادار تھے۔“ پھر وہ جیسے نکلخت پرانی بات سوچنے لگے۔ جیند محفلوں بعد انہوں نے کہا۔ ”اسکول میں بنوئے چندر اور میں ہم جماعت تھے۔ نہ

ید پانچ چھ سال کچھ سے چھوٹا ہے۔ مگر مسلمان رئیس زادہ ہونے کے کارن میری انگریزی تعلیم خاصی پردانی اور دیر میں شروع کروائی گئی تھی۔۔۔ خیر۔۔۔ وہ آنکھیں بند کر کے ابروؤں پر اپنے ہاتھ کی اور انگوٹھا پھیرنے لگے۔ اور پھر کہا۔ ”ہمارا ایک اور کلاس فیلو بھی تھا۔ وہ سید مرتضیٰ حسین۔ جو بڑا کٹر نیشنلسٹ مسلمان ہے اور تمہارے دشو ابھارتی میں بڑھا تا ہے۔ خیر۔۔۔ پھر تمہارے باپ جی اپنی قومی تحریک میں شامل ہو گئے۔ وہ جس سیاست میں شامل ہوئے، وہ میرے نزدیک مسلمانوں مخالف سیاست ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو مجھے بے چارے دشمن کی شہادت کا صدمہ نہیں ہوا۔؟“
 یہ بھی جب اس کی آنکھیں اور شبلیں اور باتیں یاد آتی ہیں۔۔۔ دل کٹ کر رہ جاتا ہے۔ مگر مٹی مجھے موسس ہی ہے کہ وہ گمراہ تھا اور اپنی جان اس نے بیکار ضائع کی۔ یہ تشدد پسندی اور ہم بھیگنا۔ گولی مار دینا۔ اس طریقے سے کیا برطانیہ کی طاقت کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے؟ مگر اب ہر حال اس ایک کا زور کم پڑ چکا ہے۔ خیر بھائی دیپالی۔ یہ بڑے گنجلک معاملے ہیں۔ بڑی ہوگی تو سمجھو گی۔
 ان نو عمری کا جوش ہے اور انقلاب زندہ باد کے نعرے لگا رہی ہو۔ مگر سردھڑکی بازی سوچ سمجھ لگانا چاہئے۔ اور بی بی تم اس فلاکت زدہ زمانے میں پیدا ہوئیں۔ تم بے چاری نے دیکھا ہی کیا ہے۔ تو سوچ بھی نہیں سکتیں کہ تمہاری چند رکنج نے بھی کبھی اچھے دن دیکھے تھے۔ میں سمجھتا ہوں اگر اورے بھٹا کر دادا کے زمانے کی امارت تھوڑی سی لہجی تنگ باقی ہوتی تو شاید تم اس جوش و خروش، خواہوں اور امیروں کی مخالف نہ ہوتیں۔“

”لیکن ادمارائے تو اب بھی بڑی رئیس زادی ہیں۔ دیپالی نے کہا شروع کیا۔

”ہاں۔۔۔ میں جانتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ بیرسٹری تو ش رائے کی لڑکی تم سب کی سرغنہ کرو بن گئی ہے۔ مگر میں اس کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ دیپالی میں پرانی وضع کا آدمی ہوں۔ میرے لات پر تم کو غصہ ہی آئے گا۔۔۔ خیر تو تم مجھ سے ڈر سکتیں کیا کرنا چاہتی تھیں۔؟“ وہ پھر سکرانے لگے۔
 ”کا کا۔ میں صرف یہ کہہ رہی تھی۔“ دیپالی نے اب ذرا غیر یقینی لہجے میں کہا۔ ”کہ بھوارے کے لئے اتحاد کی بھی کوشش کی جاسکتی ہے۔؟“

”اتحاد۔ اتحاد ہے کہاں۔؟ پنجاب کا آریہ سماج اور مہا ایشٹر اور شکال کی ہندو تجدید

اتحاد کی نشانیاں ہیں۔؟“

”میں دوسرے صوبوں کے متعلق تو نہیں جانتی کا کا۔ مگر ہمارے بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا کلچر تو بالکل ایک ہے۔“

”مانتا ہوں بھائی۔ یہاں کا کلچر ایک ہے۔ یہاں کی لوک سنگیت، لوک سائنس، چیزیں مسلمانوں کا لکنا بڑا حصہ ہے۔ مگر ہندوؤں نے بھی اس کا اعتراف کیا، بنگالی کلچر سے انہی نے انھیں ہندو بنگالی کلچر ہوتی ہے۔ پچھلی صدی میں تو زور شور سے یہ بحث چھیڑی گئی تھی کہ بنگالیوں کی زبان ہی نہیں۔ بنگالہ ادب اور تہذیب ہمہ ہندوؤں کا ورثہ ہے۔ کیا ہم انہیں نہیں چاہتے تھے؟ خدا کی قسم ہم اتحاد چاہتے تھے اور پچھلے آٹھ سو سال کی تخلیق شدہ بنگالی لوک سنگیت اور ادب اس کا مکمل ثبوت ہے۔ مگر اب مسلمانوں سے اتنی نفرت۔ ان کے لئے حقہ کا ایسا رویہ۔ تم نے آئندہ کچھ کرنا ہے؟“

دیپالی نے نفی میں سر ہلایا۔

”لیکن بنگال کے مسلمان پسماندہ اور مفلس کسان اور ماہی گیر اور تاج اور کارگر ہیں۔ اپنی مدافعت میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہمارا ہندو بنگالی پریس نواب سر سیم اللہ کو انگریز کا چٹھو کہتا ہے اور یہ جواتے بنگالی ہندو نارٹ ہیں۔ یہ انگریز کے چٹھو نہیں۔؟“

دیپالی خاموش رہی۔ نواب صاحب نے ذرا جوش بات جاری رکھی۔ ”تم بنگالی کلچر کے اتحاد کی بات کرتی ہو۔ بالکل صحیح ہے۔ سو ڈیڑھ سو سال قبل تک یہ کلچر واقعی ایک تھی۔ راجہ رام موہن رائے عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ نوابین مرشد آباد کے دوست ہندو مشرقی فارسی پڑھتے تھے۔ ہمارے گرو دیو، جن کا خاندانی نام انگریزوں نے ٹھاکر کے بجائے ٹیگور کر دیا۔ ٹھاکر کا یہ خطاب۔۔۔ اس خاندان کو بنگال کے مسلمان نوابوں ہی نے دیا تھا۔ تم یہ بات جانتی ہو۔؟“

دیپالی نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

”ایک زمانے میں یہ ٹھاکر خاندان پیر علی برہمنوں کا گھانا کہلاتا تھا۔ کیونکہ انہوں نے قنوجی برہمن کی ذات پات کی قیود توڑ کر مسلمان نوابوں کے یہاں ملازمت کر لی تھی۔ خود اپنا نام دیکھو۔ سرکار مجموعہ دلیا مندرار، تعلقہ دارا اور قالون گو۔ یہ سب بنگالی کامیستھوں کے مغل عہدے تھے، جوابہ تھا ذات بن چکے ہیں۔ نواب صاحب نے پچوان کی لئے ایک طرف رکھ کر لمبی سانس لی۔

”مگر کا کا — دیپالی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”ہندو تجدیدیت کے ساتھ مسلم تجدیدیت بھی تو شروع ہوئی بنگال میں۔“ سند بن میں اسے ریکان نے ایک شام وہابی تحریک کے متعلق بتلایا تھا۔ جس کی زیر قیادت مسلمان مولوی انیسویں صدی میں بنگالی مسلمان کسانوں سے کہتے پھرتے تھے کہ وہ اپنے ہندو مذہب و رسم و رواج ترک کر دیں۔“ اور پھر لڑوادیانگریزوں نے آپس میں۔“ اس نے باواز بطن کہا۔ ”ہریات کا الزام انگریز کے مرتھو پنا بالکل غلط چیز ہے۔ تم لوگ چند مفروضوں کی بنیاد پر اپنی ساری دلیل پیش کرتے ہو۔“ انہوں نے گھڑی دکھی اور چونک کر کہا۔ ”تمہارے ساتھ میں بیماری کی مفروضہ سوزی میں اتنا وقت نکل گیا۔ مجھے ابھی تقریر بھی تو لکھنی ہے۔“ انھوں نے تپائی پر سے کاغذ اٹھایا۔

”کا کا — مجھے سنائیے اپنی تقریر۔“

”بھاگ جاؤ۔“

”نہیں کا کا —“ اس نے اُن کے ہاتھ سے کاغذ چھین لیا اور نامکمل صفحہ پڑھنے لگی۔ ”اس گئی گذری حالت میں بھی مسلمانان بنگال نے عیسائی مبلغین کے خلاف اور ہندو احیاء کی مدد بن اخبار اور رسالے نکالے اور ہمارے لیڈر قوم کی بے چارگی پر خون کے آنسو روتے رہے۔ بھائیو! اقد یہ ہے کہ مشرک کے بعد سے آج تک، لاہور سے لے کر جالنگام اور دہلی سے لے کر مدراس تک کے مسلمان محض خون کے آنسو روتے رہے ہیں۔ مگر اب مل کا وقت آگیا ہے۔“

دیپالی نے پڑھ کر کاغذ میز پر رکھ دیا۔

نواب صاحب المشرق کا فاسل الماری میں واپس رکھنے کے لئے آرام کرسی سے اٹھے۔

دیپالی بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”تم نے مسلم احیاء کے متعلق کسی کانگریسی کی کتاب پڑھی ہوگی۔“

”جی نہیں کا کا۔“ ریکان کا نام اس کی زبان پر آنے آتے رہ گیا۔ ”ایسے ہی بس ادھر ادھر

سے سنا ہے۔“

نواب صاحب الماری کھول کر کتابوں کا جائزہ لینے لگے۔ دیپالی نے دریچے سے باہر جھانکا

ریکان نے کہا تھا۔ (یسوع مسیحؑ نے کہا تھا) آج سے دو سو برس قبل تک بہت سے بنگالی صوفی گورکھ

رہتے جیسے ناموں کی کتابیں لکھتے تھے اور شنوید گاتے تھے۔ بہت سے صوفیوں کے سلسلے

تترنگ یوگ تنگ کے ہم شکل تھے۔ بنگالی خانقاہوں میں ایک اچھا خاصا "مسلم یوگ ساہتیہ" تھوٹا ہو چکا تھا۔ مدار شاہ کے فقیر اور ہندو یوگی تقریباً ایک جیسے تھے۔ اور یہ مذہبی فقیر اور ہندو سنیوں کے ساتھ، کے بھیانک قحط کے بعد کمپنی کی افواج سے لڑتے بھڑتے پھرتے تھے۔ اور ریحان نے بتایا تھا کہ ایک مرتضیٰ شاہی فقیروں کا سلسلہ تھا جن کے گرو سید مرتضیٰ آئندہ نے یوگ قلندر اور دشمنوں کو جوڑنے کی ایک کتاب لکھی تھی۔ ایک شادی شدہ برہمن زادی ان پر عاشق ہو کر ان کی چلی بن گئی تھی۔ اس کا نام آئندہ یاد دیا تھا۔ اسی لئے وہ مرتضیٰ آئندہ کہلاتے تھے۔ مثال کے طور پر۔۔۔ ریحان نے کھنکار کر اضافہ کیا تھا۔ جس طرح اس خاکسار کو باؤل فقیر سید ریحان دیپالی کہا جائے گا! درجے میں کھڑے کھڑے دیپالی کو یہ بات یاد کر کے ہنسی آگئی۔ "You and I — we two are —"

ریحان نے کہا تھا۔

the stuff all human love is made

"اب سمجھ میں آتا ہے کہ ہمارے سارے بادل مغنی عشق مجازی اور عشق حقیقی اور انسانیت کے عشق کے متعلق کیا گاتے پھرتے تھے؟ شیخ مدن باؤل، ہشتون شاہ، حسن رضا، لال شاہ۔۔۔ یہ سنگیت کا درویش جن کی شاعری اور موسیقی نے اتنی شدت سے گرو دیو کی شاعری اور موسیقی کو متاثر کیا۔ کیا یہ مشترکہ تھیں؟" اور دیپالی نے خود اپنے گاؤں میں سمجھ میں دیکھا تھا کہ برہما دتیہ فقیر جو مسلمان تھے منتر پڑھ کر اور گفتیاں بجا بجا کر مسلمانوں کی مرادیں پوری کرنے کا تپ کرتے تھے اور مسلمان کسانوں کے ہاں شادی کے موقع پر منگل چنڈی وجے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ خود ریحان کا عرف رونا میاں تھا۔ وٹو ہندوؤں کا نام بھی تھا۔ کیا یہ سب تہذیبی مماثلت یا اتحاد تھے بے حد سطحی مظاہر ہیں، یا ان کے پیچھے کوئی ایسی گہرے تاریخی، نسلی اور نفسیاتی معنویت بھی پنہاں ہے؟ جو سیاسی تبدیلیوں سے بلند تر اور مادہ دار ہے گی؟ دیپالی بہت زیادہ الجھ کر دریچے سے مڑی۔ نواب صاحب الماری بند کر کے لکھنے کی میزنگ طرف جارہے تھے۔

"یہ سب طبقاتی سیاست ہے" دیپالی نے ریحان کے الفاظ دہرائے اور اونچی آواز میں

کہا۔ "اب میں جاتی ہوں کا کا۔"

نواب صاحب نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ اور شامانہ دقار سے چلتے ہوئے اس کے نزدیک آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تم بیٹی۔ مجھے آج تک معلوم نہ تھا کہ اتنا زیادہ پڑھ لکھ گئی ہو مجھے تمہاری

طرف سے بہت تشویش ہو گئی۔ لڑکیوں کے لئے اتنا بڑھکھ جانا بہت مضربے۔ اسی لئے میں نے جہاں آبا کو کالج سے اٹھالیا۔ تمہارا اصل فرض وہ ہے، جس کے لئے اندر تمہارا انتظار کیا جا رہا ہے۔ جاؤ جاؤ کے اپنے بھائی نیر کی بری کے جوڑے ٹانگو۔ جاؤ۔ بھاگو۔“

”جی کا کا۔۔۔“ دیپاکی نے ہنس کر کہا۔ اور تقریباً دوڑتی ہوئی کتب خانے سے باہر نکل گئی۔

نواب صاحب کیس میں سے عینک نکال کر بڑی میز پر جا بیٹھے۔

ارجمند منزل کے پائیں باغ کے وسط میں سنگِ سرخ کا بڑا خوبصورت تالاب تھا۔ جس کے چاروں طرف اونچی، کنگورے دار منڈیروں کے ساتھ ساتھ سنگی بنچیں نصب تھیں اور بیرونی میڑھیوں کے دونوں جانب حسنہ حنا کی جھاڑیاں تھیں۔ تالاب کے کنارے سیل کے نیچے کئی لڑکیاں ایک تخت پر جمع سلامتی میں مصروف تھیں۔ قریب ہی گھاس پر سیٹل پاشیاں کھچی تھیں اور بڑی سرگرمی سے جوڑے سیل رہے تھے۔ تالاب کی دوسری جانب گلاب خاص کے گھنے سائے میں ایک مسکندہ سا ”شاہی تخت“ بکھا تھا جس پر انجم آرا اطمینانی دلائی پھیلائے اس پر گولے کا چومکھا جال بنانے میں مصروف تھی۔

یہ ”شاہی تخت“ اس زمانے کی یادگار تھا جب نواب نور الزماں مرحوم کے ہاں ارجمند منزل کے باغ میں جاترا والوں کی منڈلیاں آکر ڈیرے ڈالتی تھیں۔ لوک ناٹک کھیلے جاتے تھے۔ بنگالی تھیٹر کمپنیاں تاریخی، سوشل اور سیاسی ڈرامے اسٹیج کرتی تھیں اور شہر کے ہندو اور مسلم امرا جمع ہو کر ”شاہجہاں“ ”ٹیپو سلطان“ ”سراج الدولہ“ ”میر قاسم“ ”کرانی جیون“ اور ”خودی رام باسو“ سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ (خودی رام باسو، جو ایک دہشت پسند نوجوان تھا اور جسے مظفر پور کے انگریز جج کنگز فرڈ پر قتلانہ حملہ کرنے کے جرم میں ۱۹۰۷ء میں پھانسی ہوئی تھی۔ ہزاروں ہندو گھروں میں اس کی اکھ تبرک کی طرح تقسیم کی گئی اور لوگ اس کے تصویر بنانا کر سیتے لگے۔ اس کے متعلق مقبول ڈرامہ بھی ارجمند منزل میں کھیلا جا چکا تھا) یہاں گریش چندر اور ٹیگور کا چرچا رہتا تھا۔ اور بنگلہ سنگیت ناگوں کی موسیقی لونی تھی۔

ڈھاکہ کے میں اردو تھیٹر ۱۸۷۷ء سے پہلے سے قائم تھا۔ اور اواخر انیسویں صدی تک یعنی جب اب نور الزماں فرید پور سے آکر وہاں سکونت پذیر ہوئے۔ شہر میں متعدد تھیٹر کمپنیاں موجود تھیں جن کے

نشی اور ایکویسیں لکھتو سے منگوائے جاتے تھے اور ایکڑ میں مردانہ پارٹ کرتی تھیں۔ شام تک، جب نواب قمر الزماں کے دادا پہلی بار فریدی پور سے ڈھاکے آن کرہ سے تھے۔ شہر میں چونتیس تھپڑ کپنیاں قائم تھیں۔ اور اس زمانہ سے لے کر آج تک ارجمند منزل میں نانک کا سلسلہ جاری تھا۔ جنگلی زمینداروں کو تھپڑ کا اصرار شوق تھا۔ اپنے گھروں میں ایسٹج کے جانے والے ڈراموں میں اکثر وہ خود بھی ایکٹنگ کرتے تھے۔ ”جلسہ گھر“ زمینداروں کے مکان کا لازمی حصہ تھا۔ ارجمند منزل کے جلسہ گھر میں اب سیاسی میٹنگیں بھی ہوتی تھیں۔ مگر اس کی ایسٹج اور دیگر ساز و سامان جوں کا توں موجود تھا۔ نواب نور الزماں کے چھوٹے بھائی نواب ابہ فخر الزماں مرحوم نے خود ایک ٹیکسٹر کپنی کھولی تھی۔ خواص و عوام سبھی اسٹج کے رسیا تھے۔ کلکتہ میں مدقوں سے رپو اونگ ایسٹج موجود تھی اور ”ترکی حور“ نانک میں پہلی بار بیک گراؤڈ میں فلم کے مناظر سے کام لیا گیا تھا۔ کلکتہ، ڈھاکہ اور دوسرے شہروں کے ہر محلے کی اپنی نانک منڈلی تھی۔ دیہات میں جاترا والے گاؤں گاؤں گھومتے تھے۔

اسی دور کے ”سین سینیر لویں“ کے پردوں، ادنیٰ اپنے چینی کے گدوں، فرنچیز، شاہی ملبوسات، نفتلی تاج، دار صی مونچھوں، کاکھ کی تلواروں اور دیگر لوازمات کا انبار ارجمند منزل کے شاگرد پیشے کے ایک گودام میں مقفل تھا۔ اور جب کبھی کالج میں ڈرامہ ہوتا تو دیہاتی اور روزی فوراً ارجمند منزل کا رخ کرتیں۔ نواب زادہ نیز الزماں گودام کھلواتے اور وہ اپنے مطلب کی چیزیں نکال کر لے جاتیں۔

نواب زادہ فخر الزماں مرحوم نے ”راجہ بھوج“ کے عنوان سے خود ایک سنگیت نانک منگلہ میں تصنیف کیا تھا۔ اس کے لئے نئے نئے آئینوں اور رنگ برنگے نقش و نگار سے مزین دکرم آدیہ کا روایتی سنگھاسن بنوایا گیا تھا۔ جس میں ساری میں لپٹی چار مورتیاں چاروں پایوں کی جگہ تخت نمبر پر اٹھائے کھڑی تھیں۔ بقیہ اٹھائیس مورتیاں سنگھاسن کے سر طرف منگلے میں نصب تھیں۔ یہ ”شاہی تخت“ ایسٹج کے دوسرے فرنچیز کے انبار کے نیچے مدقوں سے دبا پڑا تھا۔ اور آج صبح ملازموں نے باہر نکال کر جھاڑ پونچھ کے گلابِ خاص کے نیچے بچھا دیا تھا۔ تاکہ صاحبزادیاں آرام سے بیٹھ کر سی پرو سکیں۔

سنگھاسن کے مقابل میں سیمل کے نیچے مہر آراء مشین پر کچھ سی رہی تھی۔ تین چار خادائیں

تالاب کی سیر میں پانی چبا رہی تھیں۔ ایک سیٹیل پانی پر بار مونیٹم رکھا تھا اور ایک لڑکی بیاہ کے گیت اپنے میں مصروف تھی۔

نواب قسم الزماں چودھری کو کتب خانے میں لیگ کے مالانہ جلسے کے لئے تقریر لکھتا چھوڑ کر دیپالی سرکار طویل گیسٹری میں سے گزرتی کشادہ چوٹی پہنچے۔ اور دوسری منزل پر جا کر جہاں آراء کے کمرے میں داخل ہوئی۔ مگر کمرہ خالی پڑا تھا۔ تخت اور مسیروں پر بنارس ساریوں کے خالی ڈبے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں مٹھائی کے گلابی کاغذوں کا ڈھیر لگا تھا۔ ساری کوٹھی کی طرح اس کمرے میں بھی شادی کا ماحول نظر آ رہا تھا۔

نیچے سے بار مونیٹم کی آواز بلند ہوئی۔ دیپالی درجے میں لگی جو پچھلے باغ پر کھلتا تھا۔ اس نے جھانک کر تجرہ اور مہر آرا کو دیکھا۔ مونگیا ساری اپنے ایک اور لڑکی، جس کی پشت کوٹھی کی طرف تھی۔ بڑی تندہی سے شین کا سینڈل گھمانے میں مصروف تھی۔ بادل گھرائے تھے۔ مگر ابھی بارش کے آثار نہیں معلوم ہو رہے تھے۔ بڑی سہانی ہوا چل رہی تھی۔ ایک طائر تالاب کے دوسرے سرے کی اندرونی سیر میں چاہتی تھی۔ کتب خانے کے پریشان کن، کریناک ملکی سیاست کے تذکرے کے بعد یہ منظر کس قدر پرسکون اور نظر فریب تھا۔

باورچی خانے کی سمت سے جہاں آرا خرواں خرواں چلتی تالاب کی طرف آئی۔ دیپالی نے درجے میں سے اُسے آواز دی۔ جہاں آرا نے اسے سرائٹا کر دیکھا۔ "دیپالی۔ اتنی دیر لگا دی۔" حبلی آؤ۔

"آئی ہوں بھائی۔" اُس نے جواب دیا۔ اور تیزی سے نیچے چلی گئی۔

"آہ۔ دیدی آگئیں۔" راج سنگھاسن پر مٹی مانجم آرا نے نعرہ لگایا۔ دیپالی تقریباً دوڑتی ہوئی سیمل کے نیچے پہنچی۔ مونگیا ساری والی اجنبی لڑکی نے پلٹ کر دیکھا اور بالوں کی ایک لمبی چوٹی اندر سے پشت پر پھینک کے دیپالی کو دیکھا اسے آداب کیا۔ اور پھر سینڈل گھمانے میں جُٹ گئی۔ دیپالی تخت کے کنارے بیٹھ گئی۔

"آج صبح سے بارش نہیں ہوئی۔ ہم لوگوں نے کارخانہ باہری جاکھلا ہے۔" جہاں آرا نے پیش قیمت

چینی ریشم کی پستی ساری کا ڈھیر اس کی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔ ”لو اس پر یہ سیل ٹانگ دو۔“ دیپالی نے سورت کی جگمگاتی بیل اور ساری کے ہمرنگ دھاکے کی ریل نیچے سیٹل پائی پر سے اٹھاتے ہوئے سوچا۔ پاکستان، کمیونسٹ تحریک، ہندو مسلم آویزش، عالمی جنگ۔ ان سب جھگڑوں سے بے پروا جہاں آکر اپنے بھائی کی ہری تیار کردہ بی ہے۔ کیسی خوش قسمت ہے۔ میں خواہ مخواہ دنیا کی فکر میں کیوں ہلکان ہوتی ہوں۔ یہ سوچ کر اس نے فوراً بشارت اور زندہ دل اپنے ادھر پڑاری کر لی اور جہاں آرار اور دوسری لڑکیوں کے ساتھ بے فکری سے ہنسنے بولنے میں مصروف ہو گئی۔

”رندی آیا بھی ابھی تک نہیں پہنچیں۔“ ایک لڑکی نے کہا۔

”آج اتوار جو ہے۔ گرجا میں دیر لگے گی۔ پھر سنڈے اسکول پڑھائیں گی۔“ اختر آرار نے جواب دیا۔ ”اب آتی ہی ہوں گی بے چاری۔“ ”تم بھی سویرے سے آجائیں تو یہ سیل اب تک ٹک گئی ہوتی۔“ جہاں آرار نے دیپالی سے کہا۔

”میں باہر کا سے بحث میں لگ گئی تھی۔“

”کیسی بحث۔“ اختر آرار نے پوچھا، جو دیپالی کی ہم عمر تھی

”کچھ نہیں۔ پاکستان کے متعلق۔“

”کیا کہا تم نے؟“

”میں انھیں سمجھا رہی تھی کہ پاکستان اگر میزوں کا منصوبہ ہے۔“

”تم اب اسے جھگڑ رہی تھیں؟“ جہاں آرار نے حیرت سے پوچھا۔

”اب اگر ہاے بزرگ غلطی پر ہوں تو انھیں سمجھانا تو چاہئے ہی۔“ مونگیا ساری والی لڑکی نے

مشین چلاتے چلاتے منہ لٹکا کر کہا۔ دیپالی نے چونک کر اسے دیکھا۔

جہاں آرار منس بڑی۔ ”ارے دیپالی۔ یہ باتیں ہے باؤلی۔ میں نے تمہیں اس کے متعلق خط میں

لکھا تھا نا؟ اس نے بڑے پیار سے کہا۔ جہاں آرار کے دل میں ساری دنیا کے لئے محبت تھی۔

مولہ سترہ سالہ ذرا وحشی آنکھوں والی یاسمین مجید نے دیپالی کو دوبارہ آداب کیا۔

”یہ تمہاری رندی آپا کی اور تمہاری بھجولی ہیں۔“ جہاں آرار نے اس سے کہا۔

”آں ہاں۔ دیدی۔ میرے پاس تو آپ کے تینوں ریکارڈ موجود ہیں۔ اور ایک میت پر دیوہاں۔“

”ہوں۔“

”ہاں بھائی۔ ہمیں یاد ہی نہیں رہتا کہ تم اتنی مشہور مغنیہ ہو اور لوگ تم کو پہلے سے غائبادی
مانتے ہیں، ابھی ہم کیا کریں۔ ہمارے لئے تو تم وہی ہمیشہ کی دیپالی ہو۔ بقول ہماری اتنی بنوئے بابو کی خطی
نڈیا۔ جہاں آمار نے بس کر کہا۔

”آپ تو مجھے بھی خطی سمجھتی ہیں آپا۔“ یاسمین شگفتگی سے ہولی۔

”یہ جہل مارا، جو میں نا۔ ان کے خیال میں سب دیوانے ہیں۔ بس یہی سب سے زیادہ ہوشمند
۔ بڑی بی۔“ دیپالی نے کہا۔

”دوڑی تپا آگئیں۔“ انجم آمد چلائی۔

روزی ساجکل پر فراتے بھرتی سیدھی تلاب کے کنارے پہنچی اور سائیکل تلاب کی مندر
لکا کر تخت پر آن بیٹھی اور فوراً سلائی میں مصروف ہو گئی۔

دوسری منزل کے ایک درجے میں سے نیر الزماں نے سر نکال کر جھانکا۔ ”بھئی واہ۔ دکھو ہائی
ی۔ دودھ پانی کتنی سکھڑ ہیں۔ کون کتا ہے کہ آج کل کی لڑکیاں سینا پرونا نہیں جانتیں۔“ اس
واز دی۔

جہاں مارا نے سر اٹھا کر بھائی کا منہ چڑایا۔ ”روزی اور دیپالی نے اُسے مسکا کر کیا۔

”کتنا نینگ مد گے نیر بھائی۔“ یاسمین چلائی۔

”جتنا چاہو لو۔“ بیگم قمر الزماں نے درجے میں بیٹھے کے چھپے سے آکر کہا۔

”اے بے۔ اللہ رکھے۔ اشارہ کر لیا اچھا لگ رہا ہے۔“ سگن بیگے والی ختمہ خالہ فدیپ
ہا۔ ”اے کچھ گاؤ بھی تو۔ لڑکیوں نے فریدہ۔ تو کیوں چپ ہو گئی۔؟ دیپالی تم کچھ گاؤ بیٹی۔“
نیر الزماں درجے سے ہٹ کر اندر چلے گئے۔

”بہت اچھا خالہ۔“ دیپالی نے جواب دیا

بیگم قمر الزماں اور ختمہ خالہ بھی باتوں میں مصروف درجے میں سے غائب ہو گئیں۔

نیچے سکل کی ڈالیوں میں مینا میں شور مچا رہی تھیں۔ تلاب کے کنارے سلطانہ چپا کا درخت بہک
پھر فاصلے پر سا گوان کے جھرمٹ میں سفید پھول کھیلے تھے۔

”دیدل نڈل کا کوئی گیت سنائیے۔“ یاسمین نے کہا۔
 ”نڈل کا۔ اچھا۔“ دیپالی سر جھکا کر سلائی کرتی رہی پھر گنگنا نے لگی۔
 ”نورگس باگ میں۔ نورگس باگ میں۔“

”ہمار کی آگ میں۔“
 یاسمین تخت پر سے اٹھ کر اس گیت کے ساتھ منی پوری طرز کا ہلکا پھلکا رقص کرنے لگی
 واقعی وہ بہت اچھی رقصہ تھی۔

”ہمار کی آگ میں۔ بھرے دل داگ میں۔“
 جہاں آرا سر جھکائے سلائی کرتی رہی۔
 ”ہمار کی آگ میں۔ کہاں میرے پیارے۔“ دیپالی نے گایا۔ یاسمین نے گردن ہٹا ہوا
 باج جاری رکھا۔

”درد دل زور۔“ دیپالی نے گایا۔
 جہاں آرا ایک تخت اٹھ کر باد چھانی خانے کی طرف چلی گئی۔
 ”ہرادھا کا ختم ہو گیا۔“ روزی نے اختر آرا سے کہا۔

”دیدری۔“ اختر آرا نے دیپالی سے کہا۔ ”ڈرائیڈ اپر جا کر آپا کی الماری میں سے ہری اور سیا
 ریشیں نکال لائیے۔“ اس نے تخت پر بکھرے کپڑوں کے نیچے جہاں آرا کا مٹروں کا بٹوہ تلاش کیا اور وہ
 میں سے کنجیوں کا گچھا نکال کر دیپالی کو تھما دیا۔ ”یہ بیچ والی کنجی ہے۔ چاکلیٹ کے بڑے ڈبے میں
 ریشیں ہو گئی اور آپا کا سویٹنگ باکس اگر مقل نہ ہو تو اس میں سے ڈی ایم سی کا کاسنی تھما بھی لگاتی لائیے
 ” اچھا۔“ دیپالی نے جواب دیا اور کنجی لے کر پہلو کے زینے کی طرف روانہ ہو گئی۔

جہاں آرا کے کمرے میں پہنچ کر اس نے لمبی چوڑی دکنشین دھن کی الماری جس کے ایک پٹ پر
 ”دراڈم آفٹہ لگا تھا کھولی۔ چاکلیٹ کا تین اور سویٹنگ باکس چوڑیوں کے ڈھیر کے پاس ایک دیر
 تخت پر سامنے ہی رکھے تھے۔ دیپالی نے چاکلیٹ کے ڈبے میں سے مطلوبہ ریشیں نکالیں۔ بید کا
 باکس بھی کھلا ہوا تھا۔ اس کا ڈھکنا اٹھا کر اس نے کاسنی تھما تلاش کرنا شروع کیا۔

ریشم کے ٹھٹھوں، ریشوں اور کشیدہ کاری کے دوسرے لوازمات کے نیچے سے ڈی ایم سی

س کی جھلک نظر آئی۔ اُسے نکالنے کے لئے دیپالی نے باقی چیزیں ایک طرف سرکائیں تو کس کی تہہ
 ہی ایک تصویر دکھلائی پڑی۔

دیپالی سن سی رہ گئی۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے تصویر باہر نکالی۔

یہ آج سے چند برس پہلے کے ریحان الدین احمد کی تصویر تھی۔

تصویر کی پشت پر جگالی میں لکھا تھا۔

سہزادی جہاں آرا بیگم کے حضور میں۔

اُن کے ادنیٰ غلام بے رام کی طرف سے۔

ملکتہ - ۱۶ اپریل ۱۹۳۵ء

اس تحریر کے نیچے ایک اردو شعر لکھا تھا۔

دیپالی کی آنکھوں کے سامنے گھپ اندھیرا چھا گیا۔ چند لمحوں تک وہ تصویر ہاتھ میں لئے مفلوج
 ای رہی۔ اتنے میں برابر کے کمرے میں کسی نے زور سے دروازہ بند کیا۔ اور وہ ہوش میں آکر چاروں
 دیکھنے لگی۔ کمرہ وہی تھا۔ ساگوان کی مسہری۔ بنارسی ساریوں کے ڈپے ان گنت "طاقچوں" اور
 زوں والی وکٹورین سنگھار مزے مسند۔ قالین۔ کنہیوں کی الماری۔ کشمیری کڑھکتے کے پردے۔
 چیز بھی نہیں بدلی تھی۔ درپے کے باہر جھلانی کی بدھم دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور نیچے تالاب کے کنارے
 ٹکیوں کے قہقہوں کی آواز آ رہی تھی۔

دیپالی نے جلدی سے تصویر سوئینگ باکس کی تہہ میں واپس رکھ کر الماری بند کی اور قد آدم کینے
 نے اپنی دہشت زدہ، سوجھی شکل نظر آئی۔ اس کا چہرہ سپید پڑ گیا تھا۔ اور اس کی ٹانگیں کانپ
 تھیں۔

دھاگوں کی بلیں اور لچھا مٹھی میں بھنچ کر وہ کمرے سے باہر نکلی۔ اور زمینہ اتر کر سٹیل کے نیچے سہجی۔
 مٹوس ہمارے ازل سے ابد تک کا فاصلہ طے کر کے لوٹی ہے۔
 نورگس، باگ میں۔ بہار کی آگ میں۔

درد دل زور۔

اب شمع خالہ کی لڑکی فریدہ ہارنوم پر زور زور سے گارہی تھی اور یا سمن پھر کی طرح

ناچنے میں مشغول تھی۔ اختر آراہ اور روزی سیمل کے نیچے سلائی کر رہی تھیں۔ انجم آراہ گلاب خاص نیچے "راج سنگھاسن" پر سے دلائی سمیٹ کر اٹھ رہی تھی۔ یاسمین ناچتے ناچتے جا کر اس بیٹھ گئی۔ دیپالی کو دیکھ کر انجم آراہ نے آواز دی۔ "دیدئی۔ ادھر آؤ۔"

دیپالی اختر آراہ کو دھاگے دینے کے بعد جا کر شاہی تخت کے کنارے پرٹک گئی۔

"دیدئی ذرا سنبھل کر بیٹھنا۔ اس کا ایک پایہ ٹوٹا ہوا ہے۔" یاسمین نے کہا۔

"اچھا۔" اس نے محنتوں کی طرح ہنس کر جواب دیا۔

"آستینوں کی تریپائی۔" انجم آراہ نے اسے بروکیڈ کا ایک ادھ سلا بلاؤز تھما دیا اور خود

کر کے کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئی۔

نزدیک ایک سیٹل پاٹی پر فرید پور سے آئی ہوئی ایک رشتہ دار لڑکی نے گلابی کرب ڈ کا ایک ٹکڑا بچھا کر بلاؤز تراشنے کے لئے اسے اپنا شروع کیا۔ ملا ملازمہ اس کے قریب اکڑوں بیٹھ گئی۔ باغ چادروں طرف ڈول سا رہا تھا۔ دیپالی نے بروکیڈ کے بلاؤز کی ایک آستین کا کنارہ مو

کھنپی۔ جہاں آراہ راجپوتی خانہ سے لوٹ کر کرب آئی اور اس کے نزدیک بیٹھ کر کرب سلائی کرنے لگی۔

بھی نہ پلا۔ باغ بڑے سے جہان کی طرح ڈول رہا تھا۔

سیمل کے نیچے سے روزی اٹھ کر گلاب خاص کے نیچے "سنگھاسن" پر آئی بیٹھی۔ یاسمین بندریا کی طرح تخت کی پشت کے برابر اکڑوں بیٹھ کر جبکہ میں بنی مودتیوں پر انگلیاں پھیرنے لگی۔ سیٹل پاٹی پر بیٹھی لڑکی نے دلہن کا بلاؤز تراشنا شروع کیا۔

"اللہ کرے اب جلدی سے جہاں آراہ بی بی کے جوڑے بھی سلیں۔" قریب بیٹھی ملازمہ

ایک انگلی سے کپڑے کا کونا دباتے ہوئے کہا۔ جہاں آراہ نے سر اٹھا کر غصے اور کرب سے اس ڈالی اور اپنی سلائی پر جھک گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ جنہیں اس نے چپکے اپنی ساری کے سرخ کنارے سے پونچھ لیا۔

دیپالی نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

"اپنی شادی کے ذکر پر نہ جانے کیوں اس کا یہی ری ایکشن ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ میرے

بھی رونے لگی تھی۔ جانے کیا بات ہے۔ کبھی کبھ بتائی بھی نہیں۔" روزی نے چپکے سے اس کے

لہا۔ دیوال اپنے ہاتھوں کا برعشرہ چھپانے کے لئے ذرا دوسری طرف کو مڑ گئی۔ مگر اس طرف گلابی بی بی شین کے بکھرے ٹکڑوں میں سے کھلنا میں بنی سیتل پاٹی پر چھپا ہوا گلہار ہرن آتے نکلنے لگا۔

فریدہ ہارمونیم بند کر چکی تھی۔ باغ پر ایک دم بڑا سناٹا سا چھا گیا۔ ساری لڑکیاں سرے اپنے اپنے کام میں مصروف تھیں۔

چند منٹ بعد باتوئی اور بے چین یاسمین نے اس خاموشی کو توڑا۔ ”کیسا unny! تخت اس نے جھٹکے پر طبلہ بجاتے ہوئے اظہار خیال کیا۔

”سنگھاسن تبتی۔!“ گھاس پر بیٹھی ملازمہ مالا نے کھیسیں نکال کر کہا۔

”کون چیز۔؟“ یاسمین نے پوچھا۔

”راجہ بکرم جیت کا سنگھاسن۔“ فریدہ نے سر اٹھا کر جواب دیا۔

”ادہ۔“ یاسمین نے مورتیوں کی غور سے دیکھتے ہوئے سر ملایا۔

سیتل پاٹی پر بیٹھی ہوئی لڑکیوں نے بھی دفعتاً باتیں شروع کر دیں۔

”ایک جوڑا فرشی پانچا مے کا بھی رکھ رہی ہیں۔“ آخر آرار فریدہ سے کہہ رہی تھی۔

”ادھر ہندوستان میں تو صرف غزارہ ہی پہنا جاتا ہے۔“ آباتارہہ تھے۔ ”انجم آرار نے جو

سے واپس آچکی تھی۔ گھاس پر دوڑا نو بیٹھتے ہوئے کہا۔

”آپا کے پاس تو کئی فرشی پانچا مے ہیں۔“ ہن نا آپا۔؟ مگر آپا پہنتی ہی نہیں۔“ آخر آرار نے کہا۔

”اب بڑھاپے میں کیا خاک پہنوں گی۔“ جہاں آرار نے تلخی سے کہا۔

”اے لو۔ اور سنو۔“ فریدہ نے ذرا کھوکھلی آواز میں بڑا مانا۔

”یاد ہے ایک دفعہ آپا نے عید پر غزارہ پہنا تھا۔؟ جب ہم لوگ سب خالوجان کے ہاں

گئے تھے۔“ آخر آرار نے انجم آرار سے کہا۔

اُس عید پر اس نے گلکٹہ سے حسبِ معمول شرارتاً ایک سیدھا ہیات سا عید کا ڈبھیا

پر ہال، کھجور کے درخت ادا دانت کے منظر کے نیچے دو ہاتھ (ایک نسوانی ایک مردانہ)

ہے تھے اور برابر میں دو موٹے مسخرے نفیریاں بجا رہے تھے۔ کارڈ کی پشت پر اس نے اردو

میں ایک سخت بازاری شعر لکھا تھا۔ "عید کا دن ہے، پتہ نہیں کیا۔ مجھے مصروف یا دہنیں
 کھلے مل لو صاحب۔ رسم دنیا بھی ہے۔ موقع بھی ہے دستور بھی ہے۔" اس کی اردو
 رائٹنگ کتنی کچی اور بچکانہ تھی۔ جہاں آرا ایک گھٹنے پر سر رکھ کر سلائی میں مصروف رہی۔
 "چور لڑکیو۔ دسترخوان لگ گیا۔" برآمدے میں سے ایک بوڑھی ملازمہ نے پکا
 "آتے ہیں۔" آخر آرا نے جواب دیا۔

روزی "سنگھاسن" سے اتر کر چیزیں سمیٹنے کے لئے سیمبل کے نیچے چلی گئی۔
 یاسمین ابھی تک سنگھاسن بتیسی کے تصویر میں محو تھی۔ اس نے اچانک سر اٹھا کر جہاں
 اور دیپالی کو مخاطب کیا۔

"اما۔ آیا۔ دیدی۔ تم دونوں اور میں اس تخت پر بیٹھے ہیں نا۔ تو یہ pretend
 کر دو کہ ہم تینوں یا یوں والی مودتیاں ہیں جو راجہ بھوج اس لائق نہ ہوگا ہم سے اس تخت پر قہر
 بھی نہ رکھنے دیں گے۔"

"کیا دیوانی لڑکی ہے! جہاں آرا نے ہنس کر کہا۔
 دیپالی بلاؤ زختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ تب جہاں آرا نے پہلی بار اس کی وحشت زد
 شکل دیکھی۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ "ارے دیپالی تمہیں کیا ہو گیا۔؟"
 کچھ نہیں بھائی۔ میرے سر میں بڑا سخت درد ہو رہا ہے۔" اس نے شدید اکتاہٹ او
 ر کان کے ساتھ اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔

"ارے تو اوپر جا کر ڈرائیٹ رہو۔ کھانا پھر کھا لینا۔"
 "نہیں۔ میں اب گھر جاؤں گی۔"

"ابھی سے؟ تمہیں ہو کیا رہا ہے بیٹھے بھائے؟"
 "جہاں آرا" دیپالی کی آوازیں التجا تھی۔ "مجھے اب گھر جانے دو۔ اتوار کو بوبہ پورہ
 جانا ہے۔ اس کے لئے پکنگ بھی۔" وہ بات پوری کئے بغیر تھک کر چپ ہو گئی۔

"ایک تو اتنے دنوں بعد آئیں۔ ساری چھٹیاں جانے کہاں کہاں سیر سپائے کرتی پھر
 اب بھائی جا رہی ہو۔ یہ کیا دھاندلی ہے۔ اطمینان سے بیٹھ کر آج گپ بھی نہیں ہو سکی۔" جہاں آ

دیپالی پر دوبارہ نظر ڈالی۔ "تم واقعی بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔ چلو جلدی سے چل کر کھانا
لو۔ پھر چلی جانا۔ مالا۔" اس نے ملازمہ کو آواز دی۔ "ڈرائیور سے کہو۔ موٹر ادھر لاکر لگاؤ۔
لی بی بی کی جلدی گھر جانا ہے۔ آؤ۔" اس نے دیپالی سے کہا۔

باقی لڑکیاں کام سمیٹ کر کوٹھی کے پچھلے دالان تک پہنچ چکی تھیں۔ بوند باندی شروع ہو گئی
کے پہلے قطرے تالاب کی سطح پر نہتے سے بھنور رہا ہے تھے۔

ردزی بھاگی ہوئی دیپالی کے پاس آئی۔ "کیا ہوا۔؟ کیا ہوا جہاں آ رہی؟"

"کچھ بھی تو نہیں۔" دیپالی نے ذرا دشتی سے کہا۔ یہ میں کیا اپنا تماشہ بنا رہی ہوں اس نے

یہ کہا۔ اور "راج سنگھاسن" سے اترتی۔ چلو دیپالی اٹھو۔ اُس نے حسبِ عادت خود کو

مب کیا۔ اور پھر لپو لپو پہنچا ہے۔ چلو دیپالی سرکار دوسرا قدم آگے بڑھاؤ۔

وہ جہاں آ رہی اور ردزی کے ساتھ کوٹھی کی سمت روانہ ہو گئی۔

۱۷ گوڑا ملہار

جل بھل۔ بھہ۔ تال۔ بن۔ آپ بن۔ ندی۔ نالے۔ گری۔ گویا۔ سب ہی کچھ۔ سارا بنگال دس

رت میں، ایک میکران دریا بن چکا ہے۔ شہر کی گلیوں میں نوکائیں چل رہی ہیں۔ کالے بادلوں کے

قافیہ اندیاں بہتی ہیں۔ کائنات پھیل کر وسیع تر ہو گئی۔ فصلیں بونے اور مالیدگی اور محمدیہ اور شادابی

م۔ پٹ سن کٹنے والا ہے۔ تنکے کی نوکیلی چھبے دار ٹوپیاں اوڑھے کسان کھیتوں میں دھان بو

ہیں۔ محلوں دو محلوں، مکانوں اور جھوپڑوں میں ڈھولک بج رہی ہے۔ آبی راستوں کے چوڑے مکھے

جال پر بارا تیر رواں ہیں۔ بانسریاں بجتی ہیں۔ امرا کی دہنوں کی پالکیاں کشتیوں اور اسٹیموں

عائی آج رہی ہیں۔ غریب باراتی شکستہ چھڑیاں لگائے گاتے بجاتے شہنائوں میں لہے ایک گاؤں سے

سے گاؤں جا رہے۔ برکھائیت، شادلیوں کی رت ہے۔ ہر برسات کی مانند اس برس بھی کتے بندھن

۔ ان سب دہنوں کی قسمتوں میں کیا لکھا ہے۔؟

گھر کی لکشی، ہزار برس کی نیو بہوؤں نے سندھیا کال اپنے اپنے آنکھوں میں لکشی کی اقدار کے گنوں کے سامنے چراغ جلا دیئے۔

پچھلی صدیوں کی وہ سدا سبیا گئیں جو زبردستی سی ہونے چلیں مادر اپنے گھروں کے درو پریت کے مطابق لاکھ کے رنگ میں ڈبو کر اپنے اپنے ہاتھ کا نشان لگاتی گئیں۔ اندھیرے جنگل میں، در افتادہ گاؤں میں پرانے بوسیدہ مکانوں کے دروازوں کی چوکھٹوں پر ان کے چھو سے نیچے کے سرخ نشان ٹھٹھا رہے ہیں ستار یک نبوں میں ان بے چاری سستی ساد تریوں کی سما کے گول، نیچے لڑھ خیز گنبد، بارش میں بھیسکتے ہیں۔

شعرا کی موضوع سخن، افسانہ نگاروں کی ہیروئن۔ جذباتی چیز کاروں کی تصویر۔ بنگال کی عورت۔ سدا دکھ سینے والی۔ صابر و شاکر۔ بے چاری۔

سیندور اور جھندی کی سرخی۔ لاکھ کے رنگ کی سرخی۔

بونددوں کی لڑیاں۔ زندگی۔ موت۔ زندگی کی پھول مالا گوندھتی جا رہی ہیں۔

جب بارش فتمی ہے تو بادلوں کے اودے شامیلانے کے نیچے مورنا چنا شروع کر دیتے ہیں کنوئیں میں جو تھیکا کھلی ہے۔ بنوں میں سال کے پھول ہبک لٹھے۔ بھگی، گھپ، اندھیری رات یا جنگلوں چمک رہے ہیں۔ جن کی روشنی میں کبیروں نے کہا۔ ابھی ساریکا۔ اپنے محبوب سے ملنے جاتی ندی کنارے بید کے پھول کھٹے ہیں۔ ہرے اور سیاہ پروں والی مرغابیاں چلا رہی ہیں۔ ہمد درختوں کے نیچے چپ چاپ کھڑے ہیں۔ چھتر ٹپکنے لگے۔

بلودے بڑھ رہے ہیں۔ کھیت لہلہا اٹھے۔ بانس کے سرسراتے جھنڈ میں بائھی بارش سے بچنے کے! کھڑے کان پھٹھا رہے ہیں۔ لنگے پھلیوں کے تعاقب میں ہیں جن سے تال اور دنیاں لبریز ہو گئیں۔ پر جاتی میں کیستی ہبک رہی ہے۔ بانس کے جھرمٹ میں سانپ سوتا ہے۔

ندی پر سے بارات آ رہی ہے۔ بارات آنکھ کے دوار پر اتر گئی۔ تلسی کے سامنے چہرا زجل رہا ہے۔

یکس کا گھر ہے اور دو لہا کون ہے؟ اور کہاں ہے؟ کس کی دہن ہے جو اٹاری پر لہاں بکھرائے پریشان سوتی ہے۔؟

۱۸ میگھ رنجی راگنی

آدھی رات کے بعد بارش تھمی۔ سیمل کے خنک پتوں میں سے ٹپ ٹپ کرتی بوندیں باغ کی
رہی مٹی پر گرتی رہیں۔ مینڈکوں کا شور ایک دم تیز ہو گیا۔ محل میں روشنیاں جل اٹھیں گہما
سی مذاق۔ شور۔ تڑوؤں کی چاپ۔

دوسری منزل کی طویل گیسٹری میں سے گزرتی انجم آرا لہک لہک کر ٹنگور کا گیت الاپ رہی ہے۔
استھولے جوئے نبھواستھولے بنے آب نے ندی نادے۔ گری گولیا ربارے
آشاڑھے نوبو آنندوا نشو نوبو۔

اتی گبھیرانی گبھیر نیل ادھر سے ڈھرو بلجے
وہ بے چینی سے سہری پر کروٹ بدلتی ہے۔ شکر ٹی ناچے۔ شکر ٹی ناچے۔ مین ملا رگیت گا ہی
ہمارا تے۔ آواز دُور چلی جاتی ہے۔

لیکن سینے میں گیت جاری ہے۔
کورے گرجن نیر جھنی سگھنے۔ اٹھے روبر بھیرب تانے بتانے

سینے میں وہ گارہ ہے
جبکہ وہ بال بھرائے برجی نقش و نگار کے چھپر کھٹ پر بے چینی سے سوتی ہے۔ وہ سیمل کے نیچے
کے شکستہ سنگھاسن کے کنارے کھڑا گائے جارہا ہے۔ وکر ماتیتہ کے زرد معیق کے تحت میں سے
بزنشواعیں چھوٹ رہی ہیں۔ انصاف کا تخت ایک دم جگمگانے لگا۔ وہ گارہ ہے۔

دیکھ دیکھ کتو بانی نوبو نوبو کتو بھاشا۔ جھور د جھور د روشو دھارا۔
جھور د۔ جھور د۔ اتنی کچی ہیں۔ مالاہستی ہے۔ سیمل کے سفید اور زرد پھولوں میں بجز
کی طاقتیں پوشیدہ ہیں۔ جادو ٹھنڈے۔ مہجڑے۔

”بی بی۔ بی بی۔ اٹھیے۔ وہ آگئے۔“

وہ ایک دم چونک کر ہڑڑا کر اٹھ بیٹھتی ہے۔

الاسمہری پر جھکی اسے جگا رہی ہے۔ چھت کا برقی پنکھا تیزی سے گھوم رہا ہے۔ کھلے ہو
دریچوں اور دروازوں میں گمازہ، سہانی، ہوا اندر آرہی ہے۔

چنبیلی کے پھولوں کی اور برسات کی رات کی ہمک۔

”کون آگئے۔؟ کون۔؟“ اُس کا دل اچھل کر حلق میں اُگیا ہے۔ رنگ سفید پڑ گیا

پاؤں میں سفتی۔

”بی بی۔“ مالا سرہ نے ریشمی جھالروار لمبپ کا سوکچہ دبا کر اطمینان سے کھیسیں نکالتے ہو
جواب دیتی ہے۔ ”اجی وہی سب۔ سبھی بگچے والے۔ دوٹی ٹھو موٹر کھر کر۔ دیناج پود چلے خاطر

سب جتنے تیار ہیں۔ چہاج ٹھیک سات بجے چھوٹے گا۔ آپ ابھی تک سو رہی ہیں۔ یہ اندھے

”اوہ۔۔۔“ وہ بال سمیٹ کر آنکھیں موند لیتی ہے۔ میرے خوابوں سے تھکے ہوئے

اب تیار تک کا فاصلہ ہے۔ اچھا بھائی۔ جو تمہاری مرضی۔

”جلدی کر بی بی۔“

”اچھا۔ اچھا۔“

مالا بڑی مصروفیت سے دروازے کا پردہ اٹھا کر باہر نکل جاتی ہے۔

وہ مسہری سے اتر کر ننگے پاؤں بڑے دریچے میں جاتی ہے۔ نیچے باغ پر گہرے بادل

کھڑے ہیں۔ یہ برسات بھی گورنے والی ہے۔ گزر جائے گی۔

بجلی چمکتی ہے۔

ان مادی سودا منی رنگ بھرے زرتہ کورے۔۔۔ اور برتنے۔۔۔ انجم آرا کی سٹ

آوازاں بجلی منزل سے آرہی ہے۔ فریدہ اور دوسری لڑکیوں کے قہقہے۔

وہ آگئے۔۔۔ وہ چند لمحوں قبل کی اپنی حماقت پر تلخی سے مسکراتی ہے۔ اتنے برس۔ اتنے انا

لئے خزانے، اتنے بھادرو، اتنے موسم نکل گئے۔ وہ اب کبھی نہیں آئیں گے۔ اب کیا آئیں گے۔

دریچے سے ہٹ کر وہ غسلی نے میں جاتی ہے۔ منہ پر ٹھنڈے پانی کے تھپکے مار کر واپس

ہے۔ الماری کی طرف بڑھتی ہے۔ الماری کے قدام آئینے میں اپنے بھیگے ہوئے چہرے کا عکس دیکھتی ہے۔ یہ میں ہوں۔

وہ الماری کا پٹ کھولتی ہے۔ مرشد آبادی ریشم کی ایک بیش قیمت گلہابی ساڑھی نکال کر باندھتی ہے۔ پھر وہ سوئینگ باکس کھولتی ہے۔ (یہ سوئینگ باکس اسے دن میں کتنی بار کھولنا بند کرتا ہوتا ہے۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو فولاد کی طرح مضبوط بنالیا ہے) اس میں سے وہ برما کے گلہابی موتیوں کا ہارا اٹھالتی ہے۔ جو شام اس نے اُمی کے سیف میں سے نکلوا یا تھا۔ تصویر کو اس نے مختلف چیزوں کے نیچے اچھی طرح چھپا کر رکھ لیا ہے۔ برسوں سے وہ تصویر اسی طرح بید کی اس صندلی کی تہ میں رکھی ہے۔ اتنی مدتوں بعد بھی اسے یقین ہے کہ اگر اس پر اس کی نظر پڑے گی تو اس کے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔

وہ بال گوندھ کر اپنے ہن کر کرے سے مسکراتی ہوئی نکلتی ہے اور نیچے قہویوں اور شادابیوں کے دنیا میں شامل ہونے کے لئے اپنے ہندی لگے ہاتھ کو جنگلے پر لگاتی ہوئی میٹر میاں اترنے لگتی ہے۔

آٹاڑھے نوبو آندو آتنبو نوبو۔

میری بر لفظ، ہر آن جلتی ہوئی چٹا گس نے دیکھی ہے؛
نواب قمر الزماں جو دھری کی بڑی صاحبزادی جہاں آٹاڑجیم۔

نیچے برساتی میں سترہ سالہ یاسمین مجید خوش اور بنشاش، جار جٹ کی ہری، اور لال چٹری، ساری پینے، دو چوٹیاں گوندھے، زلیور پینے، موڑھے اتری ہے اور بامدے میں کھڑی فریدہ اور جتڑا راک کے ساتھ قہقہے لگا لگا کر نیر الزماں کو تنگ کر رہی ہے۔ خوش اور بنشاش۔
اُس کی قسمت میں کیا لکھا ہے؟

اصوہ اجنبی، بھولی لڑکی، جوان پُرشور، دیباؤں، طوفانی راستوں کے اس پار، دینلج پور کے ایک دور افتادہ گاؤں میں اجنبیوں کے اس قافلے ایک اجنبی انسان کی آمد کی منتظر ہے ماس کی
میں کیا لکھا ہے؟

دھان کے پودوں کی آواز سنو۔ جو ہر سناٹے میں آہستہ آہستہ بڑھ رہے ہیں۔

۱۹

بھیرنی کا خواب

کس کی دلہن ہے یہ، بیکراں، بھیا نک رات نے پوچھا۔ جو بھیرنی کی طرح بال بکھرائے، پریشان مورتی ہے؟

بلندوں کی لڑیاں سر سی سدن کے باغ پر ٹپ ٹپ گرتی سُرخ مٹی میں جذب ہو گئیں۔ عمارت کے ایک کمرے میں، کھڑک کے نیچے، پلنگ پر دہ بے حسنی سے کروٹ بدلتی ہے۔ سارا باغ جگنوؤں سے جگمگا رہا ہے۔ وہ بھوج پتروں کے ڈھیر پر چڑھی بیٹھی ہے۔ میں جگنوؤں کی روشنی میں زعفران سے تمبیں خد نکھوں گی اور یون دوت کے ذریعے بھجواؤں گی۔ جس طرح ہم اپنے الفاظ ہوا کے حوالے کرتے ہیں۔ اگر بولیں تو کی ہو۔؟ جگنو اور بھوج پتر اچانک غائب ہو گئے۔ گور کھالی کا میڑھی میڑھی شانوا والا خونک درخت اس کے سر پر چھوے جا رہا ہے۔ بھجوانی کا بوڑھا مندر جڑ سے اکھڑ گیا۔ اس سلسل بڑا بھاری سائیکلون آیا تھا بھائی۔ کتب خانے میں دروازے نہیں ہیں۔ صرف دیواریں۔ صرف دیواریں۔ کوئی راستہ نکلنے کا نہیں۔ کھڑک کھڑک۔ بھوج پتروں کے نیچے سے وہ نمودار ہوتا ہے۔ بڑی چالاک سے، چوہے کی طرح چٹا دہ سانے اگیا۔ بھکٹو۔ سر منڈا۔ عینک لگائے۔ کھڑاؤں پہنے۔ کھٹ کھٹ کھٹ۔ کھیسین نکال کر وہ ایک بھوج پتر اس کے حوالے کر دیتا ہے۔

(یہ بھکٹو چائنا بھون میں پڑھا تا ہے) وہ غور سے پڑھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بڑی عجیب زبان ہے۔ سمجھ میں ہی نہیں آتی۔ فائنل اسٹان اسی زبان میں ہو گا۔ بجلی کرنی۔

بھکٹو بھی غائب۔ وہ چائنا بھون کے برآمدے میں کان لگا کر سُن رہی ہے۔ "میری آواز تمہاری کڑک۔ میرے آنسو تمہاری مسلسل جھڑپی۔ میرے من کی آگ تمہاری بجلی۔ میرے دل میں اس کا چہرہ ہے اور تمہاری آغوش میں چاند۔ میں اور تم یکساں ہیں۔ بھائی بادل۔ بھیر مجھے کیوں تنگ کرتے ہو۔"

بڑا دم، سہانا اجالا سارے میں پھیل گیا۔ بھول بن میں چمپک کے شگوفوں کا چہرہ لگا رہا
ہو رہا ہے۔ ندی کے کنارے کنارے چلتا وہ خراں خراں اس کی سمت آ رہا ہے۔

وہ چکوروں کا محبوب بے بالوں، کالی آنکھوں والا، ہاتھ میں کنول سنبھالے، انگلیوں سے
امرت گراتا۔ اولوکتیشور۔ پدم پانی۔

وہ کلا بھون کے باغ میں موجود ہے۔ مسرور۔ محفوظ۔ ندلاں بوس۔ براہیے ٹرے کی ٹوپی
اڑھے نقرائی سپچوان گڑ گڑا رہے ہیں۔ ہر طرف تصویریں ہی تصویریں۔ جوان لکھا اس پر چلتا اشوک
کے بھولوں کا تاج پہنے وہ اس کی جانب آ رہا ہے۔ لوگ تاتھ۔ لوکیشور۔

وہ خوشی سے کھل کھلا کر ہنستی ہے۔ وہ تین کی طرح منہ اٹھا کر بال سری بجاتا ہے۔ وہ چاندی
سے بنا۔ سیاہ بادلوں سے نکلتا سورج۔ ابتاجھ۔ منجھٹری۔

سیکراں نور۔ سیکراں رحم۔ سیکراں محبت۔

بالکل قریب اگر اس نے سینک اتاری اور گھور کر اُسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر آنکھیں ہی نہیں
تھیں۔ آنکھ۔ ناک۔ منہ۔ کچھ بھی نہیں۔ خالی چہرہ۔ بالکل خالی چہرہ۔ انڈے جیسا۔ اس چہرے
وہ جیسا چاہو بنا لو۔ بھکشتو نے غرا کر کہا۔ وہ دہل کر رہی۔

یہ لو۔ بھکشتو نے کہا۔ اور خالی ہاتھ اس کی طرف بڑا دیا۔

یہ کیا ہے؟

دو دھ کا گلاس۔ جاؤ جا کر پرستش کرو کیسی کیونٹ ہمدرد ہو۔ پوچھا پاٹ نہیں کرتیں
ہیں مٹی کیونٹ تو نہیں ہو گئیں؟

کس کی پرستش؟

اپنی۔ ہم سب اپنی اپنی پرستش کرتے ہیں۔

مگر آج تو ناگ پنچمی ہے۔

ہاں۔

کون سی؟ کس صدی کی ناگ پنچمی۔؟

اندل سے ابد تک۔ محض ایک لمحہ۔ وہ انگلی اٹھا کر مسخروں کی طرح ناچنا شروع کر دیتا ہے۔

وہ خالی ہاتھ اس طرح اٹھائے گویا انجلی تھامے ہو۔ وزنی قدموں سے پھر گور کھ اٹلی کی سمت چلی۔ جھکل کا جھکل جھنگا سا ہے۔
 او جگمگانے والو۔ جاگو۔ تھر ڈایر کی لڑکیوں نے قطار میں کھڑے ہو کر پڑھنا شروع کیا۔ وہ حسب معمول ڈائر کٹ کر رہی ہے۔

او جگمگانے والو۔ چپوترے پر کھڑی دہلی پتلی اور نو عمر اور حسین سروجنی دیوی کی آواز جاگو۔ کہ ہم گچھاؤں اور ٹیلیوں اور مقدس برآمدگی جبرڈ میں چھپے تھماے مندر ڈھونڈ آتے ہیں۔ ابدی خرد کے مراقبے سے اپنے پھن اٹھاؤ۔ جاگو۔ بانسری کی دھن پر وجد کرو۔ ہم تمہارے لئے دودھ اور باجرہ اور جنگلی انجیر اور سنہرے شہد کی انجلی لاتے ہیں۔ ہم نے عود و لؤلؤں سے فضا کو تبرک کیا ہے۔ ہماری لاچار زندگیوں اور با صبر مشقت اور ہماری نیندوں اور ہماری مضطر تماؤں کی حفاظت کرو۔ ندی کی طرح تیز اور شبنمی طرح خاموش، بجلی کی طرح سبک اور آفتاب کی طرف درخشاں۔ غم کہ اس قدیم خاموشی کی علامت ہو جس میں موت و حیات، رنج و غم ایک ہو۔ ایٹھ دھڑام سے گر پڑی۔ گور کھ اٹلی کی شاخیں زور زور سے سرسرا رہی ہیں۔

سینکڑوں برس پرانا، بوڑھا جوگی درخت اُس کے سر پر کھڑکھڑا رہا ہے۔ پرتیوں کا بسیرا۔
 ”پچھلے آٹھ سو برس کی ہماری تہذیبی تخلیق۔۔۔ اُداس روجوں کا مسکن۔ بوڑھے مندر کے کنارے۔ مندر کا اندھا پردہ ہمت دیہی ہے، اس نے میرا بیاہ کر لیا تھا، مندر میرے پرکھڑا ہار رہا ہے۔ شری رام اور سیتا بھارانی۔ بندھیا چل کے بنوں میں کھو گئے۔ ہری ہری ہری ہری ہری ہری۔ دہائی ہے۔ دہائی۔ گور کھ اٹلی نے زور کا ہنکارا بھرا۔ اس کی ڈراؤنی چھاؤں میں کپاالی بیٹھے ہیں۔ کپالیوں کی آل اللہ یا کافرنس۔ ڈانس پر تترک علیات کا عود دسلگ رہا ہے۔ آن گت کپاالی۔ ایک کپاالی کھڑکی میں سے اندر کود آیا۔ لودم لگاؤ۔ نو۔ بھٹینک یو۔ میں نے آج تک سگریٹ بھی نہیں چکھا۔ سگریٹ پیا جاتا ہے۔ چکھا نہیں جاتا۔ بے وقوف۔ لویا ایک سوٹا۔ لگے دم۔ مٹے غم۔ معاف کیجئے گا آپ بداری ہیں یا ویشنوب، اکھ زنجن۔ آمار پرانیر آرام مونیر آئند۔ آتار ہتیا۔ اسکیموزی۔ آپ کی داڑھی تو بالکل پٹ سن کی معنوم ہوتی ہے۔ باہا مل۔ نقلی۔ سادھو۔ نقلی راجہ۔ نقلی سنگھاسن۔ آ۔ آ۔ سب جگ نقلی۔ سب جگ دھوکا ساری دنیا گور کھ دھندا۔ اُلکھن میں لے کام سمجھ سے۔ کھل جائے گا پھندا۔ ہا ہونم

خوب زور سے نک رہا ہے۔ مائی نیم برس بہری متی۔ سارے کپالی کھوپڑیوں کی مالائیں پہنے، ترنگے، ہرے اور لال پھریرے اڑاتے، گھنٹیاں بجاتے، اندھ گراؤنڈ مٹھ میں اتر گئے۔ تم نے آندھ مٹھ پڑھا ہے؟ ترکی ٹوپی والا جو کمر۔

چلتی چلتی وہ دریا پار گئی۔ سامنے سُرخ لہروں پر بہری ناؤ بنا پتوار پہے جاتی ہے۔ ناؤ پر مگریزی میں لکھا ہے۔ "ایس۔ ایس۔ علاء"۔ "بھئی واہ۔ ناؤ پہے جا رہی ہے۔ بے آواز منظر میں سے ساؤنڈ غائب۔ بھیانک۔ وہ خود کشتی میں بیٹھی ہے۔ اچانک دھماکہ۔ اب دنگ میں سے لائن شاہ قاتما ہوا نمودار ہوتا ہے۔ لائن شاہ جادو گر۔ سینکڑوں برس ہوئے مر گیا۔ پھر بھی گا رہا ہے۔ دھندلی نکل۔ ہیولا۔ کتنا ہی غور سے دیکھو۔ صاف نظر نہیں آئے گا۔ میں عشق ہوں۔ ناقابل فہم۔ غیر مرئی۔ گرفت سے باہر۔ لائن شاہ ڈائیلگ لول رہا ہے۔ اس کے دھواں ایسے ماتھے میں کدَم کا پتہ ہے۔ ل کی شکل والا کدَم کا پتہ۔ کیا گاتا ہے۔ لائن شاہ کہ میرے پاس شیٹے کا ایک گھر ہے۔ اس میں میرا بڑوسی رہتا ہے۔ اسے میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ میرے اور اس کے درمیان گہرا دریا حائل ہے۔ اس دریا کو کیسے پابکروں۔ کاش وہ خود ہی میرے پاس آجائے۔

اوجھائی رہے۔

اب وہ دوسری طرف کروٹ بدلتی ہے۔ سامنے گھڑیاں ہی گھڑیاں۔ گھڑیاؤں کی فوج تہ گھڑیاں۔ اپشت پر ایک ایک سیلولائیٹڈ کا کام دیو سوار ہے۔ جا پانی کام دیو۔ بوگس۔ تاریک طویل رنگ برنگی ٹرنک۔ اندھکار۔ سمندر۔ میں اس دریا میں ڈوب جاؤں تو مجھے جسبل ملاصی دینا۔ سبے بن مانی۔

پتوار بغیر ناؤ کے بہہ گئی۔ ناؤ بغیر ندی کے رواں ہے۔ چراغ جتا لوہے کے روشن ہے۔ لوہنا راز کے جل رہی ہے۔

جنگل کا جنگل چل رہا ہے۔ ندی کے ماتر بہتا ہے۔ اور ندی ساکت ہے اور انسان درختوں، طرح طرح جھے کھڑے ہیں

میں کہیں بہہ چکا تھا۔

ساری عمر بات نہیں کروں گی۔ پہچان کے نہیں دوں گی۔ دھوکے باز۔
دھوکے باز۔ باغ بہت سسنان ہے۔ رات چیتے کی آنکھ کی طرح مجھے گھور رہی ہے۔ عمر
جبر بات نہیں کروں گی۔ ارے آپ کی اسلیٹ تو مجھے اب معلوم ہوئی بچہ جی۔ گردک۔
برآمدے میں مدھم بلب روشن تھا۔ مرے ہوئے برصاتی پتنگوں کا مختصر سا ڈھیر بلب کے سین نیچے
فرش پر پڑا تھا۔ برآمدے کے باہر کرشن چوڑا کی ڈالیاں ٹھنڈی ہوا میں سرسرا رہی تھیں۔ مینڈک خاموش
ہو چکے تھے۔ کبھی کبھی جھینگر چلا اٹھتا۔

اسے ایک دم سردی سی لگی۔ وہ کھڑکی میں سے ہٹ آئی۔ نیم تاریکی میں ہاتھ بڑھا کر سر ہانے کی میز
پر رکھا ہوا اٹھی کیس کھولا۔ اور ٹٹول ٹٹول کر ایک مٹی کا ہاتھی نکالا۔

ہاتھی تکیے پر رکھ کر اسے بڑی مہادری اور دھیان سے دیکھنے لگی۔ چھوٹا سا
بے چارہ مسخرا، مسخر اور زرد نقش و نگار والا مٹی کا ہاتھی۔

ابوالقاسم کی آمد کے بعد وہ مولوی ابوالہاشم کے کہے پر کیا جھٹ پٹ کشتی سے اُتر آئی تھی۔ ابھی
ایک ایک بات بڑی تفصیل سے یاد ہے۔ ایک ایک بات۔ اس رات وہ اور ریان ٹہلے ہوئے ایک
بستی کی طرف گئے تھے تو وہاں۔ وہاں کہہاری روکان پر مٹی کے کھلونوں کی قطار میں سجایا ہوا تھی کتن
لیوٹ لگا تھا۔ وہ ٹھٹھک کر اسے دیکھنے لگی۔ تو ریان نے خرید کر اسے دیتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔
نب تم بہت دکھی ہو اسے الدین کے چراغ کی طرح گھسنا۔ میں فوراً اجاڑوں گا۔ سنبھال کر رکھنا اسے تبرک
لی طرح۔

اور ریان نے کہا تھا۔ عاشق۔ بچے۔ وحشی۔ یہ سب فطرت سے بے حد قریب ہوتے ہیں اور تصنع اور
ہذب ریاکاری کے پردوں میں اپنے اصل جذبات نہیں چھپا سکتے۔ اور ان سب کو ٹوٹ، منتر و اور
نویزوں کی ضرورت بھی رہتی ہے۔ بچے اپنا پسندیدہ کھلونا سر ہانے رکھ کر سوتے ہیں۔ وحشی تعویذ
پہنتے ہیں۔ عاشق بھی اسی قسم کی احمقانہ حرکت کرتے ہیں۔ پرانے خطوط، پرانی تصویریں، نشانیاں
ادگار ہیں۔ محبت کرنے والوں کے ٹوٹ اور تعویذ ہیں۔

لہذا شوکتی، مولوی صاحب کے چھوٹے کی طرف آتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ تم ایک چھوٹی

یہ جی ہو تمہیں حفاظت کی ضرورت ہے، میں تمہارا تعویذ ہوں، جو تمہیں ہر خطرہ پر دکھ سے بچائیگا
میں کو ایک کپاٹی سیراگی ہوں، قوم کو مایا جال سے نکلانے کے لئے تپ کرنے والا مٹھ دھاری گوسا میں
تم میری شوکتی ہو۔

ہر علامت۔ ہر تصور بے حد با معنی ہے۔ پیاری بچی۔ بچہ اس لئے بڑی گمبیر آوازیں کہا تھا۔
تمہارا یہاں آنا بے حد خطرناک بات تھی۔ مگر میں نے مجرا نہ بے احتیاطی سے کام لے کر تم کو یہاں بلایا۔ کیونکہ مجھے
محسوس ہوا تھا کہ میں نے اگر تم کو جلد از جلد دیکھا تو واقعی میں مرجاؤں گا۔ تم میرے اس جرم کا باعث ہو
لیکن چونکہ تم میرا ظلم ہو۔ اس لئے مجھے معلوم ہے کہ کوئی مصیبت نہیں آئے گی
شاید میں بے حد کمزور انسان ہوں۔

بے احتیاطی۔ ہاں اس نے دفعتاً بے انتہا سرا سیم ہو کر پوچھا تھا۔
ہاں۔ کچھ عرصہ سے بڑی ناش غلیظوں کا ارتکاب کیا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر جب پہلے روز تم آوا
سے دو ڈالینڈ میں میں تو ان کو تمہیں ہرگز یہ نہ بتانا چاہئے تھا کہ نور الرحمن میاں دراصل میں ہی تھے۔ اگر تم کو
پکڑ کر ایذا پہنچائی جاتی اور۔۔۔
ادہ نو۔ اس نے دہل کر کہا۔

تم صرف سر تندر اور آدھی سے واقف ہو اور وہ بھی کچھ نہیں جانتے۔ اومارے بھی کچھ نہیں جانتیں۔
دفعتاً وہ اس بے حد خوفناک نظر آیا۔ راکھشس۔ پاتال میں رہنے والا ناگ۔ دیوتا۔ راسپوتین کا
ایسا جادوگر۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ وہ اندھیرے سندھ میں ہندو دنیا سے سینکڑوں میل دور اس
پڑا سر را جی کے ساتھ موجود تھی۔ نوعری میں انسان ایسا DARE DEVIL کیوں ہو جاتا ہے۔ اب کیا ہو گا؟
پوس اور تھرڈ ڈگری۔

اچانک وہ ہنسا۔ اور کہنے لگا۔ چنانچہ شوکتی۔ میں تم کو میرے جواہرات تو تحفے میں اور نشانی کے
طور پر دے نہیں سکتی تم مٹی کے اس حقیر کھلونے کو ہی احتیاط سے رکھنا۔ یہ تم کو ہر آفت سے بچائے گا۔
دیپا کی مٹتی کو سکتی رہی۔ پرانے خط۔ تصویریں۔ نشانیاں۔ محبت کرنے والوں کے ٹوٹے ہوئے۔ اس نے غم
غصے سے ریحان کے الفاظ دل میں دہرائے۔ بید کی ایک صندوقچی میں رکھی ہوئی ایک پرانی تصویر میں تو ٹوٹے ہوئے
تم اسے بھول گئے۔

دوسری رات وہ تاریک دریا پر رستی بارش میں ہاتھیر بات کی سمت روانہ ہو گئے تھے۔ اس پہلے
 رات کے بعد سے ریمان نے شیوہ نہیں کیا تھا۔ بال بڑھائے تھے۔ کھلنا کے دائرہ دار پھیر کا بھیس بدل کر وہ
 پاندھیری رات کے سمندر میں ایک بار پھر فاسف ہو گیا۔ اسی طرح اندھیری راتوں میں سفر کرتا وہ کلکتے پہنچا ہو گا
 ہاں کہیں بھی پہنچا ہو۔ اب اسے معلوم ہو چکا تھا۔ اب تک جو کچھ بھی وہ جانتی تھی۔ اندر گر اڑنے کے اصل
 حالات اس سے بالکل مختلف تھے۔ ایسی بڑھاپہ زندگی۔ کون کس پر بھروسہ کرے گا۔

کیا تھاری آئیڈیا لو جی بھی کہیں ایک اور ٹوٹ تو نہیں؟
 اس نے ہاتھی ٹکے کے نیچے سر کر دیا۔ اذلیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد اسے فیندا لگی۔
 عجیب عجیب شکلوں والے آدمی گھاٹ پر پھر آن کھڑے ہوئے۔ ایسے انسان، جن کے چہرے ہی نہیں
 دریا پر راتوں سے لے کر ایٹم بھونپو جا رہے تھے۔

پانکی جولے۔ پانکی جولے ہو۔ ہو۔ قدموں کی تال کے ساتھ گاتے اگیا بیتال کہا روں۔
 اگر گھاس پر پٹخ دی۔
 پانکی خال ہے۔

جہاں آرا سانے کھڑی ہے۔
 اسٹیمر بھونپو جا رہا ہے۔ اسٹیمر چٹھے والا ہے۔ اسٹیمر کا نام "عمر رواں" اندھیرے میں فاسف نور
 صبح چمکتا ہے۔ "عمر رواں" کیسا بھیانک نام ہے۔ "عمر رواں" نام ایک دم چمک کر غائب ہو گیا
 چنا شروع کیا۔ جہاں آرا غائب ہو گئی۔ پانکی خالی رکھی ہے۔
 رونا مسلسل روتا۔ رونے کی آواز — دھد جاتے اسٹیمر کی سیٹی سے اونچی ہو گئی۔ تار اسٹیل پر
 دوہا دم تھوڑی بریٹھا ہے۔

صبح ہو گئی۔ سہانی، ابر آلود۔ آسمان بھکی صبح دھڑک چھین گئی۔
 باہر باغ میں سے آویہ والی کی چھوٹی بچی کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ جہاں آرا تو تو قہقہا یہاں
 ماتب نہیں کر سکتی۔

جہاں آراہ میری سکھی۔ میری بہن۔ میں نے تجھ سے تیرا آدمی چھینا۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔
 آیا۔ اب نہیں چھینوں گی۔ واپس کر دوں گی۔ مجھے معاف کر دینا۔ اس انجانی غلطی کو معاف کر دینا آیا
 ”ارے دیپاتی۔“ ابانی نے غسٹا نے کی طرف جاتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ ”صبح صبح
 کیوں رہی ہو۔ کیا ہوا؟ گھر پہ تو سب خیریت ہے؟ تم تو بالکل کسی بھرتی کی ایسی ہوتی معلوم ہو رہی ہو۔“
 وہ گہرا کرٹھ بیٹھی۔ اس کا چہرہ اور مکئی آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔
 ”سب خیریت ہے ابانی۔“ اس نے جلدی جلدی آنسو پونچھ کر ناک سنکتے اور بال سمیٹے ہوئے
 اہستہ سے جواب دیا۔ در ذرا آگے جھک کر سنگھار میز کے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ بھرتی۔ بال بکھڑے فی
 کی جوگن۔ !! ”ہر علامت ہر امیجری بے حد با معنی ہے۔ پیاری بچی۔“ کپال بیراگنی کا بچہ۔ ڈیم
 — ڈیم — ڈیم —
 اُس نے ہلنگ سے پاؤں اتار کر چلتیں اپنی طرف سرکائیں۔

زندگی کی ہر نئی صبح آفاقی رات کے اٹھارہ سمنہ کے کنارے ایک نیا اجنبی ساحل ہے۔ جس پر ہم اپنے
 خوشگوار یا اذیت دہ خوابوں کی کشتی سے مسرور یا مغموم، لبثاس یا خوفزدہ، اترتے ہیں۔
 نیند کی نوکارات کے دریا پر ساری زندگی بہتی رہتی ہے۔ ہم اپنی عمر سبز کے کئی برس بغیر تپاؤ کی اس
 نوکامی گزار دیتے ہیں۔ عمر رواں کی ہر نئی صبح جب ہم جاگتے ہیں۔ ہمارے خوابوں کی نوکامی دم غائب ہو جاتی
 ہے اور دوسری رات تک کے لئے ہماری منتظر جاگ بھراپنے ساحل سے لگ جاتی ہے۔ نیند کی پرسکون
 طوفانی پلدا پر خوابیدہ انسانوں کے سینوں کی اُن گنت نوکائیں رواں ہیں۔ ایک دوسرے کے پاس سے گزرتی
 جاتی ہیں۔ ایک دوسرے سے ٹکرا کر ڈوب جاتی ہیں یا کبھی کبھی دو نوکائیں اکٹھی گھاٹ کی سمت بڑھتی ہیں
 مقدس کی زینت بی بی اپنے کالے سوکھے مضبوط ہاتھوں میں سرخ ساری کا بنڈل سنبھالے دلہن کی منتظر

چلتیں پیروں میں ڈال کر اُس نے اپنی رسمٹ واپس اٹھانے کے لئے نکیہ سرکایا اور تب اس کی نظر
 مٹی کے ہاتھی پر پڑی۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ ہاتھی کو اٹھا کر کھڑکی میں گئی۔ چند محظوظ تک ٹھٹھکی رہی
 ایک دم بڑے زور سے اُسے باہر بھینک دیا۔ پل کے پل میں وہ بے چارہ کھڑکی کے نیچے اُگی ہوتی برساتا گیا۔

میں غائب ہو گیا۔ ہاتھی ڈباؤ لکھا اس۔ اس نے مسکرا کر دل میں کہا: اور باہیں پھیلاؤں۔ اب میں آزاد ہوں۔ میں ہر جادو ٹوٹنے۔ ٹوٹم، ٹوٹکے، تعویذ اور طلسم کے اثر سے مطلق آزاد ہوں۔ مہرے۔ خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کرنے کی سعی کرتی ہوئی وہ برآمدے میں چلی گئی۔

۲۰

ہرے بنگال کا آئندہ کاشن

پاٹ کے پیلے پھول مرجھانے لگے۔ کھیتوں میں درانتیاں چل رہی ہیں۔ گتھے پانی میں ڈبو دیئے گئے۔ مکر کمر پانی میں کھڑے کسان ریشہ علیحدہ مکر نے میں جٹے ہیں۔ یہ ریشہ دھویا اور سکھایا جائے گا۔ جھونپڑے میں چرخے اور کرگھے چلیں گے۔

بنگال کے کسان نے اس ریشے کی خاطر سال بھر اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے۔ بارش میں بھیگ کر دھوپ میں جل کر وہ شاندار فصل تیار کیا ہے۔ کچھڑ اور بدلو کے سمندر میں ڈوب کر سونا نکالا ہے۔
اب یہ "طلاتی ریشہ" کارگو کے سبب فولادی جہازوں پر لڑ کر طویل دو یا دوں پر سے گزرنا جوٹ اسٹیشنوں پر پہنچے گا۔ چاند پورا و مدار کی پورا اور نرائن گنج میں اتارا جائے گا۔ کلکتے کے تاریک کنارے اور اسکات لینڈ کے جگمگاتے سینکے۔ بنگال کے اس شہرے دھن کی منزل ہیں۔

پاٹ کے سڑتے سڑتے برکھارت بھی بیت چلی۔ گھاٹ اور گلیاں دو تارے کی جھنکار سے گونج رہی ہیں۔ سارے میں دھان کے لہر سبز پودے لہلہاتے ہیں۔ جو پال میں مڑھدی گان کی مٹھائیں ہیں۔ شیخ مدن بادل اور درگانی فقیر اور بنگال کائی۔ گاؤں کے نت نئے مندر سے گھول اور بکو قلع کی آواز بلند ہوئی۔ رادھا کرشنا۔ رادھا کرشنا۔ رادھا کرشنا۔

چنڈی داس کی رادھا۔ رام پرشاد کی کالی۔ درگانی فقیر کا اللہ۔ لالہ دے، مہاراجہ، اللہ دے بادل بوڑھے ہو گئے۔ رات نے چاند نیک شگون کے گھڑے کی طرح آسمان سے آنگن میں رکھ دیا۔ بنگلوں کی پرداز جھیلیوں میں اسی طرح منعکس ہے جیسے آن گنت سفید کنویں کھل جائیں۔ امیروں

لے ہاں بے تحاشہ کھانے والے برہمنوں کو اب گرمی محسوس ہو رہی ہے۔ گاؤں کے کسی نے کہا۔

پھر اشیئین کی تیز دھوپ پانیوں پر پھیلی۔ سینہ دراپسے سرخ سورج کی گرمی نے نازک بدن بگلوں کو دکھی کیا۔ فرسوں میں چکنے والے پرند اور پن گڑیاں داد اس ہوئیں۔ ایکہ پک گئی۔ اب ہینناک دریا اپنی پراپی رفتار پر واپس آرہے ہیں۔ سیلاب اتر گیا۔ درخت سطح آب سے نمودار ہوئے۔ ٹیلوں پر بنے جھوڑے ننھے منے زمروں جزیروں کی طرح پانی میں کھڑے ہیں۔ ہر طرف ڈونگیاں چل رہی ہیں۔ ریت کی لہروں پر راج نہیں کے پتوں کے نشان پڑے ہیں۔ زرخیز بیجی دھرتی پر پئی فصلیں لبونی جاتی ہیں۔ جھونپڑوں کی موت کی جارہی ہے۔ درگاہوں کے لئے منڈپ اور بازار سج گئے۔ سارا دیس سنگیت سے گونج رہا ہے کہ درگامیکے آنے والی ہے۔ سیلابی مٹی کے سواگت کے لئے گھر گھر تیاری کی گئی ہے۔ ہر مند و گرسختن درگاہ کی ماں اور ہر گرسخت گری راج ہے۔ گیتوں میں درگاہ کی ماں نے کہا۔ آما کو میکے کب بلاؤ گے گری راج؟ جاڑے نکلے، برسات مٹی۔ خزاں آگئی۔ مگر گوری اب تک نہیں آئی۔ اُسے تہ نے کیسے خطی سناسی کے پتے باندھ دیا۔ اس کا نورنگ بھی کالا پڑ گیا ہوگا۔ جب کہتی ہوں گوری کو کب بلاش سے لے آؤ تم ٹال جاتے ہو گری راج۔ میں اُسے لینے کیسے جاؤں۔ میں تو لوک لاج سے مری جا رہی ہوں۔ ایسا بے تکا بھکاری دالو۔

شکر نے جی مشکل سے چار دن کے لئے گوری کو میکے بھیجا ہے۔ ہر سو تہوار کی دھواں مچی ہے۔ وجہ گاتے ہوئے دیہی کو گھروں سے وداع کیا گیا۔ دیہی جسے ہوئے جکروں میں دریاؤں پر پڑ پانی میں ڈبوئی گئی۔

کارنگ میں رات کو آسمان کی شخاف ٹھیل پر چاند کا خزاں آلود کنول تیرا تیرا بھرتا ہے۔ کچی سرک پر گتے کے چھلکے بکھرے پڑے ہیں۔ ہوا میں زعفرانی گرد اڑتی ہے۔ جو کی بالیوں پر طوطے بیٹھے ہیں۔ تیز چاندنی میں بھیلوں نے اپنے جال لپٹاؤں پر پھیلا دیئے۔ ان کی بالسرلوں کے سڑوں نے پردے لیں جانے والے مسافروں کو مضطرب کیا۔ فضا میں آسمان کا دریا بہہ رہا ہے۔ اڑتے پگھلے اور سفید بادل اُسم کے ریتیلے ساحل ہیں اور ستارے اس کے نیلو فر۔ ندی کنارے رشتہ بندی کچھ میں جھوٹا ہوتا ہے۔ گاؤں کے کسی نے کہا۔

اد گھبران مہینے میں دھان تیار ہو گیا۔ منڈیوں میں قیامت کی چہل پہل ہے۔ گانے کے مقابلے کئے جا رہے ہیں۔ گھر گھر نئے چاول کی کھیر پک رہی ہے۔

چاول۔ چاول۔ چاول۔

”سہرا امکاں“ سال میں تین بار چاند اگتا ہے اور بھوکا رہتا ہے۔

گلابی جاڑوں میں سپاری کے سڈول درخت نگاہ سپاریوں سے لد گئے۔ فوش کی چاندنی راتوں میں چھیدوں کے جال روپہلی پھلیوں سے بھرے۔ کئی ہوئی فصلوں کی رکھوالی کے لئے چن بنائے گئے۔ الاؤ کے گرد غازی گان کی مجلس جی جھونپڑوں میں پرال بھجانی جانے لگی۔ رات کو گیدڑ جنگلوں سے باہر نکل آئے۔ سرسوں پھولی۔ دیاؤں پر کشتی رانی کے مقابلے شروع ہوئے۔ ساری گان کے جوشیلے سر آبی راستوں پر پھیل گئے۔

ماگھ کی طویل راتوں میں بندر رسوی سے کانپ رہے ہیں۔ کتا چوہے کے پاس بیٹھا ہے۔ لڑکیاں چرائے گی رخصتی میں سوزنیاں کاڑھنے میں مصروف ہیں۔ پردیسی مسافر گاؤں والوں سے پرال اور بھوسہ مانگ رہے ہیں۔ غریب بڑھیا آگ تابی اپنی کٹی سے باہر نہیں نکلتی۔ دھان کے گٹھوں کے پاس اُپلے جل رہے ہیں۔ آپس میں جھگڑتے مسافر چوپال کے الاؤ کے پاس اکڑوں بیٹھے ہیں۔ اماؤس کے سردار تاریک اندھیرے میں چڑیلوں اور جادوگریوں نے اپنے اپنے چوہے جلائے۔

صبح کا دھندلکا سارے گاؤں پر چھا جاتا ہے۔ دُور افق پر سرخ بھونپنے۔ گھونگٹ کا ڈھے اوشا سسرال جاتی نظر آتی ہے۔ پھر ان کی سُرخ کی طرح لال۔ جنیوپنے۔ تنک لگائے۔ کندھے پر لال انگوچھا ڈالے سوہے۔ ٹھاکر برگد کے پیچھے سے جھانکتے ہیں۔ لونبھائی۔ وہ مالی اور سنار اور تیلی کے پھپھوں تک پہنچ گئے۔ مالی کی لڑکیاں باغ میں پیشپ انجلی کے پھول چھتی ہیں۔ تیلی کی لڑکی تالاب پر برتن مانجھتی ہے۔ صبح تڑکے سوہیہ ٹھاکر ان کریمیل کی بیٹھ پر برستی ہیں جو سرسبز چوہے پر سرسوں کے پھولوں سے لدا آرام سے لیٹا ہے اور کبر اس ناپکوں پر جم گیا ہے۔ گدڑیاں اور پیوند بھری رضائیاں اوڑھے یا تری گلیوں میں بیٹھے رادھا کرشن لے نئے گاگا کر بشی والوں کو جگکار رہے ہیں۔ کوہو چلنے لگے۔ گرہ کی بھیلیاں۔ نیہوں کی دوکانوں پر نہیں۔ گاؤں کے کہی نے کہا۔

ادراب جنگلوں میں پلاش کے پتے جھڑ رہے ہیں۔ بنوں میں شیر دہارتے ہیں۔ شیشر کے خنک اندکے نیچے پہاڑی راستوں پر اور کڈ کھیلے ہیں۔ سرسوتی پوجا کے لئے مورتیاں گھر کر دھوپ سا سکھائی جا چکیں۔ سرسوں پک گئی۔

پھانگن میں بانس کے ہرے بھرے جھنڈوں میں سے گدڑی، شہد کی مکھیوں کو جلو میں لئے ران سنہی۔ دکھن کی سہانی ہوائیں چلیں۔ لڑکیوں نے بالوں میں کلیاں سجائیں۔ رنگین کشتیاں

لے کر مابھی دریا رک پر نکلے۔ پشپہ بنوں میں بھونرے گونجنے لگے۔

پھول بن میں آدھی رات کو آنارے بھونرے۔ میں چاند کی بتی جلاؤں گی ماور شبنم سے
باتیں کریں گی اور سپہنوں کی پگڑنڈی پر چلتی مہتاری ادراؤں گی۔ بہت دھیرے سے آنارے بھونرے۔ کہیں تہرا
گیت ختم نہ ہو جائے۔ میری نیند نہ ٹوٹ جائے۔ پھول اور ڈالیاں نہ جاگ اٹھیں رے بھونرے۔ گاؤں
کے کبھی نے کہا۔

ہر جانی ہوا جنگل جنگل منڈلاتی پھر رہی ہے۔ چاروں طرف رنگ ہی رنگ پکھر چکے ہیں۔ رنگین ناؤ کا
مانجھی اودی موجوں پر اپنی سبک کشتی کھیتا ہے۔ بن کھاتے دریا کی موڑ پر اسے سرخ رنگ کا جھونپڑا نظر
آیا۔ ندی کے کنارے ہری گھاس پر نیلی ساری سوکھتی ہے۔ شام کی برجھائیوں میں چھپی کالی باڑی کی سمت سے
پائل کی آواز آرہی ہے۔ جھم جھم کرتی وہ گھاٹ پر لکڑیاں رگین گھڑپائی میں ڈبو رہی ہے۔ اس کی شکل کی
ایک جھلک نے مجھے دیوانہ کر دیا۔ سورج لہروں میں ڈوبتا جا رہا ہے اور میں اپنی ناؤ کھے رہا ہوں۔ جھیلی
کے مغنی نے کہا۔

چیتروک شہد ایسے مہینے میں پلاش پھولوں سے لد گئے۔ گل مہر کی پتیاں جھڑنے لگیں۔ جنگلوں
میں زرد اور سرخ پتوں کے فرش بچھ گئے۔ آم کے کنجوں میں کوئل کوئی۔ طوطے کی چونچ ایسے سرخ سورج
ماما کا غصہ پل بڑھتا جا رہا ہے۔ جھیلیاں پکڑنے کا ہنگامہ شباب پر آیا۔ کشتیوں کی مرمت کی گئی۔ میسے
لگے۔ خلق خدا جاترا کے تماشوں سے محفوظ ہوئی۔ ندیوں اور جھیلیوں پر بنسیاں اور جاں سنہالے دیہاتوں
کی بھیر جمع ہے۔ جگمگاتی جھیلیوں کے انبار ہر سولگ گئے۔

بونی شاہک میں شیفالی مہکی اور مادھوی اور لکھل۔ اشوک اور مہوے اور ایتاس اور ششم اور
لاکھ کی شاخوں پر پھول کھلے۔ پاٹ کی نئی فصل بونی جا رہی ہے۔ خوشگوار ہوائیں آمدھویوں میں سبیل
ہونے لگیں۔

جونی شٹو کی دھوپ میں تال اور لو پکھر سو کھنے لگے۔ زرسوے کے پرند اور بٹلے اور دریائی باز
پر پھیلا کر اڑتے جا رہے ہیں۔ خوفناک صوفان۔ بیرونہ جھکڑ۔ چھڑاؤ گئے۔ جھونپڑیاں گر گئیں۔ بادبان بکھر
گئے۔ ہواؤں کی غارت گری۔ جھکڑ نے دھرتی پر پھلوں کی بارش کر دی۔ بازار اور ہاٹ آم سے پٹ گئے۔
اب جاں کھل چکے ہیں۔ اور چپا اور روجنی گندھو نے راتیں معطر کر دی ہیں۔ تباہ حال کسان بھر جھونپڑیوں

ادرجاؤں کی مرمت میں جُٹ چکے ہیں۔ برسات کے انتظار میں نئے جال بنے جا رہے ہیں۔ شدید دھوپ وحشت۔ خشک مٹی۔ اللہ میگھ دے۔ اللہ میگھ دے۔ اللہ رے اللہ۔

تب بنگال کی کھاڑی سے آٹاڑھ کے درشاہ الہ آباد لوں کے لشکر آگے بڑھنا شروع ہوئے۔ نیکی کے زرگل کا بھوت مل کر، کھوپڑیوں کے بجائے لنگوں کی قطار کی، لاپسے سیاہ بادلوں کا جوڑا بانہہ کر، دھنک کی چھڑی اور بجلی کی جھنڈیوں والا عصا۔ سنبھلے برہمنوں کو ڈرانے کے لئے موسم نے پھر جادوگر کا روپ دھارا۔ آسمان بارش کا تاریک درخت بن گیا۔ جس کی واڑھی زمین تلک آرہی ہے۔ سہ ماہیوں کے بھوکے موربوں میں چلانے لگے۔ گلابی کیلوں سے لدا درخت اپنے پتوں کا چلو بنا کر بارش بہانی پی رہا ہے۔ بید کے پھولوں سے ہلکتی ندی جہنم کے درختوں کے نیچے رواں ہے۔ مچھلی کے قواقب میں بڑگا لڑا پتوں کو پرامید لگا بھوں سے دیکھتا ہے۔ مفلس کسان کی بیوی سر پر چٹائی اوڑھے، ہر طرف ٹپکتے جھونپٹے کا بچاؤ کرنی پھیر رہی ہے۔ جنگلوں کے آدمی داسی کانن درگا کی پوجا کے لئے درختوں کی جڑوں میں خون چھڑک کر بلوا کے پایوں میں تاڑی پی رہے ہیں۔ گاؤں نے کبھی نہ کہا۔

دریا چڑھے۔ میگھنا اور بہمن پتر۔ پدما اور مدھو متی۔ بھیرب اور بھاگیرتی۔ شب بھنری اور کرناٹی۔ سُرما اور دعا لیشوری۔ سرابن کے پانچویں دن ناگ سنجی مانی گئی۔ جنگلوں میں ہاتھی چنگھاڑ رہے ہیں۔ ندیوں کے ساحلی کچھڑ اور کالی اور کینچوؤں اور دلدل کی راجدھانی بن گئے۔ سبیلوں سے نکل آئے۔ اوجھوں کا کادو بارچکا۔ چھڑیاں لگائے لوگ جلدی جلدی گھاٹ پر اترتے ہیں۔ بانس کے پلوں پر سے گزر رہے ہیں۔ تیتریوں کی ایسی نازک کشتیوں کو طوفانی دریا نکل گئے۔ دریا گاؤں اپنے ساتھ بہا لے گئے۔ درخت جڑ سے اکھڑے۔ مویشی اور انسان عزاب ہوئے۔

”میری قسمت ہی خراب ہے۔ سیلاب میں سب کچھ بہ گیا۔ اللہ تو نے دنیا بنائی اور پھر مجھ سے میرا پاٹ، میرا دھان سب کچھ چھین لیا۔ میری قسمت میں کتنے دکھ ہیں رے اللہ۔ میں پاٹ بیچ کر تیرے لئے سونے کی تھلاؤں گا۔ میں نے اُس سے کہا تھا۔ پاٹ تو سیلاب میں بہ گیا۔

اد مانجھی رے کتنے منش۔ کتنے ڈھورڈنگر طوفان کی بھینٹ چڑھے۔ اللہ رے۔ اللہ رے۔

گاؤں کے کبھی نہ کہا۔

اگست اندولن اور سپلر زوار

آشا ٹھہ - بھاردرد ۱۳۲۸ھ

کال کے گھٹا ٹوپ اندھمارے میں مناظر غیر مری تھا اور کی طرح روشن رہیں گے۔ کیونکہ ہر منظر جو معدوم ہوا باقی ہے۔ ان سارے گھروں، روشن کمروں کا تصور کرو جو لوگوں گزرنے کے باوجود، وقت میں شامل، موجود ہیں۔ باتیں کرتے ہوئے لوگ، ٹیبلو گروپ۔ ان کی آوازیں۔

چندر گنج اندھیرا پڑا تھا، جب وہ تین اس کے پھاٹک میں داخل ہوئے۔ وہ برآمدے میں آکر بیٹھک خانے کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ برآمدے کے سرے پر چاروں سرسبز لپٹے ایک داہمی والا بوڑھا بے خبر پڑا سوتا ہے۔ اب نوادر برآمدے سے اتر کر گھاس میں سے گزرتے پھوڑے ڈیوڑھی کی کندھی بجا رہے ہیں۔

رسوئی گھر کی کھڑکی کھلتی ہے۔ گھاس پر روشنی کا راستہ سا بن گیا۔ کھڑکی میں سے کسی نے جھانکا۔
”دیپالی“

”ارے تم لوگ۔“ دیپالی ذرا خشکی سے کہتی ہے مگر فوراً ہر آکر ڈیوڑھی کا دروازہ کھولتی ہے۔ وہ تینوں اس کے ساتھ پچھلے برآمدے میں آجاتے ہیں۔ دیپالی بیٹھک خانے کا دروازہ کھولتی ہے، جس میں شدید جھس طاری ہے۔

وہ تینوں برآمدے میں پڑے ہوئے تخت پر چمک جاتے ہیں۔ محمود الحق تالی بجا کر ایک پھیر مارتا ہے۔ جھوٹر توئے دتے نے سگریٹ سلگانے کے بعد ماچس کی خالی ڈبیہ شانہ باندھ کر سایہ حوض میں پھینک دی۔ روزی ہنرجی تیوری پر ہل ڈالے آنگن کے درختوں کو دیکھ رہی ہے۔ تینوں خاموش ہیں۔ دیپالی بھی خاموش ہے۔

”ادھر آؤ۔ دیپالی۔“ روزی اچانک زرد رشتی سے کہتی ہے اور دیپالی کے آگے چلتی اس کے کمرے داخل ہوتی ہے۔

کمرے میں پچتر بھنجنا رہے ہیں۔ دیپالی نے روشنی جلائی۔

”تمہارے بابا سونے میں ہیں۔“ روزی کا سوال

”بابا اور بھئی ماں فریے پورے گئے ہیں۔ بھئی ماں کے دیور کی لڑکی کی شادی ہے۔ اس میں بابا کی شرکت رہی تھی۔ رات کو عبدالقادر برآمدے میں سوئے ہیں۔ کل یا پرسوں میں بھی چلی جاؤں گی۔ شادی اتوار کو، کھو کھو بیار پڑیگا تھا اس لئے میں بابا کے ساتھ نہ جاسکی۔“ وہ پلنگ پر ٹھک جاتی ہے روزی دروازہ زنجیر ہے۔

باہر محمود الحق اور جیو تریموئے دتا چپ چاپ بیٹھے ہیں۔ اچانک اندر سے روزی کی گرجدار آواز آتی ہے۔

”غدار۔۔۔“

محمود الحق تاسف سے سر ہلاتا ہے۔

اندر کمرے میں روزی بھنجی عین اسی جگہ کھڑی ہے جہاں آج سے ڈھائی سال قبل دیپالی نے اسے حلف اٹھوایا تھا۔

”لوڈی۔“ روزی کی دوسری گہج۔

”پارٹی ڈائرکٹور۔“ دیپالی کا جو شیلا، برا فروختہ، توسیعی لہجہ۔

”برٹش ایجنٹ۔۔۔“ روزی کی پھنکار۔

”فاسٹ۔۔۔“ دیپالی کا ترکی بر ترکی جواب۔

جیو تریموئے دتا اٹھ کر دروازے پر دستک دیتا ہے۔ آگ بگولہ روزی اور دیپالی باہر نکلتی ہیں۔ نیک بارش شروع ہو جاتی ہے۔ ایک زوردار بوجھار نے سارا برآمدہ شرابور کر دیا۔ وہ چاروں بیٹھکوں میں چلے جاتے ہیں۔ دیپالی تہی جلا کر کھڑکیاں کھولتی ہے۔ کرسیوں پر ٹھک کر وہ چاروں زور شور میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ غل سن کر کھوکھو اپنے کمرے سے آنکھیں ملتا چھینکتا سلیم پر گھسیٹتا بیٹھک میں آتا ہے۔ وہ اب بڑا ہو چکا ہے۔ اور کانچ میں پڑھتا ہے۔ وہ بھی تندہی سے تکرار میں شامل ہو

اب یہ لوگ دہشت پسند شہداء کا ذکر کر رہے ہیں۔

دیپالی جلدی سے اٹھ کر باہر چلی جاتی ہے۔ آسمان پر نہ ور سے بجلی چمکی۔ وہ چند لمحوں تک پتہ چاہ کر کھڑی، اندر جھانک کر اپنے چچا کی تصویر کو دیکھتی رہتی ہے۔ کالی گھٹا ہرے بھرے آنکھ پر اتنی نیچے آئی ہے، لگتا ہے اگر ہاتھ بڑھائے تو گرنٹ میں آجائے گی۔

”کنک لت تروا — کل شہید ہوگئی۔۔۔“ اندر محمود الحق کہہ رہا ہے۔

”امیریل ہوٹل میں ریحان دا اور اومادی —“ جیو تر موئے دتا کہہ رہا ہے۔ دیپالی چوکتی ہوئی

”اومادی جو کلچرل فرنٹ پر کام کر رہی ہیں — فاشنزم کے خلاف — ہا ہا —“

تارہر سند۔

”سریری تو شس رائے کی صاحبزادی؟“ محمود الحق کا تجاہل عافانہ۔

”ڈیڈی کو نارٹ ہڈل گئی — ہٹے —“ جیو تر موئے دتا کانفرنس۔

اب ساری آوازیں گڑمڈ ہو جاتی ہیں۔

”ڈزٹاؤ —“

”چرخہ چلاؤ —“

”پیپلز ڈار میں معنوں نکھو —“

”ہٹے — ہٹے —“

”ہم جاتے ہیں دیپالی —“ روڈی کی آواز۔ ”تمہیں یاد رکھیں گے۔ بائی بائی۔ گڈ نارٹ۔“

”گڈ نارٹ دیپالی۔“ محمود الحق اور جیو تر موئے دتا کی آوازیں۔

وہ تینوں پھٹ سے کواڑ کھول کر سامنے کے برآمدے میں نکل جاتے ہیں۔ دیپالی پچھلے برآمدے میں دیوار سے لگی کھڑی ہے۔ اس کے پاؤں فرش پر جمے گئے ہیں۔ وہ دیش چندر سرکار کی تصویر پر نظر ڈال کر جلدی سے پلکیں جھپکالتی ہے۔

رات کا اندھیرا اور بارش باہر ان تینوں کو نگل لیتی ہے۔

گھوگھو باہر کا دروازہ بند کر کے چھینکتا ہوا بیٹھک جانے میں واپس آتا ہے۔ کیا یہ بھی، یہ تو اندہ میں شامل نہیں ہوگا۔ وہ اسے کچھ بھی نہیں بتاتا۔ عجیب گھٹا، تلخ سا لڑکا بنتا جا رہا ہے۔ وہ خاموش

پنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔

باہر بارش کی بھوار سے عبدالقادر کا آدھا بستر بھیک چکا ہے۔ وہ اس کے باوجود دہری نیند ہے۔ جب بارش کا چھینٹا اس کے چہرے پر پڑتا ہے تو نیند میں بڑبڑاتے ہوئے وہ کروٹ بدل رہا ہے۔ دوسرے ہم پھٹنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ یہ منظر بھی وقت میں تحلیل نہیں ہوگا۔

۲۲

بد روزی

بھادر کی موسلا دھار جھڑی کی وجہ سے روزی بھرجی نے اپنی سائیکل لیلی کاٹج کے ایک میں مقفل کر کے کھڑی کر دی ہے۔ وہ گھوڑا گاڑی میں گھرواپس پہنچی ہے۔ گاڑی اسے مشن کیاؤنڈ منے اتار کر برگد تلے جا کھڑی ہوئی ہے۔ اس کے دونوں مرگلے گھوڑے ہنہنا ہنہنا کر کھڑے ہیں اپنے سٹم ہے ہیں۔

روزی بھرجی بی رے میں فرسٹ ڈویژن لانے کے بعد یونیورسٹی میں ایم اے کسے لئے داخل ہو چکی ہیں۔ روزی بھرجی اس سے بے حد خوش ہیں، تعلیم میں اس قدر مہمک دیکھ کر ان کو یقین ہے کہ وہ اپنی ی حاققتیں ترک کر چکی ہے۔ وہ اس پر سخت نازاں ہیں۔ میری قابل، ہونہار، بے مثال بچی، وہ پچھلی سال کی حماقت اور بدتمیزی بھی معاف کر چکے ہیں۔ اور سوچتے ہیں ایک اعلیٰ خاندان عیسائی کی تلاش از سر نو شروع کر دی جائے۔ اس مرتبہ وہ قطعی روزی کی پسند یا ناپسند کا خیال رکھیں۔ وہ اس سلسلے میں وہ اس سے ابھی کچھ نہیں کہتے، یوں بھی وہ اس قدر مصروف ہے۔ پوسٹ بے بڑھائی کی وجہ سے دیر تک اسے یونیورسٹی لائبریری میں رہنا پڑتا ہے۔ شام کو وہ سگن لگے جا کر ٹن کرتی ہے (اس کی شاگردیا سمیں ہائی اسکول پانی کر کے اب ایف اے کے لئے اس سے انگریزی ہے) اس طرح روزی عموماً صبح کی گئی گئی بات پڑے لیلی کاٹج واپس آتی ہے۔ یوں بھی اگر وہ دیر دہے تو پادری بھرجی باز پرس نہیں کرتے۔ وہ اب بڑی ہو چکی ہے اور انھیں اس پر مکمل اعتماد ہے۔ جنگ نے بدل رہا ہے۔ جنگ نے پرانے معاشرے کی بہت سی تفصیلات ڈھادیں۔ جنگ دنیاوی

اور پابند وضع ڈھاکے تک پر اثر انداز ہو چکی ہے۔ پادری ہنرجی اپنے اتوار کے وعظوں میں اس اخلاقی کج بردی کی طرف بڑے دکھ سے اشارہ کر چکے ہیں، جو کلکتے جیسے گناہگار شہر کی مانند یہاں بھی عام ہو جائے۔ ۱۔

ٹھیکیداروں اور تاجروں کا نور و ناطقہ تیزی سے اُبھر رہا ہے۔ لڑائی اس وقت بنگال میں پڑوس میں لڑی جا رہی ہے۔ کلکتے پر ہلکی سی بمباری ہو چکی ہے۔ جاپان نے مشرق میں براہیمائیر کی بنیادیں بنادیں۔

۵ فروری کو سقوطِ سنگا پور کے بعد ریلوے ہنرجی نے گرجا میں رحم کی دعا کے لئے اسپیشل منعقد کی، کو ایئر نے ROCK OF AGES ایسے جذبے سے گایا کہ بڑے بڑے شقی القلب بڑستوں کی (پادری ہنرجی کے کلمے میں ایٹی برٹش بھیڑوں کی اب کمی نہیں) آنکھوں میں آنسو آگئے

اور — O GOD OUR HELP IN AGES PAST

OUR HOPE IN YEARS TO COME

OUR SHELTER IN THE STORMY BLAST

AND OUR ETERNAL HOME.

روزی پچیس سے کو ایئر میں گاتی آئی ہے۔ مگر اس روز غائب تھی۔ خیر

A THOUSAND YEARS IN THY SIGHT

ARE LIKE AN EVENING GONE

SHORT AS THE WATCH OF NIGHT

BEFORE THE MORNING SUN.

لیکن مارچ میں جاپانی بونے سارے برابر قابض ہو گئے۔ رنگون سے بھاگ کر سپیل بنگال تک پہنچنے والے پناہ گزینیوں کے حالات سن سن کر پادری ہنرجی کا دل لرز گیا۔ ڈھاکے آنے والے آبرمن ہندوستانی اور برہمن عیسائی قافلہ کے لئے مشن کمپاؤنڈ میں خیمے لگائے گئے۔ پادری ہنرجی د رات مریضوں اور زخمیوں کی تیمارداری اور دلجوئی میں جُستے رہے۔

اب بنگال کی جھانڈیوں میں برطانوی اور امریکن فوجیوں کی ریل پیل ہے، جو برما کے جنگلوں میں

ی موت کے گھاٹ اتر رہے ہیں۔ موت اور تباہ کاری کا بازار ساری دنیا میں گرم ہے۔
 ریورنڈ بنرجی کو سواچند امریکن مشنریوں کے، امریکنوں سے اب تک سابقہ نہیں پڑا تھا۔ مگر
 فون انہوں نے اس اجنبی، بے نیکی، انوکھی، ایسی پیورم قوم کے عام افراد کو پہلی بار قریب سے
 بب امریکن افسروں کی ٹولیاں جیب گاڑیوں میں لاکر مشن کیاؤنڈ آنے لگیں۔ انہوں نے بیش
 نالفت عیسائی غرام میں بانٹے، اور پادری بنرجی سے بڑی بے تکلفی اور بھائی چارے سے باتیں کیں۔
 فی چارے کے ساتھ انگریز ان کے ساتھ کبھی پیش نہیں آئے۔

ملایا میں برطانوی شکست کے بعد بنگال کے فوجی ہسپتال زخمیوں سے بھر چکے ہیں۔ ایک
 ی بنرجی نے اسٹیشن میں پڑھا کہ بہت سے ہندوستانی فوجیوں کو ملایا میں جاپانیوں نے جنگی
 لیا۔ سہاش بابو کے متعلق بھی آئے دن خبریں چھپا کرتی ہیں۔
 لیکن پادری بنرجی نے کسی اخبار میں یہ نہیں پڑھا کہ بنگال کے انقلابی، پرانے پاپی، اندھیری راتوں
 از مشیں کر رہے ہیں۔

روزی پچھلے چند روز سے رات کو کافی دیر میں گھراتی ہے۔ کیونکہ لائبریری مشن کیاؤنڈ سے
 صلے پر ہے۔

گھوڑا گاڑی سے اتر کر روزی سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ لیکن
 مسز بنرجی حسب معمول کھانے کی میز پر صبر کے ساتھ اس کے منتظر تھے۔ آج اس نے بہت
 پیر لگادی۔

اپنے کمرے میں جا کر پانی سے مٹی کی ساری تبدیل کرنے کے بعد وہ جلدی سے آکر میز پر بیٹھ گئی۔ مسز
 انجمن سے گرام گرم ٹو جیاں لے کر آئیں۔

ریورنڈ نے ماتھے پر انگلی رکھ کر گریس کی دعا کے لئے سر جھکایا۔ ان کی بیوی نے بھی سر جھکایا۔
 بھی۔ مگر کن انکھوں سے اپنی رست و لچ دکھتی رہی۔

اے ہمارے آسمانی باپ۔ تو جس نے اپنے فضل و کرم سے یہ نعمتیں ہمارے سامنے رکھیں تیری
 اسی طرح اس میز پر اور اس گھر پر برکتی رہے۔ آمین۔ پادری بنرجی نے گریس ٹیبل کر سہ

اٹھایا۔ ایسٹر بنرجی نے ٹوچیاں پیش کیں۔ ریورنڈ نے لقمہ بناتے ہوئے روزی کو دیکھا جو کھانا بنانے کرنے کے بجائے ذرا بے چینی کے ساتھ چمچے سے کھین رہی تھی۔
 ”کھانا کھاؤ بیٹی۔“

”جی ہاں بابا۔“

اس نے جلدی جلدی کھانا شروع کیا اور پانچ پھل والے ٹکڑے کے بعد کرسی سے اٹھنے لگا۔
 پادری بنرجی نے اسے ٹوکا۔

”کیا بات ہے؟“

”بھوک بالکل ہے ہی نہیں بابا۔ یونیورسٹی کینیڈا میں بہت سے سمو سے کھائے تھے۔“
 ”سارے ملک میں ان بد معاشوں نے آگ لگا رکھی ہے۔ ایسے پُر آشوب زمانے میں تم اتنے گئے گھر لوٹی ہو۔ جو رزق ہی کو ساتھ لے جایا کرو۔“

”مہیں بابا۔ گرو دیو کا انتقال ہو گیا ہے نابے چارے کا۔ تو یونیورسٹی میں ہم لوگ ان میں ایک بڑا زبردست پروگرام کرنے والے ہیں۔ اس سلسلے میں میڈنگ تھی۔ میڈنگ کے بعد آج جانے حسب معمول اڈہ شروع ہو گیا۔“

”آج کل اڈے کا زمانہ نہیں ہے۔ ہر طرف گولیاں برس رہی ہیں، احتیاط رکھو۔“

”بہت اچھا بابا۔“ وہ کرسی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

اچانک ریورنڈ بنرجی کو ایک خیال آیا۔ یونیورسٹی تو اس بد بخت، بغاوت کی وجہ سے بند ہو ہے۔ یہ پھر مجھے دنیاوی احمق بد بخت سمجھ کر بے وقوف تو نہیں بنا رہی؟

”روزی اِدھر آؤ۔“ انہوں نے کڑک کر کہا۔

وہ جھٹک گئی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ انہوں نے حکم دیا۔

وہ اطمینان سے واپس آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔

”تم پھر ان — ان غداروں سے جا ملی ہو؟“

اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”روزِی“ ریزنڈ بنرجی نے اپنے دلوں ہاتھ میز پر رکھ کر ٹوٹی ہوئی آواز میں ایک بار پھر کہنا
 رع کیا۔ ”جس سرکار نے ہمیں جنگلی سے انسان بنایا۔ بت پرستی کے جنمی راستے سے نکال کر۔“
 ”اوہ نوپا۔۔۔ نوٹ اگین۔۔۔“ روزی نے ایک محنت تھنچھلا کر میز پر یکے مارا۔ پانی کا
 چھلک گیا۔ ایستھر بنرجی نے جھاڑن اٹھا کر پھرتی سے میز صاف کرتے ہوئے اُسے ڈانٹا۔ ”روزِی۔“
 ”سو ری ماما۔“ پھر وہ اپنے پاپا کی طرف مڑی۔

”پاپا۔ سنئے۔ سی۔ ایف اینڈ ریزو تو نہ صرف پکے عیسائی تھے بلکہ اصل نسل انگریز بھی تھے۔
 آپ سے کہیں زیادہ بڑے پادری۔ آپ نے جا کر کبھی ان کو یہ سب کیوں نہ سمجھایا۔؟“ اس نے بہت
 آئی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کوئٹ انڈیا۔ کوئٹ انڈیا۔“ پادری بنرجی طیش کے عالم میں کرسی سے اٹھ کر کمرے میں
 لنگے۔ احمقو۔ گدھو۔ انگریز چلا گیا تو ہم پھر اسی بریت، بے ایمانی اور بے انصافی کے دور کی
 نوٹ جائیں گے جس سے انہوں نے ہمیں نجات دی۔“

روزِی نے دوبارہ ذرا پریشانی سے گھڑی پر نظر ڈالی۔ پادری بنرجی اب ایک کرسی کی پشت پر ہاتھ
 زنبایت برافروختہ آواز میں اس سے مخاطب تھے۔ ”کوئٹ انڈیا کی کچی، ہندوؤں اور مسلمانوں کی
 ٹانگیں پڑھ پڑھ کر پاگل ہو گئی۔ ہندوستان کی سنہری قدیم تہذیب، سنہری قدیم تہذیب یہ تھی کہ
 پوری کرنے کے لئے ہندو اپنے بچوں کو گھڑیاؤں کے سامنے پھینک دیتے تھے۔ ہندو لڑکیوں کو مار
 جاتا تھا۔ مسلمان ٹھگ مسافروں کا گلا گھونٹتے تھے۔ انڈین کلچر، انڈین کلچر، لکٹے انگریز مشنریوں نے
 عورتوں کو چتا سے نکالا۔ اور جب وہ ان بد نصیبوں کو بچانے کی کوشش کرتے، عین وہیں شمشان گھاٹ
 ادھر جاتا تھا۔۔۔ خود میری پردادی کو۔۔۔ جانتی ہے الحق؟ میری اپنی پردادی کو سستی ہونا پڑا۔
 وکلچر۔ ہندو کلچر۔۔۔“

روزِی کو باپ کا اس قدر شدید غصہ دیکھ کر بے اختیار سنسی آگئی۔ اس نے آہستہ سے کہا ”مگر پاپا۔
 لے ہند سبھی یورپ میں بھی تو ہزاروں بے گناہ عورتوں کو جادوگری کے الزام میں صدیوں تک زندہ جلا رہا
 ہا۔ اور جس زمانے میں ہندوستان میں ہندو مسلمان مزے سے اکٹھے رہ رہے تھے اس وقت آپ گے

یورپ میں INQUISITION ہو رہا تھا۔ ہا ہا ہا۔۔۔“

”روزِی۔ چپ۔“ ایستھر بنرجی نے سہم کر پاپ بیٹی کی تکرار ختم کرانی چاہی۔
 ”اور سنئے پاپا۔“ روزی مزے سے کہتی تھی۔ ”سیو۔ کے بچاریوں نے سارے یہودیوں کو اٹھا کر
 GHETTOS میں ڈال دیا۔ (میری اور بے چارے پاپا کی ڈسٹنگ سو سائی) اس نے دلی میں سوچا اور
 یہ جو پاپا آپ اچھوتوں کی بات کرتے ہیں تو کیا آپ کے انگلینڈ میں ایک جمہنی سٹوٹ یا اُسے کیا کہتے ہیں۔
 پیارو سن۔ یہ کسی لارڈ کی میز پر اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکتے ہیں؟۔ ٹاٹا۔“
 ”کچ بجتی مت کرو روزی۔“ پادری بنرجی نے ڈالیا۔

روزی کو ایک اور نکتہ یاد آیا (گو اس بجٹا بجتی میں آدھ ٹھنڈہ برباد جائے گا) ”یہ جو آپ ہمیشہ ہندوستان
 کے پرانے مطلق العنان حکمرانوں کو بُرا بھلا کہتے رہتے ہیں۔۔۔ خصوصاً شراج الدولہ کو، جو میرا ہیرو ہے
 ۔۔۔ تو کیا آپ کے ایجنٹس انگلستان میں بات بے بات لوگوں کے سر قلم نہیں کر دے جاتے تھے؟ جسے
 دیکھو ٹاٹا، آف لندن میں پڑا جھینک رہا ہے اور دوسرے سڈ کھٹ سے سرفراب۔ وہاں عام آدمی کے لئے کوئی انصاف
 تھا؟ صرف سو برس پہلے تک آپ کے انگلستان میں ایک بھیڑی کی چوری کی سزا موت تھی۔ اب یہ ”لائبڈ آرڈر“
 کا کن منہ سے ہم پر رعب ڈالتے ہیں۔ یہ انگریز کب کبے کہنے۔۔۔ ہماری دولت لوٹ کر تو خود کو مہذب
 بنایا ان غمیوں نے“

پادری بنرجی عینک ہٹا کر اسے حاکم کرتے ہوئے پھرانسی کر سی پر بیٹھ گئے۔ بد تمیز، گستاخ، زبیل
 دراز اندیش بن گئی۔

”اور بتاؤں آپ کو پاپا۔“ روزی اب صریحاً بے رحمی پر اترا آئی تھی۔ ”آپ کے وہ جو ایک کٹر
 روسی کیتھولک دوست ہیں۔ ڈاکٹر فرانسس باسکو۔ جب ان کی بڑی لڑکی نے ایک مسلمان سے شادی کی جو بے
 چارہ ایک اعلیٰ خاندان کا بنگالی ہے تو انہوں نے فوراً بیٹی کو عاق کر دیا۔ اور آپ بھی کس قدر خفا ہوئے تھے۔
 ماقوہ۔ اور ابھی پچھلے دنوں ان کی چھوٹی لڑکی نے ایک معمولی امریکن فوجی سپاہی سے سیاہ رچایا تو انکل باسکو فخر سے
 بھولے نہیں سمائے حالانکہ۔۔۔ حالانکہ وہ روسی کیتھولک تو کیا عیسائی ہی نہیں سوسے سے یہودی ہے۔ اور
 جناب آپ نے بھی فوراً لایچینا کو مبارک باد کا تار بھیجا۔ تو پاپا یہ تعظیماً نہ ذہنیت اور گوری چھڑی کا رعب۔“
 ”سن کروزی۔“ ایستھر بنرجی نے سر سیمٹی سے کہا اور چپکے سے اشارہ کیا کہ کمرے سے چلی جائے۔
 وہ گہرا سانس لے کر کمرے سے اٹھی۔

”اچھا۔ اچھا۔ بیٹی۔“ پادری ہنرجی نے طولی آواز میں جواب دیا۔ ”نکال دو انگریزوں کو
 بستان سے پھر دیکھنا کیا حشر ہوتا ہے۔ تم سب الرٹائنسلسٹوں کا۔ جوں ہی یہ ہٹے تمہارے
 لے ہندو مسلمانوں میں وہ جوتا چلے گا، وہ بھیانک خانہ جنگی ہوگی کہ دیکھ لینا۔ تب تمہیں اس
 بوڑھے پادری کی باتیں یاد آئیں گی۔“ ان کی آواز بھرا گئی

روزی نے بڑی نرمی سے کہا۔ ”پاپا۔ میں تو لوہی آپ سے تعزیا بچت کر رہی تھی۔ آخر مجھے
 فی ڈیٹوں میں یونہی ٹرافیاں ملتی رہی ہیں، مفت میں قوم پرست تو یقیناً ہوں پاپا مگر آج کل جو تباہ
 مچ رہی ہے میں خود اس کے خلاف ہوں۔“

”تم مانتی ہو بیٹی کہ ایسے نازک موقع پر جبکہ برطانیہ ہر محاذ پر کمزور رہا ہے۔“
 ”ہیں اس کی مدد کرنی چاہئے۔ بالکل۔ بالکل۔“ روزی نے جوش سے ان کی
 پوزی کر دی۔

”اچھا بس ہوگی تم لوگوں کی ڈیٹ۔ اب پاپا کو جا کر سونے دو روزی۔“ ایستھر نے اطمینان کا
 دیتے ہوئے کہا۔

”یس ماما۔“ روزی نے دروازے میں جا کر باہر جھانکا۔ مینہ ٹھم چکا تھا۔ افوہ کتنی گھپ اندھیرا
 ہے ماما۔ دیکھنا سبزی باڑی پر ٹگنو کیسے چمک رہے ہیں۔ پاپا۔“ اس نے مڑ کر پادری ہنرجی سے دوبارہ
 ”کیا آپ واقعی خفا ہو گئے؟ میں تو آپ کو TEASE کر رہی تھی سچ پاپا۔“ کر سی کے پیچھے آکر
 بڑے لاڈ سے ان کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں۔ پادری ہنرجی خوش ہو گئے۔ ہینک اتار کر اسے رعال سے
 لیا۔

”سچ پاپا۔ یونیورسٹی تو بند ہو چکی ہے، مگر ہماری لٹریچر سوسائٹی ٹیگور کا تعزیتی پروگرام کر رہی
 جلسہ ہو گا بڑا۔“

”دیپالی اس جلسے میں شامل ہے؟ وہ بھی آئی تھی؟“
 ”جی نہیں۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ پاپا۔ راجندر سنگیت کا پروگرام اس کے بغیر کیسے مکمل ہو سکتا ہے۔“
 ”ہوں۔“ انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

”گڈ نائٹ پاپا۔“ اس نے جھک کر رپورٹ ہنرجی کا سر چھوا۔

دو لہین کے مستطرد غنودگی کے عالم میں بید کی کرسی پر بیٹھے تھے۔ نیند میں ان کا سر سامنے کو ٹھک آیا تھا۔
 کی آہٹ پر وہ جھٹکے۔ اور ان کی طرف دیکھ کر بغیر علت کے مطابق پیالی کے لئے ہاتھ بڑھایا۔
 ایستھر بنرجی نے ان کے قریب جا کر آہستہ سے کہا۔ ”پال — ہماری لڑکی گھر سے بھاگ گئی۔“
 پادری بنرجی نے سر جھٹکا، بلیکس ملیں اور بیوی کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ ان کے صرف ہونٹ ہلے۔
 سے آواز نہیں نکلی۔

ایستھر گری بالا نے اقرار میں سر ہلایا۔ وہ ان کے قریب فرش پر دوڑا نو بیٹھ گئیں۔
 باہر بجلی زور سے چلی اور شکست خوردہ میاں بیوی کے ٹیل کو کوروش کر گئی۔ (مناظر وقت
 معدوم نہیں ہوں گے)

پادری بنرجی چند منٹ تک بالکل چپ، ساکت، منجمد بیٹھے رہے۔ پھر انہوں نے لرزاں ہاتھوں
 ، عینک مٹولی! ایستھر نے میز پر رکھے سیاہ کیس میں سے عینک نکال کر ان کو دی۔ پادری بنرجی نے
 ، پلنگ کے سرانے سے انجیل مقدم اٹھائی۔ ایستھر ان کے نزدیک دوسری کرسی پر بیٹھ گئیں اور
 ان سے سڑوٹھانپ لیا۔

”LET US PRAY“ پادری بنرجی نے آہستہ سے کہا۔

ایسی ساری رات پادری بنرجی حضرت ایتھاب کی گریحنداری کا باب پڑھتے رہے۔

اور دیکھو۔ کہ دنیا کے مارے مقدس صحیفوں کے یہ سارے ابواب کتنے ہزار بار برسوں
 نے ان گنت انسانوں کی مصیبت کے وقت میں پڑھے گئے ہیں۔ اور وہ چند الفاظ اسی طرح
 جو ہیں۔

وقت اور الفاظ انسان کے شکاری ہیں۔

گنگا اور برہمپتر

ڈیک چیر پر ذرا آگے کو جھکا ہوا نوجوان مضطرب سرگوشی میں کہہ رہا تھا — ”ہم نے روپوشی سے باہر آنے کے بعد تم کو اتنے خط لکھے۔ ہر تیسرے روز، ہر ہفتے، ہر پتے پر، اتنے تار دیئے اتنے سند بسے بھجوائے۔ تم نے ایک کا — — — — — ایک خط کا جواب نہ دیا۔ ہماری شدید پریشانی کا بھی تمہیں خیال نہ آیا۔ ہمیں طرح طرح کے اندیشوں نے بدحواس کر دیا تھا۔ شاید تم بکری لگی ہو۔ شاید نچے بالو نے تمہیں گاؤں بھیج دیا ہو۔ شاید زبردستی تمہاری شادی کر دی گئی ہو، پھر ادھیل کے ذریعے معلوم ہوا کہ تم خیریت سے ہو۔ اس کے بعد تمہارے چپ سادھ لینے کی وجہ بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔

”ہماری عقل حیران ہے — — — — — چند لمحوں کے وقفہ کے بعد نوجوان نے پھر کہنا شروع کیا۔

”ہماری عقل حیران ہے کہ تم نے یہ رویہ کیوں اختیار کیا۔ ناراض ہو تو صرف دو سطروں میں ناراضگی کی وجہ ہی بتلا دیتیں۔ ہم نے بار بار تمہیں لکھا۔ کسی وجہ سے خفا ہو گئی ہو تو بتلا دو۔ اور معاف کر دو۔ آخر یہ تم کو ہوا کیا؟“

نیم تاریک اور سسنا ڈیک کے سرے پر صوف سگریٹ کی روشنی چمکتی رہی۔ ڈیک کا فرش بھیگا ہوا تھا۔ کچھ دور پر ایک خلاصی ایک بیچ پر محو خواب تھا۔

”ہم شروع شروع میں تفصیل سے تمہیں کچھ نہیں لکھ سکتے تھے۔ سگریٹ ایک جھٹکے سے پدائیں جاگرا۔

”پچھل جولائی سے — — — — — کھلنا کی اس اندھیری رات سے لے کر نومبر دسمبر تک ہم ادھر ادھر روپوش رہے۔ سندن میں تم سے ملاقات کے اس خطرناک ایڈونچر کے بعد ہم بہت محتاط ہو گئے تھے۔ اس لئے تمہیں کوئی دو حرفی پیغام بھی نہ بھیجا سکے۔ ادارتیں مصروف رہتے کہ غم جاناں کے متعین سوچ کی ہلکت ہی نہ ملے۔ دیویتی والوں کو دسمبر میں رہائی حاصل ہوئی اور ہم — — — — — کدھر دیکھ رہی

، کیا ہماری آواز بھی ناگوار ہے ؟ ”

دیا سلائی کا مختصر سا شعلہ لپکا۔ دوسرا سگریٹ، زیادہ مضطرب، آزرده لہجہ۔ ”کیا تم اس لئے
تھیں کہ ہم دسمبر کے بعد تم سے ملنے بنگال نہ آ سکے ؟ ہمیں معلوم نہ تھا والٹہ کہ تم اس قدر دیوانی لڑکی
_____“

دوسرا سگریٹ بھی تین چار کش کے بعد اندھیرے مہیب دیبا میں جاگرا۔
”اگر ہمیں ایک ضروری کام سے اچانک یہاں نہ بھیجا گیا ہوتا تو شاید اب بھی نہ آ سکتے،
تم _____ تم دوسرے گروپ سے جا ملی ہو، اس وجہ سے مجھے بغیر ”ٹرائل“ کے عاقبہ کر دیا۔ یہ کیا
نا ہے ؟“

جہاز نرم روی سے آگے بڑھتا رہا۔
”کیا مجھے تم سے خفا نہیں ہونا چاہیے ؟ میرے ساتھ یہ رویہ اختیار کرنے کی آخری
_____ ڈیم یو۔“

تیسرے سگریٹ کے لئے ماچس جلانے کی کوشش، مگر ماچس سبلی ہوئی تھی۔
”کیا تم کو _____ کسی اور سے _____ کوئی لور _____ ذرا کانپتے ہوئے ہاتھ۔
_____ کی ڈبیا بھی دیا برد ہوئی۔“

”شٹ اپ۔“ دوسری ڈیک چیر پر بیٹھی ہوئی لڑکی نے ایک لحنت تھلا کر جواب دیا۔
وہ اور آگے جھکا۔ لڑکی کی شکل دھیان سے دیکھی اور آہستہ سے مسکرایا۔ ”شکر ہے۔“
”کیا شکر ہے ؟“ وہ بلی کی طرح غرائی۔

دریا پر تیز ہوا چل رہی تھی۔ لڑکی نے سردی کی وجہ سے کندھے سے سکیڑ کر ساری کا آنچل جسم سے
رح لیٹا۔ ”نوجوان نے کھادی ریشم کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس نے چادر اتار کر لڑکی کے کندھوں پر ڈالی۔
ہر کے توقف کے بعد بڑی نرمی اور احتیاط سے لپیٹ دی۔ لڑکی ذرا سا کپکپائی۔
_____ بے جاری بے وقوف، نالائق بچی۔“

”آپ کو _____ آپ کو سردی لگ جائے گی“ لڑکی نے دھیرے سے کہا۔
”تم سے مطلب ؟ مر گئے تو شہیدِ محبت کہلائیں گے، قسم خدا کی تین ساڑھے تین سال سے کیا

فیئر ٹیکل مشق چل رہا ہے۔ لاجول دلاقوہ۔

کرفک، چار سو بیس، دھوکے باز۔

”بیالے پاس کر رہا؟“ نوجوان نے پھر مات کر۔
”کر رہا۔“

”فرسٹ ڈیٹیکٹ“

”جی۔“

”ارے ماہ سٹاباش۔ مبارک ہو۔ تو اب کیا تمہاری شادی کا اشتہار اخباروں میں دیا جا سکتا ہے۔
”جی، اے پاس، ماہ سٹاباش، ماہ سٹاباش، سٹاباش کی استاد، کانسٹیٹوٹ کیا۔
”کامبریز روزگار ہونا ضروری ہے۔ کم از کم پی سی ایس کو ترجیح دی جائے گی۔“
”کیونکہ، بے ہودہ، لو فر۔“

”وہ اٹھنے لگی، نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پھر کرسی پر بٹھا دیا۔“ آپ اب کہیں بھاگ کر نہ
جاسکیں۔“

”آپ کا دماغ خراب ہے۔“ لڑکی نے آہستہ سے کہا اور پھر اٹھنے لگی۔

”یہ تم بھاگی کہاں جا رہی ہو؟“

”عبداللہ قادری کے ادھر چلے گئے بیٹھے ہیں، اگر آپ کی اس۔۔۔ کیا کہنا چاہئے۔۔۔
”کافی پران کی نظر پڑ گئی۔“

”پچھلے سال لگ بھگ اسی موسم میں آپ کہاں تشریف رکھتی تھیں، غالباً یاد ہو۔ لیکن زیادہ تر
قسم کا AMNESIA لاحق ہو گیا ہے تو۔۔۔“

”ایک مرتبہ حماقت کی تھی، اب دوبارہ ہمیں ہوگی۔ گڈ گریش۔۔۔ خیال آتا ہے تو رونگٹہ
کھڑے ہو جاتے ہیں۔“

”تم واقعی بدل گئی ہو۔“

”جی ہاں۔“

اب وہ خاموش ہو گیا۔

شاید قصہ واقعی ختم ہو چکا ہے۔ ایک سال بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ یا شاید محبت ختم ہونے کی کوئی منطقی وجہ نہیں ہوتی، میں بیکار اس لڑکی کا تعاقب کر رہا ہوں، یہ وہ لڑکی ہی نہیں ہے۔

کئی منٹ گزر گئے۔ اچانک وہ بولی: ”آپ — آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ — آپ نے آخر اس جہاز پر مجھے کیسے پکڑ لیا۔“

وہ خوش ہو گیا۔ نہیں۔ یہ وہی لڑکی ہے ابھی کچھ نہیں بدلا۔

”کس طرح پکڑ لیا۔“ اس نے بے نشان لہجے میں جواب دیا۔ ”اس طرح کہ میں ڈھاکے میں بیٹھا آپ کے گھر پہنچا۔ جو سنان پڑا تھا۔ چکر کاٹ کر شاگرد پیشے کی طرف گیا۔ وہاں آپ کی ریاست کے غیر مولوی عبدالقادر کی اہلیہ نے ضروری معلومات فراہم کیں کہ بچے کوئی سترآبا ہو میں ان کے ہاں گئے ہوئے تھے ابھی آپ کسی خاندانی شادی کے لئے عبدالقادر کے ہمراہ فریدپور تشریف لے گئے ہیں اور فلاں تاریخ کو عبدالقادر کے ساتھ ہی واپس آجائیں گی۔ گھوگھو کی بیماری کی وجہ سے۔ چنانچہ میں نے فی الفور فریدپور کا ٹکٹ کٹایا۔ میں فریدپور فریدپور کے لوگوں سے واقف ہوں۔ آپ کی بستی ماں کے گھر والوں کو بھی جانتا ہوں۔ یہاں چپکے سے پتہ لگانا بہت آسان تھا کہ آپ کس روز کس وقت مزائن گنج کے لئے روانہ ہو رہی ہیں چنانچہ اسی جہاز کا ٹکٹ اس ناچیز نے بھی خرید لیا۔ باقی حالات آپ نے پردہ سیمیں پر خود ملاحظہ فرمائے۔“

”آپ ڈھاکے میں میرا انتظار کر سکتے تھے۔“

”نہیں کر سکتے تھے، آپ کے سلسلے میں ہم منطقی نہیں ہیں۔“

دونوں دھندلے سائے ساکت بیٹھے رہے۔ چاروں طرف بادل اور دنیا ایک ہو گئے تھے۔ ڈیک چیرے سے کچھ دور لمبی سفید داڑھی والا مسلمان بوڑھا پاکستان اپنے کھلے کپڑوں کے سامنے جنگی پرچہ کا کھڑا تھا۔ اس کے نزدیک لگی ہوئی جیھٹا فتور سرچ لائٹ نے دیا کو حدِ غریب روشن کر رکھا تھا۔

”روزی کیسی ہے؟“ کچھ دیر بعد نوجوان نے دریافت کیا۔

”روزی — محمودا — یہ سب لوگ — آپ کو نہیں معلوم؟“

”ہاں۔ سریندر نے ڈھاکے میں مجھے بتلایا — ان لوگوں کو کچھ سمجھایا نہیں جاسکتا۔“ اس نے گہری سانس لی۔ ”اچھا کہیں سے جس لئے کراؤ۔“

کس منہ سے حکم چلاتے تھے، میں گھبر ہوا، ان کی زبرد خرید چروٹوں کی داسی کتنے ہی کامیڈ بن جائیں

اصلیت میں رہیں گے وہی نیا لہجہ ہندوستانی لارڈ ایڈم سٹر۔ میں نہیں لاتی ماچس واچس۔

”اے بھائی ذرا بھاگ کر ایک ماچس لے آؤ نا کیس سے۔۔۔۔۔ عبدالقادر میاں سے مانگ لو۔

وہ ضرور بیڑی پتے پھلے گئے۔“

”میں ان سے جا کر کہوں کہ ذرا دیا سلائی دینا جو میرے ایک عزیز دوست کو چاہئے جو مجھے بھگائے جانے

کا پروگرام بنا رہے ہیں۔“

”جب تم (عنقریب انشاء اللہ) بھاگو گئی تو بنوئے بابو لالہ محالہ یہی شبہ کریں گے کہ ان کے ذریعہ ہی تم ایک

مہاں بھائی کے ساتھ ڈنچھو ہو گئیں۔“

”اس خیال میں بھی نہ رہے گا۔ عبدالقادر میاں میں انتہائی فیوڈل وفاداری ہے۔ وہ آپ کے

مولوی ابوالہاشم نہیں ہیں۔۔۔۔۔“ دفعاً وہ چپ ہو گئی۔

”وہ۔۔۔ وہ ہم نے ایک سہانا۔۔۔ ناقابل یقین خواب دیکھا تھا نا۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ لڑکی نے آہستہ سے کہا۔

کچھ دور پر فوجیوں سے لدا نیم تار ایک انسٹیمر گزرا تھا۔

”عجیب بات ہے۔“ لڑکی نے پھر جلدی سے موضوع تبدیل کیا۔ ”جب کامرنڈر رندھیو سے کا

بیان چھپا پہلی بار کہ یہ جنگ اب عوامی جنگ ہے۔۔۔۔۔ تو یہ قوم پرست آئی شدت سے پارٹی کے خلاف

کیوں ہو گئے خصوصاً روزی۔۔۔۔۔ وہ تو بہت ہی ایمپیور نکلی۔ میں نے اسے کئی بار۔۔۔۔۔ کئی بار

سمجھایا کہ۔۔۔۔۔ آپ نے ایک بار لکھا تھا نا خط میں کہ کمیونسٹ انٹرنیشنل اس بے جگری سے نا۔۔۔۔۔

اور فاشزم کا مقابلہ۔۔۔۔۔“

”بہت خوب، آپ کا جواب نہیں۔ ہمارے عزیزوں کے ذریعے آپ اپنے دوستوں کو

ایجوکیٹ کرتی ہیں۔ مگر میں دوسطیں لکھنے کی ماچس نے زحمت گوارا نہ کی۔ اب بھائی ہمیں یقین ہو گیا کہ

تمہارے دماغ کی ایک بچھل ضرور ڈھیلی ہے۔“

”کمال ہے۔۔۔۔۔“ لڑکی نے مزید گڑبڑا کر یہی سنجیدگی سے یہی اسی گفتگو جاری رکھی۔

”منازع کو کاٹ کر بھی جی پی، آئی سے علیحدہ ہو گئی۔ حالانکہ۔۔۔۔۔ حالانکہ۔۔۔۔۔“

— پندت نہرو ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے فاشنزم کے خطرے کو پہچانا تھا۔ ”لوٹکی
نے اس انداز میں بات ختم کی گویا اخبار کا ایڈیٹوریل پڑھ رہی تھی۔ پھر اس نے چہرہ پھیر کر بے نیازی
سے دریا کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

”جی ہاں۔ آپ بالکل صحیح فرماتی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی سیاسی سوچ بوجھ اور بالغ
فطرت ترقی پر ہے۔“

دریا کی متلاطم لہریں اسٹیمر سے ٹکرایا کیں۔ کبھی کبھی پانی کی جھینٹیں اڑ کر اوپر آ جاتی تھیں۔
لوٹکی کے بال بھینگ گئے۔ رات تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ نوجوان نے گھبرا کر گھڑی پر نظر ڈالی۔
دفعتاً لوٹکی نے سوال کیا: ”آپ یہاں کس کام سے آئے ہیں؟ یا۔۔۔ رانکی بات ہے؟“
”نہیں۔ کوئی رانکی بات نہیں ہے۔ ہمیں پراونشل مسلم لیگ کے لیڈروں سے بات چیت کرنے
لئے بھیجا گیا ہے۔“

مسلم لیگ — نواب قمر الزماں چودھری — ارجم — جہاں آ —
جہاز دریا کی گدلی موجوں پر ڈونے لگا۔ اس کے انجن کی آواز ایک دم اونچی ہو گئی۔ ہاتھ پاؤں
نڈے پڑ گئے۔

”جیوتی دا، روزی، محمود دا، یہ سب بھی مجھ سے بے حد خفا تھے، روزی نے تو مجھے غدار اور لٹوٹی
بنا — حد ہے —“

”تم نے ان کا ساتھ کیوں نہ دیا —؟ تم تو دیش بابو کی بھتیجی ہو —“

”آپ نے جو اتنی سختی سے منع کر دیا تھا۔“

”کب۔؟“

”اپنے پچھلے خط میں۔“

”مائی گڈنس۔“

لوٹکی نے اور زیادہ چڑا کر سر جھکایا۔ ”حالانکہ مجھے اتنی شبہ مندی سی تھی کہ میں کاکا کو

LET DOWN کر رہی ہوں۔“

”مائی گڈنس۔“ نوجوان نے دہرایا۔ پھر اس نے آگے جھجک کر پوچھا۔ ”اب بتلا دو ہم

سے کیوں خفا تھیں۔ ہمارے خطوں کا جواب کیوں نہیں دیتی تھیں؟

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ نوجوان بھی اٹھا۔ اور چاروں طرف نظر ڈالی۔ "اس پُرسکون جگہ کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت سارے دیں میں آگ لگ رہی ہے۔" اس نے طویل آوازیں اڑائی۔
 لڑکی جا کر سرچ لائٹ کے نزدیک کھڑی ہو گئی۔ وہ بھی اس کے برابر آگیا۔
 "شاید میں بزدل ہو گئی ہوں۔" لڑکی نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
 وہ خاموش رہا۔ سرچ لائٹ ہدیہ پر روشنی کا ایک اور دریا بہا رہی تھی۔
 "آپ کتنے دن رہیں گے؟"

"پتہ نہیں۔ جتنے دن بھی لگ جائیں۔ معاملات کافی الجھک میں۔ مسلم لیگ ایک عوامی کارکن بن چکی ہے، اس کی نئی طاقت کو نظر انداز کرنا حماقت ہوگی۔"

بوڑھے ناخدا نے کان کھڑے کئے۔ اور ذرا نزدیک ہو کر دلچسپی سے بات سننے لگا۔ اور ایک دفعہ کہنے لگا۔ "نوجوان کو دیکھا۔ نوجوان نے مسکرا کر اسے "سلام علیکم" کہا اور بات جاری رکھی۔ "ہنگامہ مسلم اکثریت کا صوبہ ہے۔ یہاں کی مسلم جماعت پروگرامر لیڈر شپ کی منتظر ہے۔"

"نواب لوگ تو پروگرامر لیڈر نہیں ہیں۔"

"پروگرامر لیڈر شپ ہماری ہوگی۔ ہمیں لیگ کے قریب آنا ہوگا۔ یہ پیشین گوئی میں آج آگے لے رہا ہوں۔ اس رات کو رہا ہوں۔ گھر میں باندھ لو!"

نواب قمر الزماں۔۔۔ یہ ارجمند منزل جائے گا۔ ارجمند منزل جائے گا۔۔۔ اس کا دل ذرا فور سے دھڑکنے لگا۔ وہ رینگ پھجک کر نیچے لہروں کو تانے لگی۔ پچھلے سال جولائی کی اس رات مہربی سدا میں جو وعدہ میں نے اپنے آپ سے کیا تھا اس پر قائم نہ رہی۔ اُسے چپکے سے آگیا۔ اس نے جب تک مضبوط سے پکڑ لیا۔ جب تک کا لوہا بالکل رخ تھا۔ میں نے ساری رات اس سے باتیں کرنے میں گزار دی۔ اب نہیں اب کچھ نہیں۔ اب اُٹھنا بالکل پیمانہ کرنے والی گی۔ آخر سال بھر تک کس مضبوطی اور بے جگری سے اپنے وعدے پر قائم رہی ہوں کہ نہیں۔ ایک سال گزر گیا۔ اس طرح باقی عمر بھی گزر جائے گی۔ اب نہیں یہ آخری ملاقات ہے۔ دیکھ لینا۔

بوڑھا پیستے پر جھجک چکا تھا، اسٹیم تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

”ڈھاکے میں آپ کہاں ٹہرے ہیں۔“ لڑکی نے بالکل نارمل آواز میں دریافت کیا۔
 ”اُدما کے ہاں۔“ وہ ہنسا۔ ”ایک زمانہ تھا کہ ووڈ لینڈ میں ہمارے فرشتے تک۔ بچھا سکتے
 تھے۔ نہیں خیر۔ ہمارا ایک فرشتہ تو بچھٹکا تھا۔“ اس نے پیار سے لڑکی کے بالوں کو چھوا۔ وہ قہقہہ لگا کر
 پرے سرک گئی۔ وہ کہتا رہا۔

”اب ہم مزے سے عین سرسری توش رائے کے گیسٹ روم میں ڈٹے ہوئے ہیں۔ بااقل سے تم کب
 سے نہیں ملیں؟“
 ”مذمتیں ہو گئیں۔“

”آہ ان سے ملنے۔ وہ دلی سے میرے ساتھ ہی آئی ہیں آج کل ان کے والدین کلکتے لئے ہوئے ہیں اس
 لئے سارے دوستوں کا اڈمبے فکری سے وہیں ہوتا ہے۔“

”دلی میں آپ اسپرٹل ہوٹل میں ٹہرے تھے؟“
 ”ہم۔۔۔؟ نہیں تو۔ اُدما وہاں مقیم تھیں۔ ہم ایک دوست کے یہاں تھے، کیوں؟ تم کو کیسے
 معلوم ہوا؟“

”آکاش بانی آئی تھی۔“ لڑکی نے خشکی سے جواب دیا۔ زحوان نے اسے غور سے دیکھا۔
 ”تم واقعی بدل گئی ہو۔۔۔ ایک سال میں بدل گئی ہو۔ تم میں تعجبی آگئی ہے۔ تم اتنی سیدھی مانتی
 بھولی تھیں، تمہیں کیا ہو گیا۔ کون تمہاری اس تبدیلی کا ذمے دار ہے؟ اس نے مجاہت سے کہا۔
 ماں۔ مجھے مضبوط بنانا مجھے فولاد کی طرح مضبوط بنانا۔ لڑکی آنکھیں میچ کر دوسری طرف دیکھنے
 لگی۔ لیکن ہر سمت دریا کا دھندلا طاری تھا۔

”تم دن بھر گھر پر رہتی ہو؟“

”جی ہاں۔“

”میں کسی وقت تمہارے ہاں آسکتا ہوں؟“

”کسی وقت نہیں۔“

”کیوں؟“

”میرے ہی۔ میری مرضی۔“

”اچھا۔“

اسٹیمراب دیا کے موڑ سے گزر چکا تھا۔ ملاح نے بہتہ گھمانا ختم کر دیا۔ سامنے روشنی کا راستہ بے حد وسیع ہو گیا۔ وہ دونوں جنگلے پر جھکے دریا کی منور لہروں کو تلکے سے۔ گہرا ستلاطم دیا۔ منور پانی، حد نظر تک روشن۔ چاروں گھونٹ پانی۔ ابتدا میں خلا تھا، اور تاریکی اور خدا کی روح پانیوں پر ڈوبتی تھی۔ یہ تخلیق کائنات کی رات تھی۔ اور خدا نے کہا روشنی اور روشنی ہو گئی۔ اور خدا نے دیکھا کہ روشنی اچھی ہے، اور خدا نے روشنی کو تاریکی سے جدا کیا۔

اور آدم و حوا کو بنایا۔ اور ایک دوسرے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ (آدم و حوا، اسٹیمبر کے جنگلے پر جھکے کھڑے ہیں، استعارے کو اور آگے لے جاؤں تو یہ بزرگ کپتان حضرت نوح ہیں جو ہم دونوں کو نہ جانے کون سے امارات کی سمت لئے جا رہے ہیں۔ نوجوان زیر لب مسکرایا)

روشنی اور تاریکی، موت و حیات، دکھ اور سکھ، فراق اور وصال، جنوں اور غم۔ — سسگم تو گواند گھاٹ سے پرے، بہت دور رہ گیا۔ گنگا اور برہم پتر کی لہروں سے بنایا دیا۔ — اس کے پانیوں میں گنگا کون سی ہے اور برہم پتر کون ہے؟

لڑکی کو زرد کی چھینک آئی۔ وہ اس کی طرف ہڑا۔ وہ سول سول کر رہی تھی۔

”تمہیں سردی لگ جائے گی۔ چلو اندر چلیں۔“ نوجوان نے تنکڑے ہو کر کہا۔

”نہیں۔ میں تو یہیں کھڑی رہوں گی۔“ لڑکی نے ضد سے جواب دیا۔ پھر وہ ایک دم کھل کھلا

کرہنسنے لگی۔ پھر فوراً سنجیدہ ہو گئی۔ وہ اسے ہنستا دیکھ کر مسرور ہوا۔ اور خود بھی تہقہ لگا کرہنسنے لگا۔ پھر اس نے آہستہ سے زینک پر کھسے ہوئے لڑکی کے ہاتھ پر اپنا ماتھ رکھ دیا۔

لڑکی نے اپنا ماتھ نہیں ہٹایا۔

ساحل بیتیاں دھندلکے میں ٹٹھا کر گزر چکی تھیں۔ زرائن گنج کی روشنیاں قریب آتی گئیں۔ اسٹیمبر

مصروف بندرگاہ کے اجلے میں داخل ہوا۔ زرائن گنج سامنے جگہ کار تھا۔ زرائن گنج — اس کی گلیوں

کی نہروں پر چلتی کشتیاں، جوث اسٹیشن، گہا گہی، باہر اندھیرے میں چھپی کچی سڑکیں، نیم شکستہ مغل پل،

کھیت، طویل اندھیری شاہراہ جس کے سرے پر ڈھاکر ہمیشہ کی طرح منتظر طے کا شیفٹی، محفوظ، مامون ہر۔

دنیا سترزل ہو چکی تھی، مگر شاید موجود تھی۔ مسرت کا وجود بھی تھا۔ ملنا ممکن تھا۔ آخر دنیا

و ایسے لوگ بھی تو موجود ہوں گے جنہیں چین اور خوشی پیشتر ہے؛ اور مسرت کے حصول میں خود غرضی گناہ ہے۔
 لڑکی نے ہوا سے بچنے کے لئے کھادی سلاک کی دھیری چادر مضبوطی سے اپنے شانوں کے روپٹی لی۔

۲۴

چارلس بارلو، بنگال سویلین

”نفحات ہند از الف حیم“

پیارے بیٹے جم کے لئے۔ انیسویں سالگرہ پر

تمہارا ڈیڈ

میں سگھ، ۱۸۸۶ء

چارلس بارلو نے میر کا مگ تپائی پر رکھ کر سنہری جلد کتاب کا احتیاط سے ورق اٹھا۔ یہ مری کتاب تھی جو خود مصنف نے جو ”الف، حیم“ کے قلمی نام سے ہندوستان کی برطانوی سوسائٹی نیٹولائف کے متعلق سید پر لطف اور طنزیہ نظریں نکھاتا تھا، گریٹ ڈیڈ کو دی تھی۔ یہ اپنے زمانہ کا مقبول ”حیم“ دراصل ”احصار کا کیپٹن یلڈ حیم“ تھا۔ گریٹ ڈیڈ کا جگری دوست، گریٹ ڈیڈ ان دنوں ل میں ڈیڑھ نسل کشن تھے۔ انہوں نے ڈیڈ کو یہ کتاب ان کی سالگرہ پر دی تھی۔ ڈیڈ آکسفورڈ سے بول پر اپنے والدین سے ملے بنگال آئے ہوئے تھے۔ اور بہت جلد خود بھی اپنے والد کی مانند بنگال میں بننے والے تھے۔

ماضی کی وہ اضافی ہستی ————— بنگال سویلین!

چارلس بارلو نے اداس، زیر لب تبسم کے ساتھ پہلی نظم پر نظر ڈالی، اس مجموعے میں وہ سارے

کرنا موجود تھے جو ماضی کے بنگال سولہین کی زندگی کا لازمی جزورہ چسکے تھے۔

پہلی نظم ————— "ریونڈ مک فرسن کا خیال تھا کہ "انڈین ناچ" شیطانی گود کھدھدا ہے۔ ایک مدد راجہ نے ساری بھاؤنی کو ناچ کے لئے مدعو کیا۔ بارغ مقصود سے سما گیا۔ سیم صاحبوں کے لئے خیمے لگے۔ بڑھیا شراہیں، پلاؤ، عطر گلاب، سارا اسٹیشن مدعو تھا۔ "تاشا شانہ بلوٹ اچھا" تھا۔ راجہ جھک جھک کر صاحب لوگ کو سلام کرتا۔ عجیب عجیب زیورہ ناک میں پہنے ناچ گر لڑائیں اور ٹوم ٹوم کی دنگلی تال پر ہتھ کرس۔ سازندوں کے وحشیانہ ساز چنیے۔ ان کے چوہدار عود دہان اور مشعلیں سنھالے پیچھے کھڑے تھے۔ جیت رقاہہ رانا ماما کہہ کر ناچنے لگی۔ ریونڈ مک فرسن کو یہ معلوم نہ تھا کہ رانا ایک دیوتا ہے۔ ورنہ انہیں تعجب نہ ہوتا کہ شیطان کی چلی ایک دیوتا کو پکار رہی ہے۔ ان محاملات سے جواں کے بربچ سے متعلق نہ تھے، ریونڈ مک فرسن لاعلم تھے۔"

آج بھدرا لوگ کی لڑکیاں کلکتہ اور شانتی ٹکیتن کے اسٹیج پر ناچ رہی ہیں۔ بے چارے ان چہیمہ تم مجھے اپنے بلیر ڈرم، جڑٹ، تسمارک اور فرنگو جرمین داسکی باتیں کرنے والے فوجی افسروں، اپ کھڑی، مفصل، بینڈ اسٹنڈر، گزٹ، پامیر، ٹفن اور چھوٹا حاضری کی حکایات سناتے جاؤ۔ کہ اس گشتہ دنیا کے تذکرے سے ہی مجھے تقویت حاصل ہوتی ہے۔

دوسری نظم ————— "چاندنی رات، جب دور سے نیٹوز کے ٹوم ٹوم کی بھیانک آواز سنائی دیتی ہے، بانہد کی کھٹیوں ایسی بھنھناہٹ۔ چوکر اسکارلاؤ۔ میں برآمدے میں آرام کر رہی پر بیٹھا ہوں۔ باہر سرد کے دوختوں کے پیچھے سے چاند نکل رہا ہے۔ چوکر شراب اندیتا ہے۔ اوجہ اندیا! سہانی شاموں کی سوز میں۔ تھوں پر لرزاں تیری چاندنی، تیری واحد دیوانگی نہیں ہے۔"

چارلس بارلو نے پلی کی پلی کو آنکھیں بند کر لیں۔ پھر پیر کا مگ اٹھا کر ایک صفحہ اور پلٹا۔ "میرا چالاک غشی محمدین، ہوزانہ مجھے اُور دو پڑھانے آتا۔ گپتی۔ وہ انگریزی بولتا۔ "نیٹوبات" بہت کم ہوتی۔ سرکنڈے کے قلم خرید کر لاتا اور دو چار آنے چاہتا۔ مجھے کتنی نفرت تھی اس درس و تدریس سے، غشی گپتیں ہانگتا اور میں چپ چاپ بیٹھا جڑٹ پیا کرتا۔ مگر جب میں نے امتحان پاس کیا تو ایسی آوریو ہوئی کہ کوئی سالار جنگ بھی گیا لوے گا۔"

ایک اور نظم ————— "سواجر کر شخا باؤ قومی دو ————— ہند کے اس خطے میں جہاں تیلگو

کی ہوئی طرح جنگل میں سے گھوڑا دوڑاتے نکل جاتے، مندر، ناقوس پھونکتے برہمن، وحشیانہ جنگ و جدل کی یادگار قلعوں کے کھنڈر، گاڑی بانوں کے ہجوم، سیلوں کی گھنٹیاں، ہنگامٹ، کسی نیٹورس کی گاڑی، بکڑا سے، برابر سے گزر جاتے، گھنٹی بجاتا ڈاک کا ہر کارہ چڑے کے تھیلے میں ڈاک لئے پاس سے گزرتا تو معلوم ہو جاتا کہ اسٹیشن قریب آ رہا ہے، صبح کی بندوق دھنکی، منڈی، نیٹو، ہجوم، رنگین پردوں والی پہلی میں سے بھانکتی ناچ گرنے والی صاحب لوگوں کو دیکھ کر بیک وقت بے لگاتیں۔ پھر ایک صاحب اور اس کی بیٹی گھوڑوں پر گزرتے، دور سے آبادی نظر آتی، ندی، مسجد کے مینار، گنجان نیٹو شہر، دھندلا، حسین مناظر اور اسمتھ جو اور ٹیل معاملات میں جذباتی نہ تھا کہتا۔۔۔۔۔ یہ غلیظ نیٹو شہر تم کو حسین نظارہ معلوم ہوتا ہوگا، مجھے تو۔۔۔۔۔

”صاحب۔۔۔۔۔“ عید الغفور نے اندر کر کہا۔ چارلس بارلونی نے کتاب پر سے سر اٹھایا۔ عبدالغفور نے تازہ اخباروں کا پلندہ قریب کی میز پر رکھا، اور واپس چلے گئے۔ چارلس بارلونی نے آگے بڑھنا شروع کیا۔ ”پولس والا ڈاکٹر۔۔۔۔۔ کلکٹر ملک کال، جو نرناں کا مفروضہ پیشین والا سب، قوم کنٹرول اور سشن جج ہرزم دل کلکٹر شاپ سول سرجن جس نے کال کے دنوں میں جب جیل کالرا والوں سے بھرنا تھا دن رات کام کیا۔ اب ڈاکٹر کے بعد ڈاکٹر آگھر رہا ہے۔ ریونیوڈ مائیکل دائن اداس بیٹھے ہیں۔ یہ سب بڑے معقول لوگ ہیں۔ مگر مجھے پولس والے کو سال میں دو دفعہ ان کی دعوت کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ باتیں شروع ہوتی ہیں۔ مونسون آنے والی ہے جانے کب آئے گی۔ دھان کی فصل شاید اس بار بھی فیل ہو جائے، ملک کال کہتا ہے۔ بارش آنے تو چہے کا شکار شروع ہو۔ پھر شکار کے قصے، لیکن کپی ٹیشن والا شکار کے بجائے ذرا انٹلیکچوئل باتیں کرنا چاہتا ہے۔ شیریں اور جگر کے بعد خاموشی، بڑے بڑے چرٹ سلگائے گئے۔ تاش ہوا۔ ڈاکٹر اب خراٹے لے رہا تھا۔ برانڈی پانی کا دور چلا۔ پھر سب ”ڈسٹرکٹ ٹکپ“ سے پور ہو کر اپنے اپنے گھر چلے گئے۔۔۔۔۔“

”اجاڑ بنگلہ۔۔۔۔۔“ سر نکا ٹیم ہیں، کادیری کے کنرے ایک بنگلہ، جس سال ٹیمپو گرا تب سے دیر لپڑا ہے۔ باغ میں درخت آبی بھرتے ہیں۔ سنگور شور مچاتے ہیں۔ اوبو لیتے ہیں۔ دریا کے کنارے قلعہ کی تفصیل ہے جو اولڈ انگلینڈ کی طاقت سے ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ گئی۔ آنے والی لسلوں کے لئے ایک سبق، وہ زمانہ جب ہمارے جری نوجوان شیریں کچھار تک پہنچ گئے تھے، اور اس بنگلہ کے نزدیک وہ معرکہ ہوا تھا۔ محاصرے کے بعد اس

یہ ایک کرنل اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اب بھی تصور میں اس وقت کا نظارہ کر رہا ہوں، رات بنگلہ، بچوں کے قہقہے، صبح کی شہ سواری، جب کرنل اس جگہ سے گزرتے ہوئے اس بھاٹک کو ہونگا۔ جہاں ٹیپو گرہ تھا۔ شہ سواری کے بعد درختوں کے نیچے بریک فاسٹ، جس کی ٹیٹوں کے پیچھے دن گزارنے لگن اور گرینڈ پیالونی آواز اور پھر ایک شام کالرائے دروازہ کھٹ کھٹایا اور ماں اور بیٹیاں اس فقہ جلی گئیں۔ دل گرفتہ کرنل نے اس بنگلہ کو خیر باد کہا۔ اب ان کروں میں کافی جمی ہے۔ اسی برس سے وہ سنسان ہیں۔ پیالونو و قالین اور مسہرین کے پرے گل چکے۔ کاویری کے کنارے —! جہاں رہتا تھا۔

اور آگے —۔ آج کا اہم سوال —۔

”کیا روس کا اولڈ پیٹریم کو جرپ کرنا چاہتا ہے؟ کمزور خیوا فتح کر کے اتنا اڑ گیا۔ اولڈ پیٹریم سمجھتا ہے کہ ہمارا سکھ فوجی جبر پر ہم سے شک جوئی کرے گا، کیا اس نے ہند کے حقائق سے کوئی نہیں لیا؟ کیا اولڈ پیٹریم سمجھتا ہے ہمارے راجگان اس سے جا ملیں گے؟ آنے دو —۔ ذرا تان سے گزر کر آنے دو۔ ہمارے سکھ کی تلوار خیوا کی تلوار سے زیادہ مضبوط ہے۔ ہم جو روس سے رہیں، پھر اسے سست دیں گے۔ جس قوم پر حکومت کرنا خدائے ہمیں سونپا ہم اس خدائی آما تھ بددیانتی کرتے تو ہمیں ڈر تھا، اگر ہم اس ملک پر روس کی مانند کودے سے حکومت کرتے، اگر اس ہم نے روندنا ہوتا، اس نے آبادی سے محبت نہ کی ہوتی۔ سیاہ و سفید میں عدل نہ قائم کیا۔ یہ قحط فوں میں اپنی محبت نہ بولی ہوتی۔ تب ہم دشمن سے ڈرتے، چالاک روس! اس سے قبل کو تم ہمارے ن کو تاکو خود اپنے ایشیائی قبائل کی حالت سدھارو۔ ان کو محسوس کرنے دو کہ ان پر حکومت کی جا، ظلم نہیں۔ اپنے اہل خیوا اور اہل بخارا پر ثابت کر دو کہ تم خطہ فتوح ہونے کے ساتھ ساتھ انصاف پسند، وسط ایشیا کے ایسے نئے آقا بنو جو ماضی کے وحشی قبائل ایشیائی سرداروں سے مختلف ہو۔ جو ان کو سکھائے۔ اگر ہماری اور تمہاری فتوحات کا مقصد یہی ہو تو ہم مشرق میں تمہارے دوست ہیں۔ رتی کے نقیب، دونوں خواہیدہ اقوام کو جگانے والے، لیکن اگر تمہارا مقصد کچھ اور ہے تو یاد رکھو، ہاتھ میں شمشیر ہے۔ ہمیں خداوند تعالیٰ پر بھروسہ ہے۔ جو بہادرروں اور منصفوں کے ساتھ ہم پر ہر فرد و عقاب کو مٹی میں ملا سکتا ہے۔“

ایک اور نظم ————— ”انگلینڈ ہو۔! بمبئی کی بندرگاہ پر سورج چمک رہا ہے۔ گیلے
 ٹرپر گھر میاں پر میری رحمت واپس جا رہی ہے۔ گیاہ برس بعد ہم چھ سو آئے تھے، تین سو واپس جو
 رہے ہیں۔ باقی وباؤں نے کھالے۔ مشرق پر حکومت کی قیمت ہم بیماری اور موت کے ذریعے ادا کرتے ہیں۔
 ہندوستان نیلا ہٹ میں ڈوب رہا ہے، جہاں میرے تین سو دوستوں کی قبریں ہیں۔ میں اپنا ٹوپ ہٹاتا ہوں
 ہم گھر جا رہے ہیں، ہم ہند کو بھول جائیں گے، خدا حافظ دوستو، وباؤں نے تمہیں بھالیا۔ انگلستان
 خاطر تم نے اپنی جانیں دیں۔ الوداع۔ سورج کے دیس، ہماری جلا وطنی ختم ہوئی۔ —————

اگلی نظم ————— ”اوٹی میں شیلے ہوئے کونسل کا ممبر پیٹر اسٹریٹ جان مک ڈوسے کہتا
 — پیٹر ہم کو خدانے یہ ملک اس لئے دیا تھا کہ ہم اسے تمدن بنائیں، اور جب ہمارا یہ ارفع مشن ختم ہو جا
 تو واپس چلے جائیں۔ لیکن ہم کر کیا رہے ہیں؟ ہم ٹیڈز کو کالچ جانے کے لئے کہتے ہیں، اور پھر ان کو ایسی نو
 دیتے ہیں، جو کہ لئے تعلیم کی ضرورت نہیں۔ ہم انہیں شراب نوشی کو منس کرتے ہیں، مگر انہوں کی کاشت کو
 ہیں۔ ہم کہتے ہیں تم بگڑ لوگ اپنی عورتوں کو آزادی دو، اور وہ پوچھتے ہیں کیوں؟ اور طنز سے ہماری خود
 کی آزادی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ پیٹر اسٹریٹ جب ہم اپنی ٹریکوں کو ایسا نڈر منٹو جیٹلین سے شاد
 کرنے کی اجازت دیں، جب با اثر بابوؤں کو معقول عہدے دیں، کونسل والوں کی تنخواہیں کم کر دیں
 تب ہی اس ذمہ داری کو نبھاسکیں گے، جو خدانے ہمارے کندھوں پر ڈال دیا ہے۔ —————

”تب پیٹر اسٹریٹ نے کہا: تمہارا یہ پروگرام ممکن ہے بہت خوشگوار ہو، مگر مجھے تو سہ
 بکواس معلوم ہوتی ہے تمہا پر نے فرمایا۔ آپ فرماتے ہیں ہم کچھ عرصے کے لئے اس ملک کے این ہیں۔
 جناب مائی حقیقت یہ ہے کہ جب تک ممکن ہو گا ہم اس کو اپنے قبضے میں رکھیں گے۔ —————
 ”ہمیشہ آگے جاؤ۔ —————

”ہمیشہ ڈمٹی فرمٹی چندر عاقل برہمن زمانے کی ترقی سے نالاں اور متحیر تھا۔ کیا ویدوں اور شاستر
 میں پہلے سے سارا علم موجود نہیں؟ مصلحین ماضی سے متفکر ہیں۔ اور ذات پات کے بندھن توڑنا چاہتے
 فرنگی استادوں اور ان کی ایجوکیشن گرانٹس پر لعنت! انھیں کیا معلوم ہندو کی ضروریات کیا ہیں؟ ان پر
 سماجیوں پر لعنت جو کہتے ہیں خدا کا میدان بہت وسیع ہے کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں۔ یہی سب لو
 کالج میں پڑھتے ہیں۔ ————— یہی بات کیشپ چندر سین کہتا ہے۔ —————

”بابو نیل نیل بندر بھی ایک برہمن تھا۔ مگر ترقی کا جو شیوا حامی۔ وہ اور چند رشام کو دروازہ میں حقہ پیتے اور باتیں کرتے۔ بازار کا بھاؤ، چاول کی قیمت اور کبھی کبھی زیادہ سنجیدہ موضوع، ذات دھرم وغیرہ اور اپنے متضاد خیالات پر بحث کرتے کرتے جھگڑنے لگتے۔ ایک روز بندر نے کہا۔ ایک دھوا سے بیاہ کرنے والا ہوں۔“

”کھاس تو نہیں کھل گئے ہو؟ حقہ پانی بند کر دیا جائے گا۔“ چندر نے کہا۔

”زمانہ بدل چکا ہے، اب تہذیب ہمیں نئے راستے دکھا رہی ہے۔ تمہیں معلوم نہیں ہندوستان کا نعرہ ہے۔۔۔ ہمیشہ آگے جاؤ۔ بندر بولا۔

”بکواس۔“ چندر نے چار جھنجھال کر کہا۔ برہمن ہو تم؟ غدار؟ دھوا سے بیاہ؟ لعنت ہو! اگر اس نے بندر کی چپٹ پر ٹھکرو لگائی تو وہ نیچے ہتی گندری نالی میں جاگری۔ بندر نے چندر۔ دلوچ لی۔ دونوں چیخنے چلاتے ایک دوسرے کو زد و کوب کرنے لگے حتیٰ کہ ایک انگریز فوجی نے ان کو چھڑایا اور چوکی لے گیا۔ اور ان کے احتجاج پر محض اتنا کہا ”آگے جاؤ۔“

چارلس بارلو میا ختم نہیں پڑا۔ یہ بنگالی کی سچی تصویر تھی، لیکن ”سر علی بابا“ نے بابو کے متعلق جو دنی کی تھی وہ بھی آج لفظ لفظ صحیح ثابت ہو رہی تھی۔ بابو مغربی علوم اور مغربی خیالات سے مر کے اب دولتی جھاڑ رہا تھا۔ چارلس بارلو نے کاہلی سے سراٹھا کر الماریوں پر نظر ڈالی لیکن اسے ”سر علی بابا کا سفر نامہ“ میں گزریں ڈیڈ نے نواب انوار الزماں کو تحفہ دیدیا تھا۔

گریڈ ڈیڈ، ڈیڈ۔ مادو نوں چچا سڈنی اور کرسٹوفر۔ پھر گریڈ آئنٹ میس۔ آئنٹ ماڈ آئنٹ۔ آئنٹ میسڈا۔ خالص وکٹورین نام۔ بھولی بر خود غلط وکٹورین ہمنیاں۔ پورا بارلو اسڈی کے آتش دان اور دیواروں پر اپنی اپنی تصویروں کے بیش قیمت چوکھٹوں کے اندر محفوظ وجود تھا۔

جبکہ باہر دور دور پر پھٹ رہے تھے۔

گریڈ ڈیڈ اور ڈیڈ سلطنت کی اس تباہی پر اپنی اپنی قبروں میں کروٹیں بدل رہے ہوں گے۔ رکھنا کے انگریزی قبرستان، بارش میں بھیسکتے کتبے، قبروں کے کتبے، سارا ہندوستان انگریزوں پر عین قبرستان ہے اپنی جانیں دے کر ہم نے اس ملک کو سنوارا۔

گرینڈ ڈیڈ سی بری سے ٹریننگ لے کر اٹلیہ آئے تھے۔ انہوں نے ایڈمنسٹریشن میں ان سے ٹریننگ لی تھی، جن کی اپنی جوانی میں محمد رضا خاں اور شتاب رائے زندہ تھے۔ کلاویو، ہسٹنگز، کارٹوالس، ولیم ہنٹنگ، میکالے —————

کس جانفشانی اور محنت اور محبت سے گرینڈ ڈیڈ اور ان سے پہلے اور بعد کی پڑھو
 سویٹزر نے اس ملک کی حکومت کو دنیا کی بہترین حکومت بنایا۔ چلتی دھوپ، لوہے، بارشوں، سیلابوں
 کی پرول کے بغیر سینکڑوں میل کے فاصلے گھوڑوں، پالیکوں اور کشتیوں کے ذریعہ طے کر کے یہ عظیم
 آراہنی کا بندوبست کرتے، مقدمے فیصل کرتے، درختوں کے نیچے بیٹھ کر کسانوں کی فریادیں سننے
 ان کو مانی باپ کہتے، کمپنی کے اولین دور میں بے رنگ کرپشن تھا۔ مگر اس کے فوراً بعد ————— اور اگر
 اس ملک کی پرانی روایت نہیں تھی؟ نذرانہ اور رشوت؟ اب پہلی بار اہل ہند کو احساس ہوا ہے کہ
 اور صوبائی حکومت قتل و غارت، لوٹ مار اور زبردستی کا نام نہیں، بلکہ یہ رعایا کی بھلائی اور
 کے لئے قائم ہے، مغلوں کا ایڈمنسٹریشن ————— اور کسفر میں وہ مسعود علی سے بحث کیا کرتا
 اشوک، شیر شاہ، اکبر ————— ٹھیک ہے۔ مگر ان کے بعد؟ اور یہ لوگ بھی قانون کے تقہ
 نا آشنا تھے۔ سارا مشرق قانون کے تصور سے نا آشنا ہے۔

سلطنتِ روم کی وارث سیمچی یورپین تہذیب کے بہترین نمائندے برطانیہ نے پہلی بار
 ہند کو قانون عطا کیا۔

اولیڈ کارٹوالس نے تھانوں اور پولیس چوکیوں کا جال بچھا دیا۔ کلیولینڈ نے آدمی باہر
 کو انسان بنایا۔ اٹھارویں صدی میں جیسور کا ایک کلکٹر نیکل اس قدر شفیق تھا کہ عوام نے اس کی
 بنا کر اس کی پوجا کی۔ نکلسن کو پنجاب کے کسان پیار سے نیکل سائیں کہتے تھے۔ جو بھٹن ڈنگن
 میں دختر کشی کے خلاف ہم شروع کی۔ جیمز گرانٹ نے دن رات کی انتھاک محنت کے بعد ایک دیا
 اور انصاف پسند ایڈمنسٹریشن قائم کیا۔ یہ دو تھو سال کی قربانیاں، عرق ریزیاں، جانفشانیاں
 رائیگاں جائیں گی —————؟ اس عظیم کارنامے ”برطانوی ہند“ کو ہم لاقانونیت اور جذبات
 حوالے کر دیں گے؟ کورٹ انڈیا رائٹڈ —————!

انٹیا ہے کہاں؟ نہرو کے شاعرانہ تخیل میں۔ انڈیا کو ایک بار اشوک نے متحد کیا۔!

(کوشش کی مگر فیمل ہو گیا) اور اب واقعی اُسے ہم نے متحد کیا ہے۔ پنجاب میں مقیم بیڈی وٹسن نے بے نصف صدی قبل بالکل صحیح لکھا تھا کہ یہ ملک لکڑیوں کا ایک گٹھا ہے۔ ہر لکڑی چاہتی ہے ری کو توڑے۔ ان سب کا بیرونی اتحاد محض برطانوی پرچم کے ذریعے قائم ہے۔

گرینڈ ڈیڈ اپنی اس تصویر میں جو شملہ کے ایک مشہور فوٹو گرافر نے ۱۸۸۱ء میں کھینچی تھی قلم ہاتھ کچھ لکھ رہے ہیں۔ یہ تصویر آتشدان پر رکھی ہے۔ گرینڈ ڈیڈ — ایڈورڈ بارلو، برطانوی کی اس شاندار وایت کی ایک مثال تھے جنھوں نے اپنی شدید مصروف زندگی کے باوجود اس بے باکے میں نہراہ محققانہ اور عالمانہ کتابیں لکھیں۔ یہ ہندوستانی جو آج کل "انڈین کلچر" کا نعرہ دے ہیں۔ ان کی یہ "انڈین کلچر" ان ہی بیچارے وکٹورین بدھتوں نے دریافت کر کے دنیا کے سامنے رکھی۔ آج ہم ان وکٹورین بدھتوں کو بددماغ، بر خورد غلط، سمجھتے ہیں۔ اور غالباً وہ ایسے تھے لیا قدیم رومن باقی دنیا کو وحشی نہیں سمجھتے تھے؟ انیسویں صدی کے برطانیہ کا ایک فرد ہونا توڑا ہی رہا ہو گا۔ برٹش امپائر —! پوری انسانی تاریخ میں اس سے زیادہ منظم انسانیت سلطنت پہلے کہیں قائم نہ ہوئی تھی! چنانچہ یہ بدھے۔ گرینڈ ڈیڈ اور ڈیڈ اور ان کے ساتھی غ اور ذرا خبطی سے تھے۔ مگر کیا دولت اور طاقت کے بل بوتے پر امریکہ بددماغ اور بر خود بن ہو گیا؟ اور مزید ہوتا جائے گا — جب کہ اس کے پاس تہذیب بھی نہیں ہے؟ امریکہ — — — — — ڈائلٹ — — — ڈائلٹ اس وقت کیا کر رہی ہو گی۔ تمہاری صحت — — — چارلس بارلو نے مگ اٹھا کر چند گھونٹ بھرے۔ پھر ایڈورڈ بارلو کی تصویر — — —

گرینڈ ڈیڈ، پر کا قلم ہاتھ میں لے، سیاہ روشنی ڈورے والی عینک لگائے شمت کی سے کیا لکھ رہے ہو — ؟

گرینڈ ڈیڈ نے بنگال کے کتنے اضلاع کے امپیریل گزٹریٹرز پر کام کیا تھا۔ شام کو تھکے ہائے سے لوٹ کر پھونس کے چھپروالے کسی بنگلے کے برآمدے میں بیٹھ کر، لمب کی روشنی میں تم یہ سب تے ہو گے۔ چو کر ا۔ سگار لاؤ۔ چاند نکلتا ہو گا۔ مجھ بھناتے ہوں گے۔ تم تنہا بنگلے میں بیٹھے گزٹریٹ کی جلدوں میں ایک جلد ایک باب کا اضافہ کرنے میں جڑے رہتے ہو گے۔ اور "آسام کے

ناگابائل "گرینڈ ڈیڈ کی مشہور کتاب تھی۔

برابری تصویریں گرینڈا بھی ہیں۔ اونچا سا جوڑا باندھے۔ درشت چہرہ۔ سیاہ گہندوستان میں برطانوی سوسائٹی کی ایک فراموش شدہ ستون۔ ان کے برابر ہی گریٹ آئنٹ کی تصویر رکھی ہے۔ (جوڑھا و فادر عبدالغفور جو تلم کینٹ ویل سے ترکے میں ملا ہے، کس اعتبار خیال سے وہاں ان ساری تصویروں کی جھاڑ پونچھ کرتا ہے) گریٹ آئنٹ میبل جو گرینڈ ڈیڈ کے تھیں۔ انہوں نے ساری زندگی چرب آف انگلینڈ کی "زنائہ مشنری سوسائٹی" کا کام کرنے میں کردی جو ڈیڈ بتاتے تھے۔ ایک روز گواندو گھاٹ سے تن تنہا اسٹیمر پر بیٹھیں اور دروازہ مغربی صوبائے کے ایک دروازہ ضلع میں مشن قائم کرنے کے لئے یسوع کا نام لے کر چل پڑ گواندو سے موٹھیر۔ پتہ۔ بکسر۔ غازی پور۔ بنارس۔ (ہر نام کا اپنا رومان تھا) بنارس خرفناک صنم کدے سے وہ اودھ کے شہر سیتاپور پہنچیں۔ وہاں مشن کیا ونڈ میں اسکول اور رہینہ قائم کیا۔ اور بیجاری جوانی کے عالم ہی میں وہاں بیٹھے کا شکار ہو گئیں۔ آج کی یہ تعلیم یافتہ قوم پڑ ہندوستانی لڑکیاں آئنٹ میبل جیسی بہادر عورتوں کی مشکر گزار ہیں جنہوں نے تعلیم کی روشنی تک پہنچائی۔

کوئٹہ انڈیا! بلای فوئز۔

اب چارلس بارلو کا سر بھاری سا ہوتا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ تندر میں مجھ پر ماضی کی یاد کے دور سے نیا دہ چڑنے لگے ہیں۔ اور یہ اچھی بات نہیں۔

ڈیڈ کا آئل پورٹریٹ۔ جو لندن کے کسی دوسرے درجے کے مصور نے ۱۹۰۱ء میں بنایا تھا۔ تھوڑے سے ڈینڈی تھے۔ ایلن ٹیری اور واسکرو ایڈلڈ اور آبری بیرڈز لے کے دور کے فیشن اسٹیل نو جو جب فرو پر لندن جاتے تو اپنا سارا وقت فقیڑ اور ادبیر اور سیلے میں گزارتے "NINETIES" کے ہنگاموں کے رسیا۔ واپس آتے اور ہنگال اور اڑلیہ کے غیر دلچسپ پس ماندہ اضلاع میں اپنے فراتفر میں جٹ جاتے مگر اپنے لندن کے انٹلیکچوئیل دوستوں سے خط و کتابت جاری رکھتے۔ کتنے برطانوی

صحافیوں اور شاعروں سے ان کے ذاتی مراسم تھے۔ ڈیڈ کو علم نباتات کا شوق تھا۔ انہوں نے بھی گر ڈیڈ کی مانند ہندوستان کے حلقے بکھنے پڑھنے کا شغل جاری رکھا۔ آسام کے اور کٹڑ کی ان گنت افق

بنائیں اور بنگال اٹلیہ اور آسام کے پودوں اور پھولوں اور درختوں پر ایک مستند ضخیم کتاب
الی۔

ڈیڈ کتاب لکھتے تھے اور ماحضوں نے اپنی شادی سے قبل کچھ عرصہ تک پیرس میں مصوری سیکھی
، ان پھولوں اور پتوں کے انتہائی سبک اور نفیس اسکچ بناتیں۔
ما کی تصویر۔ صوفے پر بیٹھی ہیں۔ ڈیڈ کچھ کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ اس تصویر میں ڈیڈ کی کرزن
کی موچھیں ہیں، مہاپیرس کے تازہ ترین فیشن کے گاؤں میں ملبوس ہیں۔
یہ لوگ سب مر گئے۔

گرینڈ ڈیڈ نے اپنے ہندو بنگالی منشی سے فارسی پڑھی تھی، اور سبک جانتے تھے۔ ڈیڈ بھی
سے واقف تھے۔ ریشاٹر ہونے کے بعد ان کا ارادہ تھا کہ وہ اپنا زیادہ وقت لندن میں انٹیا آفس لائبرری
مرتب کریں گے۔ مگر لندن جانے سے پہلے ہی وہ سندھ بن میں شیر کاٹ مار بن گئے۔
ان سے گاؤں والوں نے درخواست کی تھی کہ اس آدم غور شیر سے بچائیں جو بہت سارے لکڑاڑ
ار کر چکا تھا۔ ڈیڈ بے غوفی سے بندوق سنبھال کر اسے مارنے کے لئے اندھیرے جنگل میں گھسے اور زندہ لپکا
۷۔

انہوں نے اپنی قیمتی جان دی تاکہ یہ نیم وحشی لکڑاڑ سے زندہ رہیں۔
گرینڈ ڈیڈ کا انتقال ۱۸۹۷ء میں ہوا۔ جب بنگال میں قتل و غارت شروع ہو چکا تھا۔ انہوں نے
لمبی عمر پائی۔ نوجوان وکٹوریہ کی تخت نشینی بکینی کی ملازمت۔ غدر، وکٹوریہ کی موت اور آخری میں خودی
سب ہی کچھ دیکھ لیا۔ ان کو پنشن لیتے کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ وہ ریشاٹر ہونے کے بعد وطن واپس نہیں لوٹے،
دارجلنگ اور کلکتے میں بید خود بصورت کوٹھیاں بنوائی تھیں اور اپنا وقت علمی مصروفیات میں صرف کرتے
کلکتہ یونیورسٹی کی سینیٹ۔ رائس لائشیاٹک سوسائٹی۔ یہ اور وہ۔ چند برہمنوں کے بھی ان کے دوست
کو یہ واقعہ ہے کہ وہ نیٹوز سے برابری کی سطح پر کھیلنے لگے، اور حاکم و محکوم کی شعوری دیوار قائم رکھی۔
نر کی سلامتی اسی میں مضمر تھی۔

گرینڈ ڈیڈ کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ وکٹوریہ دستور کے مطابق بہت بڑا کنہ تھا۔ مگر صرف یہ سنا
دوستان کے طیر یا اور دوسری بیاریوں سے زندہ بچے تھے اور دستور کے مطابق (تاکہ ہندوستانیوں کی بری

خصائیں، سیکھیں، چھ چھ سال کی عمر میں انھیں تعلیم و تربیت کے لئے انگلستان بھیج دیا گیا۔ بڑے ہو کر کے سب سے بڑے بھائی فوجی افسرین کر ہندوستان آئے، لیکن کابل کے ماسچ میں کھیت رہے۔ پھلے نے لٹکائیں چائے کی کاشت شروع کی اور وہاں کے معمول پلانٹریے۔ ڈیڈ جوان دونوں سے زیادہ ذیہ اندین سول سروس کے مقابلے میں آگئے اور اس کے بعد ابجدی ماکو بیاہ کر ہندوستان لوٹے۔

آنٹ ماڈ کی تصویر۔ روکھی پھکی شخصیت، سفید کاؤن، ہاتھ میں بائبل۔

آنٹ جیرڈین کی تصویر۔ خوش شکل، شہسٹم، شرآ نکھیں، فیشن ایس گاکوئی، گلے میں موتیوں کا گلا میں کتاب ہاتھ میں پنکھا۔

آنٹ میٹلڈا کی تصویر۔ شہسٹم بھولی صورت، یہ تینوں تصویریں ایک ایک ایک شلف پر رکھ دی گئیں۔ تینوں وکٹورین خواتین ڈیڈ کی بہنیں تھیں۔ تینوں اڑسیہ کے مختلف اضلاع میں پیدا ہوئیں۔ آنٹ ماڈ سب بڑی شادی نہیں کی۔ یہ بھی بھوپھی سبیل بارلو کی مانند اسی مشرق کی رو میں پانے میں جٹی رہیں گریٹ آنٹ میٹلڈا اس سلسلے میں صرف گواندو گھاٹ سے سیتا پور تک کا سفر کیا تھا۔ آنٹ ماڈ نے جینیوں کی روحانی نوجو کی خاطر گن بوٹ سیاست اور مشرقی ایشیا کی کونوئل جنگوں کے پرخطر زمانے میں تنہا کیشی تک کا سفر کیا۔ برہماں میں اور اس کے خلاف فسادات کے زمانے میں جب باغیوں نے ان کے مشن پکھاؤنڈ پر حملہ کیا۔ وہ چند برطانوی بلجین اور امریکن مشنری خواتین سمیت جینزس کی خاطر شہید ہوئیں۔ سرزمین چین میں ان کی قبر بنی۔

آنٹ جیرڈین۔ خوب صورت اور طرٹ۔ لندن میں ایک ہیر سٹر سے شادی کر لی۔ آنٹ میٹلڈا بھی خوب صورت اور پیاری سی تھیں۔ ڈیڈ کی پسندیدہ بہن۔ دارجلنگ میں ایک فوجی افسر (بنگال لائے ان پر عاشق ہوا۔ مگر سنگی کے بعد ان کو فساد کے کر بھاگ گیا۔ دل شکستہ آنٹ میٹلڈا بھی مذہب کی طرف راغ ہوئیں۔ گارولہز میں نیا مشن کھولا، گریٹ ڈیڈ کو ناگابائی سے بہت محبت تھی، انہوں نے آنٹ میٹلڈا کی ہم افزائی کی۔ آنٹ میٹلڈا اب بوڑھی ہو چکی ہیں اور لندن میں آبائی مکان میں رہتی ہیں۔

ڈیڈ اور ماکے ہاں تین بچے زندہ رہے۔ ایلس۔ چارلس اور رچرڈ۔ وہ تینوں بھی بچپن میں ہی جمع دیئے گئے۔

ایلس بارلو عجیب بات ہے۔ وکٹورین انگلستان مذہبی نہیں تھا۔ انگریز زیادہ مذہب پر کبھی نہیں رہا۔ مگر مشرق میں اگر سب پر مذہب کا جوش سوار ہو جاتا تھا تاں ابابا ہاں کے عجیب و غریب لیکن د

اہب سے غیر شعوری مدافعت۔ ایس کو مشنری بننے کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ ایس جدید زمانے کی لڑکی تھی۔ کوئی درمیشہ اختیار کر سکتی تھی۔ اسے گریٹ آئنٹ میں اور آئنٹ ماڈ اور آئنٹ میٹلڈا کی روایات سے متاثر ہونے کی ضرورت یا تھی؟ یہ میری سمجھ میں کبھی نہ آیا۔ غریب ایس شادی کر سکتی تھی۔ بہت ہی معمولی شکل تھی پھر کبھی یقیناً اس کی شکل دسکتی تھی۔ وہ کچھلے میں برس سے گارو کی پہاڑیوں میں، آئنٹ میٹلڈا کا ٹائم کیا ہوا مشن چلا رہی ہے۔ ناگاہاً ہل

اس کی ساری کائنات ہیں۔

مشنری عورتوں کو اس ایثار اور قربانی کا صلہ کیا ملتا ہے؟ افریقہ کے جنگل، ایشیا کے جنگل، صائب، پریشانیوں اور آخر میں تنہائی اور بڑھاپا۔ یا کسی وحشی کے ہاتھوں موت — کیوں؟ ایسا یہ لگ کیوں کرتی ہیں؟ کیا ان کو واقعی یقین ہے کہ آسمانی بادشاہت ملے گی؟

باروخ وائٹن کا تہہ ہر حال سینٹ پیٹر استقبال کرتے کرتے بولا جائیں گے۔ سیل۔ ماڈ۔ میٹلڈا۔ ایس۔ چارلس بارلو کرے کا چکر لگا کر پھر اپنی آرام کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ اتنی دیر سے اپنے خاندانی تصاویر مطالعہ کر رہا تھا، مگر ایک گردپ فوٹو جو اس کے ساگوں کے ڈیسک پر رکھا تھا۔ اس کی طرف سے اس نظر پڑا۔ وہ تینوں اسے زور زور سے پکار رہے تھے۔ اس کی بیوی ڈائلٹ۔ اس کے بچے ٹام۔ بریکر۔ وہ تینوں اس وقت ڈھاکے سے ہزاروں میل دور جنگ کے مہیب شعلوں میں گھرے انگلستان موجود تھے۔

بوڑھی اور بہادر آئنٹ میٹلڈا ابھی جو ۱۹۴۰ء کی بلٹزر کے زمانے میں اطمینان سے اپنے پلنگ پر سویا

تی تھیں (وائٹ نے لکھا تھا)

آبائی مکان کی تصویر۔ ۱۴۔ اینڈریوز کرلیفٹ — (یہ تصویر بہت چھوٹی سی ہے اور تمام نے پنے بی براڈنی سے کھینچ کر اسے بھیجی تھی۔ آئنٹ میٹلڈا پورچ کی بیڑھیوں پر بتی گودیں لے کھڑی ہیں کیوں

ریب ہی کتے سے کھیں رہی ہے (وائٹ تصویر میں نہیں ہے) یہ تصویر لکھنے کی میز پر بلاٹنگ پیڈ کے کونے

مارسی ہوئی دو سال سے اسی طرح رکھی ہے، اس دو سال میں لندن پر کیا قیامت گذر گئی۔

آبائی مکان۔ ریجنسی طرز کا یہ مکان گریٹ ڈیڈ کے والد نے جو سٹی میں سولسٹر تھے ۱۸۱۳ء میں خریدا

ما

مکانوں کی زندگی۔ انسانوں کی زندگی۔

اب میں پھر ماضی کی طرف واپس لوٹتا ہوں۔ چارلس بارلو نے لباس اس بھر کر "نجاتِ ہند" دوبارہ اٹھالی۔ کتاب کے پہلے ورقوں میں سے جو پرانی جھک آ رہی تھی وہ اسے بہت اطمینان بخش معلوم ہوئی۔ ماضی محفوظ ہے۔

یوروپین اور امریکن ہمیشہ متعجب رہتے ہیں کہ انگریز اتنا غیر جذباتی ہوتے ہوئے بھی اتنا ماضی پرست کیوں ہے۔ ان لوگوں کو کیا معلوم کہ ہم لوگ کتنے جذباتی ہیں اور دوسری بات یہ — اس نے ہاتھ سے لگ میں بیرانڈیٹی — کہ ہمارا ایسا ماضی اور کسی قوم کا ہے ہی نہیں۔ لا جواب، بے مثال، درخشاں۔ ایسا درخشاں بھی نہیں۔ ذرا ہندوستانیوں سے پوچھو۔

دہات دی ہل۔

اب مابے طرح یاد آ رہی ہیں۔ ان کے بنائے ہوئے دائرہ کار ڈرائیونگ روم میں سجے ہیں۔ بنگال کے وہ مناظر — سنہری پاٹ سے لدی ہوئی کشتی، ددر دھندلے میں مسجد کا مینار اور برگد تلے کھڑا کالا بھینگا کسان سامنے الماری میں سما کے دائرہ کار کا اہم رکھتا ہے اور اس کی بک — دارجلنگ کے چیتھڑوں میں بلوس پہناؤ بجے۔ اور کڈ کا ایک گچھا۔ فرن کے پتے۔ کرشن چوڑا کی شاخ۔ اپنے وفادار ٹیٹو طائر مول کے اس کیچ۔ اپنے تینوں بچوں کی تصویریں۔ ایٹس عمر پندرہ سال، چابی عمر گیارہ سال، ڈک عمر دو سال۔

ڈک — ونگ کمانڈر چرچہ بارلو — ڈیشنگ۔ لٹاش خوب صورت سنہری آر۔ اے، ایف موبکس۔ یونیفارم پر تنگوں کی قطار۔ یہ ایک اور تصویر ہے جو سامنے میز پر رکھی ہے۔ جسے میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ ونگ کمانڈر چرچہ بارلو — سپرائے بنگال سوپٹین ایڈورڈ بارلو مرحوم کا چوٹا۔ حیمز بارلو مرحوم کا چوٹا بیٹا۔ مسٹر چارلس بارلو، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مرشد آباد کا چھوٹا بھائی۔ عمر اٹھائیس سال۔ جرمنی پر بمبار طیاروں کی قیادت کرنے کے لئے گیا اور زندہ واپس نہ آیا۔ پچھلے سال اسٹیشن میں شائع ہوا تھا۔

ماضی کی طرف لوٹو چاہی۔ ماضی محفوظ ہے۔ پرامن۔ پرسکون۔ چارلس بارلو سر ملہا کر تلخی سے ہنس پڑا۔ سامنے کے بک شیلف میں کچھلی جنگوں کے متعلق سنہری جلد کتابیں ایک قطار میں رکھی تھیں — فرسٹ اینگلو فرینچ ڈائریکٹری، کرناٹک وار، پلاسی، فتح معلی ٹیم، کبیر، فرسٹ میسور وار، رد سیردار، فرسٹ اینگلو مرہٹہ وار، سکنڈ میسور وار، تھرڈ میسور وار، فرسٹ افغان وار، فرسٹ اینگلو سکھ وار، سکنڈ

اینگلو سکھ وار، سکندرائیگلو بریزوار، سنہقال بغاوت، سپاہی میوٹی، موکر انبالہ، بھوٹان وار، سکندرائیگلو افغان وار، تھرڈ اینگلو بریزوار، منی پور بغاوت، سرحدی بغاوت —
 یہ تو صرف پچھلے دو سو سال میں برطانیہ کی مشرقی فتوحات تھیں۔ ہزاروں لاکھوں کرسٹوفر اور رچرڈ بارلوان معرکوں میں کھیت رہے۔ یورپ کی جنگوں میں کتنے رچرڈ —
 ”عبد الغفور“ چارلس نے دفعۃً گرج کر آواز دی۔

عبد الغفور چند سکندڑ میں نمودار ہوئے۔

”گوسل کا پانی لگاؤ“

”جی صاحب۔“ عبد الغفور غائب ہو گئے۔

بہت خون بہایا میرے آباء نے۔ چارلس نے چیرے پر ہاتھ پھیرا۔ پرانے رومنوں کی مانند، مگر پرانے رومنوں کی مانند انہوں نے علم و فن کو بھی مالا مال کر دیا۔
 مارتس اور متروا کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوئے۔

اس نے کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ پرانی کتابیں اور پرانی تصویریں، یادوں کا قبرستان۔

اڑتیس سال میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ کیونکہ میری عمر اڑتیس سال نہیں ہے۔ میرے عقیدے کی عمر اڑتیس سو بیالیس سال ہے۔ ذہنی اعتبار سے ڈھائی ہزار سال، تاریخی اعتبار سے ڈیڑھ ہزار سال اور نسلی یا دشت کی عمر کتنے ہزار سال — ہر سوچنے والے یورپین انسان کی یہ سب عمریں ہیں، ہر ہندوستانی کی عمر کتنی ہے؟ غالباً لامحدود۔

پھر ہم اپنے نام رکھتے ہیں۔ ایڈورڈ، جیمز، چارلس، ٹامس، خاندانی نام بارلو۔ جو ہمیں ایک پرانے دھند لکے سے جا ملتا ہے اور جس کی وجہ سے ہمیں مستقبل میں بھی اپنے پاؤں جمائے رہنے کی خوشگوار امید ہے۔
 یہودیوں اور عربوں کا دستور ہے — فلاں ابن فلاں ابن فلاں۔ کیا خود پسندی ہے۔

سچے گیانی میں اتنی خودی بھی نہیں کہ وہ اپنا نام تک مکھے۔ کس اپنشد میں ہے؟

ڈیڈ بتاتے تھے کہ موتیرولمیز نے کسی گاؤں کے برہمنوں سے دستخط کرنے کے لئے کہا، انہوں نے جواب میں صرف نمٹھکوتے اور ادم لکھ دیا —

”صاحب پانی تیار ہے۔“ عبد الغفور نے اطلاع دی اور غائب ہو گئے۔

چارلس سر جھکائے بیٹھا رہا۔

آخر میں سب مر جاتے ہیں۔

ڈیڈ کو ہندوستان کے متعلق انگریزوں کی لکھی ہوئی کتابوں کے پہلے ایڈیشن جمع کرنے کا شوق تھا۔ ان الماریوں میں وہ ساری کتابیں موجود ہیں۔ گریٹر ڈیڈ اور ڈیڈ کا کتب خانہ۔ ان کتابوں کے مصنف — جان کینی کے افسر، انڈین سول سروس کے افسر، فوجی، مشنری، ماہرین تعلیم، پلانٹر، ان کے بھوت پھونس کی چھتوں والے بنگلوں میں اب بھی منڈلا رہے ہوں گے۔

یہ کتابیں — زراعت اور جنگلات۔ آرکیولوجی، رسل و رسائل اور رسول انجینئرنگ، تعلیم، ایٹنولوجی اور سوسولوجی (آہسام کے ناگ قبائل از ایڈورڈ بارلو آئی، سی، ایس)۔ چارلس نے فخر سے سوچا: نام مستقبل کے گرد آلود کوئلوں کھدروں میں بہر حال محفوظ رہے گا۔ کتاب کی جلد پر لکھا ہوا نام، اور قبر کا کتبہ۔ نام (قانون، ایڈمنسٹریشن، طب، فلسفہ، نیچرل ہسٹری، سفر نامے، جغرافیہ)۔

کلکتے کا جیمز برنسپ جس نے خروشی میں یونانی نام دریافت کئے اور اشوک کے کتبوں کی عبارت پڑھی کسنگم۔ جان مارشل، جیمز فرگسن، ہویل، اگرٹ ڈن، کرنل ٹاڈ، ولسنٹ اسمتھ، مورلینڈ، جیمز مل، ولیم ہیشنگز، ولیم جوزف، گریم سلی، چارلس ایلیٹ، ولسن گریفٹھ، جارج سیل — آرٹ ہسٹری، لسانیات، مذاہب۔

اور دہلیچسپ ناول جواب مضحکہ خیز لگتے ہیں، اور جدید ہندوستانیوں کے ہاتھ میں پڑ جائیں تو وہ ان کو نذر آتش کر دیں۔ جن کے ہندوستانی کردار "نیٹو اور نگر" کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ "منٹی" (گٹا دلڈ، منٹی) میرن کرافٹ، "مڈ ڈائیوڈ، کرنل میڈوز ٹامپلر کے ناول — "ایک ٹھگ کے اعترافات"۔ "سیتا"۔ "تارا"۔ "پشوپ سلطان"۔ "فلور اینی اسٹیل"۔ ایف ڈبلیو مین — ہرکشن کے کلب کی لائبریری میں یہ ناول موجود ہوتے تھے۔

ادریچوں کے لئے کتابیں جو ہم سب نے بچپن میں پڑھیں "بیل آر تھر اور اس کا بیروہ"۔ "بیل آر تھر کی ہسٹری"۔ "بیل آر تھر"۔

غدر کے متعلق کتابوں کے انبار، اور پھر کیننگ —

لاہور اور پشاور کی پراسرار گلیاں، چندو جانے، گنگا داس اور سدھو، اور ولی دادا اعلان طوا۔

ہو کر لاکھنؤ خائف غالباً کیلنگ کا علاقہ کی طرف تھی۔۔۔ مغرب کے لئے علامتی کردار۔۔۔ ایک خطرناک
 رشتہ بے ایمان مومت۔۔۔ ہندوستان۔ جو انگریز اس جادو گرئی کے ہلاکت خیز سحر کا شکار ہوا وہ بہت
 دیر پا کر دار کو بٹھا۔ پھینچ کر ہو گیا۔ اس لئے ہمیشہ الگ تھلک رہو۔ اس تاریک اور بھیاںک جنگ میں ایمپائر
 کے اسٹینڈرڈ کو قائم رکھو۔ (اسی وجہ سے گرینڈ ڈیڈ اور گرینڈ ڈیڈ اور مائٹلہ اور آسام کے دیران ڈاک
 بنگلوں میں شام کو باقاعدہ اس طرح کپڑے بدلتے تھے گویا لندن کے سولے میں ڈنر کھانے جا رہے ہوں)
 چارلس بارلو اٹھ کر درجے میں جا کھڑا ہوا۔ یہ ڈی۔ ایمز ہاؤس، اس کے ملازم، اس کا باغ، یہ سب
 بیز میں اسی مستحکم نظام اور روایات کا ایک جزو ہیں۔ یہ سحر انگیز اینگلو انڈین دنیا جو دو سو سال سے اس ملک میں
 باد ہے۔۔۔ اس کے جانے بوجھے کردار اور جزویات، کلکتہ، شملہ، ہل اسٹیشن، مفصل، اضلاع، صوبے،
 صوبے کا سولین خود کو اس صوبے سے مائل کرتا تھا۔ پنجاب سولین، سندھ سولین، بنگال سولین، سندھ
 لب، بنگال کلب۔

یہ مضبوط اور مستحکم اینگلو انڈین معاشرہ۔ یہ کسی لفٹ ونگ ہندوستانی انٹیلیجنٹس نے سچ کہا ہے کہ
 لریہ ہندوستان کو کٹری اسکوائر یا زمیندار کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ہندوستانی صوبے گویا انگریز حاکموں کی
 اتی زمیندار یاں تھیں جس میں ہم لوگ یا انسان دوسرے یورپین تھے۔ اہل بھٹانیہ ہندوستان میں ملتا
 رہنے والے اپنے ہم وطنوں کو "انڈین" "انڈین سولین" یا "انڈین باکس والا" یا "انڈین آفسیر" کہتے تھے
 ہندوستانی محض میٹو تھا۔ اور اس قابل نہ تھا کہ اس کا تذکرہ کسی ہندوستانی سیاق و سباق میں کیا جائے۔
 "پنجاب کا اولڈ جارج کل مجھے جم خانہ میں ملا تھا۔۔۔ بالکل جس طرح ڈیوک اپنی ریاستوں سے
 نکل کے جاتے ہیں اور جس طرح انگلستان کا کٹری اسکوائر اپنی رعیت کا خیال رکھتا تھا اسی شفقت اور
 اللہ سے ہم لوگ اپنی رعیت سے یہاں پیش کئے۔ زیادہ دلسوزی اور محبت سے، کیونکہ یہ رعایا بچوں کی طرح
 ق اور جانوروں کی طرح جنگلی تھی۔ نسل بعد نسل ہم سب سولینز کا یہ عقیدہ تھا کہ خدا نے ایک بڑی عظیم
 لاقی اور روحانی ذمہ داری ان کو سونپی ہے۔۔۔ برطانوی ہند کی حکومت! (مندر کے متعلق ہر برٹ ایڈورڈ

، انیسویں صدی میں ہندوستان میں رہنے والے یا یہاں ملازمین کرنے والے انگریزوں کو اینگلو انڈین
 جاتا تھا، مخلوط نسل والا طبقہ "ہاف کاسٹ" یا یورپین کہلاتا تھا۔

نے کہا تھا کہ یہ خدا نے ہم کو اس غفلت کی سزا دی ہے کہ ہم نے عوام کو عیسائیت کے اصولوں سے آشنا نہیں کیا۔ اور خدا کی قسم ہم نے اس ذمے داری کو بہت خوب نبھایا۔ ہم تاریخ سے شرمندہ نہیں ہیں۔
کوٹ انڈیا —

اسی اخلاقی برتری اور دیانت داری کے بل بوتے پر ہم مٹھی بھرا انگریز چالیس کروڑ ہندوستانیوں پر اطمینان سے حکومت کر رہے ہیں۔

گو کبھی کبھی ہماری ماؤں کو رات کے وقت ہمیں برآمدوں میں پھردانیوں کے اندر سلاتے ہوئے ایک سخت یہ دہشت آدبوچتی تھی کہ اندھیرے میں سے خودار ہو کر ٹوم ٹوم بجاتے چٹو حملہ کر دیں۔ یہ واقعہ ہے کہ غدر کی یاد ہمیں ہمیشہ HAUNT کرتی رہی ہے۔

اور گو یہ حقیقت تھی کہ اہل ہند برٹش راج کی برکتوں کے معترف تھے، اور ایک عام ہندوستانی عدالت میں ایک ہندوستانی جج کے فیصلے کے مقابلے میں انگریز جج کے فیصلے کو ترجیح دیتا تھا۔ مگر یہ بھی واقعہ تھا کہ غدر کے بعد ہنری لارنس نے کہا تھا کہ ہندوستانی اپنے دیوانے بادشاہوں کے زیر حکومت خوش تھے، اصول پرست کشنرول کے زیر نگیں خوش نہیں۔

کوٹ انڈیا —

یقیناً ہم نے بھی غلطیاں کی ہیں، شاید نا میریلزم بذاتِ خود سب سے بڑا جرم ہے، مگر ہماری جیسی با برکت امیریلزم۔، فرانس، الینڈا اور بلجیم کی کونیوٹیوں کی کیا مانگتہ بہ حالت ہے، ناقابل یقین۔

بہر حال "الف حیم" والا زمانہ قدمیں ہوئیں، پچھلی جنگ عظیم سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔

غدر سے پہلے اضلاع میں سوشل زندگی کے مرکز یورپین جرج اچھا اسمبلی روز تھے، پولشین طبقہ اپنی اچھوت حیثیت بچاتا تھا اور الگ رہتا تھا۔ پھر یہ اسمبلی روز ملبے میں تبدیل ہوئے۔ ڈانس، بلیئرڈ، تنو قہ ڈرامے، گرینڈ ڈیڈ کا ہندوستان، ڈاک گاڑیاں، کتے گاڑیاں، بگھیاں، پالکیاں، (پالکی بردار PALANQUIN BEARER) یہ بن گیا، کلکتہ کا ایڈن گارڈن جہاں شام کو بیٹھ بٹھا تھا۔ پارسیوں کی دوکانیں۔

اسیشن کے چند افسر ایک دوسرے سے ہی ملتے رہتے۔ میس دن بھر ایک دوسرے کو چسپ بھیج کر تیں۔ بھیرٹنس، پو لو، شکار، انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان اتنا دلچسپ ہو چکا تھا کہ ہوم سے اکثر لوگ چھٹیاں گزارنے یہاں آتے، گو ہندوستان سے ان کی مراد یہاں کی برطانوی سوسائٹی تھی۔

جاڑوں میں گرینڈ ڈیڈ دورے پر جاتے۔ جب گرینڈ ڈیڈ اور دوسرے صوبوں میں ان کے ساتھی فہر سے پر نکلتے تو عہد رفتہ کے منحل صوبے داروں کے لاؤ لشکر کا گمان ہو سکتا تھا۔ (یہ واقعہ ہے کہ ہم نے اس سے حکومت چین کو ترسک و احتشام میں ان کی نقل کرنے کی پوری کوشش کی۔ داسرائے کی شان و شوکت!) بنگال میں کشتیوں اور اسٹیمروں پر اور دوسرے صوبوں میں میل گاڑیوں اور ادھنوں پر لڑکر سارا ساز و سامان میں ساتھ جاتا۔ بھاری فرنیچر، تصویریں، چاندی کے ظروف، ہر چیز تاکہ سلطنت کے نمائندے کا دبہ۔ جب جنگل اور دیہات میں بھی قائم رہے۔ لشکر میں کتے، گائیں، بکریاں، مرغیاں، سواری کے گھوڑے بھی شامل نہ ہوتا۔ بڑے صاحب کے خیمے قالین تصویروں اور گلدانوں سے سجائے جاتے۔ خورد و نوش کی باتیں کے ڈبوں میں میٹھی کے ارمی اینڈ نیوی اسٹورز سے آتیں۔ کچھ فاصلے پر نیٹو افرادوں کے خیمے لگتے اور مالے اگر وہاں اپنا بازار لگاتے۔

سال نو پڑھنی کھتر کا دیوار لگتا۔ دیوار میں زمیندارندریں ہرش کرتے، جن کو صاحب مانتھ لگا کر واپس آ۔ بڑے صاحب کے دیوار میں کرسی ملنا نیٹو جھٹپین کے لئے عید عزت کی بات تھی۔

کلکتے اور شملے میں قیصر کی جرمن ایمپائر کے سفیر رہتے۔ جرمنی اور برطانیہ کی تجارتی جنگ شروع ہو چکی۔ جرمن مصنوعات کی ہندوستانی بازاروں میں ریل پیل تھی لیکن نو آبادیوں سے فائدہ اٹھانے کی اس ریس بلکہ ۱۹۱۷ء کی جنگ کی صورت میں رونما ہونے میں ابھی بہت عرصہ باقی تھا۔

نیٹو سوسائٹی سے علیحدگی کی ایک تفصیل اینگلو انڈیائی نے اپنے گرد دھڑکی کر رکھی تھی، مگر خود اس تفصیل کے مطابق جیسی شدید کلاس سسٹم نہیں تھی۔ انڈیا ایک آؤٹ پوسٹ تھا اور یہاں سب کو ایک دوسرے سے مرعوب تھا۔ زندگی زیادہ بے تکلف تھی۔ برطانیہ اپنے بہترین نوجوان یہاں حکومت کرنے کے لئے مگروہاں کے بدترین نمونوں کو یہاں قسمت آزمائی کے لئے بھیج دیا جاتا۔ عموماً اونچے خاندانوں کے یہ لڑکے، زیادہ ایڈونچرس ہوتے۔ ملک میں امن و امان، ترقی و خوش حالی کا درد دورہ تھا۔ اور ایک عام ہندو "ملکہ ٹوریہ" کو دیوی مانا جھکنے لگا تھا۔ (مرنے سے پہلے وکٹوریہ نے لارڈ کرزن سے کہا تھا:۔

(BE KIND TO MY POOR INDIA)

اس ملک کی قدیم روایت تھی کہ بادشاہ پر جا کو درشن دیتا تھا۔ اور پر جا اس سے فریادی پہنچتی تھی۔ بہت سے انگریز ہندوستانی امرا اپنا سارا اثاثہ فروخت کر کے مصعوبتیں اٹھا کر، اپنے معذموں کی اپیل کے

لے لندن جلتے تاکہ ملکہ سے خود فریادی ہوں۔ زیادہ تر نامزد لوہٹے یا غریب الوطنی کے عالم میں مرجاتے، ہا کے حکم کی اطاعت اور صاحبانِ اقتدار کا خوف اس ملک کے عوام کی سرشت میں داخل ہے۔ لہذا کیا تعجب ہے کہ اہل ہند ہماری اطاعت گزار رعایا بن گئے اور ملک کو اپنی ماں سمجھنے لگے؟

غدر کے بعد انڈین سول سروس قائم ہوئی اور ”کمپنی شیش والا“ اسنگلہ انڈین منظر پر نمودار ہوا۔ مغز خود پسند، سبلی بری کے پلے اکس برنج کا تعلیم یافتہ، جو ”باکس والا“ یعنی اپنے ہم قوم تاجر کو بھی ذرا حقیر سمجھتا تھا۔ یہ نیا سولین خاص امپریلسٹ تھا غدر سے پہلے کی نیا دہ روادار برطانوی روایات اور ہندوستان کی اس دلکش نظرو تہذیب سے بالکل ناواقف جو غدر کے بعد ہمیشہ کے لئے مٹ گئی۔ ڈیڈیہ نئے سولین تھے اور ہندوستان کی برطانوی سوسائٹی کی نئی اور شدید کٹر کاسٹ سسٹم کے ایک فرد۔ دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے نمائندے اور دنیا کی ارفع ترین ملازمت کے رکھ، مغرور، خرد مارغ، لیکن جو حق لکڑا رہا کی جانیں بچانے کے لئے اطمینان سے لہر اہل بن گئے۔ انسانی فطرت کے۔ برطانوی کردار کے یہ تضاد — چارلس بارلو دیرپے سے ہٹ آیا۔ بارش شروع ہو چکی تھی۔

شملہ برطانوی دیوتاؤں کا مسکن تھا۔ اضلاع کے کلکٹر اور کسٹنر عموماً اپنے اپنے صوبوں کے پہاڑوں پر جاتے تھے، دارجلنگ میں ہماری دلفریب کوٹھی، پہاڑ ہیں اپنے وطن کے مناظر اپنے وطن کی خوشگوار سرسبز کی یاد دلاتے تھے۔ ہمارے حبیب اسٹیشن، ہمارا پیارا ہندوستان۔

یہ واقعہ ہے کہ ہم ب، ہماری ساری قوم اس ملک کے سحر سے نہیں بچ سکی۔ اس کی گرمی، غلاظت اور کمینگی کے باوجود۔

ہماری یہ مخصوص دنیا۔ وطن واپس جاکر بھی جس کی یاد ہمیں ستاتی رہتی ہے۔ یہ مخصوص زبان جو ہم نیشون کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، بندوبست، شاباش، سب برابر، کٹب ماعوم ہائے کپڑا دار یو سٹور۔ شاندار بوٹ اچھا۔ جڑا کھانا۔ بڑا تماشا۔ ایڈوڈ لیر کی نظیں —

بیک وقت نفرت و محبت کا یہ عجیب و غریب رشتہ۔ لارڈ مورے نے صبح کہا تھا۔ میں مغربی ہوں۔ مشرقی نہیں۔ میں بہت زیادہ مشرقیت کبھی اختیار نہیں کرے کرتا۔

یہ بھی واقعہ تھا کہ عموماً انگریز میل جول میں مسلمانوں کو ترجیح دیتے تھے۔ کیونکہ مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں بہت زیادہ مہذب تھا۔ ہندوؤں کو ہمارا یہ نرہمی سلوک قدرتی بات ہے کہ بہت برا معلوم ہوا۔

اوسفرڈ میں مسعود علی اور رانا ناتھن سے ہندو مسلم سوال پر کتنی لمبی لمبی بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ صبح سے تازہ اخبار آئے رکھے ہیں۔ میں نے ابھی تک کچھ نہیں پڑھا۔ سرخیاں دیکھتے ہوئے آج ڈر لگ رہا ہے۔ برطانوی ہمت اور بہادری۔

وہ دوسری کمرسی پر بٹھ گیا۔ پائپ جلایا، اب غسل کے لئے جانا چاہئے۔ مسعود آج کل پنجاب میں کلکٹر ہے۔ رانا ناتھن مراٹھا کنڑی میں کہیں تعینات ہے۔ دونوں اپنی زبان میں ظاہر کرتے تھے کہ برطانوی حکومت سے متنفر ہیں۔ اور دونوں کی شدید تمنا تھی کہ آئی سی ایس میں لے لئے جائیں۔ دونوں اس وقت اس برطانوی حکومت کے ارفع ترین ملازمت کے اراکین ہیں۔ اپنے وطنوں کو خاطر میں نہیں لاتے اور زمین پر قدم نہیں دھرتے۔

آہ — ہندوستانی کردار —! ہندوستانی کردار! مگر وہ انقلابی جو اس حکومت کی بیخ کنی کے درپے رہے ہیں، مجھے وہ بھی مضحکہ خیز لگتے ہیں۔ اصلیت غالباً یہ ہے کہ مجھے صرف اپنے نوکر، بھشتی اور خدمت گار دیکھتے سلام کرتے، مائی، عزیز پرور کہتے کسان اور جاہل اور قابل رحم ہندوستانی اچھے لگتے ہیں۔ کچھلے دو تین سو سال میں اسے چین گاہ اہل مشرق کی پسماندگی اور جہالت کا بھرپور تجربہ کر چکے کے بعد ہم انھیں اپنے جیسا نہ سمجھنے کے لئے غالباً ابھی تیار نہیں۔

جب چارلس بارلو سول سروس میں شامل ہوا اس وقت دہشت پسند تحریک ایک بار پھر پورچوکی تھی۔ پچھلی صدی کے لبرل مصلحین کے مقابلے میں سامنے آنے والے جوشیلے قوم پرستوں کی "عوامی جہد" کی اس نچلے متوسط طبقے، اور بیکار نو جوانوں میں پہنچ چکی تھی۔ سوال یہ ہے کہ ہم نے یہ یونیورسٹی قائم کیں؟ چارلس نے پائپ سلگایا اور پھر دریچے میں جا کھڑا ہوا۔ دہشت پسند قوم پرست اور ان قوم پرست اور یہ اور وہ۔ اس جوالا نکھی پرتا بولپاکر اسی سکون کے ساتھ اس برصغیر کا ایڈمنسٹریشن کرتے جانا سول سروس کا منصب بڑا کارنامہ ہے۔

اوسفرڈ سے تازہ تازہ آیا ہوا نوجوان چارلس بارلو انقلابیوں کے پرانے گڑھ باریسال میں جو آئٹ مٹ تھا۔ یہ ان لوگوں کا بنگال ہے۔ یہ میرا بنگال بھی تو ہے۔ گریٹ ٹیڈ اور گریٹ ٹیڈا، ڈیڈ اور ماما، میل اور آئٹ ماڈ کا بنگال، مجھے اس سے کتنی محبت ہے، میں اسے نباہ ہونے دوں گا، وہ باریسال

اور پھر کچلی صدی کے بہت سخرے۔ ان کے مارٹنیم اور پیانو۔ ان کی خواتین کی گاؤں نما ساریاں۔
ان کے جوتے اور موزے۔ ان کے انگلستان کے سفر، ان عورتوں نے پردہ ترک کر کے زنانہ اور
ہم کے رومان کا بھی خاتمہ کر دیا۔

بے چارہ الف جیم۔

ٹیگور بھی ہماری نقال تہذیب کی پیداوار ہے۔ ہم نہ آئے ہوتے تو نہ رام موہن پیدا ہوتے نہ
، اسی طرح آپس کے کشت و خون میں اور کئی صدیاں نکل جاتیں۔ آخر دیکھو ان نشان وغیرہ
ت ہے۔ ٹیگور نے شبلی اور کیش نہ پڑھا ہوتا تو ایسی شاعری نہ کرتا
بے چارہ اوپری طبقہ کا ہندو۔ پہلے مسلمان حکمرانوں کی نقالی میں لگا رہا۔ اب ہماری تقلید
تے۔

رد و سری بات یہ ہے کہ سارے ہندوستانی بیا کار ہیں۔ شانتی شانتی رہتے ہیں مگر تشدد
لا گھٹتی میں چڑی ہے۔ مذہبی جنون اور ملکی سیاست کا اس ملک میں ہمیشہ سے گہرا تعلق ہے
سے پہلے شیووں، شاکتوں، برہمنوں، بودھوں، جینیوں میں جنگیں بھجائیں، جس عہد کا جو
ہوا اس کے حکمرانوں نے دوسرے فرقوں پر ظلم توڑے۔ اب مسلم پیر پڑ پر آئے۔

”عبد الغفور —“

ایک منٹ میں عبد الغفور دروازے پر نمودار ہوئے۔

صاحب۔

کچھ نہیں جاؤ۔

عبد الغفور واپس چلے گئے۔

مسلم دور — ساری مسلم پیر پڑ کی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ سارے مسلمان
فخریہ غازی کہتے تھے اور بت شکن، کافروں کو مارو۔ مندر گزار مسجد میں بنادیں۔

مظانوی دور کو لیجئے — سیاسیوں اور مولویوں کی بغاوتیں، جہاد کے فتوے۔ اور حال میں
ٹکے سوامی دیویکامندر کے ساتھ اور چیلے چاہیے جو بنگال کے اولین و ہشت لیسوں میں
افتدایوں کو اپنے مشنوں میں پناہ دیتے، خود انڈر گراؤ ٹڈیل کام کرتے۔ اٹھارویں صدی کے

الفنکاروں کے گیت ————— ”بے گاہند سچے کو بے گاہنڈان آگے۔“
 کے طوفانی گانے، ڈرامے، غوامی ناٹک، گریٹ ڈیڈ اور ایڈورڈ بارلو کا بنگال ان آتشیں آواز
 سے گونج رہا ہے۔

یہ انقلابی واقعی بڑے جری وگ تھے۔ اپنی تحریک کے قانون کے مطابق صرف
چھٹانک چاول اور دو چھٹانک چائے کو روزانہ پیٹ بھرنے کے لئے ملتا تھا۔ اور حیرت انگیز
اٹھا کر یہ ہم سے لڑ رہے تھے۔

اشلوک رشتے اور نمازیں پڑھتے ہوئے دار پر چڑھتے تھے۔
سوال یہ ہے۔ چارلس بارلو نے پائپ کا گہرا کش لگا کر سر پھپھے لکایا کہ آئرش باپ۔
بھی تو ہمارا ناک میں دم کر دیا تھا۔ ان کو ہم اتنا مجرم نہیں سمجھتے، محض اس لئے کہ وہ گوہر
ستمبر ۱۹۳۹ء میں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ نافذ کیا گیا کہ یورپ میں ہم ہٹلر کے مقابلہ
بالکل تنہا تھے اور ہندوستان میں ہمیں باغیوں اور مفسدوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ گریٹ

درخش ہوں گے کہ میں نے اپنی بساط بھر اس قومی کرائس کے موقع پر اپنے فرائض ادا کیے۔
میں نے اپنے اصناف میں کیونسٹون کا قلع قمع کرنے کی کوشش کی۔ بے چارہ پل کینٹ ویل
ایک لیڈر ریجان احمد کو نہ پکڑ سکا اور اس کی سزائیں اسے دور دراز رنگامانی تبدیل کر دیا گیا۔
کامریڈ ریجان کو میں بھی کبھی نہ پکڑ سکا۔ میں خوش ہوں کہ اب حالات بدل چکے ہیں۔ یہ واقعہ
بھی ان لوگوں کو مجرموں کی طرح پکڑنا اچھا نہیں لگتا۔ مگر فرض فرض ہے۔
خدا کرے ایٹس خیریت سے ہو۔ گارڈینز میں ہمیشہ سے مشنریوں کا اثر ہے۔ مگر کیونسٹ وہاں
پکڑ چکے ہیں۔ اور وہاں کے جنگلی کیونسٹ اور سوشلسٹ کے باریک فرق کو نہ سمجھ
سکے۔

بلیا میں باغیوں نے آزاد سرکار قائم کر لی۔ یو۔ پی کی سرٹوں پر لڑ کے ”ہمارا بادشاہ کون۔۔۔“
م آزاد!“ کے نعرے لگاتے پھر رہے ہیں۔ آسام میں گولیوں کی بارش ہو رہی ہے۔ سبھا ش چند
نے رنگوں میں بہادر شاہ ظفر کے مزار پر جا کر قسم کھائی ہے کہ وہ ہندوستان کو آزاد کر اکر دم
۔۔۔

جیزس کرائسٹ!

چارلس بارلو نے زور سے انگڑائی لی۔ بہت جلد کیا میں بھی کرنل بلیمپ کی طرح ایک کردار،
نپ میں تبدیل ہو جاؤں گا؟
اوسفر ڈین ایسے ہی ایک اتوار کی خاموش صبح دریا کے کنارے ٹہلے ہوئے حسب معمول انڈر
ناکٹ ہو رہی ہے۔ میں ٹوری فوجوان ہوں، فریڈ کارٹر بائوٹیک ہے۔ مسعود علی اور
ہندوستانی قوم پرست۔

”ہماری قدیم تہذیب۔۔۔ ماننا تھیں گرج رہا ہے۔“

”سر۔۔۔ آپ کی قدیم تہذیب؟ وہ بھی حکمران طبقے اور پرویتوں تک محدود تھی۔ اور شوک
پٹور یا شاہجہاں کے عہد کی کلچر کی طرح آج کی برٹش یا مغربی کلچر بھی آپ کے مٹتی بھر طبقے تک ہی
۔۔۔ میں جواب دیتا ہوں۔“

”یادپ میں تعلیم عام ہوئی۔ کیونکہ وہ آزاد تھا۔ ہم غلام تھے۔ اس لئے جاہل اور پسماندہ رہ گئے۔“

مسعود علی کہتا ہے۔

”خوب! آپ کا مغل دور تو آزادی کا دور تھا۔ اس وقت اسکول اور یونیورسٹیاں تھیں تھیں کہ جب گرینڈ ڈیڈ اڑیسہ پہلی بار گئے اس وقت وہاں ایک چھپی ہوئی کتاب موجود نہیں تھی۔ سہ سنو۔ سارے صوبے میں ایک چھپی ہوئی کاغذی کتاب موجود نہ تھی۔ پروہت لوگ تار کے پتوں لکھ دکھ لیا کرتے تھے۔“

”یہ جہالت فیوڈلزم کی کارستانی تھی“ بالٹوئیک فریڈ جواب دیتا ہے۔

”بکواس۔“ میں بات جاری رکھتا ہوں۔ ”اور سنو۔ جب کلکتہ میں ہم نے کتابیں چھپا کیں تو اسٹیمروں پر لدے ہوئے ہندو طلبہ چلا چلا کر ان کتابوں کا مطالبہ کرتے تھے۔ مکالمے نے کہا یورپ کی کسی لائبریری کا ایک شلیف ہند اور عربستان کے سارے نیشنلزم پر چا دی ہے۔“ میری سنی ان سنی کر کے راما ناٹھن اپنا وظیفہ شروع کر دیتا ہے۔ ”انیسویں صدی کے پہا میں سات قحط پڑے جس میں پندرہ لاکھ لوگ مرے۔ دوسرے نصف میں چوبیس قحط پڑے، جن میں کروڑ انسان مرے۔ پھر سیاہ فام راما ناٹھن بڑی شیرینی سے مسکر کر مجھ سے پوچھتا ہے۔ ”ہا ہندوستان کی یونیورسٹیوں کا کیا ذکر تھا۔؟“

”کبھی نائنہ اور ٹکسلا کا نام سنا ہے؟“ اور اس کے سفید دانت جھلملاتے ہیں۔

جیت لی۔

ہم تینوں ناؤ میں جا بیٹھے ہیں۔ مسعود علی پتوار سنبھالتا ہے۔

اب راما ناٹھن کہہ رہا ہے۔ ”اگر تم لوگ نہ آئے ہوتے تب بھی ہندوستان مغربی علوم پر ہو جاتا۔ ٹیپو سلطان شہید اور راجہ رام موہن رائے دونوں فرانس کے مداح تھے۔“ ”گاڈ آل ماسٹی۔ ٹیپو صاحب تو سخت اینٹی ہندو تھا۔ اب ہمارے مقابلے پر ایک ہیرو سوس ہوئی، تم چالاک لوگوں نے اسے اور سراج الدولہ کو ہیرو بنایا۔ دونوں اینٹی ہندو حاف کرنا مسعود۔ اولڈ چیپ۔“

”ہماری تاریخ تم لوگوں نے مسخ کی ہے۔“ راما ناٹھن غزتا ہے۔ ”ہم نے تمہیں انگریز کے ذریعے متحد کیا۔“ میں جواب دیتا ہوں۔ ”تم اور مسعود ایک دوسرے سے انگریزی میں بات

— ؟ کنارہ پر کھڑی ایک حسین لڑکی ہاتھ دلاتی ہے۔ ڈائلٹ ! ہم کشتی کھینچتے، ہنستے بولتے کشتی
رخ اس کی طرف موڑ لیتے ہیں۔ ڈائلٹ جو میری بیوی ہے

خدا کمرے ڈائلٹ خیریت سے ہو۔

وہ اب آہستہ سے اٹھ کر میز تک گیا اور تصویر دیکھنے لگا۔ ڈائلٹ لنگ۔ تم اس وقت
ناریک لندن کے کس پب میں کس فوجی کے ساتھ بیٹھی ہو گی۔ سیر کا باگ تمہارے ہاتھ میں بھی
کا۔ مگر کس کی معیت میں ؟

یہ حسین عورت مجھ سے تین بار بے وفائی کر چکی ہے۔ آؤٹی میں، فلورنس میں، ہیٹ
ڈم میں۔ ڈائلٹ مائی ٹو۔ تم یہ بھی جانتی ہو میں نے تم سے کتنی بار بیوفائی کی۔
مادرن میرج۔

اور یہ جنگ کا زمانہ ہے، اور جنگ میں سب کچھ روا ہے۔ اس محفوظ دامن ہماری
رگی میں اچانک کیسا زلزلہ آگیا۔ جنگ، بغاوت، تباہی۔

ٹائم۔ ٹائم نو سال کا ہو گیا۔ میرا پیارا بیٹا کیا میں تم سب کو زندہ دیکھ سکوں گا ؟
امریکی بہت دکھش ہوتے ہیں۔ برطانوی عورتوں کے لئے۔ ڈائلٹ تم ہمیشہ سے فلرٹر ہی ہو
س لیور لیشل ہارٹ، WAC کے یونیفارم میں کتنی بھلی معلوم ہو رہی ہے۔ میری بیوی۔ آئن
برٹن کی طرح دلغریب۔

اس وقت کیا کر رہی ہو، ڈائلٹ ؟ سینٹ جانرود ڈاک کوئی میوز ؟ کوئی کنٹری ان۔
ہمارے اپنے گھر کا۔ ۱۲ اینڈریوز کر سینٹ کا بیڈروم۔ ؟

یہ سب جانتے ہوئے بھی تم پر عاشق ہوں، جان میں۔ اور تم بھی میری اس کمزوری سے واقف ہو۔
اس نے سیر کا باگ زور سے میز پر پٹخ دیا۔ باہر بارش کا زور بڑھ چکا تھا۔
بنگال کی برسات، طیرا، پھٹھر، کچھو، تعفن، طوفان، سانپ، مینڈک۔ اس برسات کے
ٹینگور اور سانپ بنگالی شاعری کرتے کرتے مرے جاتے ہیں۔

اس وقت میں سجدہ میں بیٹھ رہا ہوں۔

وائلیٹ۔

لاچار غصے سے پھر میرا خون کھول رہا ہے۔ مجھے اس سے اتنی نفرت ہے۔ اتنا عشق ہے۔ یہ آج تک معلوم نہ تھا۔

کجنت خط بھی نہیں لکھتی۔ شاید میں اس کے لئے مرجھا ہوں۔ شاید وہ یہ سمجھتی ہے کہ باغی نے مجھے بھی قتل کر دیا ہوگا۔

ما۔ آنت میٹی

اُس نے آنت میٹلڈ کی تصویر پھر اپنے سامنے رکھی اور سر ہلانے لگا۔

آنت میٹی تم نے بھی اتنے دنوں سے خط نہیں لکھا۔ مگر اُن کے ہاتھ میں ریشم ہے۔ ٹھیک۔ قلم نہیں پکڑ سکتیں۔ آنت میٹی تم ایک زمانے میں کتنی خوب صورت تھیں۔ اپنی یہ پرانی تصویر دیکھو۔

وائلیٹ۔ ایک دن تم بھی بوڑھی ہو جاؤ گی۔ یہ نہ بھولو۔ تم نے آنت میٹی کو کسی ہوم میں ڈال د تاکہ آزادی سے عیش کرو۔ میں تمہیں کبھی معاف نہ کروں گا۔ میں ہندو عظمائی ہوں۔ میں سخت دل انگیزہ کی طرح کبھی بوڑھے ماں باپ اور رشتہ داروں کو گھر سے نکال کر کسی ہوم میں پھینکنا برداشت نہیں کر سکتا۔

اب اس کے آنسو بہنے شروع ہوئے۔ اب تک وہ کتنی شراب چرچھا چکا تھا۔

خداوند! اگر تو واقعی کہیں موجود ہے، وائلیٹ کو، ٹام اور کیرل کو، آنت میٹی کو، ایلس کو، اور سب کو اپنی حفاظت میں رکھ۔

اولڈ پیپلز ہوم۔

کسی دن شاید میں بھی، مجھے بھی ٹام اور اس کی بیوی گھر سے نکال کر اولڈ پیپلز ہوم میں ڈال دیے۔ بچا بہ بڑھا جو ہر وقت ہندوستان کے متعلق بڑبڑاتا اور آہیں بھرتا ہے۔ (نرسیں آپس میں کہیں گی)

تم آنت میٹی کی طرح مفلوج اور بوڑھی ہو جاؤ گی۔ اور تمہاری بہو تمہیں ہوم میں پھینک دے گی۔

اسی برسات میں، میں نے وائلیٹ کے ساتھ اپنی لارچ پر پدما کے کیسے روانی سفر کئے ہیں! اسٹیم
ہم اپنی مون کے لئے سندربن گئے تھے۔ اسٹیم کار کیا نام تھا۔؟ کنگ فشر۔

آج ہماری شادی کو پورے گیارہ سال ہو گئے۔ یارک شائر کی تازہ دار دلوں کی شروع شروع میں
حیرت سے یہاں کی ہر چیز کو دیکھتی تھی۔

سائبر ہمارے شادی کا پہلا سال، باریسال میں، جہاں میں نے دنیش چندر سرکار کو پکڑ دیا۔

میں نے دنیش چندر سرکار کو پکڑ دیا۔

میں نے دنیش چندر سرکار کو پکڑ دیا۔

میری سروس کا سب سے نمایاں کارنامہ۔

سیاہ آنکھوں والا دیکش، میرا ہم عمر نوجوان، میرے سامنے کھڑے میں کھڑا تھا۔ ممکن تھا کہ

ہاؤسفرڈ میں میرا جماعت ہوتا۔ کشتی کھیلتے ہوئے مجھے بحثیں کرتا۔ مگر وہ کال کو ٹھہری میں جانے سے

بل میرے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ بڑا جید انٹلیجنس ہے۔ میں اس سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔

جس روز اس کی اسپل ہائی کورٹ سے مسترد ہوئی مجھے بے حد۔ کتنا۔ سجدہ دکھ ہوا تھا۔

یوں؟ وہ بالآخر میری قوم کا جانی دشمن تھا۔ اگر میں نے اسے نہ پکڑا ہوتا تو اس نے مجھے ہلاک کر دیا ہوتا۔

مجھے اس کی اسپل مسترد ہونے کا بڑا رنج ہوا تھا۔

جس روز علی پور جیل میں اُسے پھانسی ہوئی، اسی روز ہمارے یہاں ٹام پیدا ہوا تھا۔

متوجہ آیا، وائلیٹ کی منہ چڑھی اس سے کہنے لگی۔ سیم صاحب۔ ہم ہندو لوگ آد اگوں میں

لیو کرتا ہے۔ شکر ہے کہ دنیش بابو کی پھانسی کے دو گھنٹے پہلے ٹام بابا پیدا ہوا۔ اگر تھوڑا منٹ بعد

یلا ہوتا تو بہت سا ہندو لوگ بولتا کہ دنیش بابو نے بدلہ لینے کے لئے آپ کے گھر میں جہنم بیا ہے۔

واٹ اے ہو رہل تھوٹ۔ بے چاری وائلیٹ نے ذرا سا کانپ کر کہا تھا۔

اور یہ واقعہ ہے کہ آیا کی اس عجیب و غریب بات کے بعد لاشعوری طور پر میں نے اطمینان کا

مانس لیا تھا کہ ٹام دنیش سرکار کی پھانسی سے دو گھنٹے قبل پیدا ہوا۔ کرائسٹ۔ اس دیوانے،

جی ملک میں رہ کر انسان خود دیوانہ ہو جاتا ہے۔

میں نے دنیش چندر سرکار کو

اور ایک اور بھیانک خیال :-

جفت لگ کی بتائی ہوئی خبر تازہ ترین خبر ہے وہ تو کل ہی لندن سے یہاں پہنچا ہے۔ لکن

لیکن افسر سے ملاقات بھی کی ہے۔

نمبر ۱۳۔ اینڈریوز کرسینٹ میں ایک امریکن کرنل BILLET کو دیا گیا ہے۔ اس میں دیکھا

ایک قصہ ؟

اس امریکن کا نام کرنل ڈونلڈ جو سیل ہے۔ بہت خوب صورت طرہ دار جوان ہے۔ میں طرہ دار کم ہوں۔ نونا بھڈا، اتنی موٹی ناک، وائلیٹ میری جان، میں ہرگز تمہارا حق نہیں تھا، مگر تم نے بھی تو میرے عہدے سے شادی کی تھی۔

مارچ ۳۹ء اس پر اس دنیا میں ہم آخر بار برطانیہ گئے تھے۔ کاش وہ بچوں کا داخلہ کرانے کے بعد میرے ساتھ ہی واپس آگئی ہوتی۔

اب میں پھر اللہ جیم کی تلاوت کرتا ہوں۔

وہ آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ صدمے، رنج، پچھتاوے، بہت کم ایسا ہوتا ہے جب انسان کو اتنی مہلت ملے کہ وہ ایک منوئی سے اپنی ساری زندگی کا جائزہ لے، اپنے اندر جھانکے۔ اب اُسے نیند سی آرہی تھی۔ ماضی محفوظ ہے۔ یادوں کا قبرستان محفوظ ہے۔ اس نے کلا سے لغات ہند اٹھائی اور اس کے صفحے پلٹا پلٹا کر دیکھے۔ نیم والا کھیں رڈر اس کھول کر ادنگتے ادنگتے کتاب کے آخر میں دوسری کتب کے اشتہاروں پر نظر ڈالی۔ ایک تفتیق تبسم اس کے ہونٹوں پر بکھرنے لگا۔

"میں کی کاشت — ایک پلانٹر کی زندگی کا دلچسپ مرقع۔"

"پرانے کلکتے کی آواز بازگشت" از ڈاکٹر بشیڈ۔ سردرق پریک ہول کی تصویر۔

فہرست مضامین :- فلپ فرانسس کا دور، ن کو مار، فرانس اور سیٹنگز کا ڈومین،

وغیرہ وغیرہ۔

"انکاش ایٹیکٹ فار انڈین جٹلمین۔ سوشل اینڈ انیشل" از ڈبلیو ٹریگور دیب۔

بنکال ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ۔

"بہار کی پرانی یادیں" ایک پرانے پلانٹر کے قلم سے۔

”جسٹس اونوکول چندر مکرجی آنجنانی۔“ از۔ ایم مکرجی۔ انڈین انگلشہ یا بابا انگلشہ کا
دور مزید اومونہ۔ قارئین سے درخواست ہے کہ اس جنتیں کی سوانح حیات جو ان کے چھپنے لکھی
ہے، ضرور پڑھ کر تفریح حاصل کریں۔

”آسام میں ایک ٹی پلانٹری زندگی“ از جارج بارکر۔

”انڈین ریسنگ کی چند یادیں“

”گھوڑے، آدمی اور اسپورٹس“

”سیونی“ ست پڑہ پہاڑیوں میں کیمپ لائف۔

”بنگلے کے چھپے“ از ”ایسا“ مزاحیہ کتاب۔

الباب:- بوائے کو ملازم رکھنا، ڈوگ بوائے، مشعلچی، حمال، ہری درزی، بٹلر۔

عبدالغفور۔۔۔ ابھی بنگلے کے چھپے میرا بٹلر عبدل زندہ ہے۔ میں محفوظ ہوں، چارکس
بادلو نے ادھکنا شروع کر دیا۔ اور بچہ کرسی کے مٹھے پر سر رکھ کر سو گیا۔

خاصی بوسیدہ چھتری لگائے، بارش میں بھیکتے حواس باختہ ریورنڈ بنرجی دُور بھاٹک میں دھل
ہو رہے تھے، اس وقت دوپہر کا ایک بج چکا تھا اور ڈی ایمزدوس کے برآمدے کے ایک درمیں
کھڑے عبدالغفور ہیڈ چیراسی سے آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔

”صاحب چھوڑا حاضری کے بعد سے دروازے بند کئے اسٹڈی میں بیٹھا ہے۔ سیر یہ بیر
پے چلا جا رہا ہے۔ اللہ جانے کیا معاملہ ہے۔ شاید ولایت سے میم صاحب کی کوئی خیر خبر نہیں
آئی۔“

چیراسی نے متانت سے سر ہلایا، اتنے میں اس کی نظر بادی صاحب پر پڑی جو برساتی میں
پنچ چپکے تھے۔

بادری بنرجی نے سیرھیایا چڑھ کر جلدی جلدی پائیدلان پر جوتے گڑے، اور برآمد

ہیں آئے، چھتری بند کی تو اس میں سے پانی کی بوندیں فرس پر گریں۔ شفاف فرش خراب ہو گیا۔ اور وہ اور زیادہ گھبرائے۔ اوروں نے دہشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ عبدالغفور نے پرک کر چھتری ان کے ماتھے سے لی، ہیٹ میک کے کونے میں لٹکا دی اور سلام کیا۔

”صاحب کہاں ہے؟“ پادری ہنرجی نے ہیٹ زدہ آواز میں دریافت کیا۔ عبدالغفور ان کی اس حالت پر متعجب ہوئے۔

”صاحب کتاب والے کمرے میں ہے پادری صاحب۔“

”صاحب کو بلو، مہربانی ہوگی، ایک دم ضروری بات کرنا ہے۔ مہربانی ہوگی۔“

عبدالغفور نے سر ہٹایا اور اندر گئے، لائبریری کا دروازہ دھیرے سے کھٹکھٹایا اور کواڑ آہستہ سے کھول کر کمرے میں داخل ہوئے۔ آرام کرسی کے پاس جا کر ذرا سا کھٹکا رہے۔

چارلس بارلو نے آنکھیں کھولیں۔

”صاحب۔ کالا پادری آیا ہے۔“

”کون؟“ چارلس نے ذرا چونک کر آنکھیں ملے ہوئے پوچھا۔

”کالا پادری۔ ہنرجی بابو۔“

”اوہ۔ کیا کام ہے؟“

”صاحب۔ وہ ایک دم ضروری بات کرنا مانگتا ہے۔ گول کمرے میں بٹھا دوں؟ بے چارہ

بہت گھبرایا ہوا دکھتا ہے۔۔۔“

چارلس نے سراوچا کیا۔ ”ایس۔ کیا۔؟ نہیں، ادھر ہی بھیج دو۔“

”ادھر صاحب؟“ لائبریری صاحب، کابینہ ذاتی کو مٹھا۔

”یس، یس، یو ایڈیٹ۔“ چارلس نے گرج کر کہا۔ عبدالغفور کان دبا کر غائب ہو گئے۔

چارلس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ سر میں درد، خیالات میں انتشار، دل میں دکھ، کیا کریں باب اس کالے پادری کی فریادیں سنوں۔ میں کہ ہندوستانیوں کا بابائی باپ ہوں، مانی باب، غریب یرور۔

جب اس نے آہٹ پر آنکھیں کھولیں، پادری بنرجی سولا ہیٹ دونوں ہاتھوں میں لئے سسکاتی سے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔

”وہ اٹھ کھڑا ہوا اور خوش خلقی سے مسکرایا اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔
”گڈ آفٹرنون مسٹر بارلو۔“

”ہلو۔ پادری۔ گڈ آفٹرنون۔ کیا دوپہر ہو گئی؟“

پادری بنرجی عجابت سے مسکرائے، مگر مسکراہٹ نے فوراً ساتھ چھوڑ دیا۔ اب وہ پھر ہیٹ زدہ نظر آرہے تھے۔

”کیا بات ہے پادری آپ پریشان معلوم ہوتے ہیں۔ ڈو یو ولے ڈرنک، ادہ بوڈونٹ ڈرنک، ڈو ہیٹ ڈاؤن پادری۔“

”نو، یس، مسٹر بارلو۔“ پادری بنرجی ہکلائے اور ایک کرسی پر ٹپک گئے۔ ہیٹ گود میں رکھ لی۔ کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ چارلس نے مگ میں بیرانڈیلی، مگ اٹھا کر کہا ”ٹو وکٹری۔“

پادری بنرجی نے اسی بھونچکے انداز میں سر ہلایا۔ چارلس پھر آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب ساری چیزیں دھندلی دھندلی سی معلوم ہو رہی تھیں۔ آئی ایم ڈرنک، ہتھوڑے۔ سامنے کالا پادری بیٹھا تھا۔ مجھے ہمیشہ یہ حیرت رہی ہے کہ انسان اپنا آبائی مذہب کیسے بدل لیتا ہے۔ اپنی کھال اتار کر دوسری کھال کیسے منڈھ لیتا ہے (مثال کے طور پر اگر میں مسلمان ہو جاؤں۔ ہا ہا) سیاہ سوٹ پہنے، سفید کالر لگائے پالی میتھو۔ بنرجی بھی مصحکہ خیز ہے۔ جس طرح ایڈورڈ بارلو مصحکہ خیز تھے۔ ریجان الدین احمد مصحکہ خیز ہے۔ میں مصحکہ خیز ہوں، سارا ہندوستان، ساری دنیا، ساری انسانیت ساری زندگی اتنی مصحکہ خیز ہے کہ اس پر آنسو بہانے چاہئیں۔

”مسٹر بارلو۔“

وہ چونکا۔ میں اپنے فرض میں کوتاہی کر رہا ہوں۔ نیٹو پادری، فریاد لے کر آیا ہے۔ عدل چاہتا

ہے۔ ہا ہا۔

”مسٹر بارلو۔“

”اوہ جسٹ ون منٹ پادری“ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی، اور اٹھ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا، بھاری بھاری، اونچا اونچا، جھکا جھکا سا کمرہ عبور کر کے ریڈیو کے پاس گیا اور دم سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ریڈیو کی سیڑھی گھمانے لگا۔

”دس از بی، بی، بی لندن“ ایک دم آواز گونجی۔

پادری ہنسی چونک پڑے۔

ہزاروں میل پرے۔ ڈکنی کشتیوں سے معمور سمندروں، گرم صحراؤں میں پھٹتے بھون بھونے ہوئے یورپ کے اس پار جلتی ہوئی آدکسفرڈ اسٹریٹ کے ایک تہہ خانے میں بیٹھا ہوا نادلسٹائٹ اپر لپ کے ساتھ اپنے ہم قوم چارلس بارلو سے مخاطب تھا۔

دس منٹ تک وہ چارلس بارلو کو بتاتا رہا کہ اتحادی کہاں کہاں فتح مند رہے ہیں۔ اور برطانیہ میں کہاں کہاں بمباری ہوئی ہے۔ پھر ولسٹن چرچل کے تانہ ہمت افزا بیان کے اقتباس کے بعد خبریں ختم ہوئیں گوڈ سیو دی کنگ بجا۔ چارلس بارلو فوراً اٹیشن کھڑا ہو گیا۔ پادری ہنسی بھی کھڑے ہو گئے۔

ریڈیو بند کر کے دائیں چھنگلی پلکوں پر پھیرتے ہوئے چارلس بارلو واپس اپنی کرسی پر آن بیٹھا اب جا کر پادری ہنسی نے کانپتے ہاتھوں سے اخبار جیب سے نکالا۔ اجازت بھی بارش میں بھیگ چکا تھا۔ انھوں نے اُسے ذرا احتیاط سے مسٹر بارلو کے سامنے پیش کیا۔ ایک غبر پر سرخ نشان لگا تھا۔ چارلس بارلو نے جھک کر خبر پڑھی، تیوری پر بل ڈالا۔ پادری کو دکھایا۔ ہونٹ کاتے۔

”مجھے بڑا شوق ہے، پادری۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کی لڑکی بھی —“

”میں بالکل مجبور اور لاعلم تھا مسٹر بارلو۔“

”آپ مجھ سے کیا توقع رکھتے ہیں؟“

”میری بچی — میری بچی — گمراہ ہے۔ مسٹر بارلو۔ اُسے بچا لیجئے۔“ پادری نے اس

کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے

وہ جھنجھلا گیا۔ اب اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا تھا، وہ اپنی ذاتی اندرونی دنیا سے واپس آ کر اپنے فرض منصبی پرستعد ہو چکا تھا۔ ”آپ کی لڑکی بالغ اور سمجھ دار ہے، جان بوجھ کر اس غنڈہ گردی میں شامل ہوئی ہے۔ بہت جلد اس روحان پرستی سے اس کا جی بھر جائے گا یا ممکن ہے وہ

ماری عمر اسی میں لگی رہے۔ اسٹڈیٹزم، خدمتِ قوم، اور خدمتِ خدا کا جنوں انسان کو عجیب و
ریب طریقوں سے اپنی زندگی تجنے اور تباہ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ میری عین — اب اس نے
تھک پھیلانے — ”میری بین لیس پچیس سال سے ناگہانکوں کی خاک چھانتی پھر رہی ہے اور غالباً
بہت سرور ہے۔ آپ کی بیٹی بھی جیل میں خوش رہے گی۔ اور خود کو مجاہد سمجھے گی۔“
”سٹر بارلو —“

”پادرے —“ چارلس نے دفعۃً سید جبر ملکر کہا: ”اگر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ روزی کے ہتھے
دے نے کسی کی جان لی ہے تو اسے عرقید ہوگی۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔“
پادری بنرجی کی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو ڈھبڈھانے لگے۔ چارلس دوسری طرف دیکھنے لگا۔
ایسے اشارہ تھا کہ اب ملاقات کا وقت ختم ہوا۔ مگر پادری بنرجی ڈٹے رہے، ایک آخری کوشش اور —
”سٹر بارلو — مجھے معلوم ہوا ہے کہ سس بارلو آج کل کسی کام سے تینہ میں آئی ہوئی ہیں۔ اگر آپ ان کو
نکال کر دیں، کہ — کوہ جیل کے ہسپتال میں روزی کو جا کر دیکھ لیں۔ اور — اور — میں نے یہ
طبعی ان کو — انہوں نے جیب سے ایک خط نکال کر چارلس کو بھجوا دیا، اور ملتی اور پر امید نکلا ہوں سے اسے
دیکھنے لگے۔

چارلس نے پڑھنا شروع کیا۔

”ڈیر سسٹر ان کراؤٹ۔“

اس مصیبت کے وقت میں —“

چراسی کمرے میں داخل ہوا۔

”یس۔“ بارلو نے پرچہ پڑھتے پڑھتے سر اٹھا کر پوچھا۔ سنہری اور سرخ دردی والے چراسی کے
تھیں چاندی کی پلیٹ تھی جس میں ایک پیلا الفاذر رکھا تھا۔

ہندوستان کے اہلکاروں، چراسیوں اور سائیسوں کی دردیاں، بگڑیاں اور ٹوپیاں بھلا نوی
لومت نے پچھلی صدی میں قدیم ہندوستانی امرا و شرفاء کی ملبوسات کے نمونے کی بنوائی تھیں۔ گویا
تہ بول، دیکھو، جو تمہارا لباس ہے، وہ ہم اپنے لوگوں کو پہنائیں گے۔

چراسی نے پلیٹ چارلس بارلو کو پیش کی۔ چارلس نے کیبل گرم کھولا۔ اسے بڑھا۔ اس کا رنگ سفید

پڑ گیا۔ چونٹ ذرا سے لرزے۔ وہ چند لمحوں تک بالکل سانس بٹھا رہا۔ پھر کندھے سے کندھے کرتے اٹھ کھڑا ہوا۔ کیبل گرام جیب میں رکھا، ابرو کے اشارے سے چپراسی سے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ پھر وہ لمبا، گہرا سانس لے کر کھوکھلی لیکن مضبوط آواز میں پادری سے مخاطب ہوا۔ "اک کیوز می پادری میں ابھی آتا ہوں۔" اور جلدی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

پادری بنزجی حیلان پریشان بیٹھ رہے۔ اس ایس بارلو کے نام خط تالین پر گر پڑا تھا۔ اسے اٹھا کر دوبارہ جیب میں رکھا اور صبر سے چپکے میٹھ گئے۔
پندرہ منٹ، آدھ گھنٹہ، پینتالیس منٹ، ایک گھنٹہ۔

پورا ایک گھنٹہ گزر گیا۔ تب پادری بنزجی لائبریری سے باہر نکلے۔ کوٹھی پر ایک دم ہموکا عالم طاف تھا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر شاگرد پیشے کی طرف روانہ ہو گئے۔ جس کے نزدیک ساسے ملازم ایک مجموعہ کی صورت میں جمع آپس میں کھسکھس کر رہے تھے، عبدالغفور ان کی طرف آئے۔
"کیا بات ہے عبدل۔؟"

"صاحب! " عبدالغفور نے دھیرے سے کہا اور ان کو ساتھ لے کر باغ کی روش پر آگئے۔ خوب صورت ڈک پونڈ میں بطخیں بڑے سکون سے تیر رہی تھیں۔ دور مرغی خانے میں ایک مرغی کٹ کٹلاتے جا رہی تھی۔ پادری خانے کی چٹنی میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔
"صاحب۔" عبدالغفور نے کہا۔ "میم صاحب گزر گئیں۔"
"گوڈ میورنی۔ کیسے عبدل؟"

"صاحب بیٹہ دم میں مبتلا بیٹھلے۔ ابھی اس نے مجھے آواز دی تھی۔ میں اندر گیا تو آہستہ سے بولا۔ عبدل۔ ہمارا میم صاحب گند گیا۔ ولایت سے تارا آیا ہے۔ جرمین والا بم گرا رہا تھا۔ راکٹ بولتے ہیں۔ کیا بولتے ہیں۔"

”وی ٹورا کٹ“

”جی پادری صاحب، وہ بدھ کی رات کو صاحب کے مکان پر گرا۔ مکان جلنے کے راکھ ہو گیا۔

صاحب اندر سو رہی تھی، وہ بھی —“

”مگر ادھر تو عبدل ایر ریڈ کا بھونچتا ہے۔ سب لوگ تہ خانوں میں چلا جاتا ہے۔“

”معلوم نہیں، صاحب نے اتنا ہی بولا۔ اور بولا کہ بابا لوگ سے باہر اسکول کے پور ڈنگ

ہے، اس وجہ سے وہ بچ گیا۔ اور میٹس صاحب بھی بچ گئی۔ اس کو مسیم صاحب نے بڑھا لوگ

یوم میں ڈال دیا تھا۔“

”شکر ہے۔“

”صاحب نے بولا ہے پادری صاحب سے کہو ہم ابھی آتے ہیں۔“

”اچھا۔ تحقیق یو عبدل۔“

عبد الغفور واپس چلے گئے۔ پادری بنرجی واپس آکر لا بُریری کے سامنے والے برآمدے میں

سلنے لگے۔

بوٹ کی چاپ سنائی دی۔ چارلس بارلو برآمدے میں نمودار ہوا۔ پادری بنرجی کی طرف بڑھے۔

”مسٹر بارلو۔“

”پلوے بدھ کی رات کو مسٹر بارلو کا ایر ریڈ میں انتقال ہو گیا۔“

”اس کی معنی پوری ہو۔“

”آئیے بیٹے۔“ اُس نے پھولدار گدیوں والی بید کی ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور خود

دسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

چند منٹ تک خاموشی چھائی رہی۔ باغ میں چڑیاں چہچہا۔ ہی تھیں۔ فطرت اسی بے نیازی سے

ندہ رہتی ہے۔

”غم نہ کیجے مسٹر بارلو، مسٹر بارلو ایک بہت بہتر جگہ چلی گئیں۔“

”بہتر جگہ —؟ آپ کو کیسے معلوم۔ اس دُفوق سے کس طرح کہتے ہیں؟“ چارلس نے ہنچلا

رکھا۔ ”بہتر جگہ صرف یہ دنیا ہے۔ باقی اب لوگوں کی خام خیالی اور خوش فہمی ہے۔“

پادری بنرجی خاموش رہے

چارلس بار تو بخفی سے ہنسا۔ "THE LORD HIS INFINITE MERCY"

پادری بنرجی نے آہستہ سے کہا "خدا واقعی بڑا رحیم و کریم ہے۔ میرے بیٹے"

"ہا ہا۔ اس رحیم و کریم نے میرے جوان اور نیک دل باپ کو آدم خور شیر کا نوالہ بنا دیا۔ یہ اور معصوم بچہ بھی کو جینویں سے RAPE کروا کے قتل کر دیا۔ اس رحیم و کریم نے میرے جوان بھائی کے جزائے اندھیرے آسمانوں پر پہنچے اڑا دیے۔ وہ رحیم و کریم اس وقت ساری دنیا کے لاکھوں بے گناہ انسانوں کی طرح کی موت مار رہا ہے۔ وہ رحیم و کریم اسی جنگل میں ہر سال ان گنت بے گناہ اور مصیبت زدہ کو طوفانوں اور سیلابوں اور وباؤں کی نذر بنا رہے۔ اور یاد رہے تمہارا وہ رحیم و کریم خدا نفعی بچہ نہ تھا۔ ابا ہج اندھا کر دیتا ہے۔" وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ سوری پادری نے

پادری بنرجی ذاتی کراسٹس کے مواقع پر اسرار ربانی و لاعلم فانی انسانوں کے منہ سے ا کے کلمات کفر سننے کے عادی تھے۔ انہوں نے جیب سے بائبل نکالی اور تیسواں مکن پڑھنا شروع کیا۔ تیسواں مکن جادو کا اثر رکھتا ہے۔

خداوند خدا میرا گڈریہ ہے، مجھے کوئی ڈر نہیں وہ مجھے ہر جگہ لگا ہوں میں آرام کر داتا ہے۔ وہ مجھے خاموش پانیوں کے کنارے کنارے لے جاتا ہے۔

پادری بنرجی نے کتاب گود میں رکھی اور پڑھنا شروع کیا۔

اور گویں موت کے سائے کی وادی میں چل رہا ہوں۔

لیکن ان کے ساتھ ساتھ مکن کی تلاوت کرنے کے بجائے چارلس تیوری پر بن ڈالے سر ہلائے رہا تھا۔ اور اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ پادری بنرجی نے مکن ختم کر کے بائبل کے ورق گردانی شروع کی۔ کوئی اور سکون بخش حصہ پڑھ کر سنائیں۔ مگر عجیب بات تھی کہ ہر صفحے پر ان کی نظریں جڑی پریشان ک سطر پر جڑی جا پڑتی تھیں۔

اے یعقوب! تم اپنی ان مسیبتوں پر جو آنے والی ہیں رُو اور داد دیا کرو، تمہارا مال بگڑ گیا، تمہاری پوشاکیں کو کھڑا کھا گیا، دیکھو! جن مزدوروں نے

تہا بے کھیت کاٹے ان کی وہ مزدوری جو تم نے دغا کر کے ضبط کر لی تھی چلائی ہے۔ اور فصل کاٹنے والوں کی فریاد رب الانواج کے کانوں تک پہنچ گئی۔ دیکھو منصف دروازے پر کھڑا ہے۔

پادری بنرجی نے گردن آگے بڑھا کر ورق پلٹے۔ یوحنا کا مکاشفہ —
خدا کا بیٹا جس کی آنکھیں آگ کے شعلے کے مانند اور پاؤں
خالص پتیل کے مانند ہیں فرماتا ہے کہ تیرے کاموں اور محنت اور ایمان
اور خدمت اور صبر کو تو جانتا ہوں اور یہ بھی —
اور آگے —

اور جب اس نے چھٹی مہر کھولی تو میں نے دیکھا کہ سورج کمیل کی مانند کالا اور سارا چاند حور انس
ہو گیا اور ستارے انجیر کے درختوں کے کپے پھلوں کی طرح گر پڑے۔ آسمان اس طرح مہر کی جبرط سے
ملکوب پلٹنے سے سرک جاتا ہے۔

پھر آسمانوں پر لڑائی ہوئی اور —

پھر میں نے شیشے کا سا ایک سمندر دیکھا جس میں آگ ملی ہوئی تھی —
شہر بابل گر پڑا۔ زمیں کے بادشاہ جب اس کے جلنے کا دھواں دیکھیں گے تو اس کے لئے
روئیں گے اور دنیا کے سوا اگر اس کے لئے ماتم کریں گے۔ اور سب ناخدا اور مسافر اور تاج و دو کمر
اپنے سروں پر خاک ڈالیں گے کہ افسوس افسوس وہ بڑا شہر جس کی دولت سے سمندر کے جہاز والے دولت مند ہوئے۔
پھر میں نے آسمان کو کھلا ہوا دیکھا۔ اور کیا دیکھتا ہوں ایک سفید گھوڑا ہے اور اس پر ایک سوار ہے۔
وہ خون آلود پوشاک پہنے ہے اور قوموں کے مارنے کے لئے اس کے منہ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے۔ اور —
پھر میں نے ایک فرشتے کو آفتاب پر کھڑا دیکھا اور اس نے بڑی آواز میں چلا کہ آسمان میں اڑے والے
سب پرندوں سے کہا کہ خدا کی بڑی ضیافت میں شریک ہونے کے لئے جمع ہو جاؤ تاکہ تم بادشاہوں کا گوشت
اور فوجی سرداروں کا گوشت اور گھوڑوں اور ان کے سواروں کا گوشت کھاؤ —

پھر میں نے ایک نئے آسمان اور نئی زمین کو دیکھا۔ کیونکہ پہلا آسمان اور پہلی زمین جاتی رہی تھی

اور روح اور دہن ہیں آ، اور سننے والا بھی کیسے آ اور جو بیاسا ہو وہ آئے اور آبِ حیات لے۔
پادری بزمِ جہنم نے گہرا سانس لے کر نیا عہد نامہ بند کر دیا اور سوچ میں ڈوب گئے۔

تب چارلس کی بھاری آواز نے انہیں چونکا دیا۔

”پادری! مجھے ایوبؑ کی گریہ دزاری سناؤ۔“

”بہت اچھا۔ اور آپ جی جبرائیلؑ سے سبق لیجئے۔ مسٹر مالو۔“

”سبق بعد میں لوں گا۔ تم مجھے پیدائشِ عبرانی بدھ سے کی گریہ دزاری۔“

”خاموش مسٹر مالو۔ پادری نے دفعۃً ڈانٹ کر کہا۔“ ”بہت بدیہ ادبی کر لی۔ اب خاموش
”سواری پادری۔“

پادری نے دوبارہ عینک کا کیس کھولا، عینک تبدیل کی، اور حیب سے مداری کی طرح پڑانا
عہد نامہ نکالا۔

”جستہ جستہ پڑھ کر سناؤں گا، بہت طویل باب ہے۔“

”اور پھر ایوبؑ راکھ میں بیٹھ گیا۔ اور اس کے تین درست پڑ سے کو آئے۔ اور انہوں نے خاک مرون

پر ڈالی اور اس کے ساتھ زمین پر بیٹھ رہے۔ اور سات دن اور سات رات زمین پر بیٹھے رہے۔ اور ایوبؑ
نے کہا، لعنت ہو اس دن پر جب میں پیدا ہوا تھا، میرے جسم پر کیرے ریگ رہے ہیں، میری کھال اٹھ
گئی، میرے دن جولا ہے کئی کلیفوں کی مانند تیز رفتار ہیں۔ میری زندگی ہوا بن گئی۔“

”خدا بے گناہوں کے مصائب پر بہشتا ہے اس نے زمین کو ظالموں کے حوالے کر دیا۔ منصفوں کے چہرے
چھپا دیئے۔ میری زندگی تیز رفتار جیاز کی مانند گزر رہی ہے۔ مجھے اپنے غموں سے ڈر لگتا ہے۔“

”میں خدا سے کہوں گا تجھے زیب دیتا ہے خداوند اگر اپنے بندے سے متنفر ہو اور ظالموں کا ساتھ

دے؟ کیا تو کبھی انسان ہے؟ ذرا کو عیش کر رہے ہیں اور خدا ان کو بڑا دوا دیتا ہے وہ قوموں کو ترقی دیتا ہے
اور تباہ کرتا ہے اور پھر ترقی دیتا ہے۔ میری آنکھوں نے یہ سب کچھ دیکھا۔ کانوں نے سنا۔ اور عقل نے سمجھا۔
اور اب میں خدا سے ذرا منطقی جرح کرنا چاہتا ہوں۔“

”ابن حوا کی مختصر زندگی کھفتوں سے پُر ہے۔ وہ پھول کی طرح کھلتا ہے اور کٹ کر گر جاتا ہے۔“

سائے کی طرح غائب ہو جاتا ہے۔ پانی کی خوشبو کے درخت کو از سر نو زندگی بخشی ہے۔ مگر ابن آدم ایک تیرتہ

جاے پھر نہیں اٹھتا۔ لے کر تو، جب تک تیرا طیش خائل نہ ہو، مجھے قبر میں چھپائے گا۔ میں اپنے وقت
منتظر ہوں۔

”پانی پتھروں کو بہلے جاتا ہے، تو افسان کی امیدوں پر پانی پھیرتا ہے۔ تو اس کی شکل بدل
لے۔ تو نے مجھے بلکان، پاش پاش کر دیا۔ میرے چہرے پر حقیریاں ڈال دیں۔ مجھے جابر دہلے کے حوالے
دیا۔ میری بائیں توڑ ڈالیں۔ میرا چہرہ روتے روتے بد ہتیت ہو چکا ہے۔ میری پٹکوں پر موت کا سایہ لڑا
، لے لے زمین میرا خون نہ چھپا۔ میری شنوائی نہ کر، میری قبریں میرے لیے تیار ہیں۔ میری آنکھیں دفن و غم
، دھندلا گئیں۔ مجھے تم سب میں ایک دانشمند نظر نہیں آتا۔ میرے مقاصد کا خاتمہ ہوا۔ میرے خیالات
۔ ٹوٹ کر بکھر گئے۔ قبر مرا مکان ہے۔ میں نے اپنا بستر امدھیرے میں بچھایا ہے۔ میں نے جسم کی کلن سے
۱۔ تم میرے باپ ہو، کیڑ وند سے کہا تم میری ماں اور بہنیں۔

”جانو کہ خدا نے مجھے اپنے حال میں گرفتار کیا۔ میری راہ میں روڑے اٹکائے، اور راندیہرا پھیلایا۔
ن کے لشکر نے میرے معبود کو گھیر لیا۔ میرے بھائی اور میرے عزیز اور میرے دوست مجھے بھول گئے۔ میں
نی بی بی کے لئے اجنبی ہوں، دوستو مجھ پر ترس کھاؤ کہ اس قہار و جبار کے ہاتھ نے مجھے چھو لیا ہے۔
”میں انسان کا شاکی نہیں لیکن اشتیاق بر لطا اور رغنون بجاتے ہیں۔ جبکہ میں آگے بڑھتا ہوں تو مجھے
راہیں ملتے پیچھے دیکھتا ہوں تو بھی نظر نہیں آتا۔ میں اس حاضر نظر کی موجودگی سے مضطرب ہوں، مجھے اس
ہے ڈر لگ رہا ہے۔ اس نے میرا دل گداز کر دیا ہے۔

”اہل ثروت حاجت مندوں کو اپنے راستے سے ہٹا دیتے ہیں۔ مفلس مہردی میں ٹھہرتے ہیں۔ کوہستان
رش میں کانپ رہے ہیں۔ چٹانوں میں پناہ گزیں ہیں۔ اماران بھوکوں کا اناج چھینتے ہیں، جنہوں نے ان کے
نے کو لہو چلائے۔ جو ان کے لئے شراب کشید کر کے خود پیاسے رہتے ہیں۔ جو شہر پناہ سے باہر کر لیتے ہیں۔
”میں نے خیر کی آرزو کی اور مجھے شر طار۔ روشنی کا منتظر رہا اور تاریکی پائی۔

”جب وہ رب کریم میرے شمالی حال تھا اور میری اولاد میرے ساتھ تھی، جب میں اپنی میٹر حیاں
کھن سے دھوتا تھا۔ میں شہر میں نکلتا تھا تو نو جوان مجھے دیکھ کر چھپ جاتے۔ بوڑھے تعظیماً اٹھ کھڑے ہوتے
تھے۔ شہزادے بات کرتے کرتے خاموش ہو جاتے تھے۔ کیونکہ میں غریب، کا حامی و تنہا ہوتا تھا۔ میری جڑیں ندی
لگا سے پھیلی تھیں۔ میری شاخ پر شبنم گرتی تھی۔ میری عظمت و شوکت تروتازہ تھی۔ لیکن اب نو جوان جن

کے باپوں کو میں اپنے گلے کے کتوں کے ساتھ بھی نہ بٹھاتا، میری تعنیک کرتے ہیں۔ اور آندھی کی مانند مجھ پر
 حملہ آور ہیں۔ اور تب میں نے اُٹھ کر صبح سے کہا میں آندھ ہے کا بھائی اور نویم کا ساتھی ہوں میری کھال جل گئی۔
 میرا ریشہ رورہا ہے۔ کیا خدا میری حالت نہیں دیکھتا۔ کاش وہ میری فریاد سنے، کاش میرے دشمن ایک کتاب لکھیں جسے
 میں اپنے کندھوں پر رکھوں اور تاج کی طرح پہنوں، اگر میری زمینیں میری وجہ سے لڑکھاں ہیں، تو کاش
 گھوڑوں کے بجائے گوکھرو اور جو کے بجائے گھاس بھونس ان پڑائیں۔ — ایوبؑ کے الفاظ ختم ہوئے۔

”تب جوئے میں سے خداوند عالم نے ایوبؑ کو جواب دیا۔ —“

پادری نے بائبل بند کر دی، چارلس کرسی کی پشت سے سر نکالتے آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ اس نے چونک
 کر پادری دیکھا۔ —

”ان تینوں دانش مند دوستوں کے نام کیا تھے جو ایوبؑ کو سمجھنے آئے تھے؟“

”ایلی ہو، بل داد اور ایلی فائز۔“ پادری نے جواب دیا۔

”ایلی ہو، بل داد اور ایلی فائز۔“ چارلس نے ذرا کٹائی ہوئی آوازیں دہرایا۔ اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا

زہن کیس اور جھٹک رہا تھا کیونکہ وہ بہت دیر سے سوچ رہا تھا۔ — کرنل جوئیل جو مکان میں مقیم تھا
 وہ بھی اسی رات ان شعلوں میں بھسم ہوا، تم بھی اس کے ساتھ جل کر کوئلہ ہو گئیں۔ تمہارا خوب صورت جسم کوئلہ
 بنا۔ تم مرتے وقت بھی مجھ سے بے وفا تھیں۔ افسوس۔ افسوس۔ افسوس۔ —

اس نے میز پر سے نیا عہد نامہ اٹھایا اور صفحہ الٹے لگا۔ اُسے بھی ”یوحنا کے مکاشفے“ نے متوجہ کیا
 اور سب سے پہلے اس کی نظر بڑی۔ — ”اور پھر جب میں نے نگاہ کی تو آسمان کے برج میں ایک عقاب کواڑتے دکھیا
 اور بڑی آواز سے کہتے سنا کہ ان تین فرشتوں کے زرسنگوں کی آوازوں کے سبب مجھ کو کچھ کنا ابھی باقی
 ہے زمین کے رہنے والوں پر افسوس، افسوس، افسوس۔ —

”اور ان سات فرشتوں میں سے جن کے پاس سات پیالے تھے، ایک نے مجھ سے کہا آئیں تجھے
 اس بڑی کسی کی سزا دکھاؤں جو بہت سے پانیوں پر بیٹھی ہے۔“

چارلس بارلو نے زد سے کتاب بند کر لی۔ یہ سطور بائبل کے متعلق ہیں۔ لندن کے متعلق نہیں۔

وائلیٹ بارلو۔ — مرحومہ۔ — کے متعلق بھی نہیں۔ بائبل۔ — بائبل۔ — بائبل۔ —

اب میں بیمار پڑ جاؤں گا۔ اب مجھے حاضری کھانا چاہیے۔ اب مجھے

کا دیری کے کنارے اجاڑ بنگلہ — پتیا کے کنارے اجاڑ بنگلہ — اجاڑ —
 ”اس نے زور سے آواز دی۔

عبدالغفور اچانک سامنے آن موجود ہوئے۔ وہ سید طولی اور پریشان نظر آرہے تھے۔ ”صاحب
 دڑا سا حاضری کھا لیجئے۔ اب تین بج رہا ہے۔“

چارلس بارلو نے انتہائی مشکور نگاہوں سے اولڈ عبدل کو دیکھا۔ ”اچھا۔ تھینک یو عبدل
 — پادرے میرے ساتھ بچ کھا کر جاؤ۔“

”تھینک یو، مسٹر بارلو۔“

وہ دونوں کھانے کے کمرے میں گئے۔ میز پر بیٹھ کر پادری نے گریس پر بھی سوپ کے بعد عبدالغفور
 لورس خاموشی سے سرو کئے۔ اسی خاموشی سے کھا نا ختم کر کے چارلس اور پادری باہر نکلے۔
 ”پادرے۔ میں ایس کو آج ہی تہہ ٹرنک کال کر دوں گا کہ وہ روزی کی غیرت معلوم کر لیں،
 وہ ہے کہ میں رہائی کی کوشش نہیں کر سکتا۔ مل اگر وہ معافی مانگ لے۔“

”وہ معافی نہیں مانگے گی۔“

”تو پھر میں بھی کچھ نہیں کر سکتا، پادرے۔“ چارلس نے پادری کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

ما فظ پادرے۔“

”خدا حافظ، گوڈ بلیس یو، مسٹر بارلو۔“

چارلس بارلو اندر چلا گیا۔ پادری ہنرجی نے سیٹ ریک میں سے چھتری اٹھائی۔ اب ان کے
 سامن بھر کے ہو چکے تھے۔ اب ان کو معلوم تھا کہ روزی کی قسمت میں بہت طویل قید ہے۔
 مرقید —

وہ مہر جھکائے جوں کی چال چلتے برساتی سے باہر نکلے اور پچانک تاک اس طرح پہنچے جیسے کسی
 کے ساتھ جا رہے ہوں۔ پچانک پر کھڑے ہو کر انہوں نے آسمان کو دیکھا۔ پھر سوچا اب
 باؤں بارش بہت دیر سے تھمی ہوئی تھی۔ وہ پچانک سے باہر آ کر ایک طرف کو چند قدم چلے،
 بذب کے عالم میں ٹھٹھک گئے، پھر چلنے لگے۔

نواب قمر الزماں چودھری

نواب قمر الزماں چودھری پھل سیٹ پر ٹانگ پر ٹانگ رکھتے چٹری کی لقری موٹھ پر اپنا اپنی سیاہ بیوک میں ارجمند منزل کی طرف چارپے تھے۔ جو ڈی ایمزدوس سے چند فرلانگ پر واقع تھی۔ وہ گھر کے قریب پہنچ چکے تھے۔ جب ان کو پادری بنرجی کچھوے کی چال چلتے منہ اٹھائے ایک طرف کو صبر نظر آئے۔ ان کے چہرے کی حالت دیکھ کر نواب صاحب کا دل دہل گیا۔ انہوں نے موٹر کو آئی اور رات پادری کے پاس پہنچے۔

پادری نے ان کو دیکھا اور یک لمختہ اطمینان کی سانس لی۔ نواب قمر الزماں اس وقت ڈوب کو تینکے کا سہارا معلوم ہو رہے تھے یا فرشتہ رحمت۔ نواب صاحب نے خاموشی سے ان کو اپنے برابر کار میں بٹھایا۔ صبح کا اخبار پڑھ چکے تھے۔

ارجمند منزل پہنچ کر وہ برآمدے میں پڑے صوفے پر بیٹھ گئے۔ پادری کو بٹھایا اور چائے منگوا کر سامنے لان پر آلا۔ نواب الزماں کے نوزائیدہ بچے کو گود میں لئے ٹھہل رہی تھی۔ اندر ریڈیو بج رہا تھا۔ پادری بنرجی نے جیب سے اخبار نکال کر نواب صاحب کے سامنے پیش کیا۔

”میں پڑھ چکا ہوں۔ جگلا اخبارات میں زیادہ مفصل خبریں ہیں۔“ انہوں نے آہستہ سے کہا۔ بشیر چلا لے کر آیا۔

”میں ابھی ڈی ایم کے پاس گیا تھا۔ اس نے کوئی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا۔“ نواب صاحب نے چائے بنائی۔

”ڈی ایم کی بیوی لندن کی بیماری میں ماری گئی اور آبائی مکان بھی جل گیا۔“

نواب صاحب نے آنکھیں پھیلا کر پادری کو دیکھا۔ پادری اس وقت ایک سیاہ لپش پہننا مبر نظر آتا تھا۔ جس کے پاس بری خبروں کے عدادہ اور کچھ نہ تھا۔

”اللہ رحم کرے۔“ نواب صاحب نے آہستہ سے کہا۔

اچانک پادری کھڑا ہو گیا۔ ”نواب صاحب میں ڈاکٹر سرکار سے ملنا چاہتا ہوں۔ اسی وقت نوٹہ صدر کے درجہ سے پادری بلو کھنا گیا ہے۔ بے چارہ۔ بے چارہ۔“

”آپ بیٹھے پادری صاحب میں۔“ نوٹہ بابو کو ابھی بلوانا ہوں۔ کیا وہ آپ کی کچھ مدد کر سکیں گے؟“

”میں ڈاکٹر سرکار سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ پادری نے دہرایا۔

نواب نے تالی بیانی۔ ”بھئی بھئی مالا قریب آئی۔“

”ڈرائیور کو بلاؤ۔“

ڈرائیور حاضر ہوا۔

”نوٹہ بابو کو فوراً ساتھ لے آؤ۔ کہنا ہے حد ضروری کام ہے۔“

پادری اور نواب چپ بیٹھے رہے۔

کچھ دیر بعد موٹر دوبارہ برساتی میں داخل ہوئی۔ چادر لپیٹے ہوئے بابو دقار سے سیڑھیاں

سے نواب نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا اور قریب کی کرسی پر بٹھایا۔ ”نوٹہ بابو نے پادری کو ہسٹکار

در نواب سے پوچھا۔“ میں ابھی بھی فرید پور سے واپس آیا ہوں۔ ہمارے سفر کے کپڑے بھی نہیں بدلے

کیا بات ہے خیریت؟“

”خیریت؟“ پادری ایک دم برس پڑا۔ ”میں آپ کو بتانا چاہتا تھا، یہ سب کچھ آپ کی رطل کی وجہ

ہوا۔ سب کچھ۔“

نوٹہ بابو نے خیریت سے پہلے پادری کو دیکھا اور پھر نواب کو۔

”تمہیں نہیں معلوم ہوئے۔“ نواب نے آہستہ آہستہ کہا۔ ”روزی کئی صبح اشترڈی کی بغادت میں

جو کی پرچو کرتی ہوئی قید کرنی گئی۔ پولس فائرنگ سے کئی حمزہ مارے گئے۔ روزی کے سخت زخمی ہونے

ملاع خبر میں شامل ہے۔ یہ کل رات کی خبر ہے۔ یہ شاید کل صبح کے اخباروں سے معلوم ہو گا کہ اس کا کیا

ہے اور کس جیل میں بھیجا گیا ہے۔ زخمی قیدیوں کو تو شاید جیل کے اسپتال میں رکھا جاتا ہے۔“

اندر کسی کمرے میں۔ نیز الزماں گراموفون بجا رہے تھے۔ اچانک تدرل کا ریکارڈ بجنا شروع

توڑو۔ بھوڑو۔ مارو۔ آگ لگا دو۔ آندھی طوفان بن جاؤ۔ میں سرکش ہوں۔ اصولی شکن۔

بربادی کا دلیوتا۔ باغی۔ میں ہمیشہ سربلند رہوں گا۔

”لا حول ولا قوۃ۔“ اسٹاپ اٹ۔“ نواب نے بے حد آزر دگی کے ساتھ زور سے آواز دی۔
گیت ختم ہو گیا۔

پادری نے سراٹھا کر بنوئے بابو پر نظر ڈالی۔ اتنی دیر میں شاید وہ اپنے غصہ پر قابو پا چکے تھے۔ انہوں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ”بنوئے بابو میری فرمانبرداری کو دیسپالی نے اس راستہ پر لگایا۔ اسے دیسپالی کی صحبت نے برباد کیا۔ بس میں آپ سے اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں۔ اور یہ بھی کہ باپ کی حیثیت سے آپ کا فرض تھا کہ آپ دیسپالی کو غنڈوں کی سنگت سے روکتے۔ میں نے اپنے بھرپوری کوشش کی، اپنی سچی کوشش کی۔ مگر اس کے دماغ میں زہر بہت اچھی طرح بھرا جا چکا تھا۔“

”آپ لوگ سب غالباً مجھے ایک رجعت پسند مسلمان زمیندار سمجھتے ہیں۔ مگر لڑکیوں کی آزادی کے یہی سبب متاثر ہیں۔ اسی وجہ سے میں نے اپنی لڑکیوں کو اجازت نہیں دی کہ گھر سے قدم نکالیں۔“ نواب نے کہا۔

”مجھے معلوم نہیں کہ دیسپالی کس حد تک سیاسی مشاغل میں حصہ لیتی ہے۔ اس نے ایک دفعہ مجھ سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ ٹرمسٹ تحریک میں شامل نہ ہوگی۔ اور میں نے اس کے قول کا اعتبار کیا ہے۔ علاوہ ازیں اگر وہ مجھ سے چھپا کر کسی سیاسی تحریک میں شامل ہے تب بھی میں کچھ نہیں کر سکتا تھا نہ اُسے منع کر سکتا ہوں۔ ہر نئی نسل اپنا راستہ خود بناتی ہے۔ آپ نے بھی اور میں نے بھی اپنے اپنے طریقے سے اپنے لئے نئے راستے تلاش کئے تھے۔ منموہن بابو آئیے خدا سے امید کریں کہ روزی خیرت سے ہو۔ آپ پر اس وقت جو بیت رہی ہے وہ میں سمجھ سکتا ہوں۔ دینش بھی۔“ پھر وہ چپ ہو گئے۔

طارز نے سچوان لاکر نواب کے پاس رکھا۔ پادری نے سراٹھا کر دفعتاً نواب کو مخاطب کیا۔ ”اور آپ بھی۔ آپ کا انگریز کے چلے جانے سے کیا فائدہ ہوگا، نہرو نے دیسپالی کو برباد کر دیا۔“

نواب حقہ لڑ لڑا تار مارا۔ سیاست حد سے زیادہ ٹھنک ہو گئی ہے۔ اللہ اکبر۔ یہ خستہ حال کالا پارک اور یہ خستہ حال ڈاکٹر۔ ان دونوں کو غالباً آزادی سے فائدہ ہوگا۔ مگر واقعی مجھے کیا فائدہ ہوگا۔ ریاست البتہ چلی جائے گی۔ میں نے اقتصادی پہلوؤں پر زیادہ غور نہیں کیا۔ مگر اقتصادی مسائل پر غور کر کے رونے پہلے ہی

فت پجار کھی ہے۔

دو تونے خیال نے انہیں یک نخت بید مضطرب اور طول کر دیا۔ وہ بچوان گڑ گڑایا کئے۔ پھر انہوں نے پادری سے کہا۔ ”منو موہن بابو۔ میں بھی سمجھ سکتا ہوں، آپ کے دل پر کیا گور رہی ہوگی۔ اپنے لادے بھانجے کا خیال آتا ہے تو میرا دل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اس نے کس طرح ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ تم نئی نسل کی بات کرتے ہو بنوئے۔ یہ بڑی احسان فراموشی، ام نئی نسل ہے۔ پچھلے سال تمہاری بچی مجھ سے بحث کرنے لگی۔ قربانی اور تیاگ۔ یہ اور وہ۔ بچی سے کیا کہتا کہ سیاست کی قربان گاہ پر میں اپنی سسرتوں کی قربانی دے چکا ہوں۔ میرے ہونہار کو سیاست ہڑپ کر گئی۔“

”تمہارا کون بھانجا کو مر میاں؟“ بنوئے بابو نے پوچھا۔

”تم سے بنوئے برسوں میری ملاقات نہیں ہوتی۔ تم میرے حالات سے اجنبی ہو چکے ہو۔ اس قصہ کو بھلائے نہ کھنا اسی میرے لئے بہتر ہے۔ میں اپنی اس ٹریجڈی اور اپنی بیٹی کی قیدی ن پردہ پوشی ہی میں عافیت سمجھتا ہوں۔ رہنے دو یوں ہی بات سے بات نکل آئی۔“

”سوری کو مر میاں۔ مجھے معلوم نہ تھا۔“

مگر اب نواب آہستہ آہستہ بچوان گڑ گڑاتا اور کہتا رہا۔ ”میری آنکھوں کا تارا۔ میری مرحومہ شانی۔ میرا لادلا۔ جس پر فخر کرتے کرتے میں پھولانہ سماتا تھا۔ جس کی میں نے زندگی بنادی۔ اور میکہ ساتھ۔ میری لڑ۔ میرے ساتھ کیا کیا؟۔ یہی۔ منو موہن بابو۔ یہی۔ ہوٹرو، آگ لگا دو، اینٹ سے اینٹ بجا دو۔ منو موہن بابو۔ آپ اور میں اور بنوئے ہم سب میں سوار ہیں۔ روٹو۔ روزی۔ دیپالی۔ یہ سب مل کر ہم کو اس چیز کی سزا دے رہے ہیں کہ ہم نے بے ایک محفوظ دنیا تخلیق کی تھی۔ یہ لوگ اسی لئے پیدا ہوئے ہیں کہ اس محفوظ دنیا کو دہکاتے ہوئے کو نیست و نابود کر دیں۔“

”مگر کس لئے۔؟“ پادری نے پوچھا۔ ”ہمیں نیست و نابود کرنے کے بعد یہ کس قسم کی دنیا؟“

اس بات کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ نواب نے افسردگی سے کہا۔

بنوئے بابو صوفے سے اٹھے، پادری صاحب بھی اٹھے، ”مجھے معاف کر دینا بنوئے بابو، میں ہوں
 داس کھو بیٹھا ہوں۔“ بنوئے بابو نے پادری کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔
 نواب صاحب کرسی بٹاکر پادری کے نزدیک آئے۔
 ”منموہن بابو۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ دعا کرتے رہئے۔ روزی یقیناً خیریت سے بہت
 غمروٹے گی۔“

پادری نے بے یقینی سے اقرار میں سر ہلایا۔ نواب نے نیچے اتر کر میوک کا دروازہ کھولا۔ پادری
 ڈاکٹر چھپے بیٹھ گئے۔ ڈرائیور لپک کر آیا۔ موٹر میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا۔ موٹر آگے بڑھ گئی۔
 رات کو راجندر منزل میں نواب کی پہلو بٹھی کے پوتے منوہر الزماں کے غیقے کے سلسلے میں بڑا بھارا
 تھا۔ آٹھ بجے مہمان آنے شروع ہو جائیں گے۔

_____ بابریہ عیش کو شش _____ ؟

نواب برساتی سے نکل کر پائیں باغ کی سمت چلے گئے۔

ہم تینوں۔ میں۔ سرکار اور بنرجی۔ ہم تین بنگالی، تین مختلف راستوں پر کھڑے ہیں۔ میں اور
 دوا ایسے کھبے ہیں جن کو گھٹن لگ چکا ہے۔ مگر پال میتھیو بنرجی بے چارہ یہ بات سمجھ نہیں سکتا، اور
 کر بھی کیا کر لے گا۔

پچھلے لان پر پہنچ کر ان کو بارلو کی میم کا خیال آیا۔ پادری نے بتایا تھا کہ سناؤنی سن کر بارلو نے
 بہادری اور ضبط سے کام لیا۔ خالص اسٹف اپر لپ۔ بھٹی اگر ایسی ہمتیں نہ ہوتیں تو ساری دنیا پر حکومت
 کرتے۔ نواب لان پر ٹپٹنے لگے۔ کل سارے عائدین شہر تعزیت کے لئے جائیں گے۔ مجھے بھی جانا ہو گا۔ وا
 بارلو جنگال کی پور وین سو سائی میں کافی دل پھینک مشہور تھی۔ خاصی آوارہ۔ پھل کی طرح پتی تھی۔ جو
 مرگئی غریب۔ بارلو اس کی وجہ سے بہت دکھی رہتا تھا۔ اب روزی کے لئے کیا کیا جائے۔ کچھ
 ہو سکتا۔ روزی کی ماں پندرہ سالہ گری بالا اسی تالاب کے کنارے بیٹھ کر برتن مانجھا کرتی
 اور میں اس درخت کے پیچھے چھپ چھپ کر اسے طرح طرح سے چھپڑنے کی کوشش کرتا تھا۔ وقت کسٹ
 ہے، کس طرح بدلتا ہے، اللہ غنی،

”نواب صاحب _____ ایک کلرک نما نوجوان باغ کی سڑک پر پہنچ کر سائیکل سے اتر

نزدیک آکر سلام کیا۔ ”کل شام آفس میں یہ فون آیا تھا۔ یہ پیغام ہے۔“ اس نے جیب سے ایک کاغذ
 لپٹ لیا۔ ”میں نے آپ سے ملاقات کا وقت آج ساڑھے پانچ کا دے دیا ہے۔ کیوں کہ آپ کو اسی

_____“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ نواب کارنگ پرچہ پر لکھا نام پڑھ کر سیلا پڑ چکا تھا۔

”تم جاؤ۔ اندر جاؤ۔ متعلقہ کاغذات میز پر لگا دو۔“ انھوں نے خالی خالی آواز میں کہا۔

”بہت اچھا۔“ نوجوان سائیکل سنبھال کر کتب خانہ کی طرف بڑھ گیا۔

نواب چند لمحوں تک گھاس پر ٹھٹھکے کھڑے رہے۔ پھر نظریں اٹھا کر اوپر کی منزل کو دیکھا،
 اڑانے کے لیے شیشوں والی کھڑکی ہوا کے جھونکے نے کھٹ سے بند کر دی۔ وہ اس کھڑکی کو چند
 تک مہوت تکتے رہے۔ پھر اپنی رست و اراج پر نظر ڈالی، اور سر جھکائے آہستہ آہستہ کتب خانے
 سے روانہ ہو گئے۔

۲۶

ریحان الدین احمد

اس صبح جس وقت چارلس بارلو چھوٹا حاضری کے بعد اپنی اسٹڈی میں جا کر نغماتِ ہند
 میں مصروف تھا۔ ڈی ایمز اس سے کچھ فاصلے پر ووڈ لینڈز میں کریم خانہ نے بریک فاسٹ
 سب معمول تازہ پتیر لگا لاکر رکھا۔ اور چائے دانی لینے کے لئے اندر چلا گیا۔ او مارا نے ٹوسٹ
 کاتے لگاتے اخبار کی سرخوں پر نظر ڈالی۔ درق لٹے اندر کے صفحے پر ایک سرخی نے ان کو متوجہ
 کرنے لگا۔ ”ریحان _____ جلدی آؤ۔“

بریک فاسٹ کی میز پر ڈکٹینڈ کے پہلو کے برآمدے میں لگی تھی۔ گیسٹ روم کا دروازہ برآمدے کے
 ملتا تھا۔ شیو کے صابن کا جھاگ تولیہ سے صاف کرتا ریحان الدین احمد کمرے سے نمودار ہوا۔

کیا ہوا _____ ۹

”یہ دیکھو۔ سنسنی خیز گرفتاری۔“ اوما بی نے سر اٹھا کر اخبار اس کی طرف سرکا دیا۔
 کے قریب جھجک کر اس نے اچھٹی نظروں سے پورے کالم کا جائزہ لیا۔

”کماری روزی ہنرچی، کماری سندھیانگوش اور۔۔۔۔۔“ وہ تیوری پر بٹل
 بیٹھا اور خبر کو دوبارہ غور سے پڑھنا شروع کیا۔

بیروہ چائے دانی لے کر حاضر ہوا۔ اوما نے ریجان کے لئے چائے بنائی۔

”لو چائے تو پی لو۔“

”پنی لوں گا۔۔۔ غضب ہو گیا۔ اوما۔ محمود الحق اور حیوتی دونوں شہید ہو گئے۔ رڈز
 کتنی بڑی طرح زخمی ہوئی ہوگی۔ اس خبر کا کیا، کیا بھروسہ ہے۔۔۔“
 ”پور گرل۔“

”محمود اور حیوتی دونوں۔۔۔“ ریجان نے اخبار پر سے ہر کانرا نگھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔
 منٹ تک چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اوما نے مضطرب ہونے کے دیکھا کہ وہ چپکے چپکے روتا تھا۔

”اوہ ریجان۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔۔“ اوما نے اس کے بازو پر نرمی سے ہاتھ
 ”سوشلسٹ فرنٹ! ابھی جانے اور کتنے مارے جائیں گے۔“ اوما گاڑ۔۔۔ ابھی اوما
 حیوتی نے کس جوش و خروش سے مجھ سے بحث کی تھی۔۔۔ اوما دای، جے پی، لوہیا انڈر گراؤنڈ
 پر کھیل کر جن انڈولن کوڈارکٹ کر رہے ہیں، اور آپ ریجان دارا۔ اگر میزوں کے پتھو بن گئے۔۔۔
 نو۔۔۔ نوٹ حیوتی۔ نوٹ۔۔۔“

”اتنا غم نہ کرو ریجان۔ انڈولن میں اسی طرح جائیں جاتی ہیں۔ سال بھر پہلے تم بھی کسی
 مارے جاسکتے تھے۔۔۔ لو چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔۔۔“

”اوما۔۔۔“ ریجان نے غصہ سے کہا۔

”سوری اولڈ چیپ۔۔۔ تم ہمیشہ یوں ہی مارے مارے پھرتے ہو۔ نہ کھانے کی تنکر
 لیا چائے ملتی ہوگی۔ چند روز کے لئے میرے یہاں ہو تو اپنی صحت کا خیال رکھو۔“

”اوہ۔ سوری اوما۔ لاؤ۔ میں بہت upset ہوں۔“

”میں یک upset نہیں ہوں۔ تم املیٹ کھاؤ گے نا۔“

”کریم خاں۔ روز منع کرتی ہوں کہ اندامات بائل مت کرو۔“ غصے سے ایک دم ان کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔

”اوہ آوا۔ دوسرا اندام والو۔ ایسی بھی کیا قیامت آگئی۔“

”نہیں۔ تم جانتے نہیں۔ تمہی گھر پر نہ ہوں تو یہ لوگ بالکل بیگناہ لگتے ہیں۔ دُیم۔“

بیر غائب ہو چکا تھا۔

”کم آن۔ آوا۔“ ریحان نے ہنس کر کہا۔ ”کوئی کانگریس سوشلسٹ سنے گا تو کہے گا کیونٹ

لیڈر اس طرح اپنے نوکروں کو ڈانٹتے ہیں؟“

”اوہ شٹ آپ“

”آوا۔ تمہارا غصہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔“ وہ اطمینان سے حتم کرنے میں مصروف ہو گیا۔

سیڑ پر بیٹھیاں پھلانگتا برآمدے میں آیا اور اپنی ماکن کے قدموں کے پاس ڈھیر ہو گیا۔ آوا۔

ناگواری سے اس پر نظر ڈالی۔

بیرے نے دوسرا اندام لاکر آوا کے سامنے رکھا۔ ریحان نے نظر بچا کر شرارت سے کریم خاں کو آواز

ماری۔ بوڑھا بیرہ بید خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ ہونٹ پچکا کر پچھے ہٹا اور جا کر میز سے کچھ فاصلے

پر اپنی ڈیوٹی پر کھڑا ہو گیا۔

چند لمحوں کے بعد یہ جان کر کہ آوا وہی کاغذاب ٹھنڈا ہو گیا ہوگا، ریحان نے کہا۔ ”آوا

میں تم کو ایک ضروری بات بتانا چاہتا تھا۔“

”کریم خاں۔۔۔ دھوبی سے پوچھو میری ساریاں استری کر دیں۔“

کریم خاں اشارہ سمجھ کر غائب ہو گیا۔

”بال بتا دیا یا ت ہے۔“

”میں دیپالی سے شادی کر رہا ہوں۔“

اندے کا چمچ منہ لے آوا دی کا ہاتھ ہوا میں معقول ہو کر رہ گیا۔

”اس کے بغیر اگر میں جیتے جی مر گیا تو موڈ منٹ نقصان ہوگا۔“ ریحان نے مصنوعی سنجیدگی

وضاحت کی۔

آدا اب بیک آنا کر کھوپٹی سی اسے دیکھ رہی تھیں۔

”کیوں آدا؟“

”تم۔ تم ریمان۔ جب سے ہم کالج میں داخل ہوئے۔ لندن میں رہے ایک ساتھ سیاسی کام۔ تم نے آج تک مجھ سے اپنا کوئی ذاتی راز نہیں پھیلایا تھا۔ پھر اتنی بڑی بات مجھ سے کیوں پوشیدہ کی؟“

ریمان ذرا سرخ ہو گیا۔ عورتیں۔ ”آدا۔“ اس نے متانت سے کہا۔ ”ماتا ہوں تم میری دوست، سفی اہ گائیڈ ہو۔ مگر یہ میرا بہت ہی۔ بہت ہی ذاتی معاملہ تھا اور میرا خیال تھا کہ ایک عورت دوسری دست کے سلسلے میں کبھی غیر جانبدارانہ رائے نہیں دے سکتی۔“

”یہ تم میرے لئے بک رہے ہو، میں جو تم کو اپنا۔ اپنا۔“

”اوہ۔ کم آن آدا۔۔۔ مجھے افسوس ہے کہ تم کو میری اس رازداری سے دکھ پہنچا۔“

”کیوں۔“ آدا نے کرسی پر پہلو بدلا۔ ”اگر مجھے پہلے ہی معلوم ہو جاتا کہ تم اسے پسند کرتے ہو تو پہلے سے دو گنا اس کا خیال کرتی۔ مجھے خود وہ لڑکی بہت پسند ہے۔“

”تمہیں بھی پسند ہے آدا؟“ ریمان کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ ”وٹنڈ فل۔ تو تم میرے غائب کو مانتی ہو؟“

”مجھے بہت پسند ہے۔ میں ہی اسے مومنٹ میں لائی ہوں۔ تم بھولتے ہو کہ ایک لحاظ سے ری ہی وساطت سے اس سے تمہاری ملاقات ہوئی۔“

”یہ تو غلط ہے آدا۔ اس پر تو میں بہت پہلے زہر کھا چکا تھا۔ ٹو ایٹ فرسٹ سائٹ دیکھو۔“

”نیرہ۔“

”تم جذباتی طور پر ابھی تک بیڈ ایسچور ہو۔“
”ابھی تو تم میرے انتخاب کی تعریف کر رہی تھیں، پھر میں ایسچور کیسے ہوا؟ آدا اپنا ہارڈ ٹو پلاٹ لڑا تو کھاؤ۔ تم کو اس اطلاع سے ایسا۔ ایسی حیرت ہوئی ہے کہ بے چارے محمود ادر حیوتی کی ہمدست کا بھی ایسا ری ایکشن نہیں ہوا تھا۔ کمال ہے۔“

آدا چہرہ سخت کر کے چاندی کے ننھے چمچے سے انڈے پر کھٹ کھٹ کرنے میں مصروف ہو گئی۔

ریان کہنیاں میز پر رکھے انہیں دیکھتا رہا۔ یہ شاید میری زیادتی ہے۔ ایسی مخلص دوست کے
 میں ایسی سخت باتیں کر رہا ہوں۔ ”سوری اوما۔“ واقعی مجھے بہت پہلے تم کو اپنا ہمارا بنانا چاہئے تھا
 مگر حالات بھی تو کیسے ابنا رہے تھے۔ مستقل انڈر گراؤنڈ، مسلسل احتیاط، اور پھر وہ احمق بھی نہ
 کیوں مجھ سے خفا ہو گئی تھی، نہایت محنت سے اب جا کر اسے ذرا راہ راست پر لایا ہوں۔ افویہ
 کرنا بھی خاصی مشقت ہے۔ تم تو کبھی اس چکر میں پڑی نہیں، تمہیں کیا معلوم۔“
 اوما چپ چاپ انڈا کھانے میں مصروف رہی۔

”لو۔ اب تم خفا ہو گئیں۔ یہ کیا مصیبت ہے یار“ پھر اس نے دفعتاً بڑی گھبر آواز میں کہا:
 ”اوما۔ تم جانتی ہو، میں مدتوں گاؤں جا کر اپنی بہن سے نہیں مل پاتا۔ ڈھاکے میں اپنے نواسہ
 رشتہ داروں سے ملنے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔ صرف تم ہی میرے لئے سب کچھ ہو۔ تمہارے غلوں کی
 سے یہ گھر تک مجھے اپنا گھر معلوم ہو رہا ہے۔ حالانکہ۔“ وہ مسخرا ہنسا۔ ”وڈ لیسڈز کو اپنا گھر سمجھتا
 ہے مگر ہر حال اتفاق سے تم اسی محل میں پیدا ہوئیں۔ کیا کیا جائے۔ تم جہاں رہو گی وہی میرا گھر
 اوما نے ہلکیں جھپکائیں۔ ان کی عینک کا شیشہ دھندلا ہو چکا تھا۔ ریمان جھینپ کر دوسری
 دیکھنے لگا۔ وہ جذباتیت سے بے انتہا گھبراتا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ خود بھی خاصا جذباتی ہو رہا
 ہے۔ وہ جلدی سے کرسی پیچھے سر کا کر اٹھا۔ اور پیک کر اپنے کمرے سے سگریٹ اور ماچس اٹھا لایا
 سگریٹ سلگا کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے شباش آواز میں اس نے کہا ”لاؤ گرام گرم چائے تو بنا کر دو۔“
 اوما نے آہستہ سے ٹی کوڑی اٹھا کر چائے اس کی پیالی میں انڈیلی۔

”میں۔ میں تو اب چلا جاؤں گا واپس بہنٹی۔ دینیائی تمہارے حوالے۔ تم میری غیر موجودگی میں اس
 خیال رکھنا۔ وہ ذرا بے وقوف سی لڑکی ہے۔ اگر کبھی کوئی حقاقت کی بات کرے تو میری خاطر اسے معاف
 دینا۔ وعدہ۔“

”وعدہ“

”گڈ اولڈ اوما۔“ وہ اطمینان سے چلے پینے میں جُٹ گیا۔

”تمہارا خیال ہے بنوئے بلا اس شادی کی اجازت دے دیں گے؟“

”کوشش تو میں ہی کروں گا۔“

”چندر کچ جا کر میری سفارش کر دو۔ جھٹ پٹ۔“

”میں —۔؟“

”دیپالی کہہ رہی تھی۔ ڈاکٹر کو رپہلی ملاقات ہی میں تم سے بے حد متاثر ہو گئے تھے۔ جب ”کٹھوم آبا“ کی سازش کے سلسلے میں اسے اپنے ساتھ فرضی طور پر کو میل لے گئی تھیں۔ یوں اسے اگر اپنی کہ ہاں دیر لگ جائے تو وہ پریشان ہو جاتے ہیں۔“

”دیپالی کیا کہہ رہی تھی؟“

”کیا —۔؟ تمہارے متعلق —۔؟“ اس نے ہنس کر جواب دیا۔ ”کہہ رہی تھی ایسا لگتا اودادی نے بابا پر جادو کر دیا ہو۔“

”گڈ گاڈ۔“

”قسمیہ۔ ادا تم سچ جا کر زرا ان کے خیالات کا اندازہ تو لگاؤ۔“

”مجھے مڈل کلاس ہندو بنگالیوں کے خیالات کا ابھی طرح اندازہ ہے۔ بھدرا لوگ۔“

”مجھے بھی اندازہ ہے۔ مگر میں ہندو بنگالی بونڈو وازی بھدرا لوگ کی نظروں میں کم از کم ”اشترا“ تو ہوں۔ ذرا غور کرو۔ ”وہ پھر جیسا۔“ ہمارے بنگال کی ہندو بونڈو وازی مسلم بونڈو وازی کو کس سربراہ انداز میں ”اشترا“ کہہ کر گویا tolerate کرتی ہے۔!!“

”اگر کوئی تمہارے اس لہجے کو سنے تو سمجھے کہ شاید تم بھی کیونٹن ہو۔ سچے دل سے کیونٹن نہیں۔“ ادا نے ہنس کر جواب دیا۔

”رشیان بھی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔“ بہر کیف تم اب اپنے دوسرے مشن پر چندر کچہ ”کوئی ہندو یا مسلمان باپ چاہے وہ کتنا ہی روشن خیال کیوں نہ ہو اپنی لڑکی کو دوسرے میں شادی کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔“

”تمہارے ڈیڈی بھی؟“

”میرے ڈیڈی کا یہاں کیا ذکر ہے۔“

”کیوں؟“ وہ ہنسا رہا۔ ”فرض کرو تم کسی ”اشترا“ سے بیاہ کرنا چاہو، یا عیسائی۔“ انگریز سے یا چینی، جاپانی، روسی سے، تو سر پر تو ش اجانت نہ دیں گے، وہ تو جید ازاد خیال پڑ

”میسر سیاہ کا کیا ذکر ہے۔“

”اوکے، اوکے آؤما۔ پتلیوں کی طرح مشراؤ نہیں۔ ہے کوئی مرغانظرین؟ چلوں سرری توش
ری وکالت کر دوں گا۔ تم ہوئے بابو سے میرا پروپیگنڈہ کرو۔ لاؤ ملاؤ ملے۔“ اس نے دستاویز
سے آؤما کا ہاتھ کھینچ کر زور سے مصافحہ کیا۔ آؤما نے غصے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ ”ریحان۔ تمہارا
رپن کب جائے گا؟“

”اسی لونڈا رپن کو ختم کرنے کے لئے تو اب گھر لسانے کا ارادہ ہے ہمارا۔“

”کل شام کیا پروپوز۔؟“

”نہیں۔“

”ابھی تک کوئی بات ہی نہیں کی؟“

”یوں ہی۔ ذرا شاعری داعری بگھارتا رہتا ہوں۔ اس سے کہا تو ہے کہ شادی کرنا چاہتا ہوں
عدہ سنجیدگی سے۔ ایسا کہتے ہوئے برا عجیب سا لگتا ہے۔ اگر وہ اپنی یار دوست اور کامریڈہ ہوتی،
ٹکی ہوتی تو دوسری بات تھی۔ اب عجیب مسخرہ پن سا لگتا ہے۔ تم۔ تم میرا مطلب سمجھ نہیں سکتیں۔
مے formal طور پر کیا کہوں؟ بس ایک روز بھگنا کر لے جاؤں گا۔ بھگنانے کا الٹی میٹم اسے اب ملتے
ہے۔“

”تم بالکل دیوانے ہو روتو۔“

”ہوں تو ہسی۔“

اب ہلکی ہلکی بوند باندی شروع ہو چکی تھی۔ پہلو کا باغ سید تر ترازہ اور دلفریب معلوم ہو رہا تھا۔
”اچانک آؤما نے کہا۔۔۔“ تم بے چاری جہاں آرا رکواتنی جلدی بھول گئے۔“

وہ ایک دم غیر متوقع تدرکے سے ششدر سا رہ گیا۔ پھر اس نے سگریٹ کا کش لگایا اور
کر سرخ ہوتے ہوئے کہا۔ ”اتنی جلدی تو نہیں، کافی عرصہ ہو گیا۔“

”اوہ۔۔۔ یو مین (MEN)۔“

وہ خاموش ہو گیا۔ سیزر اب آؤما ہی کے قدموں سے اٹھ کر گرا بناری سے چلتا ہوا کمرے کی طرف جا
وہ اسے دیکھتی رہیں۔ پھر انہوں نے دوسرا سوال کیا۔ ”دیپالی کو معلوم ہے؟“

”نہیں۔“

”تم نے اُسے کچھ نہیں بتایا؟“

”بتانے کی کیا خاص بات تھی۔ جہاں آرام بے چاری کی میری موجودہ زندگی میں اب کیا ہے کہ میں خواہ مخواہ اس کا تذکرہ پھیرتا۔ اور بات بھی کیا تھی کہ جہاں آرام کے والد مجھے اپنا گھر داماد چاہتے تھے۔ ایسا اکثر مسلمان گھرانوں میں ہوتا ہے۔“

”دیپالی جہاں آرام کی گہری دوست ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“

”تم ابھی کہہ رہے تھے کہ پچھلے دنوں وہ تم سے خفا ہو گئی تھی۔ ممکن ہے اُسے معلوم ہو گیا۔ اس وجہ سے وہ تم سے۔“

وہ جھنجھلا گیا۔ ”اگر اس وجہ سے ناراض تھی تو مجھے با آسانی بتلا سکتی تھی۔ وہ بے صاف دل اور منہ پھٹ لڑکی ہے۔“ وہ دفعتاً چپ ہو گیا۔ اور تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ ”پتہ لا حول ولا قوۃ۔ عورتوں کے دماغ بھی عجیب انداز سے کام کرتے ہیں۔ اُسے مجھے بتانا تو چاہ تھا۔ اگر یہی بات ہے۔ مگر تم کو یہ خیال کیسے آیا؟“

”میں بھی عورت ہوں۔“

”لائیک ہیں۔“ وہ ایک لمخت سید پریشان ہو کر پیالی میں چمچ بجانے لگا۔ ”ادائی؟“ اُدائہ تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں واقعی عجیب آفت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ مجھے پارٹی کی طرف سے مار سے بی بات چیت کرنی ہے۔ ارجمند منزل جا کر۔۔۔ ادہ ہل۔۔۔“

”ارجمند منزل کب سے نہیں گئے؟“

”مدین گزر گئیں۔“

”کیوں نہیں جاتے، کیا احساسِ جرم ستاتا ہے؟“

”یہی سمجھ لو۔“

”کبھی جہاں آرا یاد آتی ہے؟“

”اپنی پہلی محبت کو ہنسان کبھی نہیں بھول سکتا ہے؟“

”تم نے مجھے ایک بار لندن میں سرسری سا بتایا تھا۔ وہ تمہاری فرسٹ کزن ہے نا؟“

”سکند۔ اب چھوڑو اس قصہ کو۔ گرے مردے اکھیر نے بیٹھ گئیں۔“

”بے چاری لڑکی۔“

”یو آر لے ڈیم گرڈک اوما“

وہ ہنسنے لگیں۔

”اور میں نے کون سا ایسا جرم کیا ہے جس کے کنفیشن کی ضرورت ہے؟“

”پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کے متعلق تمہیں دیپالی کو اندھیرے میں نہ رکھنا چاہیے۔“

”ریٹ — آئی ایم افریڈ — ازمانی اون بزنس۔“

اوما نے تازہ چائے کے لئے گھنٹی بجائی۔ وہ اس جذباتی چھوکرے کو سینڈل کرنا خوب جانتی تھی
سراکراہٹوں نے چند لمحوں بعد موضوع تبدیل کرتے ہوئے کہا — ”بے چارے محمود اور
— ہم اپنی باتوں میں ان دونوں کو بالکل بھول ہی گئے۔“

ریحان نے پلکوں پر انگلیاں بھیریں۔ ”خدا کے لئے چپ رہو اوما۔“

وہ بھی خاموش ہو کر یارش کو دیکھنے لگیں۔ خدمت گار برآمدے میں آیا۔ اوما نے چائے دانی کی
اشارہ کیا۔ — ”وہ چائے دانی اٹھا کر اندر چلا گیا۔ اوما نے آہستہ سے“

”مجھے اس وقت گڑبڑ یاد آرہی ہے۔ کس طرح گویوں سے چھپنی ہو کر مری بے چاری۔ اسپین سے اتنے
بعد میں اطلاع ملی تھی۔ یاد ہے؟“

ریحان نے الم سے سر ملایا۔

”اور مجھے یاد ہے جب تمہاری امی کے انتقال کی خبر آئی تو تم نے کہا تھا ایک طرح سے اچھا
اگر میں بھی گڑبڑ کی طرح کہیں موت کے گھاٹ اتروں تو اچھی زندہ نہ رہ سکتیں! اس وقت نہ
بے چارے محمود کی ماں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ حیوتی کے ماں باپ تو غائب اس کے بچپن ہی میں مر

ریحان اب یہ غمناک تذکرہ ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بے حسنی سے پہلو بدلا۔ ادنا نکھیں بند کر

لیکن اب اتنے عرصہ بعد اچانک اس کی امی اس کے تصور میں آن موجد ہوئیں۔ میری امی — میری

اتنی۔ اُس نے دفعتاً سر ہاتھوں میں چھپا کر میز پر ٹکادیا۔

”روٹو۔۔۔۔۔“

صرف اس کی اتنی اتنے پیار سے اسے روٹو پکارتی تھیں۔ روٹو لو چائے آگئی۔ اٹھو۔
”روٹو۔ لو چائے آگئی۔ اٹھو۔“ اوما کہہ رہی تھیں۔

اُس نے ہڑبڑا کر سر اٹھایا۔ اور چوروں کی طرح اوما پر نظر ڈالی۔ مائی لٹل مدر۔

اوما چائے گھولنے میں مصروف رہیں۔ وہ چپ چاپ اپنی پیالی کا انتظار کرنے لگا۔

”ایک بات سنو۔ مذاق بظرف۔“ اوما نے اسے پیالی دے کر کہا۔ ”تم نے اپنی غیر موجودگی؟

دیپاتی میرے حوالے کی ہے۔ فرض کرو وہ تمہارے اس قصے کے بارے میں مجھ سے پوچھے تو میں اُس
کیا بتاؤں۔“

”کوئی ایسی بات نہیں ہے، تم خواہ مخواہ اتنی دیر سے لمبا چوڑا میلو ڈرامہ بنا رہی ہو۔“ ریا
پھر جھجھکا کر کہا۔

”مگر مجھے پوری تفصیل تو معلوم ہونی چاہئے۔ فرض کرو جہاں آرا، اس سے کچھ کہے تو خود اُڑ

کی پوزیشن کتنی نازک اور awkward ہوگی اور وہ تمہارے متعلق کیا سوچے گی کہ تم نے دو

کوٹھل دیا۔ پہلے جہاں آرا کو دغا دی اور پھر اسے دھوکے میں رکھا۔ جبکہ وہ جہاں آرا کی اتنی بڑی

دوست ہے۔۔۔۔۔ مجھے یقین ہے وہ اسی وجہ سے تم سے یک گئی تھی۔ نواب صاحب تم

گھروا ماد بنانا چاہتے تھے۔ مگر تم کو جہاں آرا سے خود کوئی دلچسپی نہ تھی؛ تم بالکل بے قصور ہو۔

”کیا میرا ٹرائل ہو رہا ہے؟ تم کو تو واقعی ہیر سٹر ہونا چاہئے تھا۔“

”تمہاری اتنی نواب قمرالزمان کی سگی چچا خادہ بن گئیں۔“

میری اتنی۔۔۔۔۔ میری اتنی۔

بارش کی لطیف دھند بارغ پر منڈلاتی رہی۔ مہما میں پھولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔

”پھر تمہیں جانکاد میں حصہ کیوں نہیں ملا؟“

”ادہ اوما۔۔۔۔۔ اوما۔۔۔۔۔ ڈونٹ بی سچ لے بور۔ تم کو تہل چکا ہوں۔“ ریحان

الٹا کر جھپٹی لیتے ہوئے کہا۔ ”مگر تم ساری الف لیٹے نہ جانے کیوں پھر سننا چاہتی ہو۔ آل رائٹ

جائداد میں حصہ نہیں ملا۔ جس کی مجھے مطلق پرواہ نہیں۔ میرے نانا فخر الزماں چودھری نور الزماں چودھری کے چھوٹے بھائی تھے۔ آیا خیال میں۔ یاد کرو۔ گرہ میں باندھ لو۔ اور بار اپنے سوالوں سے مجھے بورہ کرنا۔ میرے نانا فخر الزماں چودھری نواب قمر الزماں کے والد نواب الزماں کے اکلوتے چھوٹے بھائی تھے۔ اب رٹ کر سبق سناؤ۔ چلو۔ تم بھی کیا یاد کرو گئی۔ اوما قبہ لگا کر بنسیں۔ آگے بتاؤ۔ بڑا الف سیلوی قصہ ہے۔

”لائیک ہل۔ الف سیلوی قصہ یہ ہے کہ نانا جان اپنے بڑے بھائی کی طرح بے حد رنگین ج تھے۔ صرف کلکتہ کی گوہر جان پر ایک گاؤں نکھا کر رکھ دیا تھا۔ اور ایک وہ۔ بچپن میں سنا تھا۔ لکھنؤ کی نوا پچوا اور دتی کی خیمیا اور بنارس کی بے نظیر۔ فیوڈل ڈیکٹنس کی بات کرتے آپ لوگ۔ اس نے پیالی ذرا زور سے طشتری میں رکھی۔

”تم کو پتہ ہے ہم بورڈ والوں کو تم فیوڈل لوگ سیدنی نیٹ کرتے ہو۔ اوما نے مسکرا لیا۔

”بکواس۔ بہر حال۔“ ریمان نے ماچس کے لئے پہلے کرتے کی ایک جیب میں پھر دوسری ب میں ہاتھ ڈالا۔

”سگریٹ پینے بند کرو۔ ہاں پھر کیا ہوا۔“

”پھر یہ ہوا کہ نانا جان نے ایک تھیر کیپٹی میں روپیہ لگایا۔ مرحوم خود بھی ناٹک لکھتے تھے۔ بند منزل میں باقاعدہ جلسہ گھر تھا۔ بہر حال۔ تھیر کیپٹی کا بیجر سا دارو پیہ بن کر کے رنگوں بھاگ گیا۔ جب عین عالم جوانی میں نانا جان کا اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔ وقت ان کے حصے کی زمینداری مہاجن کے ہاں رہن رکھی ہوئی تھی۔

”امی ان کی اکلوتی لڑکی تھیں۔ جب نانا جان مرے وہ شاید چھ یا سات سال کی تھیں۔ والد کے نے کے دوسرے سال کالرا کی وبا پھیل اور اس میں ان کی والدہ بھی چل بسیں۔ امی اپنے تایا کے یہاں بننے۔ نواب زادہ فخر الزماں کی جو جائداد فضول خرچی اور عیاشی سے باقی بچی تھی نواب نور الزماں نے بہن سے راکر بھتیجی کے قانونی سرپرست کی حیثیت سے اپنے قبضہ میں لے لی۔ قاعدے سے امی کی سہوی نے ایازا زاد بھائی یعنی نواب قمر الزماں سے ہونی چاہئے تھی۔ بیگم نور الزماں اب شوہر کی یتیم اور نادار

تھی۔ دن رات وہ اس کے ارلز کورٹ کے ڈگڑ میں سرمانے بیٹھ کر اس کا ٹیپر کھینچ لیتی۔ اسے دوا پلاتی۔
اس کے لئے کھانا پکاتی۔ اس کے کپڑے تک دھوتی اور استری کرتی۔ صرت اس کی اتنی ہی نے اس کی
یسی دیکھ بھال اور خدمت کی تھی۔ ادا کا یہ بے لوث سلوک وہ عمر بھر نہ بھول سکتا تھا۔

”پھر کیا ہوا رد تو۔۔۔؟“

”ارے تمہیں بتلایا تو تھا یا۔۔۔“

”تمہاری اتنی غریب کسان گھر میں کس طرح خوش رہیں؟“

وہ ادا اسی سے مسکرا دیا۔ ”مجھے یاد ہے۔ میں چھوٹا سا تھا اور ایک اندھیری رات برآمدے
بں چٹائی بچھائے لالٹین سامنے رکھے اسکول کا سبق یاد کرنے میں مصروف تھا۔ جب اندر سے
مئی کے آہستہ آہستہ رونے اور باتا کے چلنے کی آواز آئی۔ میں اتنی کو سیدھا چاہتا تھا۔ ان کے رونے کی آواز
سے گھبرا کر میں نے باشا کی دیوار سے کان لگا دیے اور پھر سوراخ میں سے جھانکا۔ اتنی دن بھر کام
اج کی محنت کے بعد تھک کر رو نے لگی تھیں۔ وہ چولہے کے پاس بیٹھ بھی پر سر جھکائے بیٹھی
تھیں اور میرے آبا۔۔۔ مجھے وہ منظر اب تک یاد ہے۔ میرے آبا کمرے کے دروازے
بں کھڑے اس منات سے تقریر کر رہے تھے گویا جو گھر کے منبر پر وعظ کہتے ہوں۔ وہ کہہ رہے
تھے، میں نے تم کو ملیو بی بی شادی کے دوسرے دن سمجھا دیا تھا کہ بھول جاؤ کہ تم نواب نواز الزماں مرحوم
کی بیٹی اور نواب نواز الزماں چودھری رئیس اعظم فرید پور کی بھتیجی ہو۔۔۔ اور ہمیشہ یاد رکھو۔
۔۔۔ انہوں نے شہادت کی انگلی اٹھا کر کہا۔۔۔ کہ تم ایک غریب سید کی بیوی اور آل رسول کی بہو
ہو۔۔۔ اور یاد رکھو حلیمہ بی بی کہ شہنشاہ کائنات کی بیٹی مولا علیؑ کے گھر میں چکی پیستی تھیں۔
دراپران کی بادشاہ زلوی شہید کر بلا کے گھر میں فاقہ کرتی تھیں۔ تم تو ان سب کی خاک پا بھی نہیں ہو۔
نواب استغفار کر کہ اور اللہ سے ڈرتی رہو۔ وہ بخشش والا اور مہربان ہے۔۔۔ آبا رسول اللہ
کا نام لینے کے بعد درد پڑھ کر بار بار اڑھی پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ ان کی سنجیدہ شکل اور ہوا میں لرزتی
ناڑھی پر میری نظر پڑی تو باشا کی دیوار کے ادھر مجھے اپنی پریشانی کے باوجود بے اختیار سنہی آگئی۔
دو میں اپنی شیتیں پانٹی پر اوہیں آن بیٹھا۔ اتنی ساری کے آچل سے آنسو پونچھ کر پھر چولہے پر چھبک
گیں۔ اور آبا باہر چلے گئے۔

”اس کے بعد مجھے یاد ہے، اُمی نے آتا ہے پھر کوئی شکایت نہیں کی، اور خاموشی سے شوہر، ساس، سسر، دیور، جیٹھ اور نندوں کی ٹہل میں لگی رہیں۔ انہیں واقعی یہ فخر تھا کہ سید کی بیوی ہیں۔ جو مذہب تھیں۔ پانچ وقت کی نماز، روزے رکھتیں۔ میرے لئے طرح طرح کے وظیفے پڑھتیں، منتیں مانتیں۔ ریحان کی آواز بھرا گئی اور اس نے چہرہ دوسری طرف پھرنی۔

”یہ سب لوگ کون تھے؟“ اوما نے پوچھا۔

”کون —۔“ ریحان نے چونک کر دریافت کیا۔

”یہی سب جن کی محنت کشی کی مثال تمہارے آبا نے اُن کے سامنے پیش کی۔“

”پروفٹ محمد کی بیٹی اور ان کے نواسے کی بیوی۔ وغیرہ —۔ ارے چھوڑو آؤ۔ تم کون باتوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ کیا پرانے قصے لے کر بیٹھ گئیں؟“ وہ کرسی سے اٹھ کر برآمدے میں ادھر سے ادھر ٹپٹپٹ لگا۔

”تمہارے آبا بڑے بلند کردار کے انسان معلوم ہوتے ہیں۔“

”آبا —۔“ وہ ٹپٹپٹ ٹپٹٹ ٹپٹٹ گیا۔ ”آبا حیرت انگیز بڑے مثال شخصیت کے

مالک ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے گھر والے ان کو ذرا سا خطی گردانتے ہیں۔ مگر گاؤں والے ان کو اچھا خاصہ ولی اللہ بھی سمجھتے ہیں۔ جب اُمی کی شادی ہوئی تو نواب نور الزماں نے ان کو حبیروا۔ نواب نور الزماں کا چھوڑا ہوا تھوڑا سا رپیہ موجود تھا اور بہر حال اُمی نواب نور الزماں کے سگے بھائی کی اولاد تھیں اور وہ ان کی جائیداد قبضے میں کر کے ان کی کافی حق تلفی کر چکے تھے۔ بہر حال۔ تو اُمی کا تھوڑا بہت چیز بنایا گیا۔ جو غریب کسانوں کے لئے تو کسی شاہی خزانے سے کم نہ تھا۔ مگر جب آبا کشتیوں پر لرے مولویوں اور کاشٹاکاروں کا قافلہ بارات میں لے کر پہنچے تو انہوں نے حبیرو کا سامان قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اُمی بتایا کرتی تھیں کہ کہنے لگے وہ نواب نور الزماں کے ایسے غریب داماد نہیں کہلانا چاہتے جنہوں نے بیوی کے روپے سے اپنا گھر بھرا لیا۔ لہذا وہ جرن اُمی کے کپڑوں کے صندوق اٹھوا کر اُمی کو رخصت کر لے گئے۔ اُمی کے زیور البتہ جب میری بہن رابعہ پیدا ہوئی تو نواب صاحب نے اس کے نام سے بینک میں محفوظ کر دیئے تھے۔ آبا بہر حال اسی طرح دھان اُگاتے اور جہد گھر میں نماز پڑھتے رہے۔“

”سچے کیونٹس۔“ ادا نے کہا۔

ریحان ہنسنے لگا۔

”اصل قصہ تو تم نے اب تک بتایا نہیں۔“

”لاحول ولا قوۃ۔“ وہ عاجز آکر کھیر کر سی پر بیٹھ گیا۔

”جب میں گاؤں کے اسکول میں داخل ہوا اور قبول شخصے میری ذہانت کی دھوم مچنے لگی تو نواب قمر الزماں اتنی آبا سے مصر ہو کر مجھے ڈھاکے لے آئے۔ میں جب چھ سات سال کا تھا یہ نواب قمر الزماں کا جنھیں میں بڑے نانا کہتا تھا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ مجھے اچھی طرح یاد ہے بالکل پرانے فیشن کے، کار چوٹی چوہے پہنے ہوئے جفادری زمیندار۔ جیسے پرانی کتابوں کی سویروں میں ہوتے ہیں۔ بہر حال۔ اب قمر الزماں ریاست کے مالک تھے۔ وہ مجھے ڈھاکے لے آئے اور اسکول میں داخل کر دیا۔ میں اس وقت بارہ تیرہ سال کا تھا۔ میں ارجمند منزل میں رہا تھا اور قمر الزماں کے ساتھ کار میں بیٹھ کر اسکول جایا کرتا تھا۔ آبا کو ماموں جان نے یقین دلایا تھا اتنی کار و پیہ جو اتنے شادی کے وقت لینے سے انکار کیا تھا میری تعلیم پر خرچ کیا جا رہا ہے۔ اس کے وجود پیش رزمیہ ہیڈ باغیلاط ہر مہینے آبا کا پیش سے میرے نام نئی آرڈر کرتے۔ ماموں جان مسکرا کر روپیہ وصول کرتے۔ اور میرے نام ڈاک خانے میں جمن کرتے رہتے۔ اصلیت یہ تھی کہ میں ارجمند منزل میں ماموں جان کے لاڈلے نور نظر کی حیثیت سے پروان چڑھایا جا رہا تھا۔ ان کا بیٹا خواہا کوڑھ نہ تھا۔ ماموں جان اس کی طرف سے بہت مایوس تھے۔ اور مجھے آئینہ لایز کر رہے تھے اور اصل بات اسی یہ تھی کہ وہ جہاں آرا سے میری شادی کرنا چاہتے تھے۔ ماموں جان علی گڑھ کے معتقد تھے، انہوں نے ایلٹ۔ اے کے لئے علی گڑھ بھیج دیا۔ وہاں میں مزید لائق اور ہونہار ثابت ہوا۔ ماموں جان نے چاکر سائے خاندان میں واحد معقول اور ہونہار نوجوان صرف میں تھا۔ ماموں جان میرے لئے طرح طرح خواب دیکھنے لگے۔ یہ سڑی۔ آئی سی ایس کا مقابلہ ان کے پٹ سن کے کاروبار کی دیکھ بھال۔

”جہاں آرا چھوٹی سی تھی۔ مجھ سے پانچ چھ سال چھوٹی ہوگی۔ وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ دھڑی ناں اور چہ چلا کہ ماموں جان اس سے میری شادی کتنا چاہتے ہیں، تو میں بے حد خوش ہوا۔ میرا خیال تھا کالج سے نکل کر کسی اخبار میں کام کروں گا۔ ————— میں انگریز سرکار کی ملازمت کے سخت خلاف

ہو گیا تھا۔ کسی یونیورسٹی میں پڑھاؤں گا۔ اور جہاں آراء کو لے کر اپنا گھرا لگ بناؤں گا۔

”ماموں جان کو واقعی مجھ سے محبت تھی۔ لیکن میری ذہانت وغیرہ کے علاوہ ماموں جان میرا اتنا خیال رکھتے تھے اس کی غالباً ایک وجہ اور بھی تھی۔“ ریحان نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”ان کے والد نوا نور الزماں پرانے ٹائپ کے جابر اور مطلق العنان زمیندار تھے، ماموں جان۔“ ستم آڑیاں۔ ان کے برعکس ایک جدید انسان ہیں اور نیک دل۔ ان کو یہ احساس تھا کہ ان کے والد نے اپنی بے زبان بھتیجی ساتھ ہر طرح سے بڑی بے انصافی کی۔ وہ مجھے اپنا داماد بنا کر تلافی یافت کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ۔۔۔ اس کے علاوہ۔۔۔ وہ یک لخت چپ ہو گیا۔

”اوما ہم تن گوش اسے دیکھتی رہیں۔“ اس کے علاوہ کیا روٹو۔۔۔؟

ریحان نے سراٹھا کر اسے دیکھا۔ ”مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ ماموں جان اُمی کو بے حد پسند کرتے تھے انہیں بچپن سے اپنی بنتِ عم ہی سے محبت تھی۔ اور اگر ان کا بس چلتا تو وہ کشٹہ کی ریس زادی کے بجائے اُمی سے شادی کرتے۔“

”زندگی۔۔۔ واقعی کتنی عجیب چیز ہے۔“ اوما نے آہستہ سے کہا۔ ”اور تمہاری اُمی بھی نواب قمر الزماں کو پسند کرتی تھیں؟“

”یقیناً۔“

”اور کسی نے ان سے نہ پوچھا کہ ان کے دل پر کیا گزری ہوگی؟“

”نہیں۔ کسی نے ان سے نہیں پوچھا۔ اور نہ انھوں نے کسی کو بتایا۔ وہ مرتے دم تک پتی دستا پی رہیں۔ آخر دم تک شوہر کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش میں لگی رہیں۔“

”بنگالی عورت۔۔۔!“

”ہاں۔ بنگالی عورت! ہندوستانی عورت!!“

”وہ کبھی ارجمند منزل آتی تھیں؟“

”بہت کم۔ کسی خاندانی تقریب کے لئے کبھی کبھار آجاتی تھیں اور ماموں جان ان کی خاطر ملازمت میں دوڑے دوڑے پھرتے تھے۔ جاتے وقت دستور سے زیادہ تحفے تحائف ان کے ساتھ کرتے، مگر وہ کچھ نہیں چھوڑ جاتیں۔ کیونکہ آباد دولت مند سسرال کا ایک پیسہ لینے کے روادار نہ تھے۔ اور اُمی نے ساری

”ان کا یہ حکم مانا۔“

”فی مسٹ ہو میں ملے گریٹ و دمی“

”شی واز۔“

اب بارش تھم چکی تھی، ادباغ کی ابر آلود فضا بید خوشگوار معلوم ہو رہی تھی۔ ریحان نے ی پر نظر ڈالی اور جلدی جلدی داستان ختم کرنا چاہی۔

”جب میرے ولایت جانے کا پروگرام بنا تو امی نے چاہا کہ اپنے زیورات جو بینک میں محفوظ روخت کر کے میرے ولایت کے خبا کے انتظام کریں۔ ماموں جان نے ابا کو تو یہ سچی پٹھائی کر مجھے ری خط مل گیا ہے۔ اور امی سے چپکے سے کہا بی بی تم زیورا اپنی بیٹی کے جہیز کے لئے رکھو۔ میں اپنے بھانجے بھے تیر کی طرح عزیز ہے، اپنے روپے سے لندن بھیج رہا ہوں، امی کو معلوم تھا کہ ماموں جان وہ جہاں آنا کو مجھ سے بیاہ دینے کا ہے۔ وہ بیجاری بے حد مسرور تھیں۔ وہ اپنے شوہر کی ضد کی وجہ ماری عمر نگہ ستی میں گزار چکی تھیں۔ انھیں اب خوشی تھی کہ اس رشتے سے ان کے غریب بیٹے کی زندگی نئے گی۔“

”تمہاری امی کے پاس بہت گھنے تھے؟“ آو مانے خالص عورتوں کی سی دھمپی سے پوچھا۔ ریحان نے ایک بار تعجب سے اس پر نظر ڈالی۔ ”کہہ تو چکا ہوں، ان کی والدہ کے زیور تھے جو تانیا نے بینک میں رکھوا دیئے تھے۔“

”وہ میرے جواہرات جو امی کو ملنے چاہئیں تھے، ان پر ان کی والدہ کے انتقال کے بعد سب گم ل ان کی مائی پہلے ہی قبضہ کر چکی تھیں۔“

”چنانچہ میں ماموں جان کے خیر خرچ پر لندن گیا۔ وہاں سے لوٹ کر آیا تو یہاں شادی کی ہورہی تھیں۔ مجھے ہار پھول پہنائے گئے، ارجمند منزل میں زوردار دعوت ہوئی۔ شوہر والو سارا گاڈوں گھاٹ پر استقبال کے لئے موجود تھا۔ صرف امی نہیں تھیں۔ جن کو میری آمد سے زیادہ انتظار تھا۔ وہ سال بھر سیدہ مرجی تھیں۔ ابا نے جہہ گھر میں جا کر شکرانے کی نماز چوپال میں گانے کی محفل ہوئی۔ بیاتیوں نے فوراً میرے لئے گیت بنائے۔ میں گاڈوں والوں ایک عجبہ روزگار ہستی بن چکا تھا۔ جب میں ڈھاکے واپس آیا ——— تم تو ابھی لندن میں

تھیں۔ یہاں کیا کیا ہنگامے رہے میرے ساتھ تو شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی۔ ماموں جان گلے لگا کر سر پر ہاتھ پھیر کر مجھ سے کہا کہ شادی کے بعد میں ان کا پاٹ کا کاروبار اپنے ذمہ لے لوں اپنے کتب خانے کی میز پر زمینداری کے کاغذات اور رجسٹر کھولے بیٹھے تھے۔ میری رہائش کے کوٹھی کی دوسری منزل کے کمرے آراستہ کئے جا چکے تھے۔ ہر چیز پہلے سے طے شدہ تھی۔

”تب میں نے ان کو اطلاع دی کہیں کمپونٹ پارٹی آف انڈیا کا ممبر ہو چکا ہوں۔ یہ سن کر ان پر سی گر پڑی۔“

”آئی ڈونٹ بلیم ہم۔“ آجائے کہا۔

”مجھے ان کو صدمہ پہنچاتے ہوئے بڑا دکھ ہوا۔ مگر میں نے نرمی سے ان سے کہا کہ میں : ڈ مجسٹریٹ بننے کا ارادہ رکھتا ہوں، ان کا خاوند اما دین کران کی ریاست سنبھالوں گا۔ بلکہ میں چ کو لے جا کر اپنے بھونس کے مکان میں رکھوں گا۔ آخر آپ کی بہن بھی تو اسی محل سے رخصت میرے باپ کے بھونڈے میں گئی تھیں۔“

”ماموں جان بھونچکے ہو کر مجھے تنگ لگے۔ پھر غم و غصے سے تھر تھر کانپے۔ انھیں یقین نہ کہ میں کہہ رہا ہوں۔ میں نے ان کو پارٹی کارڈ دکھایا اور رساں سے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں نے یہ راستہ اپنے لئے منتخب کیا ہے۔“

”عمر بھر میں پہلی بار میں نے ان کو طیش کے عالم میں دیکھا۔ وہ یک نخت اپنے مرحوم جوادری باہ کی تصویر بن گئے، انھوں نے گرج کر کہا : ”نک حزم، احسان فراموش، کسان کی اولاد، ملانے کا چھ تیرا مستقبل میں نے سفوار، ذرہ آج ہل چلا رہا ہوتا، دھان کے گٹھے ڈھور رہا ہوتا، مکتب میں بچے پڑ رہا ہوتا بد بخت :“

”میں نے دبی زبان سے کہا : ”دھان کے گٹھے تو میں اب ڈھوؤں گا ماموں جان :

”مگر وہ اسی طرح گرجتے برستے رہے۔ اور مجھے خیال آیا کہ میرے نانا جان مرحوم کے لکھے ہو اسی قسم کے میلو ڈرائیٹک نالک، پچاس برس قبل از جند منزل کے جلسہ گھر میں اسٹیج کئے جاتے ہوں کون کہتا ہے ہمارا ہندوستانی تھٹر زندگی کی صحیح عکاسی نہیں کرتا۔“

”تین دن تک گھوم، ہنگامہ مچاتا رہا۔ ماموں جان نے ہر طرح مجھے سمجھایا۔ روئے گائے۔ مگر

اپنی عزت کا، اپنی لڑکی کی زندگی کا واسطہ دیا۔

”آپ اس کے روادار ہیں کہ آپ کی لڑکی گھٹ گھٹ کے مر جائے، مگر آپ اس کا ہاتھ ایک ٹکٹ کے ہاتھ میں نہ دیں گے۔ میں نے کہا۔

”دہریہ، کنکال، باغی، جیلوں میں سڑے گا۔ بار بار پھرے گا۔ روپوشی اور سزا انعام۔ اور وہ — (سچ پوچھو آدما جب وہ یہ سب کہہ رہے تھے تو مجھے ان پر پیار آگیا) میں اپنی نازوں پر اتیرے پلے باندھ کر اس کی قسمت پھوڑ دوں۔

”غرضیکہ نہ وہ مانے، نہ میں مانا۔ مانی جان کو اختلاج قلب کے دورے پڑنے لگے۔ گادری زچھتے کترنے لگا۔ ماموں جان نے اس کو حکم دیدیا تھا کہ کچھ سے بات نہ کرے، شادی کی تیاریاں خ ہوئیں۔ ارجمند منزل پر بڑا بھیا نک سناٹا چھا گیا۔

”ماموں جان نے ایسا بندوبست کیا کہ شادی کی تیاریوں کی یا رشتہ ٹوٹنے کی خبر ارجمند سے باہر نہ نکلے۔ ویسے بھی اس وقت تک ماموں جان نے اپنے اس ارادے کا تذکرہ مانی اور قی کے علاوہ کسی سے نہیں کیا تھا۔ زمینداروں کے ہاں شادی بیاہ کے معاملات میں بہت رازداری برتی ہے۔ ور نہ لکھنیاں اور مشاطائیں اور مخالف زمینداروں کے حالی موالی رشتہ تڑواتے ہیں اور کیا کیا ہوتا ہے اور یہاں جہاں آزار کے اپنے ماموں یعنی کشتیہ کے رئیس اعظم اپنے بھائیسیل حاجو کو بے تحاشے بیٹھے تھے۔ بہر حال۔ ڈھاکہ میں اس میلوڈرامہ کی خبر زیادہ نہیں پھیلی۔ جہاں آزار خود مر سے شرمیلی اور تھوڑی سی گھٹی لڑکی تھی۔ اس نے بھی اسکول یا کالج میں میر تذکرہ کسی سے نہ کیا تھا۔ اسی وجہ کو اتنے برسوں اس کے ساتھ پڑھنے اور اس کی دوستی کے باوجود یہ بات معلوم نہ ہوئی۔

”بھئی میں سمجھتا ہوں، اب لےج بھی ہیں منگوالو، میرا تو داستان امیر حمزہ سناتے سناتے سوکھ گیا۔“

”کہے جاؤ۔ میں پانی منگواتی ہوں۔“

”بس میں حسب سابق اپنے پرانے کمرے میں ٹہرا ہوا تھا۔ جہاں آزار کا خیال کر کے میرا دل لٹ جاتا۔ وہ میری لندن سے واپسی کے بعد دستور کے مطابق مجھ سے سخت پردہ کر رہی تھی۔ پنہ کمرے میں یا یوں بیٹھ چکی تھی۔ جب یہ ٹریجڈی ہوئی۔ اس کی دونوں بہنیں بوکھلائی بوکھلائی میرے

پاس آکر کہیں۔ آپا روتے روتے نیم جان ہو گئی ہیں۔ آپا کی آنکھیں سوچ گئی ہیں۔ آپا ان تین دنوں میں آدمی رہیں۔ کہاں وہ دلہن بننے کے لئے مایوں بیٹھی تھیں اور کہاں یہ خوفناک المیہ۔ روتی بھائی۔ خدا کے کو مرنے نہ دیجئے۔ یہ سب سن سن کر میرے حواس باختہ ہو جاتے۔

”چوتھی رات میرا آخری فیصلہ سننے کے بعد کہ میں اپنی سیاسی زندگی ہرگز ترک نہیں کروں گا۔ جان نے مجھ سے کہا، تو آج سے ارجمند منزل کے دروازے تمہارے اوپر بند ہیں، اتنا کہہ کر وہ بھوٹ کر رونے لگے۔

”چند منٹ بعد انہوں نے ————— بڑے چالاک میں میرے قمراموں ————— بلیک میل کے لئے ایک چال چلی۔ اس وقت مجھے ایسا خیال ہوا۔ مگر اب سوچتا ہوں کہ وہ خلوص دل سے ایسا کہہ رہے تھے، مگر جوانی کی اگر ڈاڑھ اپنے اصول پرستی کے زعم میں ہم یہ نہیں سمجھ پاتے کہ ہمارے بزرگوں کے بھی جذبات ہیں۔ ان کی بھی اندرونی جذباتی زندگی ہے، انھوں نے بھی شکستہ دلی کار ہے۔ ————— ماموں جان مجھ سے کہنے لگے: ”میتھ مر گئی، تم اس کی نشانی تھے تم نے بھو ساتھ یہ کیا۔ اتنا کہہ کر وہ در اذقت سے اپنی کرسی پر سے اٹھے، اور کمرے کے باہر چلے گئے۔

”اٹنی کے مرنے کا غم تازہ تھا۔ میں بھی بڑی مشکل سے آنسو ضبط کر کے اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ پھر میں نے اپنا سامان باندھنا شروع کیا۔ اور انجم آرا کو بلا کر اسی سے کہا اپنی آپا سے کہورات کو باہر بتالا۔ آجائیں۔ مجھے ان سے بعد ضروری بات کرنی ہے۔ انجم آرا کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ فوراً اوپر دوڑی گئی۔

”رات کو جہاں آرا مجھے تالاب کے کنارے ملی۔ میں نے تین سال بعد اسے دیکھا۔ تین سال اسے لندن سے خط لکھتا رہا تھا۔ اس کے متعلق سوچتا رہا تھا۔ مگر زیادہ نہیں۔ مجھے معلوم تھا وہ ہونے والی ہے۔ اس لئے مجھے اس کے لئے کوئی خاص اضطراب نہیں محسوس ہوتا تھا۔ مجھے اس سے تھی۔ مگر کوئی جنوں خیز عشق نہیں تھا۔ ہو نہیں سکتا تھا۔ بچپن سے ہم اکٹھے پلے بڑھے تھے۔ لئے ایک پرسکون سی چیز تھی۔ مجھے ہمیشہ یہ معلوم رہتا تھا کہ میں دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوں، کہ میں ہوں۔ کیسی ٹکھن مسافت طے کر کے لوٹوں، وہ سایہ دار درخت اور میٹھے پانی کے کنوئیں میری منتظر ہوگی۔ اور اب وہ میرے سامنے موجود تھی۔ میری اٹنی کی طرح حتی دستا کی ایک اور تھ میں اس کے سامنے گونگا سا ہو گیا۔ وہ تالاب کی سیر بھی پر بیٹھ گئی۔ انجم آرا، مہر آرا اور مالا ملازمہ پر

ادھر چوکس تھیں۔ اگر ماموں جان کو اس ملاقات کا علم ہو جاتا تو نہ جانے وہ ہم دونوں کا کیا حشر
 خیر۔ تو میں نے اس سے کہا۔ وہ خاموشی سے میرے ساتھ چلی چلے۔
 ”تم لڑکیوں کو بھگا کر لے جانے کی تجویز کرنے میں بہت اکیسپرٹ معلوم ہوتے ہو!“ اوما
 کاٹی۔

”میں نے اس سے کہا، میرے ساتھ جھونپڑوں میں رہے۔ روکھی سوکھی کھائے اور یہ یاد رکھے
 ب فخر الزماں چودھری کے نو لے کی نہیں بلکہ مولوی برہان الدین احمد کا شکار کے لڑکے کی بیوی ہے۔“
 ”بالکل ایسی ہی بات تمہارے آبا نے تمہاری امی سے کہی تھی۔“ اوما نے کہا۔
 ”ہاں۔ عجیب بات ہے نا۔ مگر جہاں آرا میں اپنے والد سے اتنی بڑی بغاوت کی
 تھی۔ وہ بیٹھی ہچکیوں سے روتی رہی، اور میں اسے اسی طرح روتا بھوڑ کر ہمیشہ کے لئے ارجمند نزل
 آگیا۔“

”چند روز بعد ہی مجھے انڈر گراؤنڈ ہونا پڑا۔ اور وہ سارا قصہ خواب و خیال ہو گیا۔“
 ”اور اس کے فوراً بعد تم نے ایک اور خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ واہ رے مرد کی ذات۔“
 ”اب اجازت ہے؟ دوپہر ہو گئی۔“

”ابھی نہیں۔ تمہاری بہن پڑھ رہی ہے؟“
 ”نہیں، میں کتنا چاہتا ہوں، اس کی تعلیم کا انتظام ہو جائے۔ مگر آج امی کے انتقال کے
 بھالنے میں جٹ گئی۔ اگر مجھے کبھی ڈھاکے آنا ملا تو مکان لے کر اسے یہاں بلا لوں گا۔ اگر میں آبا
 ، دلا دلوں کروں پر دے کا مکمل انتظام ہے تو آبا شاید علی گڑھ گزرنے کا لچ بھی بھجے کو تیار ہو جائیں۔“
 وہ ہنس پڑا۔ ”آبا کو اگر یہ معلوم ہو کہ میں دہریہ — دہریہ ہو گیا ہوں تو ان پر آسمان گر پڑے۔
 جب بھی گاؤں جاتا ہوں، تو باقاعدہ آبا کے ساتھ جمعہ گھر میں نماز پڑھتا ہوں۔“
 ”اوہ ————— ماؤ فنی ————— اوما نے زور سے تہقہہ لگایا۔

نہ جانے کیوں ریمان کو اوما کا یہ تہقہہ ناگوار گزرا، وہ نظریں اٹھا کر باغ کو دیکھنے لگا۔
 اوما نے اس کی طویل خاموشی سے گہرا کر لوچھا۔ ”تمہارا گھر تو بڑا خوب صورت ہو گا۔ آرٹسٹک۔“
 ”ہاں بے حد خوبصورت ہے۔ تمہارے دو ڈیلینڈز سے کہیں زیادہ خوبصورت۔ اس کی پھولس کی چھت

زرد پھولوں کی سیل سے ڈھکی ہوئی ہے۔ سامنے سبزی باڑی ہے۔ اور گھنی، سرسبز بنسلی۔ پچھلے ہا کنول کے پھولوں سے بھرا رہتا ہے۔ اس کے کنارے سپاری اور ناریل کے سڈول درخت کھڑے ہیں گائیں رہتی ہیں۔ پچھلے برآمدے میں پانکی رکھی ہے۔ ندی پر آبائی ناؤ بندھی رہتی ہے۔ اسی کو کچھ آبپار کی مسجد میں نماز جمعہ پڑھانے جاتے ہیں۔ ناؤ ہی میں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جاتے ان کی اس کے علاوہ اور کوئی سواری نہیں جانتے۔ اُمی بتاتی تھیں کہ یہی نوکا کھیتے وہ آزاد بھائیوں کو پڑھانے اپنے گاؤں سے نواب نورالزمان کی دیہاتی حویلی جایا کرتے تھے۔ کیسا ناگتھ لوگ۔ آبپاری عمریں صرف تین چار مرتبہ ہی موٹر میں بیٹھے ہیں۔ جب میرا داخلہ سکول میں کرانے ڈھ تھے اور ساموں جان کی ٹوک ان کی خدمت میں حاضر رہتی تھی۔

”اور پھر ہمارا گاؤں۔ کسانوں کے خوب صورت جھونپڑے۔ گاؤں کا قول۔ کالی باڑا مند۔ مجھ گھر۔ چوپال۔ بازار۔ منڈی۔ برگد کے تلے گھاٹ۔ درگاہ۔ میرا گاؤں ترین گاؤں ہے اور میرا گھر دنیا کا حسین ترین گھر۔ کبھی میں تم کو اپنا گھر لے جا کر دکھا اور دیپالی کو۔“

”اور قبرستان جہاں اُمی کی قبر ہے۔“ وہ چپ ہو گیا۔ چند منٹ بعد اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میری اُمی اتنی کم عمر تھیں۔ وہ مجھ سے صرف سترہ برس بڑی تھیں، اور یہ بہن معلوم ہوتی تھیں۔ اگر آج زندہ ہوتی تو تم سے بھی زیادہ بڑی نہ لگتیں۔۔۔ بعض مرتبہ تم بھلک سی دکھائی پڑتی ہے۔ خصوصاً جب ڈانسی ہو۔ تو بالکل اُمی بیسی لگتی ہو۔“

ادما کے چہرے پر کرب اور ناگواری کا بادل گزر گیا۔ جسے ریمان نے نہیں دیکھا۔ وہ کہتا ”اُمی تو مر گئیں، اب کبس تم نہ مرجانا آتما۔“

”ریمان۔“ آتما نے رشتی اور تلخی سے اس کی بات کاٹی۔ ”اب اٹھنا چاہئے۔ تم جاؤ۔“

”ہاں۔“ وہ چونک کر بولا۔ ”ابھی جاتا ہوں۔“

”کھانا کھاتے جانا۔“

”نہیں۔ کھانا سر بند کے ساتھ کھاؤں گا، اور اس کے بعد۔“ اس نے اٹھ کر طویل ہوئے کہا۔ ”ارجمند منزل میں نواب قمر الزماں چودھری سے سیاسی گفت و شنید۔ کل شام لیگ آ

ی سے ان کے ساتھ ساڑھے پانچ بجے کا پوائنٹمنٹ کروایا تھا۔ ابھی سرنیدر کے ہاں بیگم بازار
بھاگتا ہوں۔“

وہ اپنے کمرے کی طرف لپکا۔

”ارجنڈ منزل جاتے ہوئے دود تو نہیں لگ رہا؟“ اوما نے پیچھے سے آواز دی۔ ”اگر وہاں ٹھکانا
نہیجے فون کر دینا۔ تمہاری مدد کے لئے آجاؤں گی۔“

”یو آہ لوٹ مینگ ویری فنی اوما۔“ ریکان نے دروازہ بند کرتے ہوئے جواب دیا۔
اوما کھوکھی سی ہنسی ہنسیں اور میز پر بیٹھی کانٹے سے لکیریں کھینچتی رہی۔ پھر سیزر کو بلانے کے لئے
اتر گئیں۔

۲۷

جہاں آرا بیگم

اس وقت ارجنڈ منزل پر ایک سخت ایسی خاموشی چھا گئی، جیسے ماگوان کے جھرمٹ میں چھپے
ادوگر نے چپکے سے کوئی منتر بھونک دیا ہو۔ اور چرند پرند، شجر حجر، انسان سب سکے میں
ماتیں۔

جہاں آرا اور پرکی منزل پر پچھلے برآمدے میں حق کے پیچھے آرام کرسی پر بیٹھی نوزائیدہ بھتیجے کے
سے بن رہی تھی۔ اور اپنے پاؤں جھنگلے کی پٹلی جالی میں اٹکار رکھے تھے۔ جھنگلے کی سلاخوں میں سے اس نے
ہلک دیکھی جو سوچ میں ڈوبے پائیں باغ میں ٹہل رہے تھے۔ اور پھر لیگ آفس کا بہاری کلرک
نزدیک پہنچا اور آبا اس کے پیچھے باہر چلے گئے۔

بادرچی خانے میں جا کر دعوت کی دلیوں کا معاملہ کرنا ہے۔ پلاؤ دم کروانا ہے۔ شاہی ٹکڑے تیار
ہیں۔ دہن بھابی اپنے کمرے میں آرام سے سو رہی ہیں۔ امی حسب معمول اپنے کمرے میں صاحب
ہیں۔ جانے ان کو اختلاج کے دورے اتنے کیوں پڑتے ہیں۔ آبا تو ان کا اتنا خیال رکھتے ہیں۔ امی

کو ہر طرح سے خوش رہنا چاہئے۔ ان کے پاس کیا نہیں۔ سہاگ، اولاد، دولت و ثروت، بہو بیاہا ہوتا کھلا رہی ہیں۔ کیا وہ اب تک نہیں بھول سکیں کہ آبا ان کے بجائے تلیم پھوپھی سے شادی کرنا چاہتے مگر وہ تو اتنی پرانی بات ہو گئی۔

بے چارے آبا۔ یہ بات کسی کو معلوم نہیں۔ صرف میں نے محسوس کی ہے۔ اور اتنی کو تو یقیناً ہے۔ کہ آبا تلیم پھوپھی کو کبھی نہ بھلا سکے۔ وہ مر گئیں تب بھی نہیں۔ مر کے شاید وہ آبا کے دل پر محفوظ ہیں۔ جہاں پھوپھی جان کا کوئی دخل نہیں۔

یا اللہ! کیسی دنیا بنائی تو نے، انسانی دندگیوں کے ساتھ ایسے بھیٹانک مذاق۔ انجسم اور اختر آرا سگن بیگمچے سے اب تک نہیں لوٹیں۔ ہر وقت اپنی دلچسپیاں۔ صرف ہی اس لئے ہوں کہ ماؤس کی پر نی رہوں۔ دلہن بھابی بھائی کو خزانے دکھائی رہتی ہیں۔ شا کو ایک سال ہو گیا مگر کیا مجال۔ جھول کر پانی بھی پی لیں۔ اب تو بھئی نئے ولی عہد کی ماں ہیں بس میں سب کی دیکھ بھال کے لئے وقف۔ امتی نے کل کیا منہ بھر کے شمسہ خاں کے سوا کہہ دیا کہ اپنا گھر تو نصیبے میں نہیں، اسی گھر کی ذمہ داری اچھی طرح سنبھال لو۔ اچھا اللہ۔ ٹھیک ہے۔

ایک موزہ کھل ہو گیا۔ اللہ رکھے میرا منور کتنا پیارا ہے۔ ماشاء اللہ۔ خدا بری نظر۔ بجائے میں نے تو گلہ بانی اون بھی اتنی خرید لی تھی۔ اس کی بھی چیزیں بن ڈالوں گی۔ رط کے کیا گارنگ نہیں پہن سکتے۔

”بی بی۔ بی بی۔“

جہاں آرا نے چونک کر سر اٹھایا۔ مالا سامنے کھڑی لہجہ رہی تھی۔ بھاگتی ہوئی ادھر آئی تھی۔

”بی بی۔ وہ آئے ہیں۔“

دل پھر دھک سے رہ گیا۔

”کون۔۔۔؟“

”رؤنوماں۔“

”دونوں — کیا کہہ رہی ہے؟“

”اللہ قسم۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ باہر بیٹھے ہیں۔“

”باہر تو روزی اور دیپالی کے بابا آئے تھے۔“

”وہ تو کبھی کے چلے گئے۔ ابھی بشیر چائے کی تریں لے کر باہر گیا تھا۔ اس نے آکر بتایا، تو میں ماگی گئی۔ باغ والی کھڑکی میں سے جھانکا۔ سرکار اور روٹو میاں دونوں دفتر میں بیٹھے ہیں۔ دروازے دونوں جنوں میں مسکوت ہو رہی ہے۔“

ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔

”جھوٹ مت بول، مالا کی بچی۔“

”اللہ رسول کی قسم، چن کے دیکھ لیجئے۔“

”دونوں میں بڑی سنجیدگی سے باتیں ہو رہی ہیں؟“

”ہاں بی بی۔“

کیا دعائیں کامیاب ہو گئیں؟ دعائیں۔ غازیں، وظیفے، اللہ اللہ۔

وہ اون اور سلاسیاں میز پر ڈال کر جلدی سے اٹھی۔

”ٹھر۔ مالا۔ بھائی جان کہاں ہیں؟“

”نیرمیاں موٹے کر باہر گئے ہیں۔ چلے۔“

وہ مالا کے ساتھ زیر اثر کر کھانے کے کمرے میں پہنچی، جو کتب خانے سے ملحق تھا۔ درمیانی دروازہ بند تھا۔ عموماً بند رہتا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر زیر آنکھ جادی۔

وہ عین سامنے بیٹھا تھا۔ بڑی میز کے اس طرف، بالکل نہیں بدلا تھا۔ وہی شکل، وہی آنکھیں، وہی بات کرنے کا انداز۔ مقابل میں آبا بیٹھے تھے چہرہ چٹان کی طرح سخت، درمیان میں نا اور چائے کی کشتی۔ خالی پیالیاں۔ مائے اللہ۔ مجھے معلوم ہوتا تو کشتی سجا کر بھیجتی۔ اس سے کان لگا دیتے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”جی ہاں۔ میں کامیڈ جوشی کو مفصل بتا دوں گا۔“

آپا نے عینک ہاتھ پر چڑھائی اور کچھ پڑھنے لگے۔ پھر انھوں نے کہنا شروع کیا۔ ”جدا صاب

کے نکات :-

اس پر بجلی سی گری۔ وہ اس کے متعلق نہیں اس نامراد سیاست کے متعلق "مسکوٹ" کر رہے ہوئے۔ بولتے ہوئے آبا نے سرائٹھا کر سامنے بند دروازے پر نظر ڈالی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہو مالا نزدیک ہی گیسری کے صدر دروازہ پر چوکس کھڑی تھی۔ اس نے وہاں سے اشارہ کیا "بیٹھی رہ۔"

وہ پھر کواڑ سے لگ گئی۔

اب آبا کا غڈ سمیٹ رہے تھے، وہ کھڑا ہو چکا تھا۔

"اندر جا کر اپنی مانی کو دیکھ آؤ، بہت غلیل ہیں۔ آبا ذرا رکھائی سے کہہ رہے تھے مجھے ہے، مجھے معلوم ہے۔ آبا کی یہ سرد مہری مصنوعی ہے۔ آبا کی خود داری کی وجہ سے ہے۔ آبا انھیں چاہتے ہیں۔"

"بہت اچھا۔"

اللہ، اب بھی ان کا دل نرم کر دے۔ آبا کا دل بھی نرم کر دے۔ اللہ۔ آبا ان سے میرے لئے بات کر لیں۔ مولا معجزہ دکھا دے۔

"نیرامیل کہاں ہیں؟" ریحان پوچھ رہا تھا۔

"معلوم نہیں کہیں باہر گئے ہیں۔" نواب نے جواب دیا۔

آبا انھیں رات کی دعوت کے لئے ہی روک لیجئے۔ ایک اجنبی مسافر کی طرح واپس نہ چہ دیکھے۔ آبا پلیر۔

"مانی جان ————— اپنے کمرے میں ہوں گی؟"

"ہاں ہاں۔ وہیں ہوں گی۔"

"اچھا ماموں جان۔ خدا حافظ۔" اس نے مصافحہ کے لئے دونوں ہاتھ بڑھائے۔ اور بڑ

دب سے جھک کر آبا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ "میں دینی سینچتے ہی نواب زادہ لیاقت علی خاں ٹوشیکٹ کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔"

”آداب عرض مامول جان :-

”بچتے رہو۔“

وہ فائل اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھا۔ گیلری میں سے مالا نے اشارہ کیا جہاں آرا
سرعت سے ڈائینگ روم کے پچھلے دروازے سے باغ میں اتر گئی۔ اگر کہیں ٹڈ بھڑ ہو جاتی۔ گیلری میں
سے جانا چاہئے تھا۔ ضرور ٹڈ بھڑ ہوتی، اور پچھے سے آبا آ جاتے۔ تو کیا ہوتا؟ آبا کا حکم ہے کہ اگر کبھی بھی
دونوں جہند منزل آئے تو جہاں آرا کا اس سے سخت پردہ کر لیا جائے۔ وہ تیر کی طرح پچھوڑے پنچے۔
اور پنتی کا پنتی سنان تالاب کے کنارے شکستہ ”راج سنگھاسن“ پر دھم سے جا کر بیٹھ گئی۔
چند منٹ بعد مالا دیلے پاؤں درخت کے پچھے سے نمودار ہوئی۔ ”میں نے اندر جا کر تھانکا
تھا۔ رو تو میاں بیگم صاحب کے کمرے میں گئے تھے۔ مگر وہ سو رہی تھیں۔ بے سدھ، وہ باہر نکل
ئے۔ اب جانے کدھر سے۔۔۔“ ایک تخت وہ چُپ ہو گئی۔

وہ پچھلے برآمدے سے اتر کر باہر جانے کے ارادے سے تالاب کی طرف چلا آ رہا تھا۔ جس کا چکر
ٹٹ کر باغ کی سڑک سامنے کے پھاٹک کی طرف جاتی تھی۔

پھر وہ عین اس کے مقابل میں آن کھڑا ہوا۔ رنگین تخت کے پاس۔ بالکل اسی طرح، جیسے
سب روز خواب میں آیا تھا۔ خواب میں دیکھا تھا۔

بارش شروع ہو گئی۔ وہ جلدی سے سیمل کے نیچے آگیا۔

اور تب اس نے جہاں آرا کو دیکھا۔

”اوہ ہلو۔ ہلو جہاں آرا۔“ اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”آداب رو تو بھائی۔“

کوئی بھونچال نہیں آیا۔ زمین نہیں ہٹی۔ قیامت نہیں آئی۔ وہ اس کے سامنے موجود ہے
سب رات، چار سال قبل وہ اسی جگہ سے اسے خدا حافظ کہہ کر گسے رو تا بکلت چھوڑ کر گیا تھا۔ اب سامنے
وجود ہے۔ اور اس سے بات کر رہا ہے۔

مالا چپکے سے کھسک کر درخت کی ادٹ میں ہو گئی۔

”آپ کب آئے رو تو بھائی۔“ مضبوط، پرسکون آواز۔

"ابھی تھوڑے دن ہوئے۔"

"آج کل کہاں رہتے ہیں۔"

"بمبئی — تم۔ تم اب کس کلاس میں ہو؟"

"میں نے کالج چھوڑ دیا۔ کافی دن ہوئے — بھو بھاجان کیسے ہیں۔ آپ شو ناپور گئے تھے؟"

"ہاں۔ ٹھیک ہیں۔"

"اور رالہ؟"

"وہ بھی خیریت سے ہے۔ اچھا جہاں آرا اب ہم چلیں۔ بارش تیز ہو گئی تو مشکل ہو جائے گی۔ اچھا۔ خدا حافظ۔"

"اس نے کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا پھاٹک کی طرف روانہ ہو گیا۔"

"وہ آیا، اتنے برسوں، اتنی رات دن کی دعاؤں کے بعد، اور دو منٹ میں چلا گیا۔ مگر دنیا ویسی ہی موجود تھی۔ درخت، پرندے، آسمان، زمین، بادل۔"

"آلا پیڑ کے پیچھے سے نکلی۔"

"وہ ہولنوں کی طرح آلا کی شکل نکلے لگی۔"

"بنی بی اندر چلے۔"

"اور تب جہاں آرا نے تخت پر زور کا مکا مارا اور دھری ہو گئی۔" کیوں آئے تھے آلا۔ کیوں

آئے تھے، جب میں ادھر بیٹھی تھی، تو کیوں آئے تھے۔ یہ صے کیوں نہیں چلے گئے۔ تجھے معلوم ہے آلا

کیوں آئے تھے؟ کیا کہہ رہے تھے؟"

"اٹھو بنی۔ اٹھو۔"

"کیوں آئے تھے۔"

"بنی بی پاگل مت بنو۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔ توبہ۔ توبہ۔"

اس نے جلدی سے آپگل سے اپنا چہرہ لو پٹھا۔ شاید مجھے ہسٹریا ہو جائے گا، اس نے لرز کر سوچا۔

اتنی کی طرح ————— اختلاجِ قلب کی مریضہ کہلاؤں گی ————— لوگ مجھ پر ترس کھائیں گے۔

————— ہنسیں گے ————— اللہ ————— اللہ —————

آلا نے اس کا ہاتھ تھام کر "راج سنگھاسن" کے نیچے سے بہتے ایک منٹ برساتی

لے کو پھلانگے میں مدد کی۔ پھر بارش کی تیز بوجھار میں وہ دونوں سر پر آنچل ڈال کر جھکی جھکی تیزی سے کوٹھی کی طرف بھاگیں۔

۲۸

رونک لانا تیرا بھی

ستمبر ۱۹۷۲ء کی ابر الود شام کی نیم تاریکی میں دو آوازیں چنر رکنج کے پھاٹک کے ترچھے، نیم لکڑے ستون کے قریب۔

”اچھا بھائی۔ یہ لوتیوں کتابیں۔ بہت سنبھال کر رکھنا۔ اس پر ہم نے سرو جی دیہی سے دستخط ہیں۔ دیکھو انہوں نے تمہارے لئے کیا لکھا ہے۔“

”کہاں۔ کہاں۔ ۹۔“

”ماچس جلانے کی آواز۔“

”یہ دیکھو۔“

”اوماں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے میرا نام لکھا ہے۔۔۔ ہاؤ۔ ان کریڈیبل۔ آپ کو

ن ملیں؟“

”یہ سب تفصیلات نہ پوچھا کرو۔“

”نہیں بتائیے۔“

”دہلی میں۔“

”اور آپ نے ان سے میرے متعلق کیا بتایا؟“

”کچھ نہیں۔ صرف یہی کہا تھا کہ ایک باؤلی سی لڑکی ہے۔ اس کے لئے اپنی طرف سے اس

سے کچھ لکھ دیکھئے۔“

”اوماں۔“

”اور یہ لو۔“

”اوہ۔ نوکشی کا تارا ٹھہ! اور یہ۔“

”رونکسی لانا تیرا بھی۔!“

”اوماں۔!“

”مولوی جشیم الدین سے بھی دستخط کروائے بھائی۔ دونوں کتابوں پر۔ اور یہ لو۔“

مولوی منصور الدین کی نئی جلد۔“

”بیرامونی؟ دوسری جلد آگئی؟“

”ہاں۔ مع مصنف کے دستخط۔ اب تم بھی کیا یاد کرو گی۔ کس سوپر انٹیلیکچول چاہنے والے

سے واسطہ پڑا ہے۔“

”یاسمین ایک دن کہہ رہی تھی۔ ایک روز وہ اپنا ٹروپ بنائے گی۔ اور نوکشی کا تارا ٹھہ کا

بیلے تخلیق کرے گی۔“

”وہ بھی تمہاری جیسی ہے؟“

”یاسمین؟ نہیں۔ دراصل وہ روزی بیجاری کی چیلی تھی۔ پھر میری چیلی بھی بن گئی۔“

”بس تو پھر اب اللہ اس پر رحم کرے۔ روزی کا حشر دیکھو تمہاری چیلی بن کر کیا ہوا۔ اچھا بھی

اب ہم بھاگتے ہیں۔ تمہارے بابا آہی نہیں چلتے۔“

”وہ شاید مترابا لو کی طرف چلے گئے۔ اب پھر کب آئیں گے؟“

”جب بھی تم بلاؤ گی۔ فوراً۔ اچھا۔ اب چلتے چلتے یہ بتا دو کہ کیوں خفا تھیں۔“

”افوہ۔ دن ٹریک مائنڈ۔“

”ہرگز نہیں بتلاؤ گی وجہ؟“

”نہیں۔“

”میں آدھا سے کہے جا رہا ہوں کہ معلوم کر رکھیں۔ ان کو بتا دو گی؟“

”ہرگز نہیں۔۔۔ دہلی میں ڈھاکر صاف سنائی دیتا ہے؟“

”ہمیں بالکل صاف سنائی دے گا۔ ۲۹ تاریخ شام کے ساڑھے چھ بجے۔ پھر ساڑھے ساڑھے

پھر سوادس، تمہارا ہندوستانی پردگرام کس وقت ہے؟

”سارٹھے سات“

”کیا کیا گا رہی ہو؟“

”ہندوستانی پردگرام میں؟ ‘مائی ری میں تو‘ دالا بھجن۔“

”سنائو۔ سنائو۔“

”یہاں شرک پر۔؟“

”یہ شرک ہے؟ سنن، جنگل بیابان۔ ہو کا عالم، آہستہ سے گنگنا دو۔“
خاموشی۔

”مائی ری میں تو لیور میو مول۔“

”ہاں۔ ہاں اور آگے۔“

”کوئی کہے چھانے، کوئی کہے چوڑے۔ لیو ہے جنتاڑھول۔“
خاموشی۔

”پھر رک گئیں، ارے گاؤ بھائی۔“

”کوئی کہے کارو، کوئی کہے گورو۔ لیو ہے انکھیاں کھول۔“

”شاہاش بالکل ٹھیک کہتی ہو۔“

”جائیے ہم نہیں گاتے۔“

”کیری آون۔ کیری آون۔ ایڈریٹ۔“

”کوئی کہے ہلکو، کوئی کہے بھارو۔ لیو ہے تراجو تول۔“

تن کا گہنا میں سب کچھ دینا

دیو ہے باجو بند کھول۔“

”اور تین عدد بالوچر ساڑیاں بھی۔“

”دل پو شٹ آپ۔“

”آگے۔“

مگر جہاں میرے رنج و راحت کا سوال پیدا ہو وہ سماجی قوانین کو بالکل نظر انداز کر سکتے ہیں۔ پہلے
ی انھیں اپنے سماج سے کیا سروکار ہے۔ برسوں سے گوشہ نشین بیٹھے ہیں۔

”قواب میں اطمینان سے پردیس جاؤں؟“

”بالکل اطمینان سے۔“

”بھئی واہ۔ کیا چرخیوں گاڑی چلی آرہی ہے۔“

”کہاں —؟ ارے، ارے بھائے۔ پشی ماں آرہی ہیں۔“

”اس وقت کہاں گئی تھیں؟“

”رئیس کو رس کے قریب جو پرانا مندر ہے نا، وہاں ہر منگل کی شام کو کیرتن ہوتا ہے۔“

”تمہارے عہدِ اتحادِ میاں کس قدر چرخیوں گاڑی ہانکتے ہیں۔“

”بھائے۔“

”ہشت۔ میں ڈرتا ہوں تمہاری پشی ماں سے؟ مگر یہ گاڑی تو ادھر نہیں آرہی۔“

”پشی ماں سیدھی جا کر ڈیوڑھی پر اتیر جائیں گی۔ تھینک گوڈ۔“

”قواب میں اطمینان سے کھڑا رہوں۔؟“

”نہیں۔ اب بھائے۔ تینوں روکے آتے ہوں گے۔ اور بعد میں طرح طرح کے سوال کریں گے۔ نہیں

نہیں مت جائیے۔“

”بھائی فیصلہ کر لو۔“

”کیا آپ کو فیصلے کرنے مشکل نہیں لگتے؟“

”قطعی نہیں۔“

”مجھے بھی نہیں۔ میں کسی سے ڈرتی ہوں۔“

”اب گئی بار میں تم کو شو نا پور لے جاؤں گا۔“

تبسم۔

”کیوں کیا خیال ہے۔“

”سادھو! میں تمہارے گھر ہرگز نہ آؤں گی۔“

”اے! — گوری! — میں نے تمہارے لئے تالاب کھودا ہے۔ سبزی باڑی بنائی ہے۔ میں تمہارے لئے سیندر کی ڈبیا اور پیشوری ساری لاؤں گا۔ ڈھا کے سینگ کی چوٹیا میں راجہ کا ملازم ہوں۔ تمہارے بالوں سے کھینچتا ہوا لے جاتا۔ مگر کیا کروں عورت کی عزت کرتا ہوں۔“

”بشاش ہنسی۔“

”اچھا سنو۔ روزی کے متعلق کوئی اطلاع ملے تو مجھے ضرور لکھنا۔“

”بہت اچھا۔“

”اب واقعی چلوں۔ دہنہ ٹرین چھوٹ جائے گی۔ دیکھو میں آدما سے کہے جا رہا ہوں کہ وہ مسیحا غیر موجودگی میں تمہاری دیکھ بھال رکھیں۔ اور تمہارے بابا سے بھی ذرا میری خوب تعریف واریں کر دیں راستہ ہموار کرنے کے لئے۔ اور یہ یاد رکھو۔ آدما فرشتہ خصلت بے مثال لڑکی ہے۔ اس سے بڑھ کر پُر خلوص دوست تمہیں اور کوئی نہ ملے گا۔ یہ بات میں تم سے پہلے بھی کہ چکا ہوں۔ اچھا اب چلے۔ بہت لمبا سفر ہے۔ کلکتہ۔ دلی۔ بمبئی۔“

”اپنا خیال رکھئے گا۔“

خاموشی، کیلے کی ڈالیموں کی سرسراہٹ — — — دور ایک کتاب دے جا رہا ہے۔
در رسونی گھر میں روشنی جل گئی۔

”مسکراؤ۔ — — — تو ہم روشنی میں تمہارا چہرہ دیکھیں۔“

ماچس جلانے کی آواز

”اے لودہ لب۔ آئی ہنسی۔ اے لودہ مسکراتے ہیں۔“

”کیا مطلب؟ سوں سوں؟“

”ہم نے اردو کا ایک حسب موقع مصرع پڑھا تھا۔ بے وقوف۔“

”آپ نے اتنی فر فرار دیکھاں سے سیکھ لی۔“

”بہتہ لوک گیت۔“

”علی گڑھ میں بے وقوف۔“
 ”مجھے بھی سکھلا دیجئے؟ سوں سوں۔“
 ”ضرور سکھلا دیں گے۔“
 ”دور گھنٹے کی آواز۔“
 ”ارے آٹھ بج گئے۔ اب چلوں۔ بائی۔ بائی۔“

آواز باز گشت
 آواز باز گشت
 آواز باز گشت

۲۹

شرمیلی رادھیکا سانیاں

ڈیر لیٹ دیپالی

میں تم سے دلی معافی چاہتی ہوں۔ اُسے کی اس طوفانی رات اپنی مہم پر جانے سے
 تمہارے گھر آکر میں نے تمہیں بہت بُرا بھلا کہا تھا۔ مگر ہم سب ایک زبردست قومی کرائس
 گذرے ہیں۔ اور اتنی قربانیاں دے کر محمود داؤمیری آنکھوں کے سامنے گولی کا نشانہ بنے۔ جیوتی را
 بس نے اتنا مارا کہ انہوں نے حوالات میں ہی دم توڑ دیا۔ جب ہمارے ساتھیوں نے پولس چوکی پر حملہ
 کیا بالکل ہنسی تھی۔ اور صحت جو اس کی قیادت کر رہی تھی۔ اسی وجہ سے میرے اوپر کوئی فرد جرم نوچا
 نہ گیا۔ جب ہمارے ساتھیوں نے تھلے پر سبھتہ گولے پھینکے پولس نے فوراً گولی چلا
 دی۔ جو ہم پر اشک اور گیس چھڑکا اور بری کوڑی چارج کیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میری بائیں
 س میں سخت تکلیف تھی۔ اور میں ہتھکڑی پہنے زمانہ حوالات کے فرش پر پڑی تھی۔ اور باہر شام ہو
 تھی۔ بالکل سناٹا۔ کچھ دیر بعد کچھ سپاہی اندر آئے۔ مجھے پولس کی لاری میں بٹھال کر جیل لے گئے

اور فنانہ دارڈ میں ڈال دیا۔ جہاں پھرتی پھرتی تھی۔ ایک ٹائمن میرے پاس رکھ دی گئی۔ باہر کھٹ سے جب میں زور زور سے کراہنے لگی تو ایک بڑھیا دارڈ راند رانی اور بڑبڑاتی ہوئی پھر باہر نکل گئی۔ بعد حیلر آیا۔ اس نے گنداسا اسٹرکچر منگوا یا۔ مجھے پھر لوہے کی لاری میں لاد اگیا۔ دو مسلح سپاہی ساتھ بیٹھے۔ لاری چمکولے کھاتی اندھیرے شہر میں سے گذرتی سول ہسپتال پہنچی۔ مجھے آثار کر زمانہ دارڈ کے ایک میسلے سے لوہے کے پلنگ پر ڈال دیا گیا۔ اس طرح ہتھکڑیوں سمیت دارڈ دیکھ کر ننگا مر سا ہو گیا۔ ایک بوڑھی عورت زور زور سے مین کرنے لگی۔ اس کا لڑکا بھی چند درختوں پر شبید ہو گیا تھا۔ خیر ڈاکٹر آیا۔ میری مر مچ پٹی ہوئی۔ کھانا کھلایا گیا۔ سپاہی دروازے پر پہرے پر بیٹھے۔ تین دن تک جنرل دارڈ میں رہی۔ مریض عورتیں ہمدردی سے ہر وقت میرے پاس گھری رہتا حکام نے میرا پلنگ ایک خالی کمرے میں منتقل کر دیا۔

خوش قسمتی سے میری ٹانگ کی ہڈی پر ضرب نہیں آئی تھی۔ مریض البتہ زیادہ چوٹ لگی تھی۔ ہر ڈاکٹر بڑی توجہ سے میرا علاج کرتے رہے۔ رات کو جنرل دارڈ کی عورتیں سپاہیوں کی نظر کا کر مجھے پھل دے جاتیں اور ہر طرح میری خدمت کو تیار رہتیں۔ اور میں سوچتی رہتی اس لائق نہیں ہوں کہ میری قوم کے افرو پر اتنا خیال کر رہے ہیں۔

اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ تب ایک روز صبح صبح کمرے میں ایک سیم صاحب داخل ہوئیں۔ انگریز ادب چھلکے اور آہستہ سے کہا: ”روزی باا دھیر عمر کی خاتون جھوٹا سا جوڑا باندھے۔ جھوٹے ہاتھ رنگ کا فراک۔ پاؤں میں بھدے بوٹے۔ مس آئیس بارو لو تھیں۔ اور ان کو دیکھتے ہی باہر بیٹھے سپاہیوں نے انھیں فوراً اندر آنے دیا۔ مس بارو چارلس بارو کی بڑی بہن ہیں۔ مشنری۔ انہوں نے نرمی سے کہ میرے پاپا پریشان حال مڑ بارو کے پاس پہنچے تھے۔ اور مڑ بارو نے فوراً مین کے انگریز بڑے پادری ٹرنک کال کیا تھا۔ جن کے ہاتھ میں بارو گھرو مڑ سے آئی ہوئی تھیں۔ میں چپ چاپ بیٹھی۔ عجیب و غریب کی تفصیل ہنسائی۔ مس بارو نے اسٹول پر بیٹھ کر مجھے سمجھانا بھانا شروع کیا۔ چیز جس کے رحم و کرم کی تبلیغ کیا کہ وہ اپنی کشیدہ ہتھکڑیوں کی ویسی کا منتظر ہے اور یہ کہ اگر میں معافی مانے پر دستخط کر دوں تو مجھے فوراً رہا کر دیا جائے گا۔ اور جیل کے ڈسٹرکٹ جیسٹرٹ سسراری حفاظت میں ڈھاکے پہنچا دیں گے (پینز کے ڈی۔ ایم مڑ بارو نے کہا) میں نے صاف انکار کر دیا۔ مس بارو اٹھ کر چلی گئیں۔ دوسرے روز صبح پھر آئیں۔ ایک پھل،

اظلاسک اٹھائے چیرا سی ساتھ (میری یہ نئی شان و شوکت دیکھ کر ہسپتال کے عملے اور پہرے کے سپاہی بہت
بہ ہوئے اور ان کا رویہ بدل گیا) اس بار لو نے پھر مجھے اس نرمی سے لیکچر دینا شروع کیا گویا میں کوئی کم عقل لڑکا
ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ اپنا وقت ضائع کر رہی ہیں۔ وہ مایوس ہو کر چلے گئیں۔

اس رات زناہ جزل دارڈ کی ایک مریضی لڑکی خدیجہ چپکے سے میرے پاس آئی (اس کا باپ کچیری کا مرنی
رہا) اور کہنے لگی دیدی ہم سب عورتیں برابر آپ کی صحت کے لئے دعا میں مانگ رہے ہیں لیکن آپ نے
مافی نامہ پر دستخط کر دیئے تو ہم آپ کو کبھی معاف نہ کریں گے۔

میں نے اس سے کہا۔ خدیجہ۔ تم سب اطمینان رکھو۔ میں ہرگز معافی نہ مانگوں گی۔ اسی وقت باہر پہرے
سپاہی نے ڈنڈا بجایا اور وہ چپکے سے کھسک گئی۔

ایلیس بارلو تیسرے روز شام کو آئیں۔ اب کے سے ایک بنگالی افسران کے ساتھ تھے۔ انہوں نے
دع کرایا۔ مسٹر سین گپتا کے اسٹنٹ، مسٹر رتی کمار سانیال۔ یہ تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے
جواب نہ دیا۔ مسٹر سانیال نے بھی اس بار لو کے الفاظ دہرائے۔ معاف نہ ہو دستخط کر دیجئے۔ میں نے
سری طون کروٹ بدلی۔ مسٹر سانیال نے کہا۔ میں کل معافی نامہ لے کر آؤں گا۔ کل تک اچھی طرح سوچ
لیا۔ ایلیس بارلو کو شاید امید ہو چلی تھی کہ میں نرم پڑ جاؤں گی۔ چند منٹ بعد وہ اور مسٹر سانیال واپس چلے گئے۔

چوتھے روز صبح مسٹر سانیال پھر آن موجود ہوئے۔ لیکن ان کے ہمراہ اس بار لو کے بجائے ان ہی کے منسلک
اور صاحب تھے۔ انہوں نے کہا کہ ان کے کون بہت کمار سانیال ہیں۔ کلکتہ کے ایڈوکیٹ اور جنرل
انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔ انٹرویو کے معرکے کے بعد کے حالات "کور" کرنے کے لئے کلکتہ سے آئے ہوئے ہیں۔

یہ انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ذرا حیرت سے سوچا کہ ایک سرکاری افسر اس قسم کے انٹرویو کی اجازت کس
باز سے ملے گی۔ مگر یہ اندولن کا بنا رمل نہ تھا۔ ہر چیز ممکن تھی۔ کچھ پتہ نہیں کون ہمارا ساتھی ہے کون دشمن۔

رتی کمار سانیال مسکرا رہے تھے۔ مسٹر بہت کمار سانیال اب تک بت کی طرح بیٹھے تھے تکیے جا رہے تھے۔

ایک دم گھبرا گئی۔ میرا حلیہ بھی گیارہ ہو گا۔ اس وقت مانتے پر پٹی بندھی۔ سر جھاڑ نہ پیار۔ جیسے برسوں کی ردگی

ت آٹھ دن سے آئینہ تک نہ دیکھا تھا۔ بھنے بڑا غصہ آیا۔ یہ انٹرویو کی کیا تک ہے اور میں کون سی اتنی بڑی

بہر و ن ہوں۔ میری جیسی ان گنت لڑکیوں نے کیس زیادہ بہادری سے یہ اندولن چلایا ہے۔ میں تو پولیس کی

لاٹھی سے ہی چکر اڑا کر رہی۔

خیر۔ تو بسنت کمار سانیال نے مجھ سے چند عام سے سوالات کئے۔ کہاں پڑھا ہے۔ تحریکِ یو سے ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد وہ ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور خشکار کر کے دونوں باہر میں نے چونکہ معافی مانگنے سے قطعی انکار کر دیا تھا اور میری ٹانگ اور سر کے زخم ٹھیک ہو اس لئے دس روز بعد مجھے ہتھکڑیاں پہنا کر پولس گاڑی میں سوار کر دیا گیا اور دوبارہ جیل پہنچا دیا گیا۔ اس روز رات بھر زندہ وارڈ میں رت جگا رہا۔ مرضِ لڑکیاں چپکے چپکے قاضی نذر اللہ اسلام کے گئے رہیں۔ صبح کو جب میں اپنے کمرے سے نکل کر جا رہی تھی بہت ساری مرضی عورتیں برآمدے میں کھڑی رہی تھیں۔ ان سب کو معلوم تھا کہ اگر مقدمہ گئے پھینکنے کا جرم مجھ پر ثابت ہو گیا تو عمر قید ہو سکتی ہے پلنگ سے لٹا کر دیا جاسکتا تھا۔ وہ بھی زسوں کے چلانے کی پرواہ کے بغیر کھسکتی کھسکتی وارڈ کے دروازے میں آگئی تھیں۔

چنانچہ میں نے سڑک جیل کے زندہ وارڈ میں پہنچا دی گئی۔ کوٹھری میں پہنچ کر مجھے پہلی بار احسا اس میں داخل کیے گئے۔

تھوڑے عرصے کے وقت بسنت کمار سانیال آن پہنچے۔ انہوں نے کہا کہ میں قطعی فکر نہ کر دوں گے۔ یہاں کانگریس کے نامور ہیرسٹریں۔ اگر مجھ پر مقدمہ چلا تو وہ پیروی کریں گے۔ میں نے کہا کہ آپ میرے لئے اتنی پریشانی کیوں اٹھا رہے ہیں۔ وہ ایک دم ہنسے لگے۔ قصہ مختصر کرتی ہوں دیپالی بسنت کمار سانیال روزانہ شام کو جیل آکر مجھے قانونی صورت حال بتاتے رہے۔ اسٹریڈی کے سر کے بعد ہم بیتالیس لوگوں کو بغیر مقدمہ چلائے جیل میں رکھا گیا تھا۔ سندھ اور دوسری لڑکیاں کشتیہ جیل بھیجا جا چکی تھیں۔

اب دیپالی غور سے سنو۔ مجھے یہ انکشاف ہوا کہ بسنت کمار مجھے بیدار پسند کرنے لگے ہیں۔ اسی سے وہ جو صرف دو روز کے لئے پینہ آئے تھے آج ایک مہینے سے یہاں ڈٹے ہوئے تھے۔ یہ صبح تھا کہ وہ قومی میری مدد کرنا چاہتے تھے مگر اور بھی تو اتنی لڑکیاں جیلوں میں بھر دی گئی تھیں صرف میری مدد ہی کیوں؟ اس جواب میں انہوں نے کہا کہ ان سب لڑکیوں کے گھر والے ان کے لئے دودھ دھوپ کوئیں گے میری مدد کرنے والا نہیں ہے۔ (میں ان کو پاپا کے متعلق بتا چکی تھی) مگر مجھے لگتا ہے یہ بھی گپ تھی۔ دراصل ان کو مجھ سے عشق ہ تھا۔ نوائٹ فرسٹ سائٹ گپ نہیں ہے۔

ایک روز وہ خوش خوش آئے اور کہنے لگے مجھے دس ہزار کی ضمانت پر رہا کیا جاسکتا ہے میری ضمانت کون دے گا۔ میں نے کہا۔ اس کے متعلق سوچنا ہی بے کار ہے۔ دراصل دیپالی میں نے اپنے تیار کر لیا تھا کہ ایک نامعلوم مدت تک جیل میں پڑی رہوں گی اور پاپا میرے غم میں روتے روتے اندھے بن گئے یا مر جائیں گے۔ (ایلیس بارلو ہسپتال کے بعد ایک مرتبہ جیل بھی آئیں تھیں۔ مگر میرے ارادہ کی مضبوطی وہ لگا کر دوبارہ نہ آئیں۔ گارڈ ہلز واپس چلی گئیں)

دوسری صبح دروازہ کھلا۔ جیلر نے اندر آکر کہا آپ کو رہا کیا جاتا ہے ضمانت سسرل بنت لکار سانیاں ابھی۔ میں بالکل ہی بھونچکی رہ گئی۔

جیل کے پھاٹک پر بسنت لکار اپنے بھائی بھادج رتی اور رنجنا سانیاں کے ساتھ موٹر لے کر منتظر تھے اپنے ساتھ گھر لے لے۔ رتی لکار سانیاں کی کوٹھی سول لائنز میں تھی۔ وہاں پہنچ کر افوہ دیپالی۔ مجھے ایسا لگا۔ زنانہ جیل اور ہسپتال کے زنانہ جنرل وارڈ کے بھینانک، افسردہ ماحول کے بعد یہ دوسری دنیا معلوم۔ میں نے سوچا۔ میں خوش قسمت ہوں۔ میں جو اکثر اپنی اپنی کالج کی محدود سی زندگی سے شاکہ رہا ابھی۔ میں نے دیکھا کہ اسی دنیا میں بیشتر انسان کتنی تکلیفوں میں زندہ رہتے ہیں۔ کیسی کیسی ذلتیں ذلتیں اٹھاتے ہیں۔ مجھے وہ سب زنانہ جنرل وارڈ کی غریب، میلی کچیلی لیکن باجمت عورتیں یاد آئیں۔ مجھے پتہ چلا کہ ہماری جتنا، ہماری عورتیں واقعی کتنی بہادر ہیں۔ کیسی بہادر سی سے زندہ رہتی ہیں۔ سی بہادری سے مرنے لگی ہیں۔

اتنے دنوں بعد اچھے سے غسل کرنے میں اچھی طرح نہائی۔ صاف ساری پہنی۔ میز پر بیٹھ کر کھانا یا۔ اور برابر یہ احساس رہا کہ ورنہ انسانوں کو زندگی کی یہ بنیادی آسائشیں ہی میسر نہیں۔ یہ احساس پچ پچ پہلی بار ہوا۔

شام کو ہم تینوں برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ بسنت نے مجھ سے کہا۔ کل روانگی ہے سنا۔ ملو۔ (میرے پاس سامان ہی کہاں تھا جو ساری پہن کر میں ہم پر لگی تھی وہ خون میں تر تر ہو چکی تھی۔)۔ ل میں انہوں نے ایک بھداسار دپ پہننے کو دیدیا تھا۔ مجھے وہ روب بہت چبھتا تھا۔ بے چاری خدیجہ مجھے اپنی ساری اور بلاؤز اور پیٹی کوٹ پہننے کو دیدیا تھا۔ روزانہ وہ اپنی ایک ساری دھو کر سکھا کر مجھے کو دیتی۔ وہ خود بہت غریب لڑکی تھی۔ ایک سماج چراسی کی بیٹی۔ دوسری عورتوں نے بھی مجھے اپنی ساریاں

پہننے کو دیں۔ یہ سب مجلس عورتیں تھیں۔ دیپالی۔

”سامان میرے پاس کہاں ہے؟“ میں نے کہا۔

وہ ہنس پڑے اور کہنے لگے۔ ”بالکل عادتاً منہ سے نکل گیا۔“

”میں روزی کو کل بازار لے جاؤں گی۔“ رنجنا بولیں۔

”میں ان کے بازار میں کیا رکھا ہے۔ جب وہ کلکتہ پہنچے گی تو۔۔۔“ بسنت بابو نے کہا شروع کیا۔

”کلکتہ کیوں۔۔۔؟“ میں نے ان کی بات کاٹی۔

”کلکتہ اس لئے کہ میں تم سے شادی کر رہا ہوں۔“ بسنت بابو نے جواب دیا۔

اسے ویمنز میگزین رومانس، طوفانی محبت، سنڈیلا اسٹوری وغیرہ کیا کہتے ہیں۔ اپنا تاج

تو بہر حال یہ بتا لے کہ اس طرح کے واقعات زندگی میں یقیناً ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

میں نے پایا کا غیظ و غضب، یہ انوکھی، پرخطر صورت، ہر چیز نظر انداز کر دی۔

سول میرج کے لئے عدالت جانا پڑتا۔ اور نئے قضے اٹھ کھڑے ہوتے۔ چنانچہ دوسرے روز ذات کو چپکے۔

پینڈت کو بلایا گیا۔ ٹیکل ٹھکانا تازہ برہمن۔ ڈرائنگ روم میں پھیرے پڑے۔ باقاعدہ۔ میرا نام رادھیکا رکھا

گیا۔ بسنت نے مجھے بتایا کہ بنگالی دیشنومت میں ہر مرد کرشن اور ہر عورت رادھا کا تصور ہے۔ کوئی ایسی

مذہب و مذہب سب میرے لئے معنی بات ہے۔ چرچ کا پادری چند الفاظ دہرا دیتا۔ پینڈت نے بھی

اسی طرح کچھ عجیبو جمبو کہہ دیا۔ اصلی چیز محبت ہے۔

تین روز بعد ہم لوگ کلکتہ آ گئے۔ بسنت کی کوٹھی بالی گنج میں ہے۔ بیدرا علی خاندان۔ ان کے بابا کلکتہ

کے مشہور سرجن ہیں۔ بڑے بھائی پیرسٹر۔ بسنت کی بھابھی بھی ڈاکٹر ہیں۔ میری نند۔ برادورن کالج میں کیمسٹر

کی ٹیکر ہے۔ بڑا روشن خیال اور کلچرڈ خاندان ہے۔ میرے سسر اور حیثیت نے جو بڑے جو شیلے قوم پرست

ہیں فخر سے میرا سواگت کیا۔ لیکن ساس اور کہنے کی دوسری بڑی اہلیاں اس شادی سے خوش نہیں ہیں

کیونکہ بہر حال میں عیسائی ہوں۔ اور ایک گناہم غریب پادری کی لڑکی۔ مگر یہ لوگ اتنی شائستہ ہیں کہ اپنے کسی

رویت سے اپنی ناخوشی کا اظہار نہیں کرتیں۔ اور انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ بسنت کمار مجھے کتنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک

بید sophisticated خاندان ہے۔ اور اسے کے خاندان جیسا۔ مجھے یقین ہے کہ بہت جلد میری

ساس اور دوسری بورسہ خواتین میرے برتاؤ سے خوش ہو جائیں گی۔

ہماری کوٹھی سرپری توش رائے کے بیٹے کی کوٹھی کے پڑوس ہی میں ہے۔ میرے جلیقہ اور لبنت کی مٹر بہت دوستی ہے۔ چنانچہ دیپالی اب میں جہاں آرا اور اوارائے والے اس اونچے طبقہ میں شامل ہو چکی پر مجھے اپنے احساس کمتری کی وجہ سے اتنا رشک آیا کرتا تھا۔ یہ سب باتیں میں اس سہائی سے تم کو لکھ رہی اور کو نہیں لکھ سکتی۔

سانیاں بہت دولت مند خاندان ہے اور دیپالی میری ساری عمر سرت میں کٹی۔ اب میں خوش ہوں گا اگر ان کی زندگی گزار دوں گی۔ روپے کی قدر اسی کو ہوتی ہے جس نے ہمیشہ تنگی و ترشی سے بسر کی ہو۔ ہماری بلی، زندگی تمہیں یاد ہے؟

پاپا اکثر اسرار ربانی کی بات کیا کرتے تھے۔ اور ذرا سوچو تو مجھے لبنت کس ذریعے سے ملے اپنے پرانے پارس بارلو کے ذریعے! اگر چارس بار لو اپنی پسین کو ٹرنک کال نہ کرنا، وہ مجھ سے ملنے نہ آتیں۔ وہ اپنے ربی بابو کو لے کر آئیں اور ربی بابو کے ساتھ لبنت کھارے!!

پاپا ظاہر ہے کہ ہندو سے شادی کرنے کی وجہ سے مجھے قطعی معاف نہ کریں گے۔ میں نے بھی ایک ایک ان کو کتے عظیم حد سے پہچانے ہیں۔ کلکتے پہنچتے ہی میں نے اور لبنت نے اکٹھے پاپا کو خط لکھا۔ اسے ان کی BLESSINGS کی درخواست کی۔ آج صبح ان کا چند سطروں میں جواب آیا ہے لکھا کہ وہ خداوند خدا کے شکر گزار ہیں کہ میں زندہ بچ گئی اور خیریت سے ہوں۔ مگر میں نے مسوع کا دامن چھوڑا۔ بہت پرست کافر سے شادی کر لی۔ اس وجہ سے وہ عمر بھر میری شکل نہ دیکھیں گے۔ اور بلی کا بچ کے دروازے اور ہمیشہ کے لئے بند ہیں۔ اور یہ کہ وہ میری روحانی نجات اور بخشش کے لئے برابر دعا کرتے رہیں گے۔

اب ختم کرتی ہوں۔ دیپالی۔ بہت لمبا خط ہو گیا۔ ڈائینگ روم میں بچ کا گھنٹہ بج رہا ہے۔ اب دل۔ سسرال کا معاملہ ہے بھائی! پی۔ ایس۔ لبنت نے تم کو بہت بہت سلام کہا ہے۔ اور تم سے ملنے منت مشتاق ہیں۔ اب تم جلدی سے ہمارے پاس کلکتہ آؤ۔

تمہاری

رادھیکا موری سانیاں

بالی گنج۔ کلکتہ۔ ۸ اکتوبر ۱۹۳۲ء

ڈاکٹر بنوئے چند سرکار

بھوتارنی دی نے کھانے کے کمرے کی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا کالے رنگ کی لمبی پھانک پر کھڑی تھی۔ یہ مس صاحب کل بھی آئی تھیں۔ بنوئے گھر پہنچا تھا۔ باہر سے باہر چلی گئی۔ اب آج پھر آئی بیٹھی ہیں۔ بھوتارنی دی نے بیٹھک خانے کے دروازے میں جا کر پردے کے پیچے سے نظر ڈالی۔ ہمان خاتون کو تیوری پر بل ڈال کر غور سے دیکھا اور کھڑا دس پہننے کھٹ کھٹ کرتی رسوئی کی طرف چلی گئیں۔

ٹوٹو نے جا کر ڈاکٹر سرکار کو ان کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ ”اچھا۔ بٹھاؤ۔ میں آتا ہوں“ مریض اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر سرکار نے چلمی میں ہاتھ دھوئے اور تولیہ سے کلائیوں کو تھپتھپکے غانے میں آئے۔ اس وقت ہمان بی بی مسز سرکار مرحومہ کی تصویر کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔

”نو مشکار۔ او ما دی۔“

”نو مشکار۔ بنوئے بابو۔“ انہوں نے چونک کر کہا۔

”دیپالی تو بولہ پور جا چکی ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ وہ مسکرائیں۔

شیریں مسکرائی۔ ڈاکٹر سرکار صوفے پر چپکے بیٹھے رہے۔ بڑی عجیب بات ہے۔ شیشا بانی مرنے کے بعد سے آج تک، اس گھر میں، اس کمرے میں، دیپالی اور بھوتارنی کے علاوہ اور کسی عورت کے ہی نہیں آئے تھے۔

اُمانے باتیں شروع کیں۔ سوشل ”اسمال ٹاک“۔ ٹوٹو اندر سے سلاٹھی بید کی کشتی میں چاہ لے کر آیا۔ بھوتارنی دی نے باقاعدہ چاندی کا سیٹ مقفل الماری سے نکال کر نئی پیالیوں کے ساتھ چائے پی بھی تھی۔ عمدہ ٹرے کلا تھا۔ جلدی میں ٹی کوزی کا غلات تبدیل کرنا البتہ بھول گئیں۔

”دیپالی تو اسی اتوار کو بولہ پور گئی ہے۔ اگر آپ جب آگئی ہوتیں تو اس سے ملاقات ہو جاتی۔“

”کیوں بنوئے بالو۔ کیا میں آپ سے ملاقات کرنے نہیں آسکتی؟“
 بنوئے بالو جھینپ گئے۔ ”کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔“ وہ ذرا سیلف کوئٹھس سے ہو کر میز
 انگلیاں بجانے لگے۔ شبانی کے مرنے کے بعد سے انہیں خواتین سے غیر ضروری ”اسمال ٹاک“
 کرنے کی عادت ہی نہیں رہی تھی۔

اُومانے اُن پر ایک محفوظ نظر ڈال کر دیش چندرا آنجنائی کے پورٹریٹ کو دیکھا۔ واقعی
 لوں بھائیوں میں بڑی گہری مشابہت تھی۔ بنوئے بالو بھی خاصے دکش تھے۔ یہ آج غور سے
 دیکھنے پر تہہ جلا۔ دیپالی نے اس روز پہلے روز دوڈ لینڈز کے مودنگ روم میں ان کے متعلق غلط
 باتیں کہا تھا۔ بنوئے بالو واقعی بہت جاذب نظر تھے۔ اور سجدہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بنوئے بالو ان کو پہچاننے کے لئے پچھانک تک گئے۔ واپس
 رکھ مطلب میں جا بیٹھے۔

چند روز بعد اُوما پھر چندر کنج آئیں۔ یہ اتوار کا روز تھا۔ کوئی پندرہ منٹ تک مطلب میں بیٹھی
 رہا کھل شام آؤں گی۔

دوسری شام وہ دیر تک دیش چندرا آنجنائی کی باتیں کرتی رہیں جن کی وہ عقیدہ مند اور پرستار
 تھیں۔ پھر شبانی کا تذکرہ چھڑا۔ ڈاکٹر سرکار موجودہ شبانی کے متعلق کسی سے باتیں نہ کرتے تھے وہ
 ان کے نہاں خانہ دل کا ایک ایسا انمول خزانہ تھا کسی دوسرے سے اس کا ذکر کرنا ہی اس کی توہین
 تھی۔ مگر اُومانے ایسے خلوص اور محبت سے شبانی کے متعلق پوچھا کہ وہ بے اختیار اس کا تذکرہ کرنے
 لگے۔ اس عورت کو وہ اپنا ہمراز بنا سکتے تھے۔ یہ عورت شاید جانتی تھی کہ مرد دراصل کتنا

HELPLESS ہوتا ہے اور یہ عورت میں شاید اپنی ماں کو ڈھونڈ رہے۔

اب وہ شام کے وقت اُوما کا انتظار سا کرنے لگے تھے۔ تینوں لڑکے اس وقت کھیلنے کے
 باہر چلے جاتے تھے ورنہ اپنے بابا کو براہِ مے میں ذرا اکٹھن کے ساتھ ٹھٹھا دیکھ کر نہ جانے کیا سمجھتے
 رہتارنی دیپالی ان کو بخشنے والی نہ تھیں۔ وہ تو ایسے کسی موقع کے لئے برسوں سے ادھار کھائے
 بیٹھی تھیں۔ ایک روز انہوں نے بنوئے بالو سے کہا۔ ”سر پر تو ش رائے کی دلایت پلٹ لڑکی میری
 باند سے بھی پرتو ہو گئی ہے۔ اب اسے زیادہ دبدبے میں نہ رکھو۔ بڑھیا ہوئی جا رہی ہے

لاکھوں کا جہیز لائے گی۔ کیوں کھوکھا۔“

”دیدہ۔“ بتوئے بابو نے یک سخت سجدہ سمجھلا کر کہا۔ ”آئندہ ایسی پھر حماقت کی بات نہ کہنا؛ وہ ہونٹ پچکا کر مسکراتی اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

مگر کہاں رہنے والی تھیں۔ دوسری شام جب اودا دیسی آئیں بھوتارنی دیسی نے جھپاک سے اندہ پنچ کر پان پیش کیا۔ اودا دیسی کھڑکی کے پاس بیٹھی ڈاکٹر سرکار کا وہ ذاتی البم دیکھ رہی تھیں جس میں ان کی لڑکپن کا لٹچ کے زمانے، سیاسی دور، شادی اور سنی مون کی تصویریں تھیں۔ اُن کی فرمائش اور اصرار پر بنوئے بابو نے فوراً یہ البم لا کر ان کو دیدیا تھا اور خود کسی کام سے اپنے مطلب کی طرف چلے گئے تھے۔

اودا کی بھوتارنی دیسی سے اب تک ملاقات نہ ہوئی تھی۔ وہ ان سے بھی بہت گھل مل کر باتیں کرنے لگیں۔ کچھ دیر بعد بڑی بی نے پھٹ سے کہا۔ ”اے تم سیاہ کب کر دو گی بیبا؟“

اسی لمحے ڈاکٹر سرکار کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے انتہائی کوفت اور مذمت سے بڑی بہن کو دیکھا۔ ”دیدہ۔“

اودا بھی صاف تعجب گئی تھیں۔ لیکن بھوتارنی دیسی نے اطمینان سے جواب دیا ”اے کیوں؟ تمہیں تو اپنی بیٹی تک کی شادی کی فکر نہیں۔ تم کو ان معاملات سے کیا غرض۔ جاؤ۔ تم باہر جا کر اپنے حقے مرلیضوں کا ٹمپر بچر لیتے رہو۔“

اودا دیسی جھجکا کر سر کرنے لگیں۔ اس ہینڈ سٹم، ہٹ میلے، تارک الدینا ڈاکٹر سے ہلکا ہلکا فٹل کرنے میں لطف آ رہا تھا۔ بڑی بی نے لے کے پیار سے کہا اگل ہی شرم سے لال بھبو کا کر دیا۔

بھوتارنی دیسی اٹھیں اور فاتحانہ انداز سے قدم اٹھاتی کر سے سے باہر چلی گئیں۔

”آپ۔ دیدہ کی حماقت کا برا ماننے گا اودا دیسی۔“

”قطعا نہیں۔ میں پرانی نسل کی خواتین کو کیا جانتی نہیں ہوں!“ انہوں نے شگفتگی سے جواب دیا۔

لیکن اسی رات جب سب لوگ سو گئے۔ نو بھوتارنی دیسی نے سر ملنے کی کارنس سے قلم دوات اتار پتوں کے کمرے میں رہے پاؤں گئیں اور کھوکھو کی کاپی بگ میں سے چند سائے کاغذ بھاڑے اپنے کمرے میں آکر لٹنگ پر اتنی پالتی مار کر بیٹھیں اور بھتیجی کو خط لکھنا شروع کیا۔ بڑی احتیاط سے آہستہ آہستہ حروف بن کر لکھنے لگیں۔

نے لکھا۔ بیٹی۔ بھگوتی اما نے میری برصوں کی پرارتھائیں سوائس۔ شاید تمہارے باپ کا گھر بس۔

آدمی کے لئے کی تفصیل۔ آدمی کی محبت اور خلوص۔ (اتنے بڑے باپ کی بیٹی۔ مگر غور نام کو نہیں)۔
 کھوکا کو پسند کرنے لگی ہے۔ کھوکا کا بھی عورت کے معاملے میں میں سمجھتی ہوں اب جا کر شاید دل نرم پڑا۔
 برشتہ مجھے لگتا ہے بہت مبارک ثابت ہوگا۔ کھوکا کے اور تم سب کے دن بدل جائیں گے۔ اب تم ہی سوچو۔
 نہری شادی ہو جائے گی۔ (مآں سے پرارہنسا ہے تم کو کوئی ڈپٹی مجسٹریٹ ملے۔ رانی بن کر رہو۔ تم نے میری
 بی بہت مصیبتیں بھوگئیں) لڑکے کا چلے جائیں گے۔ رہ گئی ہیں۔ کسی روز بھی میری آنکھ بند ہوگئی تو میرے
 کھوکا کا پرسان حال کون ہوگا۔ تو بیٹی خوش ہو جاؤ کہ آتما جیسی امیر اور سمجھ داساں ملے گی۔ باقی اس خط
 کھوکا سے ذکر نہ کرنا۔ میں تمہیں بڑے راز سے لکھ رہی ہوں۔

تمہاری بیوی

بھومارنی دیوی

ڈاکٹر مسکار کے ایک مریض مترابا بوسری قوش رائے کے موکل تھے۔ اور اکثر مطب آتے رہتے تھے۔
 ادھر ڈاکٹر کی خاطر۔ انہوں نے کئی بار مسری قوش رائے کی کار بار دیکھی اور آدمی کو آتے جاتے
 بھا۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ دیپالی گھریہ موجود نہیں ہے۔ پھر انہوں نے خرا کرید سے بنوئے بابو سے
 چھا کر کیا آج کل آدمی ان سے اپنے درد سر کا علاج کروا رہی ہیں۔ بنوئے بابو صاف گواہ بھولے آدمی
 نے۔ کہنے لگے۔ نہیں ایسے ہی ملنے کے لئے چلی آتی ہیں۔

مترابا بونے فوراً گھریہ جا کر انجی بی بی کو یہ قصہ سنایا۔ مسر مترادوسرے ہی روز ڈوڈلینڈ پہنچیں۔
 دی رائے پچھلے برآمدے میں بیٹھی صبح کی کافی پی رہی تھیں اور اسٹیشن میں پڑھتی جا رہی تھیں۔ جب مسر
 راجہ صبح چلتی آکر نزدیک کی کرسی پر بیٹھ گئیں اور مسکار کیا۔

”ادھ ہوا اورن دھتی۔“ لیڈی رائے نے مسکار اخبار رکھ دیا۔ اور ان کے لئے کافی بنائے لگیں۔
 ڈی سی رسمی گفتگو کے بعد مسر مترادو اس خوبصورتی اور فنکاری سے جو اس قسم کے معاملات میں صرف
 اتین کا حصہ ہے، اصل مقصد کی طرف آئیں۔ ”آتما کی بیعت اب کیسی ہے؟“ انہوں نے کافی کا گھونٹ
 رتے ہوئے دریافت کیا۔

”اب تو بالکل ٹھیک ہے۔ آپ تو جانتی ہیں وہ ہمیشہ سے کتنی زود درخ اور چڑچڑی رہی

ہے۔ لیڈی رائے نے جواب دیا۔

”جیسی تو میں نے پوچھا۔“

”نہیں۔ اب تو شکر ہے کچھ دنوں سے کافی شگفتہ نظر آرہی ہے۔“

”یہ بھی ہمیشہ مجھ سے کہتے ہیں کوڈاکٹر سرکار کا علاج بالکل جادو کا اثر رکھتا ہے۔“

”ڈاکٹر سرکار۔۔۔؟“

”یہ بھی ڈاکٹر صاحب سے اپنے دے کا علاج کروا رہے ہیں۔ بہت تعریف کرتے ہیں۔ انہوں نے

ہی کئی مرتباً اوما کوڈاکٹر صاحب کے مطب میں دیکھا تو مجھ سے آکر بولے کہ یہ بڑا اچھا ہوا۔“

”اچھا۔ اوما نے مجھ سے ذکر نہیں کیا۔“

مسز متراب باقاعدہ GLOAT کر رہی تھیں۔ انہوں نے بات جاری رکھی۔ ”آپ نے اُن

کا نام تو سنا ہوگا۔ بنوئے چند سرکار۔ وہی جن کی لڑکی دیپالی سرکار ریڈیو پر گاتی ہے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“

”بے چارے بڑے شریف آدمی ہیں۔ بی بی نوعرہ سہا بر لوک سندھاریں۔ چار بچے ہیں۔ لڑکی بس

دیپالی ہی ہے۔ بڑا اچھا خاندان ہے۔ ان کے بابا سمن سنگھ کے زمیندار تھے۔“

لیڈی رائے قطعاً یقیناً نہیں تھیں۔ وہ مسز متراب لہجہ اور عندیہ دونوں بھانپ گئیں اور فوراً

ذرا رکھائی اور ناگواری سے دوسری طرف دیکھنے لگیں۔ لیکن مسز متراب کہیں گئیں۔ ”یہ تو بنوئے بابو کو بالکل

دیوتا سمجھتے ہیں۔ ایسے خاندانی اور وضعدار لوگ آج کل کہاں ملتے ہیں اور ہمارے پیسہ تو وہ تو ہاتھ

کا میں ہے۔“ اس نکتے تک پہنچ کر مسز متراب نے کوئی بالکل غیر متعلق موضوع چھیڑ دیا۔ اس کے دس منٹ

بعد کھانا بھر کر بات کو پھر وہیں لے آئیں۔ ”لڑکیوں کی شادی آج کل ایسا کٹھن مرحلہ بنتی جا رہی ہے آخر

کیا کیا جائے۔ میری مامی ماں کے دیور کی لڑکی بچی داس پیتا تو آپ کو یاد ہوگی اوما کی ہیلی تھی اس کی عمر کل

گئی بال سفید ہو گئے وہ تنگ آکر بھلاؤ ان جانے لٹکا یا برمایا کہاں چلی گئی۔ اسکول پڑھانے۔ اب خیال آنا

ہے۔ بنوئے بابو جیسا کوئی مل جاتا تو بیچاری کی قسمت بن جاتی۔ بنوئے بابو بے چارے اب جا کر کوئی چوائس

پینت ایس سال کے ہوئے ہوں گے۔ زمیندار کے لاڈ لے بیٹے تھے۔ باپ ماں نے نوعمری ہی میں بیاہ کر دیا تھا۔

یہاں تک پہنچ کر مسز متراب نے سوچا کہ اتنا آج بھر کے لئے کافی ہے۔ اور پھر دوسری باتوں میں لگ گئیں۔

یڈی رائے سسر مترا کی گفتگو سے کافی پریشان ہو چکی تھیں۔ رات کو ڈنر کے بعد انہوں نے سر
ی توش سے اس کا ذکر کیا۔ ڈھاکہ بہت چھوٹا اور پروفیشنل قسم کا شہر تھا۔ اُدما کی چند رکنج جانے
نا خبر اڑتی اڑتی سر پری توش تک بھی پہنچ چکی تھی۔ وہ ڈاکٹر سرکار سے واقف تھے۔ اس وقت انہوں نے یڈی
رائے سے کہا: ”شکر کرو کہ اُدما نے کسی میں دلچسپی لینی شروع تو کی۔“

”اس کا مجھے احساس کھائے جا رہا ہے کہ وہ اکتیس^۳ سے اوپر ہو چکی ہے۔ مگر ایسا بھی کیا۔“ یڈی
رائے نے آزدگی سے کہا۔ وہ اب تک اس لگائے بیٹھی تھیں کہ شاید کوئی ہم رتبہ داماد مل جائے۔ حالانکہ لڑکی اردو
وز زیادہ چڑچڑی اور موٹی اور بھڈی ہوتی جا رہی تھی۔ ہماری قسمت میں نہ جانے یہ دکھ کیوں لکھا تھا۔ معمولی معمولی
لوگوں کی لڑکیاں ایک سے ایک حسین، نازک، دلچسپ۔ ہماری بیٹی شکل و صورت اور چلنے سے استانی
لمتی ہے۔ باتیں شروع کرتی ہے تو سوائے اس کے ان بے تکے کامریڈز کے، سمجھ دار نوجوان ڈر کر دور بھاگ جاتے
ہیں۔ کارل مارکس اور لینن اور اسٹالن اور یہ اور وہ۔ لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا ہمارے مصلحین کی شاید ہدایہ
سے بھی بڑی غلطی تھی۔

بالی گنج کلکتہ میں سر پری توش اور یڈی رائے کے اکلوتے فرزند زمیں داس میلند وکمار رائے کے پڑوس
میں ایک سجدہ و تہذیب سانیال خاندان رہتا تھا۔ اس خاندان کے چھوٹے بیٹے بسنت کمار سے زمیں داس کی بڑی
دوستی تھی۔ پچھلے دنوں جب اُدما کلکتہ اپنے بھائی کے پاس جا کر رہی تو وہ نوجوان اس سے بھی ملنے آیا کرتا تھا اور
یڈی رائے کو امید بندھ چکی تھی کہ شاید بسنت اُدما میں کچھ دلچسپی لے۔ مگر اس نے بھی ابدیدہ اُدما کو دیدی کہنا شروع
کر دیا اور پھر وہی کارل مارکس اور لینن اور اسٹالن اور اُدما نے بھی ذرا سی بھی جو اس میں دلچسپی لی ہو۔ بس وہی
کج بحث ہو گئی اور مارکس اور بسنت نے اس غریب کالے پاروی کی حسین لڑکی روز کی سے بیاہ کر لیا۔ غضب خدا کا۔
اور اب ساری دنیا دیکھنے کے بعد یہ بے چارہ بنوئے چند سرور اُدما کو بھایا ہے۔ چلو۔ واقعی
شکر ہے۔ کوئی تو پسند آیا۔ سرکاری افسر سے شادی کرے گی نہیں۔ کمپوٹسٹ ہو گئی ہے۔ تو ظاہر ہے کسی ایسے
بی نادار آدمی کو چھانٹے گی۔

”مگر بنوئے بالو بہر حال خاندانی آدمی ہیں۔ ان کے باپ زمیندار و پیش چندر کو لوگ آج بھی ڈھاکے
میں بھولے نہیں ہیں۔“ سر پری توش کہہ رہے تھے۔ یڈی رائے نے گہرا سانس بھرا۔
”ان کی ایک جوان لڑکی بھی ہے۔“ یڈی رائے نے سوچ کر کہا۔

”دیپالی — اس کے گانے تو تم بڑے شوق سے سنتی ہو۔ اور ہمارا ترانہ اس کے ریکارڈ بڑی لگن سے بکایا کرتا ہے۔ سرسری قوش نے نہیں کر کہا۔

لیڈی رائے خاموش ہو گئیں۔ اور سوچنے لگیں۔ دیپالی کچھ عرصہ بعد اپنے گھر چلی جائے گی۔ مگر کے اپنی ذراہ لیڈنگ ٹھیک ہے۔ بجائے مجبوری اُٹا کے لئے بنوئے بالوبی بالکل ٹھیک ہیں۔ اگر وہ آج ہی اپنا عندیہ اظہار کرے تو بات آگے بڑھائی جائے۔

صبح کو لیڈی رائے نے اُٹا سے ڈاکٹر مرکار کے متعلق گولی گولی الفاظ میں استفسار کیا تو وہ مسکرا کر چپ نہیں۔ لیڈی رائے نے فوراً چپکے چپکے بنوئے بالو کے متعلق مزید معلومات شروع کر دیں۔

ایک روز اُٹا چند رکن گئیں تو ڈاکٹر مرکار سے کہنے لگیں۔ ”دیپالی کے لئے اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟“

”دیپالی — ابھی تو وہ اپنے میوزک ڈپلوے کے لئے ٹھہر رہی ہے۔“

”اس کے بعد؟“

”پتہ نہیں۔“

”آپ کے خیال میں ہے کوئی لڑکا؟“

”نہیں۔ آپ اتنے لوگوں کو جانتی ہیں آپ ہی کوئی تجویز کیجئے مگر آپ کو معلوم ہے میں لمبا چوڑا جہیز نہیں دے سکتا۔“

”مجھے وہ اپنی چھوٹی بہن کی طرح عزیز ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ جلد از جلد اس کا اچھی جگہ بیاہ ہو جائے۔“

”جلد از جلد — ابھی دو سال تو اس کے میوزک ڈپلوے میں باقی ہیں۔ پھر اس کی ضد ہے کہ ایم۔ اے کرے۔“

”ابھی اس کی عمر زیادہ نہیں ہے۔“

”نہیں۔ جلد ہی وہ اپنے گھر چلی جائے تو بہتر ہے آج کل زمانہ —“

”بڑا غریب ہے؟ بنوئے بالو نہیں پڑے۔“ آپ جیسی ترقی پسند یہ کہہ رہی ہیں؟

”میں آپ کو قدامت پرست سمجھتی تھی مگر آپ شاید مجھ سے بھی زیادہ ترقی پسند ہیں!“

”نہیں۔ میں پرانی وضع کا آدمی ہوں۔ مگر میں دیپالی کی خلاف مرضی اس کا بیاہ ہرگز نہ کروں گا۔“

”اگر وہ آپ کی خلات مرضی کرے تو؟“

”وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتی۔ بڑی معصوم، سیدھی بچی ہے۔“

آدما ذرا سکرائیں۔ بنوے بابو نے ان کو تعجب سے دیکھا۔

”ہر باب اپنی مٹی کو معصوم سیدھی ننھی مٹی ہی سمجھتا ہے۔“

”آپ کے والد بھی آپ کو یہی سمجھتے ہوں گے۔“ بنوے بابو نے منہس کر جواب دیا۔ آدما رلے لاجواب ہو

نیں۔ چند سیکنڈ بعد انہوں نے کہا۔ ”غرض کیجئے۔ دیپالی غیفر قریے میں شادی کرنا چاہیے۔“

”غیفر قریے میں؟ آپ کو یہ خیال کس طرح آیا؟“

”بنوے بابو۔ وہ ایک مسلمان لڑکا نہیں ہے۔ کامریڈ ریمان۔ وہ شاید آپ کے ہاں بھی کئی بار آچکا ہے۔“

نے کچھ یونہی افواہ مٹی تھی کہ۔۔۔

”افواہ۔۔۔؟“ بنوے بابو نے گھبرا کر پوچھا۔

”بنوے بابو۔ دھماکا اتنا جھوٹی سی جگہ ہے۔ افواہیں اڑتے کیا دیر لگتی ہے۔“

”لیکن آپ نے کیا سنا؟“

”کچھ نہیں۔“ آدما نے اطمینان سے صوفے پر پہلو بدل کر عینک اتاری۔ لگائی۔ اور ذرا بے پرواہ آواز

ماہنے لگیں۔ ”دیپالی پچھلے سال جون میں جب بولیور سے گھر آنے کے بجائے سندربن چلی گئی تھی نا۔“

”سندھال پر گئے۔“ بنوے بابو نے تصحیح کرنا چاہی مگر آدما دیپالے کے گیس ”وہ سندربن گئی تھی نا۔“

پچھلے سال جون میں۔ ریمان سے ملنے۔ آپ کو تو خیر معلوم ہی ہوگا۔ تب ڈیڑی کے کسی موکل نے منسل کھٹانے ایک

لوے اسٹیشن پر، شاید باگھیر مارٹ پر ریمان کو اسے ٹرین پر سوار کراتے دیکھا تھا۔ ”اچانک وہ سراسیمگی کے ساتھ

،، ادھوری جھوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ کیونکہ ان کو لگا جیسے بنوے بابو پر دل کا دورہ پڑنے والا ہے۔ وہ بھونچکے سے

نیں ننگے جا رہے تھے۔

”اوہ۔۔۔ آئی ایم سو سوری۔ بنوے بابو۔ میرا خیال تھا کہ آپ جانتے ہوں گے۔ آئی ایم سوری۔۔۔“

بز۔۔۔ اوہ۔۔۔

بنوے بابو نے ہاتھ اٹھا کر ان کو خاموش رہے کا اشارہ کیا۔ ذرا کرب سے اُن پر نظر ڈالی اور صوفے کی

نت سے سرٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں بعد وہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اور تیوری پر بن ڈال کر کھڑکی سے باہر

دیکھنے لگے۔

”مجھے افسوس ہے بنوے بابو“ اُٹا نے پھر کتنا شروع کیا۔ ”میرا خیال تھا آپ خود جانتے ہوں!“
دیپالی بڑی ماستانہ بچی ہے۔ وہ آپ سے جھوٹ نہیں بولتی ہوگی۔

”اُسے جھوٹ بولنا آپ نے سکھایا ہے اُٹا دمی۔“ بنوے بابو نے مدھم آواز میں کہا۔

”میں نے۔۔۔ میں نے بنوے بابو۔“ اُٹا نے نینک اٹا کر حیرت سے پوچھا۔

”جس طرح آپ اسے ایک بھتے کے لئے اپنے ساتھ گویا کو تیل لائے گئی تھیں۔ مجھے آج تک معلوم نہیں
دراصل وہ کہاں گئی تھی۔ یہ سب آپ کی ٹریننگ کا نتیجہ ہے اُٹا دمی۔“

”مجھے افسوس ہے بنوے بابو۔ اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں۔“ اُٹا اب ہڑ ہڑا کر کھڑی ہو گئیں

”میں آپ کو پانی لا دوں؟“ بنوے بابو خاموش رہے۔ اُٹا جلدی سے کھانے کے کمرے میں گئیں۔ ڈولی
رکھی صراحی میں سے گلاس میں پانی انڈیلنے سے قبل ایک نظر سے کمرے کا جائزہ لیا۔

خام کا وقت تھا اور رسوائی گھر سے کڑا ہی کی چھن چھن کی آواز آرہی تھی۔ کھانے کے کمرے کی کھڑکی
باہر عبدالقادر کے سر پر گھوڑے گھاس چر رہے تھے۔ اُٹا گلاس کے کمرے میں کھینک خانے میں واپس پہنچیں۔
بنوے بابو اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ اور دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ اُٹا تذبذب کے عالم میں دروازہ
کے پاس کھڑی رہیں۔ اتنے میں بھوتارنی دیسی کھڑا میں پہنے کھٹ کھٹ کرنی اندر آئیں۔

”کیا ہوا۔۔۔؟“ انہوں نے بھوس جھڑک کر دریافت کیا۔

”کچھ نہیں۔ شاید بنوے بابو کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے۔ یہ لیجئے۔“ گلاس بڑی بی کو تھما کر
جلدی سے باہر کمرے میں جا بیٹھیں۔ اور گھر روانہ ہو گئیں۔

دوسری صبح اُٹا پھر چند رکھ پنہیں۔ مطلب کے دروازے میں تالا پڑا تھا۔ بچے اسکول جا چکے
تھے۔ بھوتارنی دیسی عبدالقادر کی گاڑی میں بیٹھ کر بسنے کی جنس لانے بازار گئی ہوئی تھیں۔ اُٹا نے اندر جا کر
بابو کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بنوے بابو نے اخبار ہاتھ میں لئے کوارٹر کھول۔

”اوہ۔۔۔ تھینک گُڈ۔۔۔“ اُٹا نے کہا۔

”کیوں۔۔۔؟“

”رات بھر مجھے فکر کے مارے نیند نہیں آئی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو یہ صدمہ پہنچایا۔“

”میں زندگی میں بڑے سے بڑے دھچکے کو سہارا لینے کا عادی ہو چکا ہوں۔ مگر میں آپ کا مشکور ہوں کہ
نے مجھے اصل صورت حال سے آگاہ کر دیا۔“ وہ باہر بیٹھک خانے میں آنے لگے مگر اوما ان کے کمرے میں داخل
ہوئیں۔ انہوں نے چاروں طرف نظر ڈالی۔

”آپ تو واقعی بالکل سادہ صوفین چکے ہیں۔“

بنوئے بالو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اوما نے عینک اتار کر آنکھیں پتھیلیوں سے ملنے رہنے کے بعد کہا: ”بنوئے بالو آپ سے اب صرف

درخواست ہے۔“

”کہئے۔“

”آپ دیپالی پر ہرگز ہرگز یہ دظاہر کیجئے کہ میں نے آپ کو اس کے سنبھرنے جانے کا واقعہ بتایا ہے۔“

”آپ کو یہ درخواست کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس سے اس سلسلے میں کچھ سمجھ نہیں کر سکتا۔“

”کچھ بھی نہیں کہیں گے؟“ اوما نے حیرت سے دُہرایا۔

”نہیں۔“ بنوئے بالو آہستہ آہستہ دروازے کی سمت بڑھے۔ ”آئیے باہر چل کر بیٹھیں۔“

ایلی سمجھ دار اور بالغ لڑکی ہے۔ آپ کا خیال ہے میں اس طرح کی کوئی بات کہہ کر اُسے شرمندہ

نہیں کر سکتا؟

اوما ان کے پیچھے پیچھے بیٹھک خانے میں آکر ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔

بنوئے بالو آہستہ آہستہ کہتے رہے۔ ”اوما دیپالی شاید ایک غیر متند باب کی حیثیت سے

دیپالی کو کال کوٹھری میں بند کر دینا چاہئے۔ اور شاید فوراً کوئی ہندو لڑکا تلاش کر کے اس کی

ی کر دینی چاہئے۔ لیکن اوما دیپالی۔“ انہوں نے ایک لمبا سانس لیا۔ ”میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتا۔“

اس اشارہ میں وہ تھکے تھکے سے ہنسنے لگا۔ ”اس کے شکستہ صوفے پر بیٹھ چکے تھے۔“ میں یہ بھی جانتا

کہ وہ اپنی نو عمری کی رومانیت، آئیڈیلزم، اس سلیمان لڑکے سے محبت، جو کچھ بھی ہو، اس کی وجہ

مجھ سے پہلے بنا کر ریمان سے ملنے اکیلی وہاں چلی گئی اور غالباً اس کے ساتھ ایک ہی جگہ رہی۔ مگر اس نے

بھی ایسی حرکت نہ کی ہوگی جو اسے نہ کرنا چاہئے۔ مجھے اس کا یقین ہے۔“

”کس طرح۔“

”اوپ اوما دیسی۔ آپ ولایت میں تین چار سال اکیلی رہیں۔ آپ کے والد کو کس طرح ہے کہ آپ نے وہاں کوئی ایسی حرکت نہ کی ہوگی جو آپ کو نہ کرنا چاہئے۔“

اوما پھر جواب ہو گئیں۔ انھوں نے دھیمی آواز میں سوال کیا ”اب آپ کیا کریں گے؟“ وہ اور — اور ریختن کو بیاہ کی اجازت دیدیں گے؟ میں ریختن کو عرصہ سے جانتی ہوں۔ وہ کافی آبالی اور غیر ذمہ دار لڑکا ہے۔ ایک مرتبہ وہ اپنی کزن کو let down کر چکا ہے۔ اودیوا بھی، وہ بالکل hand to month زندگی گزارتا ہے۔ دیپالی ایک ہول ٹامر کے لادنس پر کس طرح گذر کرے گی۔؟ علاوہ ازیں وہ مسلم سماج میں کس طرح ایڈجسٹ کرے گی؟ خود اس غلامی سے آپ کی اپنی پرکیش پر بڑا اثر نہیں پڑے گا؟ آپ کے زیادہ تر مریض کٹر ہندو بھدرالوگ ہیں۔ — معاف کیجئے گا بنوئے بالو آپ تو ایک لامذہب رشی ثابت ہوئے مگر میں آپ کی ایک پُرخصوص کی حیثیت سے دیپالی کی بھلائی کے خیال سے یہ سب کہہ رہی ہوں۔ حالانکہ it is none of my business!

بنوئے بالو سر پیچھے ڈالے چھت کو تنک رہے تھے۔ وہ ذرا سا مسکرائے۔ ”اوما دیسی۔ آپ یقیناً میری اور دیپالی کی بھلائی کے لئے یہ سب کہہ رہی ہیں۔ اور میں آپ کا ممنون ہوں۔ مگر بات یہ ہے کہ انہوں نے پھر ایک لمبا سانس لیا۔ ”میرے نزدیک انسانی زندگی ایک انتہائی انمول شے ہے۔ اپنی نو جوان بیوی، اور اپنے نو جوان بھائی کو کھودینے کے بعد مجھے احساس ہوا ہے کہ زندگی کتنی انمول شے ہے۔ انسان کا دل — انسان کا دل —“ ایک دم ان کی آواز میں جوش سا آگیا۔ ”اوما دیسی آپ کو کیا اتنا بھی علم نہیں۔ آپ اتنا پڑھ لکھ گئیں۔ دنیا گھوم آئیں۔ اتنا نہیں جانتیں کہ انسان کا دل کتنی قیمتی چیز ہے۔ جوان دل اور جوان زندگی بید — بید بیش قیمت چیزیں ہیں۔ اوما۔ اور اس ایک مختصر سی انسانی زندگی کو دکھی بنانا دنیا کا سب سے بڑا گناہ ہے۔ کیونکہ زندگی بار بار نہیں ملتی۔ انسان صرف ایک بار جنم لیتا۔ میں پُر جنم میں یقین نہیں رکھتا۔ وہ ایک نفوتصور ہے۔ انسان کا دنیا سے، دوسرے انسانوں سے صرف بار رشتہ بندھتا ہے اور موت آتی ہے تو یہ رشتہ بھی ہمیشہ کے لئے منقطع ہو جاتا ہے۔ — اگر۔ اگر۔ اگر۔ یقیناً ہو جائے کہ دیپالی اس لڑکے کو اتنا چاہتی ہے۔ وہ لڑکا دیپالی کو اتنا چاہتا ہے، کہ ان کے راستے میں ہونے کی وجہ سے ان کی زندگیاں ہمیشہ کے لئے خزاں آلود ہو جائیں گی۔ تو میں یقیناً اسے شادی کی اجازت

لگا۔ ہندو سماج اور مسلم سماج اور میری پریکٹس، میری سچی کی مسرت سے زیادہ اہم نہیں۔
 "شادی کی اجازت دے دیں گے۔" اوما نے بھونچکی ہو کر دہرایا۔
 "یقیناً؟" وہ بہت محفوظ ہو کر اوما کو دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔ "تعب ہے! کٹر پروگریسو
 پاتھیں۔ آپ کو میرے ان پروگریسو خیالات پر بہت خوش ہونا چاہیے۔"
 اوما۔ کرسی سے اٹھیں۔

"جاری ہیں۔" بیٹھے۔ چار وائے پی کر جائے گا۔ دیدی ابھی بازار سے آئی ہوں گی۔"
 "نہیں اب میں چلوں" اوما نے جواب دیا۔

بنوے بالو صوفے پر سے اٹھے اور انھیں کار میں سوار کرانے کے لئے باہر آگئے۔ جب اوما کار میں بیٹھ
 ، تو انھوں نے ہاتھ اونچی کر کے سکرارتے ہوئے غصہ کیا۔ اور فوراً دو مریضوں سے بات چیت میں تنہک
 ے جو اسی وقت پھاٹک پر پہنچے تھے۔

دو ڈیٹڈ واپس پہنچ کر اومارائے نے مریضی توش کے سکرٹری کو حکم دیا کہ جلد اور جلد بولپو جانے کے
 ٹیمز اور ٹرین میں ان کا ریزرویشن کروادے۔ وہ دیپالی سے ملنے شانتی نکیتن جا رہی تھیں۔

۳۱ دلہن کی پالکی

دیپالی دیدی آداب

پرسوں یعنی جمعے کے روز جہاں آرا آپا کی شادی ہو گئی۔ آپ کو معلوم کر کے ضرور تعجب ہوگا
 یکے چپکے بات چیت چلائی جا رہی تھی تاکہ بقول شمسہ خاں کوئی باہر والا اڑنگا نہ لگا دے۔ خود
 آرا آپا کو تاریخ طے کرنے سے چند روز قبل ہی اطلاع دی گئی۔ یہ شادی بھی شمسہ خاں ہی نے
 ہے۔ نواب اجمل حسین مرشدزادہ نیر بھائی کی دلہن کے سکے خالو ہیں۔ دلہن بھائی کی خالہ
 ہوا انتقال ہو گیا۔ اولاد کوئی نہیں ہے۔ بقول شمسہ خاں جہاں آرا آپا کی عمر چھوڑ رہی تھی اور
 کم عمر و کامل نہیں رہا تھا۔ خصوصاً جبکہ جہاں آرا آپا کی صورت شکل بھی معمولی ہے۔ نواب اجمل حسین

مرشد زادہ آپسے عمر میں دو گئے بڑے ہیں۔ وہ بھی دیناج پور کے بہت بڑے زمیندار ہیں۔ میٹرک پاس ہو مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ بقول شمسہ خاں وہ اپنے سسر نواب قمر الزماں مجدد مہری کے توڑ کے رئیس تین موٹریں اور تین چارم تھی رکھتے ہیں۔ آپا کے لئے سیروں زیور چڑھاوے میں آیا۔ شمسہ خاں اُمّی۔ کہہ رہی تھیں لڑکا میٹرک پاس ہے تو کیا ہوا کون سا جہاں آرا کو اس کے ساتھ بیٹھ کر شیکسپیر پڑ کرنا ہے۔ لیکن اُمّی نے مجھ سے کہا کہ بے چاری جہاں آرا کی قسمت بھوٹ گئی۔ سنا ہے اجمل حسین صاحب عیاش ہیں شراب بھی پیتے ہیں۔ اُمّی نے شمسہ خاں سے ان کی عیاشی کی خبر پوچھ گچھ کی تو وہ بولیں۔ یہیں بس اب چکی رہو۔ جب لڑکی والوں نے سب طرح سے اطمینان کر دیا ہے تو ہم غیر لوگ کیوں فکر میں گھلیں۔ دوسرے یہ کہ لڑکا ایک زمانہ میں ذرا رنگین مزاج ضرور تھا۔ کلکتے جا کر ریس کھیلتا تھا! اور ذرا پے پلانے اور گانا دانا سننے کا شوقین تھا۔ مگر غریب کیا کرتا۔ بیوی مرحی تھی۔ اکیلا دام۔ اللہ کا دیا پیسہ بہت اٹھاتا تھا۔ مگر اب پھر سے گھر گرمست میں لگ کر ٹھیک ہو جائے گا۔ جہاں آرا بڑی نیک بخت ہے اس کی اصلاح کر لے گی۔

صبح کہتی ہوں دیدی مجھے شمسہ خاں اور نیر بھائی کی دلہن دونوں پر بڑا عصفہ آیا کہ انھوں نے مل کر آپا کو کہاں جھونک دیا۔ نواب صاحب اس رشتے سے قطعی خوش نہیں ہیں مگر سب گھر والوں نے مل کر اُن کا پیچھا لیا۔ اُوئی کیا لڑکی کا کوار کوڑ چٹنا ہے۔ جب تک وہ بیٹھی رہے گی انجم آرا، اختار کے لئے بھی پیغام نہیں آسکتے۔ نواب صاحب نے پھر بھی حامی نہ بھری تو جہاں آرا کی امی پر فوراً احتجاج قلب کا دورہ پڑ گیا۔ (احتجاج قلب نہیں دیدی۔ اب میں بڑی ہوتی جا رہی ہوں تو دنیا کی بہت سی باتیں سمجھ میں آتی جا رہی ہیں۔ بیگم قمر الزماں کو دراصل مہر بیا کا مرض ہے اور نواب صاحب چائے اسن پسند آتی ہیں بیوی کے ان دوروں سے ان کی روح فنا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے بچا ہے۔ نے ساری عمر اپنے اس ڈیپر سینگ کتب خانے میں بیٹھے بیٹھے گزار دی) بہر حال تو بیگم قمر الزماں نے الٹی میٹم دے دیا کہ لڑکی کا رشتہ اس جگہ نہ ہوا تو وہ زمین آسمان ایک کر دیں گی۔ نواب صاحب تر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔

اور تب ان کی بیوی نے ایک تَرپ چال چلی۔ یہ مجھے بالکل اتفاقیہ معلوم ہوا اور بڑی سخت حیرت ہوئی۔ ایک موزم میں ارجمند منزل گئی ہوئی تھی۔ جہاں آرا آپا باورچی خانے کی طرف جہ

تھیں۔ میں زیر بھائی کے بچے منور کو گود میں لے کر پیچھے والے برآمدے میں بیٹھنے لگی اور اندر بیگم قمرانہ کمرے سے آواز آئی۔ نواب صاحب بے چارے اپنی بیوی سے آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔ میں اس آواز کو جان بوجھ کر کنوئیں میں نہیں ڈھکیلوں گا۔ "تو وہ چمک کر بولیں۔ "اور کیا کر دے؟" جتنے ہو کر وہ تمہاری جتنی ملیحہ کے لہسنکے بیٹے کے ساتھ بھاگ جائے؟" نواب صاحب نے تانت سے کہا۔ زری بیگم۔ خاموش رہو۔ خاموش رہو۔ "وہ بھلا کہاں خاموش رہتیں۔ بولیں۔" معلوم بھی ہے ہنگامہ جیل سے چھوٹ گیا۔ پھر ڈھاکے کے چکر لگا رہا ہے، ابھی پرلے روز یہاں آیا تھا۔ میں سو رہی۔ وہ میرے کمرے سے باہر نکلا تو آہٹ سے میری آنکھ کھلی۔ جاتے ہوئے اس کی جھلک دیکھی تو گھبرا کر کی میں گئی۔ باہر جھانکا تو کیا دیکھتی ہوں۔ باہر تالاب کے کنارے دونوں کھسکے سر کر رہے ہیں۔ جہیں سنت کی خبر بھی ہے نواب صاحب۔ تم اپنی اسٹڈی میں بیٹھے پاکستان زندہ باد کرتے رہو۔ جہیں یہ نیکو لہاکہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ اب تم ہی چاہتے ہو کہ صاحبزادی تنہا ہے، ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگا کر اس ن اٹھائی گیرے کے ساتھ گھر سے نکل جائیں؟ اور فرض کرو وہ نہ بھی بھاگ سکے تو یہ خبر کرو تو میاں ن آگئے ہیں کم بدنامی کی بات ہے؟ بے چاری ختمہ بین اور اللہ رکھے نیر کی دہن نے جوڑ توڑ کر کے ایک رنگا ہے وہ بھی ٹوٹ جائے گا۔ رو تو میاں کا قصہ اب تک چھپا ہوا تھا۔ مگر اب بات پھیل گئی تو آرا تو خیر ہیں ہی بد نصیب۔ چھوٹی دونوں کے بھار شے نہیں آئیں گے۔"

نواب صاحب چپ چاپ بیگم کی یہ تقریر سننے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے۔ "انوری بیگم۔ رو تو اگر ی کے لئے اپنے کچے تو میں اسے اجازت دے دوں گا۔ چار برس قبل میں نے حماقت کی تھی۔ اب اجازت دوں گا۔" یہ سنتا تھا کہ انوری بیگم پردہ ساڑ گیا۔ کہنے لگیں۔ "میں مرقی مر جاؤں گی یہ شادی نہ ہو گی۔ اور یاد رکھو وہ اب تمہاری لڑکی سے بیاہ کرے گا بھی نہیں۔ میں اس روز کے بعد شہر بہن کے اس کے رتی رتی حالات معلوم کر رہی ہوں۔ وہ اس ہندو پیرسٹر کی لڑکی کے چکر میں مبتلا ہے۔ سرش کی لڑکی۔ یوں کہو کہ پیرسٹر کی لڑکی نے اسے رکھا ہوا ہے۔ تو بہ تو بہ تو بہ۔ اس خاندان میں ایسا بے آدمی پیدا ہوا۔ مگر کیا کرے۔ ہے بھی تو پاٹ کوٹنے والے دوٹکے کے کسان کی اولاد۔ اجمی وہ نواب کا بن کر بھی آئے تو میں اس دہلیز کو نہ بھلا نکتے دوں۔ آوارہ۔ دو کوڑی کی اوقات۔ میری شہزادی کو گاہ اور اجمی تم بھی سمجھا گئے ہو کیا۔ یا مرحومہ ملیحہ بیگم کی محبت نے جوش مارا ہے؟ بلواؤ تو اس کو۔"

ذرا دیکھوں کیسے شادی کرتے ہو جیاں آرا سے اس کی : ”اتنا کہہ کر وہ تو سوسے بہانے لگیں اور نو صاحب کمرے سے باہر چلے گئے۔

جب اندر یہ باتیں ہو رہی تھیں تو انجم آرا بھی برآمدے میں آگئی تھی اور کان لگا کر والدین مکالمہ سن رہی تھی جب باپ باہر چلے گئے تو وہ لمبا سانس بھر کر مجھ سے بولی : ”اب دیکھو کیا کیا ہے۔ اللہ کرے ایسا ہو جائے۔ اللہ کرے ایسا ہو جائے۔“ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ قصہ کیا۔ انجم کہنے لگی ابھی آپا سے کچھ ذکر نہ کرنا۔ ممکن ہے کچھ بھی نہ ہو اور آپا پھر غلط آس لگا کر بیٹھ جائیں۔ مگر دیدی بے چاری انجم کو ٹوہ لگ گئی کہ اب آبا کیا کرتے ہیں۔ اور وہ اور سالادوں جاس پرستہ ہو گئیں۔ انہوں نے اپنی جاسوسی کے ذریعے معلوم کیا کہ نواب صاحب نے شمسہ خاں کو بلا کر سے پوچھا : ”رو تو میاں اور اومارائے کا قصہ کیا ہے؟“ شمسہ خاں ہاتھ کانوں پر رکھ کر بولیں : ”مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں نے تو ایسے ہی اڑتی اڑتی سنی تھی۔ وہی میں نے انوری بہن کو بتلادیا۔“ اب نو صاحب نے جلد از جلد اپنے روزناموں کو کوئٹہ لکھنے کی کوشش کی۔ ان کو دہلی خط لکھا کہ فوراً آکر اومارائے کو فون کر کے پوچھا کرو تو اس وقت کہاں ہیں۔ انہوں نے کچھ گول سا جواب دیدیا۔

ادھر دیناج پور سے عقد کی تاریخ جلد طے کرنے کے تقاضے پر تقاضے آرہے تھے۔ اور سیکم قہ کے احتجاج قلب میں زیادتی ہوتی جا رہی تھی۔ جس روز نواب صاحب نے ان سے کہا کہ وہ جب تک میاں سے بات نہ کریں نکاح کی تاریخ طے نہ کریں گے۔ تو ان کی سیکم نے قیامت برپا کر دی۔ نواب نے دلی۔ بمبئی۔ کلکتہ جانے کہاں کہاں ہر ممکن پتے پر رونا میاں کو تار دیئے ٹرنک کال کئے مگر وہ حضرت جا کہاں غائب ہو چکے تھے۔ کوئی جواب نہ آیا۔ ادھر انوری سیکم پر اتنا زبردست دل کا درد پڑا کہ لینے کے پڑ گئے۔ نواب مستعز الزمل نے ہارمان لی۔ نواب اجمل حسین سے شادی کی تاریخ طے کر دی گئی۔

مجھے اس زمانہ میں دیدی نواب صاحب پر اتنا ترس آیا کہ کیا بتاؤں۔ ایسے ٹوٹے ہوئے اور دکھ اور غمزدہ لگتے تھے کہ دیکھنا نہ جاتا تھا۔ آبا کو مایوں بٹھایا گیا۔ ان کو بس چپ سی لگ گئی تھی۔ بڑی دھوم کی شادی ہوئی۔ روزی آبا کی اور آپ کی عدم موجودگی کا ہم سب کو افسوس تھا۔ روزی آبا کا اب کچھ پتہ نہیں چلا۔ ایک خبر ہے کہ معافی مانگ کر جیل سے نکل آئیں دوسری خبر ہے کہ کالے پانی بھیج دیا گیا اور ایک خبر ہے کہ کسی انگریز سے بیاہ کر لیا۔ اور ایک خبر ہے کہ ہتھکڑیوں سمیت جیل سے فرار ہو گئیں

وں کی کوئی حد نہیں!) اس بلا مئی کے زمانے میں بھی بڑی شان و شوکت کی تقریب رہی۔ نواب قمرالنبی کی بیٹی کا خادی تھی کوئی مذاق تھوڑا ہی تھا دیدی۔ دنیا ج پور سے برات آئی۔ جو دراصل سب مانی کے سسرال والے ہی تھے۔ ایک سے ایک دقیانوسی زمیندار نرائن گنج میں ماسٹرم سے اترا۔ سال ہم لوگ اسی برسات کے زمانے میں نیر بھائی کی بارات لے کر دنیا ج پور گئے تھے (خیر صاحب بارات ارجمند منزل کے دروازے پر آئی اور دولہا ہاتھی سے اترا تو ہم سب دھک سے رہ گئے۔ بھنگ۔ تمباکو کا پیٹا۔ منہ پان سے رہا ہوا۔ بس شکل قصبائی زمیندار۔ نواب اجمل حسین نواب راں کے ہم عمر ہیں بلکہ ایک آدھ برس نواب صاحب سے بڑے ہی لگتے ہیں۔ اور ان کے گھر کی عورتیں قصبائی ان پڑھ بنگالین۔ جن کے نزدیک ڈھا کہ بھی لندن سے زیادہ آزاد ہے۔ یا اللہ۔ یہ آپا کی مرال ہے۔ اور یہ آپا کے شوہر ہیں۔ اللہ کی شان ہے۔

اب اللہ کی ایک اور شان کا قصہ بھی سنئے اور غور کیجئے کہ بڑی بوڑھیاں جو "قسمت کا کھیل" مت کا کھیل" رشتی ہیں تو کچھ غلط نہیں کہتیں۔

شادی میں رخصتی کے وقت، روتومیاں بحیثیت مہمان آن موجود ہوئے، نکاح ہو چکا تھا۔ نیچے اردوں کی ٹفس مچی تھی۔ قہقہے لگ رہے تھے۔ میں نے فرید پور سے آئے ہوئے کسی نوجوان رشتے دار از سنی "رولوبھائی۔ آپ بھی کھا لیجئے۔ جلدی سے دو کیلے ہو جائیں گے۔" میں نے پلٹ کر انگریزوں میں اتنی بھڑکتی کہ کچھ پتہ نہ چلا۔ اتنے میں انجم میرے پاس بھائی بھائی آئی۔ اور کہنے "غضب ہو گیا یا سمین۔ رولوبھائی آپ نیچے۔ ان کو اب آنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا ان کو یہ تار نہیں ملے؟ اور اگر مل گئے تو ان کا جواب کیوں نہ دیا۔ پہلے کیوں نہ آئے؟ اب کیوں میں زخموں پر ہنک چھڑکے؟" اتنے میں شور مچا۔ دولہا آرہا ہے۔ دولہا آرہا ہے۔

آپا جو بالکل بے جان سی ہو گئی تھیں۔ ان کو زینے سے اتار کر زنانہ دیوانخانے میں لایا گیا اور پر بٹھال دیا گیا۔ دولہا میاں مسکراتے ہوئے آئے۔ آرسی مصحف ہوا۔ ساری رسمیں ادا کی۔ ہم لوگوں کا انجم، اختر اور میرا جی جتنا چرانے کو بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر مجبوراً چرایا۔ اس وقت مجھے پہلی بار روتومیاں نظر آئے جو دیوانخانے کے دروازے میں کھڑے اطمینان بر بھائی سے باتیں کر رہے تھے۔

اب دیدی اللہ کی تیسری شان سینے — یہ دونوں ماں آپ کے مشہور و معزز ترین
 احمد ہیں۔ جن کو آپ بھی شاید جانتی ہوں۔ کمال ہو گیا۔ یہ آپا کے چھوٹے زاد بھائی ہیں۔ ان کی سنگتی
 سے کیسے ٹوٹی ایک اور لمبا قہقہہ ہے جو مجھے انجم آرانے بعد میں بتایا مادر اگر میں اس خط میں لکھوں تو خط
 ہی طویل ہو جائے گا۔ زبانی بتاؤں گی۔ بہر حال تو دیوانخانے میں عورتوں کی وہ بھڑک جیہتی کدم گھڑ
 تھا۔ اسی وقت میں نے آپا کے خاندان کی چند بڑھیلیوں کی کھسک سہیلی سے فرید پور سے آئی ہوئی ایک بڑی
 بولیں۔ "اے ہے یہ تو اللہ بخشے فخر کی بھائی کا نواسہ ہے۔" دوسری نے کہا۔ "وہ تو روپوش تھا میں نے سنا ہے
 تیسری بولیں۔ "نکل آیا جیل سے نگوڑا۔ یہ بھی خدائی خوار پھرتا ہے۔" چوتھی نے فرمایا۔ "اے جنت مکانی
 کا قوت۔" "ہاں۔ ہاں وہی۔ اچھا ہوا جہاں آرا سے بیاہ نہ ہوا۔ بے چاری کی قسمت بھوٹ جاتی۔
 خود دکھانا۔ کیا نواب کی بیٹی کو کھلاتا نگوڑا دہریہ کیونٹا۔"

اب رخصتی کا وقت آیا۔ نیر بھائی نے پکارا۔ "مکہ خالی کرو۔ بھڑک کر دو۔ دلہن کے بزرگ آرہے
 بزرگ آرہے ہیں۔" خیر بہت سارے بزرگ آئے۔ آپا کو دعائیں دینے (ماں دیدی آپ کے بابا پٹشی ماں
 یتنوں بھائی بھی آئے تھے شادی میں) آپ کے بابا آپا کے لئے ایک بنا رسی ساری لائے تھے۔ دوسرے بزرگوں
 ساتھ جب وہ آئے سر پر ہاتھ رکھنے تو وہ آپا کے سر پر ہاتھ رکھ کر ایک منٹ کے لئے چپ سے کھڑے رہے۔ نو
 صاحب نے کہا۔ "بیٹی تمہارے ڈاکو چچا آئے ہیں۔ نواب صاحب دراصل رخصتی کے وقت دیوانخانے کے ایک
 گوشے میں گم سم کھڑے تھے۔ (میں نے کسی مرد کو روتے زندگی میں پہلی بار جھبی دیکھا۔ مگر سند ہے کہ بیٹیو
 کی شادی پر سب باپ لوگ روتے ہیں) جب دیدی آپ کے بابا آپا کے قریب آئے تو نواب صاحب
 سے کہنے لگے۔ "بنوئے! ایک دن دیپائی بھی اسی طرح رخصت ہو جائے گی۔ تم بہت کچھ لہجہ کرا۔
 دداع کرنا۔" میں مسند کے پیچھے دلے درتچے میں ہڑھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اور یہ سارا نظارہ دیکھ رہی تھی
 پھر پادری بنرجی روزی کے پاپا آگے بڑھے۔ انہوں نے بھی آپا کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ اور آئنا
 والے قسم کے عنوان کی ایک مذہبی داخلاتی پند و نصائح کی مجملہ کتاب رہن سے بندھی ان کے
 رکھ دی۔ پھر نواب صاحب سے کہا خدا باپ کا شکر ہے۔ آپ نے اپنی عمر کی اپنے ہاتھوں سے عزت
 ساتھ اپنے گھر سے رخصت کی۔ خدا کا شکر ہے۔ اور سر تھکائے مکر کے پیچھے ہاتھ باندھے باہر چلے گئے۔
 وہ کو آگوار میٹھی تھی کہ کیا بتاؤں۔ اور انجم بار بار جب موقع ملتا کچھ سے اکرکان میں کہہ جاتی۔ "ر"

نی کو نہ آنا چاہئے تھا۔ ایسی بے رحمی کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کہاں کی جدلیاں تھیں، ارکسیت ہے کیا آدمی
بیسٹ بن کر جذبات سے عاری ہو جاتا ہے؟

رونو میاں اُمادیہی کے ساتھ آئے تھے۔ بہانوں میں سرسری توجہ اور لیڈی رائے بھی شامل تھیں۔
رونو میاں اُمادیہی کے ساتھ بعد میں پہنچے۔ رخصتی کے وقت وہ دروازے میں کھڑے نیر بھائی سے باتیں
کر رہے تھے۔ نیر بھائی نے کہا: آقا، رونو بھائی یہ عید کا چاند کہاں سے نکلا۔ آپ سے تو آج چار ساڑھے
ربرس بعد ملاقات ہوئی ہے۔ کہنے لگے۔ ہاں بھئی۔ ذرا دھرخا صاف صاف رہا۔ (یہ بھی کن قدر زبردست
راسٹینٹ تھا!) میں ابھی پچھلے مہینے ڈھاکر آیا تھا۔ تب تم لوگوں سے ملاقات نہ ہو سکی۔

انجم تو اس موقع کی ناک میں تھی کہ ان سے ٹیٹھا کر سکے۔ وہ بچپن سے ان کی کافی منہ چڑھلی کر رہا ہے
ایک کراگے جڑھی اور لہنی۔ رونو بھائی آپ ڈھاکے سے کہاں گئے تھے۔ دلی؟ کہنے لگے۔ نہیں بی بی میں
لکے بجائے پارٹی کے ایک مزدوری کام سے سیدھا لاہور چلا گیا تھا اور وہاں سے پشاور۔ یہ پچھلا مہینہ
باب اور سرحد کے دورے میں گذرا۔ پشاور میں مجھے پارٹی ہیڈ کو آرٹریز کی طرف سے حکم پہنچا کہ فلاں کام
نے لئے پھر فوراً ڈھاکے واپس جاؤ۔ تو دوبارہ سیدھا یہاں آ رہا ہوں۔ آج صبح ہی پہنچا تو اُٹھانے
لایا کہ شام کو جہاں آرا کی شادی ہے۔ کیوں بھئی۔ اب تم کب شادی کر رہی ہو۔ کم از کم تم
راگے پڑھ ڈالو۔ بے چاری جہاں آرا کو اماں جان نے کالج سے نہ جانے کیوں اٹھالیا تھا۔

انجم مجھ سے کہہ رہی تھی کہ جب وہ اس قدر سادگی سے یہ سب کہہ رہے تھے تو میرا جی چاہا کہ
ہاٹیں مارا کر دوں اور پھر ان کو قتل کر ڈالوں۔ آپا ان کے دکھ میں رو رہا کہ زندہ درگور ہو گئیں اور یہ
ان کی شادی میں کس قدر مطمئن اور بے نیاز نظر آ رہے تھے۔

ساتھ ہی اُمادیہی بھی تھیں۔ دیوار سے لگی۔ اور عینک کے پیچھے سے آنکھیں چمکا چمکا کر رخصتی کا نظارہ
لاحظہ کر رہی تھیں۔

اب دواغ کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ آپا کو گود میں اٹھا کر صدر دروازے تک لایا گیا۔ پھر رونو
مینا چا۔ نیر بھائی آپا کو بالکی میں بٹھانے لگے۔ اس وقت رونو میاں بھی قریب کھڑے تھے۔ شب خارا بھی
اب ہی خڑا میں۔ چمک کر لوہیں۔ "اے رونو میاں۔ تم بھی تو بہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے رخصت کرو۔"
اس وقت دیدی مجھے ایسا لگا جسے سرخ گھڑی بنی آپا سے سیر تک لڑ کر کرہ گئیں۔ چنانچہ رونو میاں نے

اگے بڑھ کر ان کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ سے کہا ALL THE BEST بی بی۔ اور جلدی
 ہٹ گئے۔ نواب صاحب قریب کھڑے تھے۔ وہ چہرہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگے۔ دراصل اس
 وہ زار و قطار رو رہے تھے۔ اور اسی پھر بھڑکے میں ایک بڑی بی دوسری بڑی بی سے پولیس "اے ہے!
 طرح دکھایا تم کو بھائی کی حیثیت سے تمہاریاں نے رخصت کیا تھا۔"

ظاہر بینہ کی رہا تھا۔ ہاں ایک بات بتانا تو بھول ہی گئی۔ میں انجم اور اختر اس شادی سے اس
 ڈیپریسڈ تھے جن دنوں شادی کی تیاریاں کی جا رہی تھیں تو میں نے سوچا کہ دل خوش کرنے کے لئے کچھ تو
 جائے چنانچہ سوجنی دیسی کی وہ نظم "پالنگی بردار" ہے نا۔ کالج کی چند لڑکیوں کے ساتھ مل کر میں نے اس کو
 میل بنایا اور اسے رخصتی سے کچھ دیر پہلے ارجمند منزل کے جلسہ گھر میں پیش کیا۔ آپا کی پالنگی سامنے ہی رکھی
 تھی۔ اور دیناج پور پہنچ کر بھی آپا اسٹیمر گھاٹ سے سیس میل در اپنی سسرال پالنگی میں جائیں گی۔
 ہمارا بیٹے دیکھنے کے لئے سارے ہمان مرد عورتیں جلسہ گھر پر ٹوٹ پڑے۔ بہت سے اوپر جا کر رو رہے
 میں سے جھانکنے لگے۔ جو پسند کیا۔ دیدی یہ گویا میری پہلی پبلک پیش کش تھی۔ آپا بہت خفا ہوتے مگر وہ
 خوش قسمتی سے جل پائے گوری گئے ہوئے تھے۔ آپ کو معلوم ہے نا آپا بڑے قدامت پسند پکے مولوی ہیں۔

پھر پھرتے ہیں۔ دونوں بھی جلسہ گھر کی ایک دیوار سے لگے "پالنگی بردار" دیکھ رہے تھے امارا
 ان کے ساتھ کھڑی تھیں۔ وہ بڑے سوچ میں ڈوبے ہمارا قصہ دیکھا کئے جب میل ختم ہوا تو وہ پھر پھرتے
 میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔ بھئی تم تو کروگرانی کا خوب صلاحیت رکھتی ہو۔ شاہنشاہ کہاں سیکھ رہی
 ہو۔ میں نے جواب دیا۔ کہیں بھی نہیں کہنے لگے مگر یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ تم کو باقاعدہ یہ فن سیکھنا چاہیے
 میں نے کہا آپا کی اجازت نہیں۔ حالانکہ میں شانتی نکیتن جانا چاہتی تھی وہاں ہماری دیپالی دیدی بھی ہیں
 دیپالی کے نام پر دیدی وہ مسکرائے لگے۔ بولے اچھا تمہاری دیپالی دیدی وہاں ہیں۔ بہت
 خوب۔ کوشش کر کے تم وہاں ضرور جاؤ۔ اور ان کے چہرے پر ایک دم آپ کا نام سننے ہی روشنی سی آگئی۔
 کیوں دیدی؟ کیا قصہ ہے؟ پھپھی رستم؟

جس وقت، وٹو بھائی مجھ سے باتیں کر رہے تھے امارا تینکے کے ٹول گول شیشوں کے
 پیچھے سے کھڑی مجھے گھورے جا رہی تھیں۔ میں تو بھتی فوراً وہاں سے کھسک گئی۔ ارے بھئی آپ ہی
 سوچئے روٹو میاں سے مجھے مطالب؟

دیدنی سرحدی دیسی کے "پالکی والوں کا گیت" کتنا دل دوز ہے۔ پالکی چلے ہو ہو۔ پالکی ہو ہو۔ گیتوں کی تھاپ پر پھولوں سی جھومتی۔ ندیا کے جھاگ پر چڑیا سی ڈولتی۔ پالکی چلے ہو۔ ہنس ہنس ہم گاتے چلیں، تیز تیز، جلدی جلدی، گیتوں کی شبنم میں تارا سی پالکی۔ ٹما کی موجوں پر کرنوں کی لہریں۔ یاد لہن کے آنسو۔ سچ سچ پالکی چلے۔ پالکی چلے۔ " دیدنی اس گیت پر بہت ہی موثر سیلے بنا۔ خوب تالیں بچیں۔ اس کے بعد آپا کو پالکی میں بٹھا لایا۔ ہیلے چاری روٹی بلکتی سسرال مددھاریں۔ جب ان کی پالکی ارجمند منزل کے پھاٹک سے باہر نکلی روڈوں اس وقت لان پر ایک طرف کھڑے دوستوں کے ساتھ خوش گپوں میں مصروف تھے۔ ایسوں تو بس پیسے پر رکھ کے مات۔

اچھا دیدنی بائی بائی فقط

یا سمین مجید
سگن بگپہ - ڈھاکہ
۲۱ اکتوبر ۱۹۵۲ء

۳۲

کھل اور اکمل

اکتوبر ۱۹۵۲ء - تیسرا پہر۔ ارجمند منزل کا پچھلا برآمدہ۔ جہاں آرا، روزی، یا سمین، انجم آرا اور مترا ابڑے تخت پر بیٹھی ہیں۔ جہاں آرا، روزی کے تین ماہ کے بچے کو گود میں لئے کھلا رہے۔ روزی، ماں آرا کے ڈھائی ماہ کے بچے کی کاڑی پر ٹھکی "بے بی ٹاک" میں مشغول ہے۔ پھر وہ دونوں لڑکیوں مخاطب کر کے کہتی ہے۔ "کلکے میں میں قسمت سے کہا۔ جہاں آرا کے بیٹے کا نام اس کے باپ اجمل حسین، نام کے وزن پر اکمل رکھا گیا ہے۔ میں اپنے بیٹے کا نام اکمل کے وزن پر کمل رکھوں گی۔ قسمت ہنسے۔ بولے۔ سنسکرت میں کسی شبد کا مخالف شبد بنانا ہو تو اس کے شروع میں ا لگا دیتے ہیں۔ یو کیس تمہارا اکمل کمل کا مخالف نہ ہو جائے!"

جہاں امارتوں کے بچے کو اس کے گدیے پر لٹا کر کھتی ہے۔ ”کیوں ماسٹر کل! تم بڑے ہو کر اکٹس سے لڑو گئے؟“

نیر الزماں کا سوا سال کا منور الزماں اپنے گلو دلنے کو برآمدے میں دھکیلتا پھر رہا ہے۔ تینوں کی آئیں گٹ بنائے سامنے تالاب کی سیڑھیوں پر بیٹھی پان چار ہی ہیں، روزی سانیال اپنے شوہر، بچے اور کے ہمراہ چند روز قبل کلکتہ سے ڈھاکہ آئی ہے۔

”روزی آپا اپنی ہم کاصفہ تو سنائیے جب آپ کل ملی کالج پہنچیں تو کیا ہوا؟“ آخر آپا جھپٹی۔ ”کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں کل کو لے کر ملی کالج گئی تھی۔ ماما کو کلکتہ سے خط لکھ دیا تھا کہ پاپا کے ڈر کے بعد صبح گھر نہیں آؤں گی۔ وڈ لیڈر ڈولے بسنت کے خاندانی دوست ہیں۔ زلیخہ ورائے نے اصرار کیا تھا ڈھاکہ کے جاؤ تو ہمارے ہاں ہی اترنا۔ ڈھاکہ کے پہنچ کر اسی شام وڈ لیڈر سے میں ملی کالج گئی۔ ماما نے چار صبح سے راہ دیکھ رہی تھیں۔ سارا مشن کمپاؤنڈ بھاٹک پر جمع تھا۔ میں کل کو لے کر لیڈی رائے کی کار سے بسنت بابو ساتھ گئے تھے؟“ یاسمین مجید نے پوچھا۔

”نہیں۔ ماما تو روٹی ہوئی آکر لیٹ گئیں۔ سیدہ نے پھولوں سے سارا گھر سجایا تھا۔ ڈاکہ انتظام کیا تھا۔ میں اندر گئی تو بولیں تمہارے پاپا اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ چلی جاؤ کچھ نہیں کہیں گے میں سہمی سہمی اندر گئی۔ پاپا کھڑکی میں کھڑے کچھ بڑھ رہے تھے۔ ماما نے کہا ’پال۔‘“

”وہ کچھ نہ بولے۔ معلوم تھا میں دبیز پرکھری ہوں۔ ماما نے پھر کہا۔ پال! خدا باپ کے ناشکر۔ نہ تو۔ ایک سال ہوا تمہاری لڑکی اس طوفانی رات موت کے منہ میں جانے کے لئے گھر سے نکلی تھی۔ خدایا نے اسے زندہ سلامت رکھا۔ اسے برکت دو۔ دیکھو اس کے ساتھ ایک ننھا فرشتہ تمہارے گھر مبارک آیا ہے۔ (گلو اولٹا ماما۔) میں نے دل میں کہا) عزیزک پاپا شاید کیو CUE کے انتظار میں کھڑے تھے ذرا چہرہ سخت کر کے میری طرف مڑے۔ بینک مانتھے پر سر کاٹی۔ ذرا جھجک کر آگے بڑھے اور میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ کل اپنی غوغاں کرنے لگا۔ پاپا بولے خدا باپ لمبی عمر کرے۔ اور پڑمکلف لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ کیا نام رکھا ہے؟ کل میں نے جواب دیا۔“

”بسنت بابو کے لئے کچھ نہ پوچھا؟“ جہاں آرانے دریافت کیا۔

”نہیں۔“

”چلو۔ خیر کچھ تو برت بگھلی۔“ اختر آرا بولی

”بالکل بگھل گئی۔ کچھ دیر بعد پاپائے کل کو گود میں لیا۔ اس سے لاڈ پیار کرنے لگے۔ اس نے
ن کا سوٹ بھی خراب کر دیا۔ مگر پھر وہ اسے اپنے سے الگ ہی کر لی۔ جب میں چلنے لگی پوچھا کہاں
جا ہو؟ میں نے کہا میں دو ڈبلینڈز میں ٹھہری ہوں۔ کہنے لگے۔ کیوں؟ کیا یہ گھر تمہارا نہیں ہے؟
”کہا۔ کل آ جاؤں گی۔ چنانچہ دوسرے روز جو میں گئی تو وہ جیسے کل کے انتظار میں باہر ہی تھیں نہ ہتھے۔
یکھ کر کھل لٹھے۔ مامے نے چپکے سے پوچھا۔ بسنت بابو کو نہ بتی آئیں؟ میں نے جواب دیا۔ کل لاؤں گی آپ
سہ ہموار کر رکھئے۔“

”پھر لے کر گئیں بسنت بابو کو؟“ یاسمین نے دریافت کیا۔

”نہیں۔ کل تو نہیں جاسکی۔ برسوں برسوں کسی روز لے جاؤں گی۔“

”اتنی دیر کیوں لگا رہی ہو روزی آیا؟ میں تمہاری جگہ ہوں تو فوراً لے جاؤں۔“ یاسمین نے اپنی سابق
نی سے کہا۔

روزی چپ ہو گئی۔ اتنے میں ماسٹر اکل حسین مرشد زادہ نے زرد زور سے دعا شروع کر دیا۔ ہانچوں
اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ جہاں آرا نے روزی سے کہا۔ ”بسنت بابو کو آج ہی ملی کا سچ لے جاؤ۔“

—

”کل شام تو ہم لوگ سرپری توش سے باتوں میں لگ گئے تھے۔ میرے سر بسنت کو دلی بھیجنے
رہیں ہیں کہ وہ وہاں رہ کر قانون کی پریکٹس شروع کریں۔ نئی دلی میں ان کی کوٹھی بھی ہے۔ اس کے کرائے
جانے کا انتظار ہے۔ اسی سلسلے میں مزدوری باتیں ہونے لگیں۔ اور آج شام کو سرپری توش اور لیڈی
نے ہم دونوں کے اعزاز میں ڈنر کیا ہے۔ اس لئے آج بھی نہ جاسکیں گے۔“

”سرپری توش اور ان کے ڈنر کی وجہ سے روزی تم اپنے ماں باپ کے گھر نہیں گئیں۔“ جہاں آرا نے کہا۔
”جہاں آرا۔“ روزی نے آہستہ سے ذرا کوفت کے ساتھ جواب دیا۔ ”اب میں بسنت کو وہ پٹھیر
ا دکھانا نہیں چاہتی۔“

”جہاں آرا نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔“ روزی۔ ”تم کو اب اپنے گھر سے شرم آتی ہے اپنے
لو اپنے posh شوہر سے ملاتے بھی شرم آتی ہے۔ تم جھینپی ہو کہ پادری بنرجی کی لڑکی ہو۔“

اسی وقت سلیم قمر الزماں اپنے کمرے سے نکلیں۔ ڈھکے کی سرخ پاڑ والی سفید ساری بنگالی طرز سے باندھے، بچہ نازک اندام اگر تخت کے کنارے پر ٹپک گئیں۔ کچن کو گودس لے کر قریب آئی مالا کو ابروئے اشارہ کیا۔ وہ اندر سے صندوقچہ نکال کر لائی۔ سلیم صاحبہ نے صندوقچہ کھول کر دستو ایک روپے کے نوٹ نکالے اور مکمل کے گدیے کے نیچے چھپکے سے سرکادینے۔

”اور سناؤ روزی۔ ماں باپ سے صلح صفائی ہو گئی؟“ انہوں نے دریافت کیا۔

”جی ہاں۔“

”اچھا ہوا۔ اللہ مبارک کرے۔“ لڑکیوں سے چند منٹ باتیں کرنے کے بعد سلیم قمر الزماں اندر واپس چلی گئیں۔

روزی نے قیمتی جارحہ کی ساری بہن رکھی تھی اور نوٹنگے کا پورا سیٹ۔ مالا نزدیک آکر بڑے اشتیاق سے اس کے گہنے چھو چھو کر دیکھنے لگی۔ ارجمند منزل کی خواہشوں کے لئے بے چارے غریب پادری صاحب کی بیٹیا کی بڑے گھرانے میں شادی نہایت اہم واقعہ تھی خواہشوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ پادری صاحب سے شادی سے پہلے روزی کی ماں گری بالا ارجمند منزل میں ماما گیری کر چکی تھیں۔ ان سب کو وہ قصہ معلوم تھا۔ کس طرح ایک غریب برہمن بال و دھوا سسرال والوں کے مظالم سے بچنے کے لئے فرید پور کے ایک گاؤں سے بھاگ کر اپنے زمیندار آقا نواب قمر الزماں جو دھری کی پناہ میں ارجمند منزل پہنچے تھی۔ یہاں برہمن بچھنے کے کام پر لگا دی گئی تھی۔ کس طرح نواب صاحب نے اسے اپنے نو عمر بیٹوں کی عنایات سے بچانے کے لئے انگریز لاٹ پادری کی میم کے حوالے کر دیا تھا۔ جس نے اسے عیسائی کر کے اس کی شادی نوجوان کا لے پادری ہنری سے کر دی تھی۔۔۔ روزی کو بھی ماضی کی ان تلخ حقائق کا شدت سے احساس تھا۔

ملازمہ مالا مصاحب خاص کی حیثیت رکھتی تھی اور صاحبزادیوں کی گپ شپ میں حصہ لیتی تھی۔ اس نے روزی سے پوچھا۔ ”یہ سب سسرال سے ملا ہے بی بی؟“

”ہاں۔ مالا۔“

”کیا کیا ملا؟“

”ایک سیٹ ہیرے کا۔ سات جڑاؤ اور سادے۔ یہ والا سیٹ ہماری شادی کی پہلی سالگرہ پر مکمل

کے ڈیڑی نے دیا ہے۔“

”اللہ مبارک کرے۔“

(مسز ایسٹھ گری بالابنرجی نے اپنے گلے کی باریک طلائی زنجیر جس میں متی سی صلیب آویزاں اور کانوں کے مختصر سے بھول اور چار باریک چوڑیاں اتار کر اس کے لئے رکھ لی تھیں۔ جب ریشن کے سٹر کو تھر بسو اس سے اس کا رشتہ طے ہوا تھا۔ اور پچھلے سال جب روزی نے گلے سے اپنی شادی کی اطلاع بھیجی تو مسز بنرجی نے گھر کے خرچ میں سے تھوڑے تھوڑے پیسے بچا کر اپنے بے ہونے اچار مرتبے میں لپوش اور سوئٹرز بیچ بیچ کر روپیہ جمع کیا۔ اور ساری عمر کی گزشتہ میں جو چند پیسے انہوں نے پس انداز کئے تھے ان کو اس رقم میں ملا کر ڈھاکر کا مخصوص کھوکھلے سونے کا ایک لمبی خمیر پائیں۔ اور تین ریشمی ساریاں۔ ان کی اپنی شادی میں ان کے انگریز مربی رایت ریورنڈ ولفروڈ نے اور مسز براؤن نے چاندی کا ٹی سیٹ دیا تھا۔ انہوں نے اسے بھی روزی کے لئے محفوظ رکھا ہوا تھا۔ یہ چیزیں جب روزی پہلے روز لٹی کاٹج گئی تو انہوں نے ایک سوٹ کیس میں رکھ کر اسے دیں۔ روزی اگلے آج ارجمند منزل میں اپنی بلند مرتبہ ہسیلوں سے اور مال سے اس کم مایہ چیز کا ذکر کیا۔)

ارجمند منزل کی ایک باندی چاؤ کی کشتی لے کر حاضر ہوئی۔ جہاں آراء نے اگلے کو اختر آرائی گود اور چاء بنانے میں مصروف ہو گئی۔

نواب قمر الزماں چودھری باہر تشریف لائے۔ پانچوں لڑکیاں تعظیماً کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے اسے بات کی۔ اس کے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”کیا نام رکھا ہے؟“

”کمل کمار سانیاں۔“

”اگلے کے وزن پر۔“ اختر آرائے خوشی سے کہا اور سب کمار سانیاں کی کہی ہوئی بات دہرائی

الفاظ میں ا ب ج کی اصاف اس لفظ کا الٹ نظر کرتی ہے۔

”کیوں بے؟ میرے اگلے سے لڑے گا؟ کان کھینچوں گا۔“ نواب صاحب نے خوشدلی سے کہا۔

”جی نہیں نواب صاحب۔!“ روزی نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”اگلے کمل کا مخالف۔“ وہ اس سے۔ میرے کمل سے لڑے گا۔“

”دونوں کے کان کھینچوں گا۔ بد معاش کہیں گے۔!“ پھر نواب صاحب ہنستے ہوئے برآمد ہوئے۔

نیچے اتر گئے۔ اور پاتس باغ کی روٹوں پر چہل قدمی کرنے لگے۔ کچھ دیر قبل نیر الزماں کی دہن ایک سواہک نوٹ مکمل کے گدیے کے نیچے سر کا گئی تھیں۔ جہاں آرا نے چاندی کے ننھے منے پتھر توں، نفرتی جھنجھوڑ ریش قیمت انگریزی کھپڑوں اور کپڑوں سے بھرا سوٹ کس مع ایک سواہک روپے کے دیا تھا۔ سوٹ کا تخت کے نزدیک رکھا تھا۔

”پوٹرول کار تیس!“ روزی نے چار پیسے ہوئے شگفتگی سے کہا۔ ”دیکھو جڑوں تو تلو کے نور بکھرے پڑے ہیں۔“

روزی کے اس جھلسے سے تینوں لڑائیوں اور یا سمین جھینپ گئیں۔ روزی بطور مسر سناٹا اپنی نئی دو ٹمنڈ حیثیت سے بید سر در بختی۔ یا سمین کو بہت مایوسی ہوئی۔ شاید روزی آپا تھوڑی سی بددعا بھی ہو گئی ہیں۔ وہی روزی جو آج سے صرف سال بھر قبل سر پر کفن باندھ کر میدان کارزار میں کود پڑی تھی پوئیس کی لاکھیاں کھائی تھیں۔ جیل میں معافی مانگنے سے انکار کیا تھا۔ دولت، مرتبہ اور آسائش انسان اتنی جلدی کا یا پلٹ دیتے ہیں، اب یہ کس مرتبہ انداز میں مجھ سے باغ کر رہی ہیں کہو نہ میں محض ایک غریبہ واد کی لڑکی ہوں۔ یہ بھی بھول گئیں کہ سال بھر قبل تک پندرہ روپے ماہوار پر مجھے ٹیوشن دیتی رہی ہیں۔ یا سمین نے سوچا۔

عین اسی لمحے روزی نے اسے مخاطب کیا۔ ”ارے یا سمین اب تم بھی جھٹ پٹ شادی کر ڈالو دیپالی کو بھی چاہئے بیاہ کر لے۔ اور نکلے اپنے اس ڈیمپر سنگ جینڈر کنج سے۔“
”وہ دیپالی دیدی کا گھر ہے روزی آپا۔ اور وہ ان کے لئے شاید بالکل ڈپریشننگ نہیں ہے۔“
یا سمین نے نرمی سے جواب دیا۔

”نوں سنس۔ شادی سے پہلے ماں باپ کا گھر لڑکی کے لئے قید خانہ ہوتا ہے۔ آزادی تو شادی کے بعد ملتی ہے۔ خود مختاری کی زندگی۔ کیوں جہاں آرا؟“
جہاں آرا مسکرا کر خاموش رہی۔

روزی نمائش پسند، چھپوری اور بددماغ ہونے کے علاوہ ذرا سی بے وقوف بھی ہو گئی ہے۔ جہاں آرا نے افسوس کے ساتھ سوچا۔ اور اسے ایک نہایت کمینہ خیال آیا۔۔۔ آخر ہے تو ہماری پرانی نوکرائی کی اولاد۔۔۔ دوسرے لمحے اسے اپنے اس خیال پر ندامت ہوئی۔ اس نے جلدی سے کہا۔

رے دیپالی کا بیاہ ہو گا تو دیکھنا میں کیسی دھوم دھام کروں گی۔ اس کے بابا تو کچھ کرنے سے رہے۔ سادھو
ی ٹھہرے۔ میں دوہینے پہلے سے دیناج پور سے آجاؤں گی۔ سارا انتظام خود کروں گی۔ مگر وہ روزی کی طرح
پہ کر کسی سے بیاہ نہ کر لے۔ سول میرج۔“

”آپا تم اپنے ہاتھی بھی لیتی آنا۔ دیناج پور سے“ انجم آمار نے لقمہ دیا۔
”ضرور۔ ہاتھی گھوڑے پالکی سب لاؤں گی۔ مگر دیپالی کوئی مرغادھوٹے تو سہی جیسے روزی نے
ھوٹل لیا۔“

”دیپالی ہے کہاں؟ تم سسرال سے آئی ہوئی ہو۔ کیا تم سے ملنے سے نہیں آنا چاہئے تھا؟“ روزی
نے ذرا بلند سی ترش لہجے میں کہا۔

”آپا کے ڈھاکے آنے سے پہلے ہی دیپالی دی ریڈیو پر وگرام کے لئے دلی بلای گئیں۔ آج کل یہ خبر گرم
ہے کہ اومارے ڈاکٹر سرکار سے بیاہ کرنے والی ہیں۔ شاید دیپالی دی کو یہ بات پسند نہ ہو۔ اور اسی وجہ
سے وہ زیادہ سے زیادہ گھر سے دور رہتی ہوں۔“ اختر آمار نے کہا۔

”ڈاکٹر سرکار سے؟ اومارے؟ میں نے تو ووڈ لینڈز میں کوئی تذکرہ نہیں سنا۔“ روزی
نے حیرت سے کہا۔

”کیوں؟ اومارے جیسی ہیں ویسی ہیں۔ ڈاکٹر سرکار نے انہیں قبول کر لیا تو اومارے کی خوش قسمتی
ہوئی۔ مگر دنیا یہی سمجھے گی کہ ڈاکٹر سرکار نے اومارے کی دولت سے شادی کی ہے۔ جہاں آمار نے جو ابدیا۔
انجم آمار اچھے کراندر گئی اور ایک قیمتی دلایتی کھلونا لاکر مکمل کے قریب رکھ دیا۔

”ہمائے تم لوگوں نے کتنی پیاری پیاری چیزیں کس کو دی ہیں۔ روزی نے تینوں نوابزادیوں کو مخاطبہ
کر کے کہا۔

”ڈونٹ بی سلی۔“ جہاں آمار بولی۔

تخت کے کنارے بیٹھی ہوئی یا سمین نے سوچا۔ میرا تحفہ ان سب تحالفت کے مقابلے میں حقیر اور
کم قیمت ہے۔ مگر میں نے کتنے پیار سے بچے کے یہ دو فراک سی کر انہیں دیے ہیں۔ انھوں نے میرے پرنیٹ
کا ذکر تک نہیں کیا۔ اب وہ دوستی کو تحالفت کی قیمت سے ماپا کریں گی؟

”لیڈی ارچنارائے نے تو بس ایک چیک دیدیل ہے۔“ روزی بے پردائی کے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

ہر کھل کے ہم جمع کر دالوں۔ ویسے تو اس کے ٹھا کر دالنے اس کے پیدا ہوتے ہی بنک میں اس کا اکاؤ
کھول دیا ہے۔

بے چاری روزی نئی نئی دولت پا کر بوکھلا گئی ہے۔ چاروں لڑکیوں نے سوچا۔

برآمدے سے موٹر آن لگی۔ اور نواب اجل حسین مرشد زادہ جوڑی دار پانجامہ، سیاہ شیروا
ترکی ٹوپی نیچے اترے۔ برآمدے میں آکر وہ تخت کے قریب ذرا سا ٹھٹھکے۔ جہاں آرا نے روزی سے ان کا
کرایا۔ انہوں نے ذرا گھبرا کر ”آداب عرض۔ آداب عرض۔ مزاج شریف۔“ کہا اور زینے کی سمت چلے
۔ پان چباتے، بھڑے، جھٹی نا، بد ہیئت، میٹرک فیل جاگیر دار جہاں آرا کے خدائے مجازی
رضی سوچ رہی تھی۔ اسرار خداوندی! میں جہاں آرا کو کتنا خوش قسمت سمجھا کرتی تھی اور خود کو کتنا
بد نصیب۔ مجھے بسنت کمار سانپال جیسا دلکش اور اسماٹ شوہر ملا جہاں آرا بے چاری کی تقدیر میں
نواب اجل حسین کھٹے تھے۔ اسرار ربانی!

نواب مستر الزماں پائیں باغ میں ہوا غوری کر کے برآمدے کی طرف آ رہے تھے۔

”ارے بھی سگم۔ ذرا یہاں لکھیے گا۔ میری سفید شیروانی کہاں ہے۔“ اوپر زینے پر اگر نواب

اجل حسین نے آواز دی۔

”جی ابھی آئی۔“

”اور تازہ پان۔“

”جی۔ آتی ہوں۔“ جہاں آرا نے فوراً اکمل کو تخت پر بٹایا۔ اور چپ پیروں میں ڈال کر

بسرعت زینے کی طرف بھاگی۔

نواب قمر الزماں اس وقت برآمدے میں پہنچ کر گیسٹری کی جانب جا رہے تھے۔ انہوں نے

کرب کے ساتھ جہاں آرا پر نظر ڈالی۔ بے زبان ملیح چودھری کی بے زبان جھنجھی! اس کی طرح جتنی دوتا! ملیح کی
کی شادی ایک غریب کسان، مولوی کے ساتھ کر دی گئی تھی وہ اس سے نباہ لے گئی۔ لیکن یہ کالج کی تعلیم یافتہ
لڑکی بھی اس زبردستی کے بے شک رشتے کو کس صلح سے نباہ رہی ہے۔ میں تجھ سے شرمندہ ہوں بچی! اور اپنی
مجبوریوں سے شرمندہ ہوں۔ میں تو ساری عمر ملیح سے بھی نامور رہا تھا مگر میری ندامت سے ملیح کے لئے کیا
فرق پڑا؟ میری شرمندگی یا پشیمانی سے تیرے لئے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تو میرے دم تک اپنے اس نامتور

مجازی کی اسی طرح خدمت کرتی رہے گی۔ میری بچی۔ میری بے چاری بچی۔ کاش۔ کاش میں
 بان سے تیرا یہ کہہ دیا ہوتا۔ شاید میں لہجہ کی دوج کے سامنے بھی سرخوہ ہو سکتا۔ کاش۔ کاش۔
 یہ آہستہ گیلری میں سے گزرتے اپنی جائے پناہ۔ اپنے کتب خانے کی طرف چلے گئے۔
 دو ڈبلنڈز سے مشرلسنٹ کمار سامنیال کا فون آیا۔ تھوڑی دیر میں مسز سامنیال کے لئے کاریم
 آئے گی۔ نیرازاں نے برآمدے میں آکر روڑی سے کہا۔

روڑی کی آیا تالاب کی مٹی پر سے اٹھ کر آئی اور کل کا سامان اور تحائف پیک کرنے میں مصروف
 مکمل اور مکمل دونوں برابر گڈیوں پر پڑے بے خبر سو رہے تھے۔ ڈھائی تین ماہ کی دو مختصر کمزور، نازک
 سی جاہیں۔ مسودہ عجب بدردھما تھا۔ تالاب کا پانی گلن رہ گیا۔ گلاب خاص کے نیچے رکھے دو کرم ادرتہ
 لہاسن کی رنگین موتیاں کروں میں جھلا اٹھیں۔

جھٹ پٹے کا وقت کروں کے اندر بہت ڈیپر سنگ ہو سکتا ہے۔ نواب قمرانزاں گھبرا کر اپنے
 ملنے سے پہلے کے باغ میں اتر گئے اور شیتے ہوئے تالاب کے کنارے آکر راج سنگھاسن پر جھک گئے۔
 برآمدے میں تخت پر لیٹے دو لڑکے سوئے ہیں کمنائے۔

سنلہ جب ننھے بچے کوئی پیارا سا خواب دیکھتے ہیں تو کمناتے ہیں۔ یاسمین نے مسکرا کر بچوں پر
 ہلی۔ اسی لمحے اس نے دل ہی دل میں روڑی کے لئے کہنے پن اور نوڈولتے پن کو معاف کر دیا اور اپنی فطری
 لی سے اسے مخاطب کیا۔ "روڑی آیا۔! آپ نے یہ نام خوب سوچا۔ کل برعزلی اگلے۔! اسدوون
 بیٹے۔ ایک سن کی بیدارگی۔! دوئے ہندوستانی!"

"انسان۔ جدید ترین موڈل۔" روڑی نے کہا۔

دونوں لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"روڑی آیا۔" سروجنی دیسی کی ایک نظم ہے۔ "فکار یا ستمین کل اور اکل کو دیکھتے ہوئے
 ہستہ بولی۔"

"سو جاؤ میرے بچو۔"

صبح یک کے لئے محفوظ و امون

سوئے رہے۔

کہ ہمارا رت جگا بہت طویل ہے۔
 جتنی دیر تم سوؤ۔ ہم۔ ہم کھیتی بوئیں گے
 ہم آرزوں، اور رنجوں اور آنسوؤں سے بھر پور سینے بوئے ہیں۔
 تاکہ جب تم جاگو تو ان کی فصل کاٹ سکو
 بچو۔

صبح ہوتی ہے۔ رات گزر گئی۔
 ہماری مشقت ختم ہوئی۔ ہماری کھیتیاں لہلہا رہی ہیں
 ہمارے ہاتھ کمزور تھے
 لیکن اندھیاے میں ہم نے تمہاری آنے والی شان و شوکت کے خواب دیکھے۔
 تمہارے بچوں کو اپنے آنسوؤں سے سنبھالے۔ ہمارا رت جگا ختم ہوا۔
 جاگو بچو

ہم نے سینوں کی جو فصل تمہارے لئے بوئی ہے
 اس کے صلے میں
 ہماری محنتوں کے ثمر کو
 تم تو صیغ سے یاد کرو گے
 یاد رکھو؟

ہمیں ملزم ٹھہراؤ گے۔ یا ہمیں معاف کر دو گے۔
 یا ہمیں مجید نے سراٹھایا۔ نواب قمر الزماں برآمدے میں آچکے تھے اور تخت کے قریب کھڑے
 رہے تھے۔ انہوں نے یا ہمیں کے سر پر ہاتھ رکھا اور چپ چاپ خواہش اندر چلے گئے۔
 بن بارغ کے درخت شام کی سنہری ہوا میں لویاں لگتا رہے تھے۔
 مل اور اکمل بے خبر سوایکے۔

برڈز آف پیراڈائیز

”اگر تمہارا وہ خط مجھے صرف ایک دن پہلے مل گیا ہوتا تو شاید ہم لوگ آج یہاں نہ ہوتے۔“

نے کہا۔

ہسپانوی لباس پہنے مسٹرئس سرسوتی نے کیلے کے جھنڈ میں سے نکلی کر قبوے کی کشتی میز۔ ایک برڈ آف پیراڈائیز رین ٹری کی شاخوں سے اتر کر نیچے آئی اور گھاس پر چلنے لگی۔ یاسمین۔ در سے دیکھ رہی تھی۔ پہاڑی کے نیچے اسپینش کولونیل وضع کے ہنگے میں سے کلیپسو موزک زانے لگی۔ ”شو لو کی گرل فرینڈ سان فرینڈو سے آئی ہوئی ہے۔“ دیپالی نے کہا۔ پانی کی اینڈ ٹیپ سے میز پر آن گری۔ یاسمین نے اوپر دیکھا۔ بادل کریمین پر سے سرکتے کیلے کی سمت آ رہے۔ بڑے پتوں اور موٹے تنے والے رین ٹری کے جھرمٹ میں شفاف نارہمہ سما تھا۔ سر پر سرخ بندھن۔ مانا باندھے اسکرٹ میں ملبوس ایک ایٹ انڈین عورت نالے کے کنارے کپڑے دھو رہی تھی۔ ایک درخت پر بنے ٹری ٹاپ ہاؤس پر پور ڈلگا تھا۔ ڈاکٹر بنوے چندر سرکار۔ پلانٹیشن میڈیکل۔ ڈسپنسری۔ اس درخت کے نیچے بھی پندرہ فردوس اترتے پھر رہے تھے۔ چند مریض جمع تھے۔ چنی لیٹ نیگرو۔ اپنی اپنی جنتوں سے نکالے ہوئے انسان۔ آدمی کی عادت ہے اس کی جنت سے نکالو تو وہ اپنے ہی بھلی ایک اور جنت بنا لیتا ہے۔

”دیدہ۔ کیا ہوا تھا۔؟“ یاسمین نے کمزور آواز میں پوچھا۔

”اسٹرکافون۔“ مسٹرئس سرسوتی نے جھکے کے برآمدے سے آواز دی۔ دیپالی نے کہا۔ ابھی آئی۔“
 ٹھہ کر ہنگے کی سمت چلی گئی۔ مسٹرئس سرسوتی باہر آکر کرسی پر بیٹھیں۔ اور بولیں۔ ”ہمارا میم صاحب کہتے ہیں ڈانسر ہے۔ پاکستان سے آیا ہے۔“ ہاں مسٹرئس سرسوتی۔ ہم تمہارا میم صاحب کو بہت زمانے سے ملے۔“ یاسمین نے ہنگے اردو میں جواب دیا۔ ”ہم اور دیپالی میم صاحب ایک ہی کنٹری کارپنے والا۔“
 ”مطلب۔۔ پہلے ایک ہی کنٹری تھا۔“

”تم سینا میں بھی جتنا ہے؟“ جیسے مس ککو۔ ”سٹرپس سرسوتی نے کھڑے ہو کر دو تین چک لیں۔ یاسمین کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔“

سرخ بننا آوازی عورت اسکرٹ گھماتی کپڑوں کی ٹوکری مکر پر رکھے ٹالے کی طرف سے آئی۔ گلاب کے قریب پہنچ کر اس نے ٹوکری گھاس پر رکھی اور سٹرپس سرسوتی کے ساتھ ناچنے لگی۔ اب وہ دو بیانیوی رقص کر رہی تھیں۔ سمر ست ماہم کے کسی قبل از جنگ استوائی سینک کے ناول کا سین۔ یا نے آنکھیں ملیں۔

سرخ بننا آوازی عورت نے گلے میں پختی پاک کا بڑا تھوڑا پین دکھا تھا۔ وہ سٹرپس سرسوتی زیادہ خوبصورتی سے ناچ رہی تھی۔ دیپالی بنگلے سے واپس آئی۔ کرسی پر بیٹھ کر چاء بنانے لگی۔ کتنی بے فکری کی زندگی ہے یہاں یاسمین نے سوچا۔ ”یہ لڑکی بہت اچھی ڈانس کر سکتی ہے۔ کون یاسمین نے پوچھا۔“

”سٹرپس خیر النساء؟ بابا کے کمپاؤنڈر سٹرافٹ علی کی بیوی۔“ دیپالی نے جواب دیا۔

سٹرپس خیر النساء نے عقیدت سے پوچھا۔ ”آپ پاکستان سے آیا ہے؟“

”ہاں۔“ یاسمین نے جواب دیا۔

”آپ نے نور جہاں کو دیکھا ہے؟“

”کون نور جہاں؟“

”میرے لئے جہاں میں چین ہے نہ کہ اس ہے۔“ سٹرپس خیر النساء نے گلاب کو جواب دیا۔ ”خاندان مووی والا۔ ہم نے سب موڈیز دیکھی ہیں۔ کنگن۔ بندھن۔ گاجی صلاح الدین۔ سکندر۔ جندگی ہے پیا سے پیار میں بٹلے جا۔ عسک کے محو میں اپنا سر جھکائے جا۔“

”مگر یہ تو بہت پرانی فلمیں ہیں۔“ یاسمین نے کہا۔

”بس وہی یہاں چلتا ہے۔ اور دو ٹی فلم دیکھا۔ انداز اور برسات۔“ سٹرپس سرسوتی۔

جواب دیا۔

”ہم لوگ س صاحب یہ موڈیز دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے۔ ہیں پتہ چلا ہے ہمارا دل۔ کنڑی ایسا ہی ہوگا۔“ سٹرپس خیر النساء نے اداس آواز میں کہا۔

دیپالی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔

”فرگٹ اٹ۔ دیدی۔“ یاسمین نے کہا۔

”تم بہت خوش ہو۔ تم دنیا کے TOP پر ہو۔ ورلڈ ٹور پر نکلی ہو۔ اپنے ملک کی مشہور ڈانر ڈھاکہ اب بھی تمہارا وطن ہے۔“ دیپالی نے ذرا ترشی سے جواب دیا۔

”سُوری دیپالی دی۔“ یاسمین نے کہا۔ واقعی میں بہت مسرور ہوں۔ ساری دنیا اب میرے ہوں میں ہے۔ کامیاب کریر۔ اُن گنت مَدَاح۔ گلیمر۔ سیلشی۔ شہرت۔ اُن بے چاری دیپالی دیدی کو اٹا۔ ۵ اور جہاں آرا آپا کو۔ ۶ محض مایوسی۔ لیکن مجھے روزی سانیال کی طرح اپنی کامیابی پر ضرور نہیں ہونا چاہیے۔ ”گو میں نے اپنی کامیابی کی بھاری قیمت ادا کی۔ اپنے بابا کو ڈیغائی کیا۔ مگر ٹسٹ کی لگن۔“ اس نے باواہ بلند اضافہ کیا۔

”بُوش۔“ دیپالی بولی بھرا جانک چپ ہو گئی۔

شاید یہ مجھ سے چلنے لگی ہیں۔ انہیں اب کون جانتا ہے۔ مجھے ساری دنیا جاننے لگی ہے۔ جیرلڈ ہتا ہے اگر کوشش کی جائے تو میں اپنے ”موڈرن اور ٹیل بیسے“ کا نیویارک میں باقاعدہ اسٹوڈیو قائم کر سکتی ہوں۔ مگر ابھی یہ بات ان کو نہیں بتاؤں گی اور چل جائی گی۔ کیا پتہ لا شعوری طور پر متعصب بھی ہوں۔ میرا حال الیٹ پاکستان سے ان کو ٹکنا ہی پڑا۔ نہیں۔ پرانی مارکسیسٹ ہیں۔ متعصب تو شاید نہیں ہیں۔ اتنی پرانی دوست ہیں۔ اگر ان کو یہ بتا دوں کہ سینڈ سم، مشہور انگریز فیشن ڈیزائنر جیرلڈ بلونٹ سے شادی کرنے والی ہوں تو شاید اور حمد کریں۔ نہیں بتاؤں گی۔ نظر لگ جائے گی۔ پری نادر جیرلڈ ایک طرف۔ بے مثال یونانی مجسمہ۔ ادا ایک طرف ان بے چاری کے موٹے کالے لبت موہی ہیں۔ وہ تو جہاں آرا آپا کے میاں سے بھی گئے گذر رہے ہیں۔

سرسوتی اور خیر النساء گھاس پر بیٹھی ایک اجنبی زبان میں گفتگو کر رہی تھیں۔ شو نو نے بنگلے کے برآمد میں اگر آواز دی۔ ”دیدی۔ آپ کا فون۔“ دیپالی پھراٹھی اور عمارت کی طرف چلی گئی۔

سرسوتی نے آہستہ سے پوچھا۔ ”مس صاحب ہمارا سیم صاحب رو کیوں رہا تھا؟ ہم نے دیکھا ہے۔ وہ کبھی کبھی ایسے ہی بیٹھے بٹھلے رونے لگتا ہے۔“

”معلوم نہیں۔ سسر میں سرسوتی۔ شاید۔ شاید ان کو اپنا کنٹری یاد آتا ہے۔ اور۔ اور۔“

”اور کون —؟“

یاسمین نے جلدی سے بات بنائی۔ ”وہ — مٹریس سرسوتی ادھر ڈھکا کہ میں دیدی کا ایک فرینڈ تھا۔ جہاں آرا بیگم —“

”جہاں آرا بیگم —!“ مٹریس خیر النساء نے خوشی سے دہرایا۔ ”بادشاہ کا بیٹی؟“

”نہیں۔ ایک معمولی سے نواب کا بیٹی۔“

”پھر کیا ہوا — کیا ہوا؟“ دونوں عورتوں نے بے صبری سے پوچھا۔

”جہاں آرا بیگم کا نو اسٹوری بہت ٹریجک تھا۔ اُسی کو یاد کر کے تمہارا سیم صاحب دکھی ہو جاتا ہوگا۔“

”کیا ہوا؟ — کیا ہوا؟ — عا سکی معسومی؟“ سرسوتی نے پوچھا

خیر النساء نے سوال کیا۔ ”عسک مجاجی تھا یا عسک حلیکی —؟ ہیرد کون تھا —؟“

یہ عورتیں بے حد سینما دیکھتی تھیں۔

”خیر النساء شاید عسک مجاجی اور حلیکی دونوں تھا۔ جہاں آرا آیا اپنے کزن کو کو کرتا تھا۔ اُس کو —“

”سمجھ گیا۔“ مٹریس سرسوتی نے طمانیت سے کہا۔

”پھر اُن کا کزن اُن کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔“

”کیوں —؟ چچ — ہائے — ہائے رے۔“

”آئیڈیالوجی کی خاطر۔“

”آئیڈیالوجی — کیا —؟“ خیر النساء نے دریافت کیا۔

”مطلب — مطلب — ایسا کہ — عزیز امیر سب برابر ہونا چاہئے۔ ہیرد امیر لوگ

کو HATE کرتا تھا — ہیرد بہت امیر تھا — اُس زمانے میں خیر النساء — لڑکا لڑکی آئیڈیالوجی کی خاطر ایک دوسرے کو چھوڑ دیتا تھا۔“

”تب تو وہ پاگل لوگ تھا۔“ سرسوتی نے کہا۔

”ہاں۔ ایک دم پاگل۔ اور اگر سوچو تو — تو ہم بھی پاگل ہے۔ ہم نے آئیڈیالوجی کی خاطر

ن سیکھا۔ کہ ہمارا دیش میں کلچر خوب پھلے پھولے۔ ہم نے اس کے لئے بہت محنت کیا۔ بہت کوشش
ہمارا ایک انکل کا دوست سنٹرل منسٹر تھا۔ اس نے ہمیں فارن ٹور پر بھیج دیا۔ پاکستان گورنمنٹ

”کون گورنمنٹ۔؟“ سر سوئی نے پوچھا۔

”ہمارا اپنا پاکستان گورنمنٹ۔ تم لوگ تو ابھی برٹش کولونی ہے۔“

”کولونی ہے تو ٹھیک ہے۔ آرام سے ہے۔“

”آہ۔ تمہاری منٹیلیٹی اب تک کونوئل ہے۔“ یاسمین نے حقارت سے کہا۔ بے چاریاں غلاموں
ولاد۔ خورد غلام۔

”اور تمہاری منٹیلیٹی کیا ہے؟“ سر سوئی نے چک کر پوچھا۔ نیو ورلڈ میں پیدا ہو کر ہندی نژاد
رہ بھی ٹنڈہ ہو جاتے ہیں۔ اور بے ادب۔ اب ان جاہلوں سے کون بحث کرے۔ وہ چُپ ہو گئی۔

”دیپالی واپس آئی۔“ میرے شوہر کا فون آیا تھا کہ تم سے کہہ دوں۔ انہوں نے کل رات کو تمہارے ڈانس
درگرم گورنمنٹ ہاؤس میں رکھوا دیا ہے۔ گورنر جنرل کے لئے۔“

”گورنر جنرل کے لئے۔؟“ یاسمین نے خوشی سے اچھل کر دہرایا۔ سڑکیں سر سوئی زبردستی سکرانی
سے کی ٹرے اٹھا کر بنگلے کی طرف چلی۔ یاسمین نے اس کی طنزیہ مسکراہٹ دیکھی اور جھینپ گئی۔

”اچھا اب ہم بھی چلتا ہے۔“ خیر النساء نے کہا۔ سرخم کر کے سکرانی اور کچروں کی ٹوکری اٹھا کر
ردپیشی کی سمت روانہ ہو گئی۔

”عجیب مسخری عورتیں ہیں۔“ یاسمین نے اظہار خیال کیا ”تم کن لوگوں میں آچھنیں۔“

”بہت بھلے لوگ ہیں۔“ دیپالی نے جواب دیا۔ ”انہیں یقیناً ہم اور تم مسخرے لگتے ہوں گے۔“

اسرزمین کو چھوڑے انہیں تلو سال سے اوپر ہو گئے۔ اب تک اسے یاد کرتے ہیں۔ یہ خیر النساء اور سر سوئی
دونوں کے پُرکھے یو۔ پی کے ضلع اعظم گڑھ سے آئے تھے۔ تلو سال پہلے۔ جب انگریزوں نے یہاں اپنے

مرد غلاموں کو آزاد کیا تھا۔ تب ان کی جگہ اپنے نئے ہندوستانی غلام یہاں منگوائے تھے۔ امبیہ آدھے
میشن آدھے ایسٹرن یو جی کے ہندو یا مسلمان آدھے برٹش ہیں۔ ستر سوئیں صدی کے انگریزی الفاظ

ان لوگوں ہیں۔ یک میل زبانیں۔ یہ بے چارے اب تک برٹش فلی کہلاتے ہیں۔ مگر یہ بڑے ذہین لوگ ہیں انہیں

معمولی مت سمجھنا۔

”دیدیں۔ کہاں سے کہاں بات نکلی گئی۔ کچھ دیر ہوئی میں نے آپ سے پوچھا تھا۔ کیا ہوا تھا
میں کا جواب تو دیجئے۔ مجھے اب تک معلوم نہیں۔ کیا ہوا تھا۔ ذرا سوچنے کی بات ہے۔“
”سیدے اب ملاقات ہوئی ہے۔ اور اس اجنبی و در افتادہ جگہ۔۔۔ آخر ہوا کیا تھا۔؟“

دیپالی نے ایک بڑا آن پر اڑائیز کو دیکھ کر کہا۔ ”دیکھو یہ کتنے خوب صورت پرندے ہیں۔“

”دیدیں۔ پلٹر۔ بات مت ٹالئے۔“ یا سمیں بھائی تم تو ہمیشہ کی فوڑی پار کر ہوا۔“

”پوری بات بتائیے نا۔ آپ سن بیا لیس میں جب جہاں آرا آپا کی شادی ہوئی اس کے بعد بھی
اُن سے ملی کیوں نہیں؟ وہ جب بھی دیناج پور سے ڈھاکہ آتیں آپ کے لئے معلوم کرا تیں۔ اطلاع
ملتی کہ شانتی نکیتن میں ہیں یا ریڈیو پور ڈگرام کے لئے لکھتے گئی ہوئی ہیں۔“

”نہیں۔ میں چند ایک بار جہاں آرا سے ملی تو تھی۔ دراصل اس سے نظریں چار کرتے ہوئے
مجھے احساس جرم سنا تھا۔“

”آخر کیوں۔؟ کیا ہوا تھا؟“

دیپالی ہنس پڑی۔ ”کیا ہوا تھا؟ اُس نے دہرایا۔“ کچھ بھی نہیں۔ جہاں آرا کی شادی کی
اطلاع کا جب تمہارا خط آیا اس سے صرف دو روز قبل اُد مار لے شانتی نکیتن پہنچیں۔ مجھ سے
بہت سیلو ڈریمٹک انداز میں کہا۔ ریمان اپنی کزن کا بچپن کا منگیت رہے۔ تم سچ میں آگئیں پڑ
شرم کی بات ہے۔ تم اپنی ہسلی کی زندگی بریاد کر رہی ہو۔ اپنے نیک دل باپ کو صدمہ پہنچا رہی ہو۔
جہاں آرا اور ڈاکٹر مرکار دونوں کہیں تمہاری وجہ سے اپنی جانوں سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔

”جب سے میں نے بالکل غیر متوقع جہاں آرا کی الماری میں ریمان کی تصویر رکھی دیکھی تھی میں
بھونکی تھی۔ اور احساس جرم مارے ڈال رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے ریمان سے بات نہیں کی۔ ان کے
بہت اصرار پر جب ان کو وجہ بتائی انہوں نے پورا قصہ سنایا۔ کس طرح ان کی نسبت لڑائی۔ اور
ان سے میری ملاقات سے پہلے کی بات تھی۔ پھر بھی مجھے تشفی نہیں ہوئی۔ بہت سمجھا بکھا کر ریمان نے
مجھ سے بیاہ کر لینے پر راضی کر لیا۔ لیکن اب شانتی نکیتن پہنچ کر اُدامی کہنے لگیں۔ جہاں آرا اب
نک یہ آس لگائے بیٹھی ہے کہ ریمان شاید ارجمند منزل واپس آجائے اور نواب اس سے شادی کر لے۔“

کے لئے تیار بھی ہو جائیں۔ اگر تم نے ریحان سے بیاہ رچایا تو جہاں آراغریب شاید نہ رکھالے پلٹے
 نشین محمدن لڑکیوں کے ایسے ٹریک قصے سے ہیں۔ علاوہ ازیں ریحان ایسا ناقابل اعتبار شخص
 ہے جب اس نے اپنی کزن سے بے وفائی کی جس کے باپ کے روپے سے وہ ولایت پڑھنے گیا تھا تو وہ
 بھلا تمہارا کب تک ساتھ دے گا۔ تم کو بھی چھوڑ دے گا۔ پھر تم کیا کرو گی چند رکنج کے دروازے
 بھی تمہارے لئے بند ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ کیا کہیں تھی اور ناجبرہ کار۔ یہ سب سن کر ذہل گئی۔ اُف اُف
 کے واپس جانے کے بعد اسی رات میں نے ریحان کو بڑا کڑا خط لکھا کہ آئندہ مجھ سے کبھی نہ ملیں۔ اسی رات
 میں نے وہ خط پوسٹ کر دیا۔ اس کے دوسرے روز تمہارا خط ملا جس میں تم نے اطلاع دی تھی کہ بیماری
 جہاں آرا کی شادی دیناج پور کے کسی زمیندار سے ہو گئی۔ اگر تمہارا وہ خط مجھے دو روز پہلے مل گیا ہوتا
 تو میں اُدمارے کے بھڑے میں نہ آئی ہوتی اور پردگرام کے مطابق ریحان سے سول میرج کرنے کلکتہ چلی جاتی
 کہ ہونی کو کوئی مال نہیں سکتا۔

”ریحان کلکتہ جا چکے تھے۔ میرا اعتبار نامہ موصول ہونے کے بعد انہوں نے مجھ سے ملنے کی کوشش
 بھی نہیں کی۔ میں نے ان کو بہت ہی سخت خط لکھا تھا۔ آئیٹلیا لوجی کی خاطر۔ یعنی یہ کہ انسان انسان کا
 ل نہ دکھائے۔ اور وہ جہاں آرا کا دل دکھا رہے تھے۔ اور میں اپنے والد کا۔“

”دیپالی دیدی۔ ایک بات بتاؤں۔ ہم سب پاگل لوگ تھے۔ قبول سٹرلیس سرسوتی۔ صرف
 وادی صبح الدماغ تھیں۔ اور ریحان بھائی کے بارے میں آگے میں بتاؤں؟ سنئے۔ سن پتیا لیس میں
 لاندیا کسان نبھا کی طرف سے ایک لوک گیت کانفرنس ہوئی تھی۔ یاد ہے؟ لوک گیت منڈلیاں
 مارے ملک سے آئی تھیں۔ اس کانفرنس میں ریحان بھائی میرے پیچھے لگ لئے۔“

”راسکل۔۔۔!“ دیپالی نے قہقہہ لگایا۔

”آپ اُس میں نہیں آئی تھیں۔“

”مجھے معلوم ہوا تھا کہ ریحان اور اُدمادیاں جانے والے ہیں اس لئے نہیں گئی تھی۔“

”مسلمان نوک سنگرز بہت بڑی تعداد میں آئے تھے کیونکہ جنکال کی فوک میوزک زیادہ تر

مسلمانوں کی تھی۔ یہ دراصل مجھے اب مشرقی پاکستان بننے کے بعد اندازہ ہوا۔ ریحان بھائی
 ن فوک سنگرز کے کمپ کے انچارج تھے۔ ایک دستہ منی پور سے آیا تھا۔ گارو ہلز سے مس اہیں بارو

کو انہوں نے بھگا دیا تھا۔ کیا زمانہ تھا کہ مئی پور کے راجہ کا بھائی کیونست لیڈر تھا! آج یہ سب قصے اتنے عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ سپینر تھیٹر کے لوگ تھے۔ کیا جوش و خروش تھا۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ شونا رنگال عنقریب تقسیم ہونے والا ہے۔ بس صرف یہی خیال تھا کہ انگریزوں کو نکالتے ہی ملک میں دودھ کی ندیاں بہ جائیں گی۔ —

”اور کتنی جنگجو اصطلاحات تھیں! ہماری ٹولیاں اسکوڈ کہلاتی تھیں۔ چانگام اسکوڈ۔ مورا دی اسکوڈ۔ مئی پور اسکوڈ۔ سپینر تھیٹر اسکوڈ۔ دیدی دہاں اڑیہ اسکوڈ نے ایک گیت سنایا تھا۔ اس پیٹ کی خاطر میں رنگال گیا۔ پاڑ بیلے۔ دھان کوٹے۔ دھان کاٹی۔ چاکری کی۔ پیٹھ پر کوڑے کھائے۔ ناچا۔ چرخہ کاٹا۔ گالیاں دیں۔ ہم راج سے ملا۔ اس پیٹ کی خاطر۔ —

”اور ہم ڈھاکہ سے ٹری نیڈا ڈال گئے۔ اس پیٹ کی خاطر۔“ دیپالی بولی۔
 یاسمین کہتی رہی۔ ایک گونڈ گیت تھا۔ میں نے گائے سج کر جنگل کا ٹیکس دیا۔ سیل سج کر۔ اب بھی کافی نہیں۔ انگریز کے راج میں ہم بھوکے رہتے ہیں، ہمیں اس وقت ایسا پکا معصوم یقین تھا کہ اپنے قومی راج میں کوئی بھوکا نہیں رہے گا۔ — اور وہ حیدر آباد اسکوڈ۔ ہم سرخ سپاہی شانِ وطن۔ —

”ریحان کے متعلق بتاؤ یا سمیں۔“

”ہاں دیدی تو وہ اس کانفرنس میں میری بہت سرپرستی کرتے رہے۔ میں نے ان کو بتایا میں دیپالی سرکار کی دوست ہوں۔ ان پر مطلق اثر نہ ہوا۔ اچانک میں بہت بور ہو گئی۔ طبیعت بیزار ہو گئی۔ پارٹیشن سے ذرا پہلے میں اپنے کٹر مذہبی قدامت پرست مولوی دالدار سارے گھر والوں سے بخاوت کر کے ایک اسکالرشپ پر بھرت ناٹیم سیکھنے مدراس چلی گئی۔ اور وہاں سے ایک سال بعد اپنے ایک روشن خیال رشتہ دار کے پاس سیدھی کراچی۔ وہ بہت بار سوخ آدمی تھے۔ انہوں نے ایک بنگالی منٹرل منسٹر کے ذریعہ کوشش کر کے مجھے باہر بھجوانے کا بندوبست کیا۔ انہی دنوں ڈھاکہ سے جہاں آرا آپا نے لکھا کہ آپ لوگ چند رنج فروخت کر کے کلکتہ اور وہاں سے ٹری نیڈا ڈال چکے ہیں۔ جہاں آرا آپا کو بڑا افسوس تھا کہ جاتے وقت آپ ان سے ملی نہیں۔ خط تک نہ لکھا۔ ان کو صدمہ زیادہ یہ تھا کہ شاید ہندوستان پاکستان کی سیاست کی بجائے آپ دونوں کے درمیان آگئی۔ —“

نہاد لے میں لیا ہوا بڑا سا مکان تھا۔

”متر بابو نے نہ جانے کس طرح یہ طے کر لیا تھا کہ بابا اوارا لے پر عاشق ہو گئے ہیں۔ لیڈی رائے بھی چاہتی تھیں کہ اوارا کسی سے بھی جلد از جلد شادی کر لیں اور ریمان کے FIXATION سے آزاد ہوں۔ ریمان بھی شہر میں موجود تھے۔ میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ نیا نیا پارٹیشن ہوا تھا۔ کیونکہ بہت شدید تھی۔ ریمان سے دوستی کی افواہ کی وجہ سے اپنی ساری دولت کے باوجود اوارا کے لئے رشتے مفقود تھے۔ نرپیند بھی بہت پریشان تھا۔ وہ ایک پگلا سرمایہ دار۔ وہ بہن کے سیاسی رجحانات سے ہمیشہ نالاں تھا۔ اب اس نے بھی اوارا پر شادی کے لئے زور ڈالا۔ آخر ایک روز اوارا می خود ہی اگر ٹیڑھا ہٹ میں بابا سے کہ گئیں کہ وہ اُن سے بیاہ کر لیں گی۔ شاید ان کی اسکیم یہ بھی رہی ہو کہ بیاہ کے بعد شوہر کی موجودگی میں ریمان سے ملنا جلنا اتنا قابل اعتراض نہ سمجھا جائیگا۔“

”میرے بابا بہت سادہ لوح ہیں۔ وہ کسی انسان کو برا سمجھ ہی نہیں سکتے۔ مگر اوارا کے وہ بھی مدّاح نہ تھے۔ اس کے باوجود، چونکہ اپنی جگہ سے اکھڑ چکے تھے، وہ کسی جذباتی سہارے کے متلاشی تھے اور اوارا می ان کو بھی خوب FLATTER کر رہی تھیں۔ متر بابو جو شادی کی گفت و شنید ڈھاکے کے زمانے سے چلا رہے تھے بڑے کامیاب بزنس مین تھے۔ بابا رائے خاندان کے داماد بن جائیں تو ان کے ذریعے وہ نرپیند رائے سے اپنے دسیوں کام کھلا سکیں گے۔ کیونکہ نرپیند داتا ”براون صاحب“ اور بد دماغ مفرو را دی تھا کہ کوئی ننھو خیر اس کے پاس پہنچ ہی نہ سکتا تھا۔

”میں محو حیرت یہ سارا ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔ اصول پرست بابا نے مجھ سے ریمان کے بارے میں کبھی ایک لفظ نہ پوچھا تھا۔ اوارا می سے میں بات ہی نہیں کرتی تھی۔ بڑے شدید تناؤ میں وقت گزر رہا تھا۔

”اب دیکھو۔ کلاس کی پیدائشی خردماغی کبھی جاتی نہیں۔ اوارا بانی ”فیوٹرور“ تھیں۔ بابا سے شادی کرنے والی تھیں مگر ہمارے کہنے سے اس طرح کا برتاؤ کرنے لگی تھیں جیسے ہم غریب ریونیو جی لوگ ان کے محتاج کرم تھے۔

”میں نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ بابا مطلب جانے کی فکر میں تھے۔ چند رنج کی قیمت کا روپیہ ہستہ ہستہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔ شوٹو اور ٹوٹو آوارہ گردی کرنے لگے تھے۔ متر بابو کے گھر پر رچے

لوں کو تقریباً ایک سال ہو گیا۔ اب سبز منزل نے پشی ماں سے لڑنا شروع کر دیا۔ بھوتانی دینی۔ گود
ہر۔ خود ایک لڑکا خاتون۔ گھر میں روز کھٹ پٹ ہونے لگی۔ میں گھبرا کر باہر نکل جاتی۔ ریڈا
راہوں سے ذرا سی آمدنی ہو جاتی تھی۔ باقی وقت میں میوزیم یا کسی لائبریری میں گزارتی۔ مڑا بونے کے
پس جلتے مجھے وحشت ہوتی تھی۔ اور اس چیز سے اور زیادہ کوفت ہوتی کہ ریمان اسی شہر میں موجود
اور ان کو معلوم ہے کہ میں کس حال میں ہوں۔ ایک بے روزگار ریفریو جی۔

”ایک صبح میں دکتوریہ میوریل میں گھوم رہی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں میپو سلطان کے
بالخالی کے پوڈریٹ کے نیچے کھڑی جانے کیا کیا سوچ رہی تھی۔ سراج الدولہ بکائیو۔ کارنوا
یو میر۔ اچانک اودادی کی آواز سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا وہ کسی انگریز کے ساتھ وہاں موجود
مجھے اس سے ملوایا۔ وہ ان کا لندن کا کوئی پرانا ہم جماعت تھا۔ کلکتہ آیا ہوا تھا۔ اسے سیر کر رہی
پھر انہوں نے نہایت بلندی سے میرا تعارف کرایا۔ مس دیپالی سرکار۔ میرے بھائی
درائے کی پرسنل اسسٹنٹ۔

”میں ہنگامہ بنگا کی شکل دیکھنے لگی غصے کے مارے میرا بھیجا آؤٹ ہو گیا۔ میں نے فوراً کہا
”کیجئے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں کسی سٹریٹینڈ ورائے کی پی۔ لے نہیں ہوں۔
اودادی نے جو اس وقت دکتوریہ میوریل کے اندر انگریز دوست کے ساتھ بڑی شان سے کھڑی
تھے گھور کر دیکھا۔ اور کسی برطانوی ڈچر کے سے انداز میں کہا۔ ”اس کے متعلق ہم پھر بات کریں
یونگ برٹ۔

”انگریز بہت ہتھ بوتا ہے۔ وہ اس غیر متوقع محیٹے سے خاصا نادام نظر آیا۔ میں لالہ سیلی
اسے ہنٹ گئی۔

”اسی روز شام اُمارائے مڑا بونے کے وہاں پہنچیں۔ میں باہر چوڑے پر کھڑی تھی انہوں نے
زتے ہی مجھے ہنکارنا شروع کیا۔ تم۔ تم کو میرے انگریز دوست کے سامنے مجھے جواب دینے کے
ہوئی۔

پہلے سے آگے بڑھ رہی ہیں اودادی۔ میں نے جواب دیا۔
مدے سے تم آگے بڑھ چکی ہو۔ احسان فراموش۔ تم پہلا تاریخ سے زلیند کے آفس میں کام کر رہی۔

تجارتی جیسی لیفوجی لڑکیوں سے کلکتہ پٹا پڑا ہے۔ ہر چوتھی بنگالی لڑکی تمہاری طرح گاتی ہے۔ تم مجوزہ را نہیں ہو۔ یہاں تم کو ویسٹ بنگال کا گورنر کوئی نہیں بنا دے گا۔ بشکر کرو کہ میں نے نرملیندو کے دفتر میں ملازمت کا بندوبست کر دیا۔

”اگر آپ سمجھتی ہیں کہ میں آپ کے شرابی، بد معاش، بد دماغ بھائی کی سکرٹری بننا قبول کروں گی بہت سخت غلطی پر ہیں۔ اُدا میدی۔“
”میں نے اب ذرا سکون سے جواب دیا۔

”میں تمہارے باپ سے بات کرتی ہوں۔ انہوں نے پیرٹنج کر کہا۔“
”کر لیجئے۔ میں نے جواب دیا۔

”بابا اور مسٹر متر گھر پر موجود نہ تھے۔ پشی ماں کالی گھاٹ گئی ہوئی تھیں۔ مسٹر متر کان لگا اندر سے یہ سارا مکالمہ سن رہی تھیں۔ اودا میدی اُلٹے پاؤں واپس گئیں۔ جب بابا گھر آئے مسٹر یہ سارا قصہ ننگ مرچ لگا کر ان کو سنایا۔ بابا نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ نزد میدان میں ٹہلنے جاتے تھے۔ کھانے کے بعد مجھے آواز دی۔ میں باہر چوتھے پر آئی۔ اس رات میں اُد جانے کے بعد کمرہ بند کر کے بہت رونی تھی۔ بابا نے کہا۔ دیپالی ہمت سے کام لو

”میں نے کہا۔ بابا کیا آپ واقعی اس خوفناک عودت سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟“
”وہ چپ رہے۔ میں نے کہا کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں نرملیندو رائے کی پرسنل سکرٹری علاوہ ازیں سرپری توش اودا میدی کے لئے علیحدہ کوٹھی بنوا رہے ہیں۔ آپ وہاں رہیں گے۔ ریحان آیا کریں گے۔ میں ریحان کی ساری عمر شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔ یہ کیسی ہولناک صورت حال ہے۔ پچھوٹ پچھوٹ کر رونے لگی۔ اس روز میں نے پہلی بار بابا کے سامنے ریحان کا نام لیا تھا۔

”بابا چند منٹ ننگ خاموش رہے۔ پھر بولے۔ چلو۔ ہم اس ملک کو ہی خیر باد کہتے ہیں۔“
”واپس ڈھاکہ۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔ ٹری نیڈرڈ۔ مکمل کا خط آیا تھا۔ اگر میں وہاں آنا چاہوں تو وہ میرے لئے وہاں کر سکتا ہے۔ کبھی بھی پلانٹیشن پر میڈیٹل آفسیر کی جگہ مل سکتی ہے۔

”بابا کے ایک چچا زاد بھائی مدین گدڑیں ڈھاکہ سے پورٹ آتے ہیں چلے گئے تھے۔ ڈا

بہت پیسہ لگایا۔ ایک مرتبہ وطن آئے تو چند کنج آئے تھے۔ بڑھیا سوٹ۔ ہونا سنگار۔ میری ماں زندہ
 ۱۔ بھیلوں نے جھینپ جھینپ کر گھر کا افلاس چھپاتے ہوئے ان کی میزبانی کی تھی۔ اب میں نے بابا سے
 ”مگر آپ اب اودادی کو کس طرح SHAKE OFF کریں گے؟“
 ”بابا ہنس پڑے کہنے لگے۔ میں ان سے کہوں گا شادی کے بعد وہ میرے ساتھ ٹری نیڈا دھلیں۔
 نکار کریں گی۔ قصہ ختم ہو جائے گا۔

”ایسا ہی ہوا۔“

”چندر کنج کی قیمت کا جو رد یہ باقی بچا تھا اس نے جہاز کے پانچ ٹکٹ خریدے گئے۔ بابا۔
 ماں۔ مٹیا۔ شو نو۔ ٹو نو۔ بہت لمبا بحری سفر کر کے ہم لوگ یہاں پہنچے۔ کھوکھو آنے پر راضی نہ ہوا۔
 نبھاسجھائی لیڈر بننا جا رہا تھا۔ اور آر۔ ایس۔ ایس میں شامل ہو چکا تھا۔

”ازدواجی زندگی کا آرام جو سپندر برس بعد ان کو دوبارہ حاصل ہو سکتا تھا شاید بابا نے میری وجہ
 اس کی قربانی دی۔ پتہ نہیں۔ لشی ہاں مجھ سے بہت خفا تھیں کہ گھر آئی لکشمی کو واپس کر دیا۔“
 ”ارے وہ لکشمی تھی کہ وہاں جان۔“ یاسمین بولی۔ ”آپ سب کی زندگی اجیرن کر دیتیں۔“
 ”یہاں پہنچ کر میں نے لشی ماں کو سمجھایا کہ اشنان کر میں میں بھی ہو سکتا ہے۔ جہا کالی ہر جگہ ہے۔
 بروں کی یہاں کمی نہیں۔

”یہاں سوشل رسوم انیسویں صدی کے ہندوستان کی ہیں۔ ہنومان جی کے مندروں میں پوجا
 بعد لوگ باگ چوراہوں پر آکر فیٹا کرتے ہیں اور کلیسو ڈانس۔ شو نو کو سہان فرمینڈو میں ٹوکرڈ
 یے ہے ٹو نو ونیز دلا چلا گیا ہے۔

”للت سین سے میری شادی یہاں پہنچنے کے دوسرے برس مکمل چاچا نے طے کرادی۔ اور میں بڑے
 ن سے مسز سین بن گئی۔ للت یہاں کے کامیاب ترین سیرسٹریں۔ پہلی بیوی اسپینش نژاد اور لاو لڈھی
 عرصہ ہوا اطلاق دیدی۔ شریف آدمی ہے، میں کافی خوش ہوں۔ بابا اور لشی ماں ہمارے ساتھ بطور P.G.
 تے ہیں۔ بابا کے مطب کے لئے دیکھو للت نے کیسا خوب صورت ٹری ٹاپ ہاؤس بنوایا ہے۔“
 یاسمین نے ذرا تعجب سے دیپالی کو دیکھا۔ کچھ لمحے خاموش رہی اور بولی۔ ”اس کا مطلب ہے
 نا آرا آیا بھی لینے دینا چ پورے رئیس کے ساتھ خوش ہوں گی؟“

”شاید۔“

”یہ مجبور یوں سے سمجھوتہ ہے یا سچی خوشی؟“

”معلوم نہیں۔“

ایک طویل امریکن کار بھانٹک میں داخل ہوئی۔ اسے ددی پوش نیگرو شو فر ڈرائیو کر رہا
بھاری بھر کم اور کم رولت سین برلیٹ کیس سنبھالے کار سے برآمد ہوئے۔ رین ٹری کی سمت آئے
ڈاکٹر بنوئے چند سرکار ٹری باپ ماؤس کی سیڑھیاں اترے۔ وہ چاروں باتیں کرتے آپس
کو لو نیل بنگلے کی طرف چلے گئے۔ اندر ڈائینگ روم میں نیگرو بٹلر پنچ کے انتظام میں مصروف
یا سمین طویل برآمدے میں سے گزرتی ڈائینگ روم میں چلی گئی۔ اس نے دریچے سے باہر بھاگنا سمجھوتہ
دیہی ایک درخت کے نیچے آنکھیں بند کئے بیٹھی ہل رہی تھی کہ مالا جب رہی تھیں۔ سامنے پالتو خرگوش
اور اعلیٰ نسل کتے دوڑتے پھر رہے تھے۔ نہایت پرسکون منظر تھا۔ یا سمین دریچے میں سے ہٹ کر
وسیع ڈائینگ روم میں ادھر سے ادھر بیٹھ قیمت سامان آرائش دیکھتی پھری۔ ایک بڑے اونچے
گرافوفون کے نزدیک دیپالی سرکار کے پرانے ریکارڈ رکھے تھے۔ یا سمین نے ٹوک بھر کے سفید
اور بھونپو والا ایک ریکارڈ گرافوفون پر لگایا۔ سوئی کہیں بیچ میں پڑ گئی۔ اچانک دیپالی کی آواز بلند
ہوئی۔ کوئی کپے کالو۔ کوئی کپے گورو۔ لیو ہے۔ لیو ہے۔ بختاڑ بھول۔

یا سمین پر پھر ہزاری کا دورہ پڑا۔ اس نے سوئی اٹھائی۔ ریکارڈ پلٹا۔ کماری دیپالی سرکار
دوسرا بھین۔ سوئی پھر وسط پر پڑی۔ جو پہراوے سو ہی پہنوں۔ جو کھلاوے سو ہی کھا
جہاں بٹھاوے تاہیں بیٹھوں۔ میرا کپے پر بھو۔

واہری عورت کی اوقات۔ یا سمین نے دل میں کہا۔

نیگرو بٹلر کمرے میں آکر بولا ”مس! پنچ از سر وڈ۔“

گرافوفون بند کر کے وہ ایوان طعام کی طرف بڑھی۔ سامنے آتش دان پر روزی کی دستخ

شدہ تصویر پر نظر پڑی۔ ”رادھیکا سانیاں۔ نئی دہلی۔ ۱۶ مارچ ۱۹۴۹ء

ڈھاکہ۔ مشرقی پاکستان۔ دسمبر ۱۹۶۷ء

مشن کمپاؤنڈ کے ایک کوارٹر کے سٹنگ روم میں کروشیا کے میزبوس سے ڈھکی بڑی ہیز
تین تصویریں رکھی ہیں۔ کمل - نیرا - ایلا - نئی دہلی - رومی کے بچے - پادری بمنجی آرام کرسی پر لکھیں
ند کئے لیٹے ہیں۔ ڈاکہ سامنے سے گزرتا ہے۔ وہ اس کے قدموں کی آہٹ پہچانتے ہیں۔

”روزی کا خط آیا؟“

”نہیں۔“ ایستھر گری بال اسٹوری بھات اُپالتے ہوئے جواب دیتی ہیں۔

”اتنے برسوں سے وہ آئی بھی نہیں۔ کب آئے گی؟ ہر سال انتظار کرتا ہوں کہ شاید اس کمرکس

آجائے۔

"یاں۔ اس کے لئے یہاں آنا اتنا آسان نہیں ہے۔ وزیر اٹاری مشکل سے ملتا ہے۔"

”جب پارٹیشن نہیں ہوا تھا تب کونسا آتی تھی۔ اسے اب بھی ہم سے شرم آتی ہے۔ وہ ہم سے

میشہ سے چڑتی تھی۔ وہ بڑے آدمی کی بیوی ہے۔ ہم دہلی کر سچیں غریب لوگ ہیں۔ مگر ہمارے مرنے کے بدلے شاید ہماری قدر آئے۔ ہم اس کے ماں باپ کہتے۔

چارج سے ریٹائر ہونے کے بعد ان کو دو کمروں کا کوارٹر مل گیا ہے۔ عسرت سے گزر رہی ہے۔

لڑی بالا اچا رختی بنا کر سجتی ہیں۔ دونوں کا باری باری موتیا بند کا ایرلین ہو چکا ہے۔ پادری صاحب

ہا آیرٹن ٹھک سے نہیں ہوا۔ ان کی بصارت زائل ہو چکی ہے۔ یسوع۔ یسوع۔ وہ جو آسمانوں

سے گذر گیا۔ یسوع۔ شام کو گری بالا پادری صاحب کا ہاتھ تھام کر ان کو شہلا نے لے جاتی ہیں۔

سفید دالھی - نابینا - پر نور حیرے والے پادری بنرجی سنان سڑک پر آہستہ آہستہ چلتے یسوع

کے ایک حواری معلوم ہوتے ہیں۔ اگلے ٹوہاہ۔ آگے ٹوہاہ

کلی رات پادری بھرجی اپنے منجی سے جا ملے۔ آخر وقت میں وہ اپنی اکلوتی بیٹی کو نہ دیکھ سکا۔
 گری بالانہ روزی کو موت کی اطلاع کا تار بھیجا۔ اس کا خط آیا۔ ماما تم فوراً میرے پاس چلی آؤ۔
 لیکن برعین خزانہ ماما اپنے داماد کے ٹکڑوں پر پلنے نئی دہلی نہیں جائیں گی۔ اور نہ اپنے امیر زائد
 نواسوں کی آیا گیری کریں گی۔ مشن والے ان کی مدد کر رہے ہیں۔ مشن اسکول میں ہوسٹل وارڈن کا کام
 دلوادیا ہے۔ مگر پرنسپل سے ان کی نہیں بنتی۔

ایک روز وہ رکشا پر بیٹھ کر ارجمند منزل پہنچی ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں ایک بال و دھوا برہمن ہندو
 پندرہ سالہ بچی سسرال والوں کے مظالم سے بچنے کے لئے کشمیری بیٹھ کر فریدپور کے گاؤں سے بھاگ کر اپنے
 زمیندار آقا کے ہاں پناہ لینے ارجمند منزل ڈھاکر آئی تھی۔ ایک بوڑھی عیسائی غریب بیوہ نے ارجمند منزل
 پہنچ کر نواب قمر الزماں کے دفتر کے دروازے پر دستک دی۔

پنچالیس سال قبل، نو عمر قمر الزماں اپنی بنت عم ملیحہ بی بی پر دم دے رہے تھے۔ مگر اپنی رعیت
 کی اس دلکش ہندو بال و دھوا کے قیر نظر کے بھی گھائل ہو گئے تھے۔ بوڑھے نواب قمر الزماں نے خود
 کر دروازہ کھولا۔ ایک پوپلے مندو والی پریشان حال ضعیفہ ان کے سامنے کھڑی تھی

اسکول پرنسپل کے خلاف اس کی شکایات سن کر نواب نے کہا۔ "البتہ ارجمند منزل تمہارا
 گھر ہے۔ یہیں رہو۔ تم کو اس عمر میں ہم محنت مزدوری نہیں کرنے دیں گے۔"
 "نواب صاحب۔ پال بڑے خود دار آدمی تھے۔ میں کسی بھی جگہ مفت خوردی کر کے ان کی روح کو
 تکلیف نہیں پہنچاؤں گی۔ میری صحت بہت اچھی ہے۔ مجھے کہیں کام دلواد کیجئے۔"

گری بالادیمبی کے اصرار پر نواب صاحب۔ ان کو یونیورسٹی کے گرلز ہوسٹل میں کچن سپروائزر
 کی ملازمت دلوادیتے ہیں۔ دو سال بعد وہ بعارضہ نمونہ مر جاتی ہیں۔ چرچ یا ریڈیں پال کے پہلو میں دفن کی
 گئیں۔ کسی کو علم نہیں کہ نئی دہلی کی مشہور دو تہمند ہوسٹل وکر رادیکا سانیال ان کی بیٹی ہے۔

نئی دہلی میں جس وقت روزی کو مسز بھرجی کی وفات کا تار ملا جو نواب قمر الزماں نے بھجوا دیا تھا
 وہ اپنی عالی شان نئی کوٹھی میں ڈرنے کے انتظام میں مصروف تھی۔

بہان آچکے تھے۔ تار لسنٹ کمار سانیال نے لیا۔ وہ روزی کے پاس گیا جو چند غیر

لی ہمانوں کا سواگت کر رہی تھی۔ ایک امریکن اسکالر اسکور کی تحریک کے بارے میں ایک امریکن فائڈیشن کی ف سے کتاب لکھ رہا تھا۔ اس سلسلے میں روزی سے ملنے آیا تھا۔ اس نے بسنت کمار سانیاں سے کہا۔ ”مجھے م ہوا ہے کہ آپ کی بیوی اسکور کے نمونہ کی ایک ہیروئن تھی!“ بسنت سانیاں دھیرے سے سکریا۔ اس نے روزی کے ہاتھ میں وہ تار دیا جو ڈھاک سے آیا تھا۔ اور آہستہ سے کہا۔ ”روزی۔ تم ہیروئن نہیں ہیں۔ تمہاری ماں ہیروئن تھیں۔“

جہاں آرا دیناج پور سے میکے آئی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ سب ارجمند منزل کے پھلے والے جمع تھے۔ اس کا بچہ اکل۔ والدہ۔ بھادج۔ دونوں چھوٹی بہنیں۔ نیر الزماں نے اندر سے آکر کہا۔ ذرا اپنی جیتی یا سمن مجید کی حرکتیں دیکھو۔ یہ دیکھو لندن کے ایک اخبار میں اس کی تصویر کسی زیر سے شادی کر لی۔“

جہاں آرا نے ہینک لگا کر اخبار دیکھا۔ ”بلیک میوٹی ویڈیز۔ ڈارک ڈانس یا سمن مجید ہیر وٹ پرش چارمنگ۔“ ننگے پاؤں والی کالی رقاصہ کی شادی۔“

”معقول۔ اور یا سمن کیا رس کا گھوٹا ہے۔ بلیک میوٹی۔ ڈارک ڈانس۔ حدیث گوی۔“ نیر الزماں ہسرا کر کہا۔ ”جل پائے گوری کے مولویوں کا خاندان۔ اور یہ انجام۔ ننگے پاؤں والی رقاصہ۔“

”اور وہ نگوٹا انگریز کیا کرتا ہے؟“ بیگم قمر الزماں نے پوچھا۔

”ہو گا کوئی بھڑبھڑا۔“ نیر الزماں نے کہا۔

”فیشن ڈیزائنر ہے۔“ جہاں آرا نے اخبار پڑھ کر کہا۔ ”مگر جب دیہالی کا ٹری نیڈاڈ سے خط آیا اس نے لکھا تھا کہ یا سمن ڈانس کرنے پورٹ آف اسپن گئی تھی۔ اس خط میں تو کسی انگریز وٹریز کا ذکر تھا۔“ جیرلڈ ایڈرین بلونٹ۔ بہت خوب!“

یاسمین بلمونٹ، ڈارک ڈانسر

دیپالی دیدی۔ آپ کا خط ملا۔ اب آپ کو ساری بات بتاتی ہوں۔ بہت عرصہ بعد آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ جیرلڈ سے میں نے کہا تھا کہ شادی اسلامی طریقے سے ہو۔ وہ مان گیا۔ نکاح کے لئے ہم نے ایک دوست کو بلایا جو پہلے باقاعدہ مولوی رہ چکے تھے۔ اب بے دین تھے۔ ہم سب پیسے نکل کر رات کے بارہ بجے ان کے گھر پہنچے۔ وہاں مزید مئے نوشی ہوئی۔ پھر مولوی صاحب نے نکاح پڑھا۔ دو لہا دلہن مولوی گواہ سب نشے میں آؤٹ تھے۔

شادی کے بعد ہم دونوں نے جیلی میں ایک میوزک کرائے پر لے لی۔ جیرلڈ کی آمدنی بہت اچھی تھی میں نے رقص ترک کر دیا۔ سنگھڑاؤس وائف بنی۔ بچی پیدا ہوئی۔ اس کا نام شہزاد رکھا۔ جب وہ ذرا بڑی ہوئی میں نے پھر اپنا ڈانس ٹرپ تیار کیا۔

ایک روز اچانک اور بالکل غیر متوقع جیرلڈ میرے ٹرپ کے ایک بنگالی رقاص کے ساتھ یہاں آ گیا۔ معلوم ہوا دونوں پیرس میں ہیں۔ میں پتہ چلا کر نیرس پہنچی۔ ان کو ڈھونڈ نکالا۔ صبح کو میں ان کے فلیٹ پر پہنچی بنگالی چھوڑا اسپرٹ باندھے گھر بولے عورتوں کے سے انداز میں اسٹوڈ کے سامنے کھڑا ناشتہ تیار کر رہا تھا۔ جیرلڈ ڈریسنگ گارڈن پہنچے بیٹھا اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔ اگر سستی کا یہ نظارہ دیکھ کر مجھے اُبکانی سی آئی اور میں بغیر کچھ کہنے سے لپٹے پاؤں لندن واپس آگئی۔ پھر میں نے جیرلڈ کو لکھا کہ طلاقیہ دیدی۔ اور مہر ادا کر اس کا جواب آیا کہ شادی ہی کب ہوئی تھی۔ مولوی اور گواہ سب نشے میں دھست تھے۔ وہ نکاح نہیں تھا مذاق تھا۔ علاوہ ازیں ہم لے بلماظ برطانوی قانون سول میرج نہیں کی۔ لہذا بچی کی پرورش کی ذمہ داری بھی مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔ مجھے صفت نازک میں کبھی دلچسپی نہیں تھی۔ تم لندن میں اپنا ڈانس اسکول اور لوکا کلاسیں چلاؤ کی ناکام کوشش کر رہی تھیں اور ڈاؤن اینڈ آؤٹ تھیں۔ اور وطن واپس جانے کے لئے کرایہ تک پاس نہ تھا۔ میں تنہا اسے ساتھ رکھ کر تنہا ہی کفالت کرنے لگا تھا۔ محض ازراہ ہمدردی۔ لیکن میں امید کرتا ہوں تم اچھے دوست رہیں گے۔

جیرلڈ کی والدہ جو ایک متمول اور نہایت کنبوس ریٹائرڈ ایجنٹ ایکٹرس ہیں وہ شہر زاد کو اپنے
 بچے کاؤں لے گئی ہیں اور اس شرط پر اس کی ذمہ داری لینے کو تیار ہیں کہ وہ اسے روٹ کیتھولک اٹھائیں
 میں نے کہا روٹ کیتھولک کیا ہوٹن ٹوٹ، شنتو، بدھسٹ کچھ بھی بنادیکئے۔ اسے میری طرح دھکے
 کھانے پڑیں۔ میں اب ایک دفتر میں کلر کی کر رہی ہوں۔ ڈانس ٹروپ چلانا بہت مشکل تھا۔ انڈیا
 آنے والے نامور ڈانسرز کا کچی ٹیشن بہت سخت ہے۔ پچھلے مہینے اسید کی کرن نظر آنی معلوم ہوا
 یحان الدین احمد آئے ہوئے ہیں۔ کچھلی مرتبہ پورٹ آف اسپین میں آپ کو میں نے بتایا تھا کس طرح یہ
 ایک زمانے میں میرا تعاقب کرتے رہے تھے۔ اب وہ منسٹر تھے اور یہاں ایک وفد کے ساتھ آئے
 اور ڈور چیمبر میں ٹھہرے تھے۔ میں نے فون کیا۔ ملنے کی کوشش کی۔ انہوں نے صاف ڈال دیا کہ
 مصروف ہیں۔ پھر میں نے سنا، انھوں نے کہا "پرانی شناسا اب سب قریبی دوست ہونے کا دعو
 تہ ہیں۔ مجھے تنگ کرتے ہیں۔ یہ کام کروادو۔ وہ کام کروادو۔ میں کس کس سے ملتا بھرتوں۔ جس
 طن سے انہوں نے یہ کہا۔ اتفاق سے وہ مجھے بھی جانتا تھا۔ اس نے اگر مجھے بنایا۔

جہاں آرا آپا سے آپ کی خط و کتابت ہے، میں نے ان کو کئی خط لکھے جواب نہیں آیا۔ غالباً
 بند منزل والے بھی میرے طرز زندگی سے سخت متنفر اور بیزار ہیں۔ مگر میں کیا کر سکتی ہوں۔ زمین او
 ن میرے سامنے سے بھاگ گئے۔ مجھے کہیں پناہ نہ ملی۔

آپ کی یاسمین بلونٹ

۳۶ پالیٹ آفیسر اکمل مرشد زادہ

لاڈا اسپیکر پر دھرایا جارہا تھا۔ مسز دیپالی سین۔ مسز دیپالی سین۔ وی۔ آئی۔ پی۔ لافچ۔ ٹر
 آپ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ مسز دیپالی سین ٹی۔ ٹیلیو۔ اے کی مسافر۔ پورٹ آف اسپین کی مس
 پالی سین —

ششدر اور مضطرب وہ مسافروں کی بھڑ سے نکلی۔ پاکستان ایر فورس کے یونیفارم میں

ملبوس ایک سافلا نوجوان اس کی طرف آیا۔ ”دیپالی آنٹی۔“ اس نے ذرا جھجک کر پوچھا۔ ”میں مکمل ہوں۔ اُمّی لاؤنج میں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ آپ کی فلاحیت بہت لیٹ تھی۔“ وہ پائلیٹ آفسیر مکمل حسین مرشد زادہ کے ساتھ وی۔ آئی۔ پی۔ لاؤنج کی طرف بڑھی، مکہ کے اندر ڈھکی ملل کی سفید ساری میں ملبوس ایک غلین آنکھوں والی دہلی پتلی عورت، کچھ چڑی خیر مقدم کے لئے مصروف سے اٹھی۔ دیپالی نے تعجب سے اسے دیکھا۔

”یہ اُمّی ہیں۔“ نوجوان مکمل نے ذرا گھبرا کر کہا۔

”میں تمہاری شادی میں شریک نہ ہو سکی تھی دیکھو اتنی دور سے تمہارے بیٹے کی شادی میری شرکت کے لئے آئی!“ دیپالی نے مصنوعی ایشامٹ سے کہا۔ جہاں آرا کو اس حانت میں دیکھنے کی ذمہ داری میں خود ہوں۔ میں ریمان کو آسانی سے بھلا سکی۔ لیکن ریمان؟ رح سے ان کی زندگی ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی۔ زندگی کی بربادوں کا یہ کیسا لاتناہی سلسلہ ہے۔ اس نے آرا کی آنکھوں والی جہاں آرا پر بھڑکنا دوسال قبل وہ بیوہ ہو گئی تھی۔ مکمل اس کا اکلوتا لڑکا تھا۔

دیپالی نے اتنی شام، خوشحالت پہلے ارجمند منزل میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ اُدمارے کے دو دنوں میں بھی نہیں۔ پاکستان کا نیا اوپری طبقہ واقعی سید متھول ہو چکا تھا۔ دہلی بھی ایک ملک التجار کی طرح جب مکمل کے سہرا باندھا جانے لگا جہاں آرا وہاں سے ہٹ گئی۔ وہ کونے میں جا کر اپنے رنج و شوق کو یاد کر کے رو رہی تھی۔ دیپالی نے ایک بار پھر اسے حیرت سے دیکھا۔ ہندوستانی۔ خیر۔ پاکستانی۔ عورت! اچھا، مرنی اسے ایک ایسے عیاش بدقوارہ بد ہیئت شخص سے بیاہ گیا جس نے ساری عمر اسے جلایا۔ مگر اس نے دوسروں کے سامنے ہمیشہ اپنے شوہر کی حمایت کی اور اس کی خدمت گزار رہی۔ اور اب اسی یاد کے رو رہی تھی۔

چند سال قبل جہاں آرا کی چھوٹی کنواری بہنیں انجم آرا اور اختر آرا اپنے بھتیجے منور الزماں سے ملنے لندن جا رہی تھیں جو وہاں اسکول میں پڑھتا تھا۔ طیارہ آپس پر گر کر پاش پاش ہو گیا۔ سارے مسافر ہلاک ہوئے۔ برف میں لاشیں بھی نہ ملیں۔ اس دہشتناک جوائنرنگی کے صدمے نے ان کی ماں بیگم قمر الزماں کی جان لی۔ نواب قمر الزماں، اس کے بعد سے بہت کم لوگ تھے۔ اس وقت یتیم نواسے کی شادی کے عہد نے میں

میلانے کے نیچے ترکی ٹوپی اوڑھے (اگلے وقتوں کے لوگ شنگ مسمرہ مخالفت تہذیب گردانتے تھے) گورنر اور اعلیٰ افسروں سے ایک آدھ بات کر لینے کے بعد پھر خاموش ہو گئے۔ صوفے پر گم صم بیٹھے رہے۔ کی نظر دیپالی پر پڑی جو ایک طرف کھڑی جہاں آرا کی پرانی خادمہ مالا سے باتیں کر رہی تھی۔ انہوں نے اشارہ کے لئے اپنے پاس بلایا۔ وہ ان کے قریب جا بیٹھی۔ وہ دونوں چپ چاپ سامنے کی چل پہل کا نظارہ کیا کرتے۔ دیپالی کی آنکھ بھڑائی۔ اس نے چپکے سے آنسو پوچھے۔ نواب صاحب نے دیکھ لیا۔ آہستہ سے ”رونا نہیں چاہئے بیٹی۔ بُری بات ہے۔ صبر بڑی چیز ہے۔“

کچھ دیر بعد اس نے آہستہ سے کہا۔ ”آپ کے بھانجے ریحان الدین احمد۔۔۔ میں ابھی ان سے یہیں مل کر آ رہی ہوں۔“

نواب صاحب نے چاندی کی موٹھ والی چھڑی کو آہستہ سے قالین پر کھٹکھٹایا اور ذرا توقف کے بولے۔ ”ریحان اب وہاں بڑا آدمی ہے۔ اپنی پرانی سیاست چھوڑ کر کانگریس میں شامل ہو گیا۔ منسٹر بن گیا ہے۔ اب کیا کر رہا ہے؟“

”اُمّارائے کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ اُن کے بھائی کی کوئی بہت بڑی بزنس ہے۔ دونوں ایک فرم کے جنرل منیجر ہو گئے ہیں۔ میں اپنے چھوٹے بھائی کھوکھو کے ہاں ٹھہری تھی۔ اس نے لن کو فون کر سیکر آنے کی خبر دی۔ خود ملنے نہیں آئے۔ اپنی کار بھیج دی۔ میں کھوکھو اور اس کی بیوی اُمّارائے کے علی۔ روڈ گئے۔ کوٹھی کی دوسری منزل میں اُمّارائے خود رہتی ہیں۔ نیچے ایک دنگ میں ریحان اور اُن کی بیوی اور لڑکا۔ چند روز ہوئے لڑکا گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اُمّادیدی کے بھائی نرملیندورائے نے اب شادی نہیں کی۔ چوبیس گھنٹے شراب میں غرق منگال کلب میں بیٹھا رہتا ہے۔ سارا کاروبار ریحان ہاتھ میں ہے۔ سنا ہے چند ماہ کے لئے منسٹر بنے تھے نرملیندو اور اُمّارائے کے اس کاروبار کو۔ فائدہ پہنچایا تھا۔ اس وجہ سے وہ لوگ ان کے اور زیادہ احسان مند ہیں۔ ریحان صاحب اپنے لڑکے کے متعلق بہت پریشان تھے۔ مجھ سے کہنے لگے باغی ہو کر گھر سے نکل گیا۔ تیرہ سال لڑیں۔ ابھی سے شاعری کرتا ہے۔ بھوک کی پیڑھی کا ہمدرد شاعر۔“

نواب دسترالزماں نے جو سر آگے بڑھائے بغور سن رہے تھے۔ یک لمحت ایک تلخ قہقہہ بلند۔ لوگوں نے اچھی سے انہیں دیکھا۔ انجم آزاد اور اختر آباد کی موت کے بعد آج وہ پہلی بار منہ سے تھے

بنگال کے ایک قدیم کوئی ابھی خند نے کہا تھا "تالاب کنول سے بھر گئے بہار میں کھسکیاں آم
بور پر جمع ہیں۔ مسافت چھوٹی ہو تب بھی، ہوا جب گاڑی کے راستے میں رقص کرتی ہے، غریب الوطن
دل دکھ سے بھر جاتا ہے۔" اور ڈھاکہ سے پورٹ آف اسپین کا راستہ بہت طویل تھا۔ واپس جانے سے
قبل اس آخری شام وہ سنگ مرخ کے تالاب کے کنارے پرانے "راج سنگھاسن" پر مٹی جھارا
سے باتیں کرتی رہی۔ اس نقلی شاہی تخت پر لوگوں میں یہ لوگ اسی طرح بیٹھا کرتی تھیں۔

معاً جہاں آرا سنے پوچھا: "ریحان بھائی کی دلہن کیسی ہیں؟ کون لوگ ہیں؟"

"عام سی گھڑلو بی بی میں۔" دیپالی نے جواب دیا۔ "غریب شریف گھرانے کی لڑکی۔ بتا رہی تھی
اُومارائے کے بھائی نریندر رائے نشے میں نشین کا چلا سہ سے تھے۔ گارڈن ریچ میں۔ ان زہرونی بی کے با
اُن کی کار کے نیچے دب کر مر گئے۔ وہ ایک غریب کارنگر تھے۔ زردوز۔ جن کے دادا کھنڈو سے کلکتے آگے
تھے۔ اُومادیری نے تنگم کر کے بھائی کو پولیس کچہری سے بچا لیا۔ متوفی کی ایک ہی لڑکی تھی۔ ماں مر چکی
بھائی اُدھر نکل گئے تھے۔ اُومارائے بطور تلافی اس نیم بے سہارا لڑکی کو اپنے ہاں اپنی نئی کوٹھی میں۔
آئیں۔ اپنے دارڈروب کی دیکھ بھالی اس کے سپرد کر دی۔ رہنے کے لئے ایک کوٹھری دیدی۔ زردوز
لڑکی سینے پر دے میں طاق سلیقہ مند۔ احساس کمتری کی شکار۔ ریحان صاحب جو حسب معمول اُوم
کے ہاں آتے رہتے تھے انہیں یہ لڑکی بھاگتی۔ یہ پارٹیشن کے ڈھانچے تین سال بعد کی بات ہے۔ ریحان صاحب
کے دل میں جانے کیا نیکی آئی ایک دن اس بے چاری مظلوم لڑکی سے نکاح پڑھوا لیا۔ اُوما اس کے ساتھ
بڑی ساس مند کا سا برتاؤ کرتی ہیں۔ وہ خاموش رہتی ہے۔ ریحان بھی اس کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیتے
"اُومارائے کا ایک دلچسپ نسخہ زہرہ نے بتایا۔ دائم الماریج ہیں۔ سیاست سے کب کی کنارہ کش
ہو چکی ہیں۔ صبح سویرے اُٹھ کر نزدیک بیلوڈ پر چلی جاتی ہیں۔ ایک ملازم چھپرہوں اور ہڈیوں کا برتنہ
کر پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ سڑک اور باغ کے سارے آوارہ بلیوں اور کتوں کو ناشتہ کراتی پھرتی ہیں۔ پھر کوڈر
کو دانہ ڈالتی ہیں۔ گھر واپس آکر ریحان کی بیوی سے جھائیں جھائیں کرتی ہیں۔ ریحان عموماً گھر سے باہر رہتے ہیں
واٹ لے لائف۔"

جہاں آرا نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور اُٹھ کر مغرب کی نماز کے لئے اندھ چلی گئی۔ باورچی خانے کے
طرف سے رابعہ آتی نظر آئی۔ ریحان کی چھوٹی بہن رابعہ جو اکمل کی شادی کے لئے اپنے گھر عظیم پورے سے

دز کے لئے ارجمند منزل آئی ہوئی تھی۔ وہ راج سنگھاسن کے پاس آکر کھڑی ہوئی شفق رنگ پر نظر ڈالی اور کہا۔ ”میں بھی نماز پڑھ آؤں۔ ناصرو کو تمہارے پاس بھجی ہوں۔“

”ناصرہ نماز نہیں پڑھتی۔“ دیپالی نے پوچھا۔

”نماز۔۔۔ وہ خدا ہی کو نہیں مانتی۔ وہ اپنے ماموں پر پڑی ہے۔ اللہ کی شان ہے۔ مولانا الدین احمد کا بیٹا اور نواسی دونوں ملکر۔“ رابعہ نے جواب دیا اور تیز چلتی کوٹھی کی طرف روانہ ہوئی چند منٹ بعد اس کی لڑکی ناصرو نجم السحر ارجمند منزل سے باہر آکر ”راج سنگھاسن“ پر ہلک گئی۔ حساس، ذہین چہرے والی بیسٹ سالہ لڑکی تھی۔ اور ایک جوشیلی اسٹوڈنٹ لیڈر۔ لگ بھگ اسی پر نے انقلابی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تھا۔ دیپالی نے سوچا۔ پچھلے ایک ہفتے میں دیپالی کی مہرہ مت دوستی ہو گئی تھی۔ ناصرو اسے ایسٹ پاکستان کی پیچیدہ سیاست کے قصے سناتی رہی تھی۔ مولانا فی کی عوامی لیگ۔ بالیسال اور کھٹنا کے قحط۔ جیسو کی زرعی تہہ کا تحریک۔ پولس فائرنگ۔ کابجی ٹیشن۔ پولس فائرنگ۔ مظاہرے۔ آدم جی جوٹ مل کا فساد۔ عوامی محاذ جیل یا ترائیں بنگال سب کا پرانا نقشہ۔ ادھر مغربی بنگال میں بھی تقریباً ہی سب ہو رہا تھا۔

”میں تمہارے ماموں کے متعلق تمہاری جہاں آراء خالہ کو بتا رہی تھی۔“ دیپالی نے کہا۔

”مجھ ان کے متعلق سب معلوم ہے۔“ ناصرو نے ناگواری سے جواب دیا۔ ”اُمی اپنے بھائی کو ہمیشہ میڈیلیٹیز کرتی رہی ہیں۔ اور تہاں آراء خالہ بھی۔ اور شاید۔۔۔ اور شاید۔۔۔ آپ بھی۔ مگر ہم لوگ آپ سے زیادہ تیز فہم ہیں۔ ہم کھرا کھوٹا سچاں لیتے ہیں۔ ماموں جانتے۔ کیا خوب چیز ہیں۔ مکمل آدرش دادی۔ محترم نعل گڈول۔ آج پراگ میں ہیں۔ کل قاہرہ۔ برسوں نیویارک۔ آج اس پوٹیشن پارٹی میں ہیں کل اس جہاں منسٹر بننے کے مواقع زیادہ نظر آئیں۔ ادھر کو لڑھک گئے۔ ماسکو اور واشنگٹن دونوں کے خیر خواہ۔ فیضانِ بنداری اسے کہتے ہیں۔“

”ناصرہ۔۔۔“ دیپالی نے رسائیت سے کہا۔ ”کل کے باغی آج کے ایسٹبلیشمنٹ میں شامل ہو چکے۔ آج کی باغی ہو۔ ممکن ہے تم کل کے ایسٹبلیشمنٹ میں شامل ہو جاؤ۔“

ناصرہ نجم السحر استہزا کے ساتھ ہنسی۔

”دیپالی آنٹی۔۔۔ معاف کیجئے گا آپ عمر کی اس ایسٹ پر سچ چلی ہیں جہاں انسان

کو ایک دفاعی ہتھیار۔ ایک زہ بکتر کی طرح استعمال کرتا ہے۔ اس کا زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے۔
 دیپالی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس نے کہا۔ "ناصرہ ڈیر۔ تم نے ایس ان ونڈر لینڈ پڑھی ہے۔ ا
 کی وہ نظم یاد ہے۔"

YOU ARE OLD FATHER
 WILLIAM, THE
 YOUNG MAN SAID
 AND YOUR HAIR HAS
 BECOME VERY
 WHITE
 AND YET YOU INCESSANTLY
 STAND ON YOUR
 HEAD —
 DO YOU THINK, AT
 YOUR AGE
 IT IS RIGHT ?

ناصرہ بھی ہنسنے لگی۔ اور بولی۔ "یہ بات تو آپ کے پنڈت نہرو سے کہنی چاہئے۔"
 مالا اندر سے تہوڑے کی ٹپے لے کر آئی اور ابے تخت پر رکھ دیا۔ اس کے واپس جانے کے بعد
 دیپالی نے کہا۔ "ناصرہ۔ تم جہاں آزار سے ملتی رہا کرو۔ مجھے محسوس ہوا ہے کہ وہ بید تھا ہے۔ نیرا زما
 کی بیوی سے اس کی نہیں بنتی۔ دیناج پورا اپنی سسرال میں اب وہ رہنا نہیں چاہتی۔ ماں مر گئیں۔ دو جوا
 بہنوں کی خوفناک موت کا غم سہہ چکی ہے۔ باپ چراغ سحری ہیں۔ اور وہ اُن سے ہمیشہ سے خائف رہ
 ہے۔ شوہر مر گیا۔ جیسا کچھ بھی تھا۔ اب لڑکے نے اپنا گھر بسایا۔ وہ کتنی اکیلی ہے۔"
 "ہوں گی۔ مجھے ان سے کوئی ہمدردی نہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اگلے مجھ سے شادی کرنا چاہتا
 تھا؟ مجھے بھی وہ بید رہتا تھا۔ مگر میرے باپ معمولی آدمی ہیں۔ کلاس ٹو افسر۔ ہم لوگ عظیم لوگوں

بہت معمولی سرکاری فلیٹ میں رہتے ہیں۔ ہماری کوئی سماجی حیثیت نہیں۔ جہاں آراء، خاں اپنے اکلوتے خواہش رد کر کے ایک کرڈرپتی انڈسٹریٹ کی رطکی بیاہ لائیں۔ یہ طبقہ ناقابل معافی ہے۔ جب میں پیدا ہوا تھا جہاں آراء خاں نے میرے بڑے چاؤ چو پچنے کئے تھے۔ میرا نام نجیم السحر انہوں نے ہی رکھا تھا۔ اتنی کو بنا کر دیتی تھیں۔ گویا ہماری سرپرستی کرتی تھیں۔ ہم لوگ ان کے POOR RELATIVES تھے۔

اب بھڑک کر اس نے ایک کنکر اٹھایا اسے زور سے تالاب میں پھینکا اور بات جاری رکھی۔ ”اور یہ فوٹاں۔ ہمارے نانا۔۔۔ یہ اب تک اس ٹکڑم میں رہے ہیں کہ ان کو مرکزی کابینہ میں لے لیا جائے۔ ناکام رہے۔ زندگی ان کی سیاسی داؤ پیچ میں گزری۔ اولڈ گارڈ مسلم لیگی۔ جب یہاں زبان کا ایجنسی ہو انہوں کی موافقت میں آواز اٹھائی۔ جلوس نعرے لگاتا یہاں ارجمند منزل کے پھاٹک پر آیا۔ اردو بھاشا۔۔۔ اردو بھاشا چوبے نا۔۔۔ یہ اپنی چھڑی ہاتھ میں لے کر ٹوپی اوڑھے برآمدے میں جا کر چلائے۔ پیلے۔۔۔ صردو چوبے۔۔۔ جلوس اتنا مشتعل ہوا کہ پھراؤ کر دیتا۔ بچ گئے۔ اب یہ ایک پولیٹیکل میک اندر فرسٹریڈ۔ لیکن یاد رکھئے۔“ اس نے منگھا سن پر سے اٹھ کر خطیبانہ انداز میں کہا۔ ”یہ نہ سمجھئے ہم لوگ اردو امپریلزم کے خلاف ہیں یا مغربی پاکستان جو ہمارا استحصال کر رہا ہے اس سے متفق ہیں تو اسے ہم انڈیا سے جا ملیں گے۔ ہرگز نہیں۔ جہاں انڈیا سے مقابلے کا سوال پیدا ہوا ہم پاکستان کی حفاظت کے لئے لڑیں گے۔ ہم بچے پاکستانی ہیں۔ اچھا دیپالی آئی۔ اب میں چلوں۔ کل آپ کو ایرپورٹ نے آجاؤں گی۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اس وقت کہاں جا رہی ہو۔“

”گھر۔ عظیم پورہ۔“

”تم شادی کے لئے یہاں ارجمند منزل میں نہیں ٹھہری ہو۔“

”ہرگز نہیں۔ اتنی آگئی ہیں۔ وہی ان لوگوں کی محبت میں ٹھہلی جا رہی ہیں۔ میں روزانہ آپ سے ملنے جاتی تھی۔ اچھا خدا حافظ۔“

دیپالی اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ وہ روش پر سے گزر کر بر سرعت پھاٹک کی طرف چلی گئی۔

نے رات کی تاریکی میں ڈوبی کافی آلودارجمند منزل پر نظر ڈالی۔ اندر کمروں میں تیز روشنی ہو رہی تھی گہما گہما۔ مہانوں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ دو دن بعد اگلے اپنی دہن کے ساتھ مغربی پاکستان واپس

جانے والا تھا۔ وہ پشاور پر فورس اسٹیشن میں تعینات تھا۔ اپنی کرنل ناصرہ کی طرح وہ بھی بڑا شدید قوت پاکستانی تھا۔ پاکستان کی دفاعی سروریز کا ایک فرض شناس جوشیلا، محب وطن ہوا باز۔

۳۷

شنکری کا ناچ

نئی دہلی

۳ اکتوبر ۱۹۶۵ء

مائی ڈیر دیپالی

تمہارا خط آیا تھا۔ جلد جواب نہ دے سکی۔ اپنی شدید پریشانیوں اور فکروں میں مبتلا تھی۔ میرا کمرل اب فوج میں لفٹننٹ ہے۔ وہ محاذ پر لڑ رہا تھا۔ خدا باپ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ خیریت سے آگیا۔ مگر ایک بری خبر سناتی ہوں۔ جہاں آرار کا بیٹا اکمل جموں پر بمباری کرتے ہوئے مارا گیا۔ یہ خبر مجھے بالکل اتفاقہ معلوم ہوئی۔ میں سوچ سکتی ہوں کہ جہاں آرار بے چاری کا کیا حال ہوگا۔ اس بے چاری کی شادی میں شرکت کے لئے پچھلے سال ہی وطن آئی تھیں۔

جب کمرل اور اکمل پیدا ہوئے ہیں تو یاد نہیں کس نے یا تم نے یا میرے شوہر نے کہا تھا کہ کہے پہلے ا (حادثہ) لگانے سے اس لفظ کی ضد بن جاتی ہے۔ سچ یہ نام ہی منحوس نکلا۔

موجودہ صورت حال میں جہاں آرار کو تعزیت کا خط لکھنا بھی ممکن نہیں۔ کیا قیامت ہے اور جہاں آرار ٹیگور کا "شنکری ناچے" اتنی گمبھیر نیل اومبرے ڈمر و باجے "بہت گایا کرتی تھیں۔ بے چارہ اکمل مرشدزادہ نیل اومبرے ڈمر و بجانے گیا اور اس کے اپنے پر خچے اڑ گئے۔ ہندوستان اور پاکستان کی سرحد پر تمہاری شنکری زوروں میں ناچ گئی۔ تم وہاں آرام سے بیٹھی ہو۔ خوش قسمت ہو۔ بچ و دو۔

پیرسٹر صاحب کو سلام۔

تمہاری

رودی

۳۸ گڈلک ڈائری

۴ جنوری ۱۹۶۷ء — ۱۶ اپریل ۱۳۴۳ھ — ۱۹ رمضان ۱۳۸۶ھ — ۱۸ اپریل ۲۰۲۳ء

نام: یاسمین بلورنٹ

دفتر کا پتہ:-

گھر کا پتہ:-

ٹیلیفون نمبر:-

کار نمبر:-

ڈرائیونگ لائسنس نمبر:-

ٹی۔وی۔ لائسنس نمبر:-

بینک اکاؤنٹ نمبر:-

پاسپورٹ نمبر:-

لائف انشورنس پالیسی:-

بلڈ گروپ:-

عینک نمبر:-

آج سال نو ہے۔ اللہ کا نام لے کر اس نئی نویلی ڈائری کو شروع کرتی ہوں۔ جو ڈھاکہ سے کوئی آنے
مجھے لے گیا ہے۔ نام ہے "گڈلک ڈائری" اس میں میں لکھ رہی ہوں۔ لہذا اس کا نام "گڈلک ڈائری"
چاہئے۔ توبہ۔ توبہ۔ یا اللہ میں تیری ناشکری نہیں کرتی۔ ہزاروں سے اچھی ہوں۔ توبہ۔ توبہ۔ اللہ
نہ کرنا۔ اللہ تجھ پر میرا سارا حال روشن ہے۔ میرے گناہوں کو معاف کرنا۔ تو مفور و رحیم ہے۔ میں نے
افغانیاں کیں۔ اپنے حافظ قرآن مولوی باپ کو صدمہ پہنچایا۔ اسٹیج پر ناچی گائی۔ مشرک سے بیاہ کیا۔
حارہ نکاح ہی نہ تھا۔ بیٹی کو عیسائی بنوا دیا۔ اللہ میں تیرے غضب کے خوف سے تھر تھر کاہتی ہوں۔

مجھے عذاب قبر سے بچاؤ۔ اللہ تجھے اپنے حبیب کا واسطہ۔

آج سال نو ہے۔ میں نے سینئر سنر بلونٹ کو ٹرانک کال کی تھی کہ نئے سال کی مبارکباد اپنی بیٹی
دوں۔ معلوم ہوا دادی پوتی دونوں ماس کے لئے چرچ گئی ہوئی ہیں۔ اللہ مجھے معاف کرنا۔ اللہ میں اپنے حال
اپنی مجبور یوں کا شکار تھی۔ اللہ تو میرے سب مصائب یا مجبور یوں سے واقف ہے۔ پھر کبھی مجھے
زرے گا ؟

ڈیر ڈائری۔ اس ملک کی عورتوں کے بھی خون سفید ہیں۔ شہر زاد بیمار پڑی ہے۔ بڑھیا سنر
نے اسے ہسپتال میں ڈال دیا ہے دیکھنے بھی نہیں جاتی۔ وہ گاؤں یہاں سے اتنی دُور ہے۔ صبح کو ٹرین سے ج
رات کو تھکن سے چور ٹرین سے لوٹو۔ صبح سویرے پھر فیکٹری وقت پر پہنچو۔ یہ بے کیفی مسلسل محنت، ج
کی زندگی کب تک چنے گی۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا ہے تمہارا دلی کمزور ہے۔ ڈاکٹر کرنا بالکل چھوڑ دو۔ میری بیٹی
شہر زاد جس کا اب پورا نام شہر زاد کر سٹیا جو ز فین بلونٹ ہے۔ مجھ سے کہتی ہے۔ اس کے دین میں احساسِ ج
ورا احساسِ گناہ کی شدت ہی بخشش کا باعث بنتی ہے۔ بہت سے راہب اپنی پیٹھ پر خود کو ڈرے لگا
یں۔ تو کوٹے تو مجھے زندگی ہی لگا رہی ہے۔ اللہ میرے عیوب سے چشم پوشی کرے۔

ڈیر گڈ لک ڈائری۔ پرموں شام میں شیریں کو دیکھ کر ہسپتال سے باہر آئی۔ گاؤں کی خاموشی
سڑک شدید بارش میں نظروں سے اچھل ہو چکی تھی۔ میں بس اسٹاپ پر کھڑی ہو گئی۔ شیریں مجھ سے پہ
رکھائی سے پیش آئی تھی۔ شاید اس کی دادی نہیں چاہتی کہ میں اس سے زیادہ لمبے لمبوں۔ شہر زاد ابھی ٹانگا
براہر چھو کر رہی ہے مگر اپنے باپ کی طرح بے رحم اور کائیاں اور دادی کی طرح سرد مزاج۔ وہ شاید یہ بھی نہیں
چاہتی کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ اس کی ماں ایک کالی عورت ہے۔ اس کا اپنا رنگ سفید ہے۔ سبز آنکھیں۔
چوکیٹ بال۔ اپنے حسین و جمیل باپ پر لگتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو مددِ غلامی کرنا نہیں چاہتی۔ آج وہ مجھے
صاف صاف کہہ رہی تھی۔ "میں تم بار بار ہر ہفتے مجھے دیکھنے اتنی دُور سے کیوں آتی ہو۔ مت آیا کرو۔ میں اچھ
ہوں۔" میرا دل ٹوٹ گیا۔ میں باہر آ کر سنان بس اسٹاپ پر کوچ کا انتظار کر رہی تھی۔ مینہ زیادہ تیزی سے
لگا۔ بارش کے قطروں اور میرے آنسوؤں نے میرا چہرہ بھگو دیا تھا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ اللہ اللہ کہتے ہوئے میں چہرے پر اوٹ کر کے ذرا پیچھے اس اجنبی نے مجھے اللہ اللہ کہتے سن لیا۔ اُنہوں میں بڑے ہمدردی کے ساتھ دریافت کیا۔ کیا آپ کا کوئی اس ہسپتال میں ہے؟

میں نے جھجک کر اس کی صورت پر نظر ڈالی گورا چٹا، لمبا تھکا۔ پجانی یا پٹھان۔ خاصا خوش شکل برساتی ہے۔ وہ بھی اسی کوچ کا منتظر تھا۔ اس کے درد مند لہجے کے یہ دو بول سن کر میں جو اس وقت اس لمحے اس اتنی دنیا میں خود کو بالکل تنہا اور بے سہارا اور بے یار و مددگار محسوس کر رہی تھی مجھے ایسا لگا جیسے تاریک طوفانی کی لہروں پر ایک روشن محفوظ ٹوکا اچانک نمودار ہو گئی۔ میں نے مومنیت کے ساتھ اُسے جواب دیا۔ میری ہسپتال میں ہے۔ اچھی ہے۔ اگلے ہفتے اُسے ڈسچارج کر دیں گے۔

تو پھر میں اس بڑی طرح بلک بلک کر رڈ کیوں رہی تھی۔ اس نے وجہ نہ پوچھی۔ روشن کوچ سلیٹی رول میں سے نمودار ہوئی۔ وہ میرے ساتھ ہی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ راستے میں اس نے بتایا بیڈ فڈ سے آکر یہاں پہنچ کر اس کی کار خراب ہو گئی۔ اُسے ایک گیراج میں چھوڑا اب بس پکڑ کر شہر جا رہا ہے۔ آبائی وطن۔ یہاں ملا ہو رہے آیا ہے۔ بزنس کرتا ہے۔ باتوں سے اعلیٰ تعلیم یافتہ معلوم ہوتا تھا۔ کہنے لگا آپ ہیں۔ مگر اردو اتنی صاف کیسے بولتی ہیں اور وہ بھی پجانی لہجے میں۔ میں نے بتایا میں برسوں سے لندن کی ایک لارمنٹ فیکٹری میں مزدوری کر رہی ہوں جہاں میری ساتھ دایاں سب پجانی عورتیں ہیں۔ جی ہاں۔ میں ہوں لیکن ہول سیل قمیض سیتی ہوں۔ ناکام ڈانسر۔

ڈیر گڈ لک ڈائری۔ آج شام میں اور مقبول دیر تک ہیمپٹن کورٹ کے باغات میں ٹہلتے رہے۔ اٹھا غریب بارنز میں ایک قیمت بڑا مکان خریدنے والا ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا۔ مگر کواشارہ کافی ہے۔

مقبول کہتا ہے میں فیکٹری میں مزدوری کرنا چھوڑ دوں اور اس کی فرم میں کام کروں۔ چار گنی زیادہ تنخواہ لے کیوں دل گوارا نہیں کرتا۔ میں اس کی احسان مند نہیں ہونا چاہتی۔ ابھی وہ میری بہت عزت کرتا ہے بہت دے ملتا ہے۔ پھر میں اس کی طرز میں جاؤں گی اور وہ میرا آگے۔ نہیں۔ یہ بات غلط ہوگی۔ جہنا اللہ؟

اُتو مجھے صراطِ مستقیم پر چلائے جائیو۔ آمین۔

جب شہزاد چھوٹی سی تھی۔ میں اور حیرلہ جیلسی کی ایک میوزیم رہتے تھے۔ ٹیلی ویژن پر ایک دیکھا تھا۔ AUTUMN CROCUS ایک غریب اسکول بچہ جس کی زندگی میں کوئی رنگ اسپنسر کم مایہ۔ وہ پیسہ جوڑ کر تھقی گزارنے سوئٹرز لینڈ جاتی ہے۔ وہاں سے ایک بڑا دایرہ سا شے ملتا ہے۔ نہایت اداس۔ ہلکا پھلکا غناک سار داس۔ چھٹیاں ختم ہوتی ہیں۔ وہ آدمی اپنے ملک چلا ہے۔ اسکول بچہ اپنی اجاڑ زندگی میں واپس انگلستان آ جاتی ہے۔

بڑھیا مسز بلونٹ نے آج تک مجھے اپنے گھر نہیں بلایا۔ حرامزادی۔ شہزادہ لہو لہو ہے بہت خوبصورت درمزرہ مکان ہے۔ بہت بڑا باغ۔ بڑھیا اپنی جوانی میں وندہ میں بھی ناچ چکی ہے۔ بہت دولت مند ہے۔ شیری اسی مٹے اس کی خوشامیں لگی رہتی ہے۔ اور کوئی رشتہ دار نہیں۔ بڑھیا اپنے اکلوتے لڑکے حیرلہ گھٹاک کر چکی ہے۔ شہزاد نے آج تک مجھے کوئی معمولی سا تحفہ خرید کر نہیں دیا۔ ہاں پھلی کر مس پر ایک ہینڈ بیگ لے آئی تھی۔ سال میں ایک دوبار مجھ سے مل لیتے۔ خیر۔ خدائے خوش رکھے۔ آبا بھگے قاق کر چکے ہیں۔ دوسرے رشتہ داروں نے مجھے بھلا دیا۔ شاید وہ میرا ذکر بھی کرتے ہوں گے تو اس طرح کہ چل پائے گوری کے مولویوں کے خاندان کی لڑکی اور آوارہ نکل خاندان کی ناک کشادی۔ خیر میرا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ میرے ہم وطن جب کبھی یہاں ملتے ہیں خصوصاً دھاکے والے بڑے جوش سے کہتے ہیں۔ کراچی آجائے۔ آپ کے لئے حکومت ڈانس ایکڑ می بنا رہے گی۔ جہ نے اس کے لئے خط و کتابت شروع کی۔ وہاں سے کوئی جواب ہی نہ آیا۔ میں بہت کمزور، بہت غمناک، معمولی ہستی ہوں۔ کون میری سنے گا۔ وہ تو بالکل شروع شروع کی بات تھی۔ ایک بنگالی منسٹر کوخو کرنا تھا جس کی سفارش پر حکومت نے میرے فارن ٹور کا بند دہست کر دیا تھا۔ اس کے بعد میں ٹا۔ ڈیر ڈاکری۔ دنیا بہت ہی ذلیل کمینی جگہ ہے۔ منسٹر ریحان الدین احمد کا رعیت دیکھا؟

فیکٹری میں میرے ساتھ کی دو بچیاں لڑکیاں بہت اچھی سنگرز ہیں ان میں سے ایک نے مجھے نو

مرنے نے مینوں ہشک نہ ملاں
مینوں مرن دا شوق مٹا دن دے
کجری بیناں میری عورت د گھنڈی
مینوں بچ کے یارہ مٹاواں دے

لڑچی میں بندر روڈ کے جنگلات کے اونچے فٹیٹوں کے نیچے رات کے وقت ایک اندھا فقیر سر پر گول ٹوپی۔
نا انگلی تھامے آنکلتا۔ اور منہ اٹھا کر چلتا۔ اے گم کے ارد۔ خدا تمہارا گم دھند کرے۔ اور وہ فحش
یا دلہن دز آواز میں گانے گاتا۔ دھنسی حال کی جب ہمیں اپنی خبر۔ رہے دیکھتے اوروں کے غیب و ہنر
یوں پہ جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا۔

۱۳۔ جولائی ۱۹۶۷ء ۲۱ رجب اشانی ۱۳۸۶ھ ۱۵ سادون ۲۰۲۲ء

۱۳۷۵

لک ڈائری۔ اس برس کے بھی سات مہینے نکل گئے۔ اور ابک اکیلا تنہا انسان اور اتنے سارے
سا گھرا ہوا ہے۔ کیوں؟ مسیحی۔ اسلامی۔ جنگالی۔ بکری۔ اور شاید ایرانیوں کا ایک اور کینڈر
اس ڈائری کے چھاپنے والوں نے ایرانی کینڈر بھی کیوں نہ شامل کر دیا۔ ذرا وقت کا کنفیوژن

ی رے۔ اور رنگین کشتی والے طارج۔ کشتی موٹ لے۔ اس گھاٹ سے لگادے۔ یہ ندی کرتاک
گی۔ اس ناؤ کو کب تک کھینا ہے۔ کس دھن میں شام سویرے کس دھن میں چلا جاتا ہے۔ تیرے
بھیے ہیں۔ بھائی مانجھی۔ کیا اس دہکا کا کوئی انت نہیں۔ اس کا کوئی سر نہیں اوانجھی رے۔

مانجھی مے بھائی۔ اب ہاتھ تھک گئے۔ کشتی کھینے کی اب سکت نہیں میں نے دہکا لے خال

ممت بھی چپوہ چلائے۔ پر اب ہمت نہیں۔ ادا نہیں رہے۔

یہ سارے بھٹیالی گیت بار بار یاد آتے ہیں میرے دکھی مظلوم خوبصورت دلیس کے ملاو
لدوز گیت۔ کیا میں کبھی واپس جاسکوں گی؟

آج میں نے دیپالی کو خط لکھا۔

ردزی۔ اپنے میاں اور چاروں بچوں کے ساتھ مغرب کی سیاحت پر نکلی ہے۔ کیا
میں نے اسے نہیں بتایا کہاں رہتی ہوں۔ کیا کرتی ہوں۔ شام کو ان کے ساتھ جاکر پکڑی میں کھانا
کھا رہا ہوں۔ دنوں کا ذکر نکلا جب ردزی اور دیپالی انڈر گروونڈ الفٹلابی درکرز تھیں۔ ردزی
ساتھ ان کے ہندوستانی میزبان کے لڑکے لڑکیاں بھی تھے۔ میں نے ذکر کیا اسکول میں ہم دو
تھی کرپتی تھیں۔ کلیناٹ اور کنکے بڑا کی طرح کی ہیروئن بنیں تو ردزی کے میزبان کی لڑکی نے
یہ لوگ آپ کے زمانے کی فلم اسٹار تھیں؟

”کافکا کہتا ہے کہ بعض الفاظ کا مطلب محض اپنے زخموں کے ذریعے ہی سمجھ میں آتا۔
نے بھی ایسا ہی بولا۔“

”اوہ گوڈ کیپ کو اسٹیا سمین یو آر کریزی۔ ڈونٹ ڈسٹرب می۔ میں اپنی کپنی کے کاغذ
”جھن جھن جھن۔“ اچھا۔ سنو۔ ایک پولش رائٹر نے کہا۔
”ہیں۔ تم نے پھر ناچ شروع کر دیا۔ ڈاکٹر نے تم کو منع کیا ہے۔“
”میںوں چم کے یار منا دل دے۔“
”خو رگوڈز میک۔ گھنگر و اتارو۔ ڈاکٹر کا حکم مانو۔“

منو پولش رائٹر نے کہا ہے۔ انسان کی روح جو رسات تالوں میں بند ہے اس میں
گیشہ۔۔۔ بتاؤں۔۔۔ سن رہے ہو۔۔۔“

”بکو۔“

”ایک پوشیدہ گوشہ ہے جس کو صرف مصائب کی کنجی ہی کھول سکتی ہے۔ اور اس کنجی میں
ت اور افضل ترین نعم اور ادراک چھپا ہوا ہے۔ اور مقبول ایک جگہ میں نے لکھا دیکھا ہے کہ جب
بھٹی میں نے خدا کو دیکھا۔“

”اور بکو۔“

”اور جب ہم اپنی مسرت کے باہر میں سوچتے ہیں اس وقت ہمارا تخیل بچے کے تخیل کی طرح
ور معصوم ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہ ہم حسن در بچے میں کھڑے ہوتے اس کے سامنے کا منظر تائی
ہوتا۔“

”اور شیکور ایسا بول گیا ہے کہ یاد مندر کی وہ بچان ہے جو حال کو مار کر اس کا دل مردہ ماضی کے سامنے
رہی ہے۔“

”اور کیا کیا بول گیا ہے، تمہارے شیکور نے ناگ میں دم کر رکھا ہے۔“
”چھن چھن چھن۔“

جو بیرادے سو ہی پہنوں

جو دے سو ہی کھاؤں۔

جہاں بھادے تال ہی بیٹھوں۔

سے یو لومی۔ میں نے التجا کی۔

”آئی لویو“ اس نے جواب دیا۔

مقبول اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گھڑی دیکھی اور کہا اسے ضروری کام سے جا ملے۔ خدا حافظ
باہر گیا کار میں بیٹھا اور چلا گیا۔ مقبول ایک سیلف میڈ جید و متمدد کاروباری ہے اور عوام سیلف
امیاب لوگ خود غرض ایگو سنٹرک اور خود پسند اور مغرور ہوتے ہیں۔ وہ بھی ایگو سنٹرک، خود پسند اور مغرور
مگر بہت سی چیزوں میں اصول پرست اور راست باز۔

وہ اپنی ایک کتاب میرے کمرے میں بھول گیا تھا۔ میں نے کتاب اٹھائی کہ سنبھال کر رکھ دوں جب دوبارہ
دے دوں گی۔ کتاب میں سے ایک کٹھا خط سرک کر نیچے گر گیا۔ فنا نہ کچی اردو تحریر۔

ڈیر سید لک ڈائری میں نے وہ خط پڑھا:

میرے پیارے خاندان عالی جناب خان مقبول احمد خان صاحب۔ کینز دست بستہ آداب بجا
ہے اور عرض کرتی ہے کہ واضح ہو کہ نیا ڈرموہول ہوا۔ میں خیریت سے ہوں۔ بچے بھی خیریت سے
اور آپ کو یاد کرتے ہیں گے۔ دیگر یہ کہ آپ کو ولایت گئے بہت برس ہو گئے۔ اب اگر اپنی پیاری
دکھا جائے یا ہم لوگوں کو وہاں جلد از جلد کر کے بلا لیجئے۔ اپنی ہیلتھ کا خیال رکھیں۔ مکرمہ ساس صاحبہ
مکرمہ سسر صاحب آپ کو ماکھواتے ہیں۔ پیاری شہزادہ خاتون سلام عرض کرتی ہے۔ باقی ہر دم آپ
کرنے والی

آپ کی

ناجیز زوجہ میمونہ سلطان

آج بتاریخ ۹ ستمبر بمقام لاہور دست پرست کیا۔

اصل پرست راستباز خان مقبول احمد خان صاحب۔ عالی جناب خان صاحب۔ تم بھی

۳۱ اکتوبر۔ گہری رات۔ اٹو کی آنکھ۔ بلی کی آنکھ۔ چیتے کی آنکھ۔ برہن کی آنکھ۔ خاموشی سوہی
درؤ خزاں ایک ایسی کزور بے بس عودت ہے جس کا آدمی اسے چھوڑ کر بھاگ گیا ہو۔ میمونہ سلطان خزار
ہر آتی کا جانے کس کا دلاری کا ایک بہت پرانا گھسا پٹا ریکارڈ ارجنڈ منزل میں موجود تھا۔ ا
جہاں آراء آپا اسے اکثر بجا کرتی تھیں۔ جل جانے دو۔ جل جانے دو اس دنیا کو۔ یاں کوئی کم
کایا نہیں۔

تم بھی غم مت کرو میمونہ سلطان۔ اے گم کے مارو گم مت کرو۔

ڈیر ڈائری۔ میں نے ابھی ابھی طے کیا ہے۔ کل کارمنٹ فیکٹری کے سالانہ جلسے میں خوب ناچا

WHAT THE BLOODY HELL

گی۔

ڈیر ڈائری۔ تم تو دبئی سن سرٹھ کی پرانی ڈائری ہو۔ آج میں نے اتنے برسوں بعد الماری کے نچلے خانے

ن تم کو پڑایا یا سہرا کتوبر کے بعد سارے ورق ساھے۔ کیا ہوا تھا ہمارا ٹیک۔ طویل بیماری پھر DOLE
 عینا۔ شہر زادہ موڈ لنگ کر رہی ہے کبھی دیکھنے بھی نہیں آتی۔ روزی، دیپالی کسی کو میں خط نہیں لکھتی
 یا لکھوں اپنی ساس کا سر؛ مقبول نے اچانک ملنا جیلنا چھوڑ دیا۔ ایک دائم المریض عورت کے ساتھ کو
 بدوقت خراب کہے۔ سنا ہے ایک حسین انگریز لڑکی اس کے ساتھ رہتی ہے۔

اوجھل تم گئے تو میں نے دیکھا کہ خدا کے پاؤں کے نشان فرش پر بنے تھے۔ جیگور نے کہا تھا۔ ہا ہا
 یر فنی۔

BUT WHEN THE NIGHT IS
 ON THE HILLS, AND THE
 GREAT VOICES
 ROLL IN FROM THE SEA,
 BY STARLIGHT AND BY
 CANDLELIGHT HE COMES
 BACK TO ME

دھت۔

نادر دام تانا دی رے نا۔ نادر دام تانا دی رے نا۔
 شیرازی کا باب جیرلڈ بلونٹ ایک GAY LIB رسالے کا اسٹنٹ اڈیٹر ہو گیا ہے۔ سنا
 ہے اب ایک جرمن بڑا اس کے ساتھ رہتا ہے۔ زندگی بڑی ڈرائی چیز ہے۔ بھیانک۔

ڈیر گڈ لک ڈائری۔ آج صبح برسوں بعد مقبول نے فون کیا۔ بڑی درد مندی سے کہا اگر مجھے ملازمت
 کی ضرورت ہو۔ سمیرگ میں اپنی برانچ میں ہکا بھلا کارپسیشنٹ کا کام دیدے گا۔ جس میں مجھے محنت کرنی پڑے
 میں نے یہ پیشکش قبول کرنے سے انکار کیا۔

ڈیر بیڈ لک ڈائری۔ آج میں خود مقبول کے دفتر گئی تھی۔ رقت مغز و رانوں کو بھکاری بنا دیتا ہے۔ میں نے

اس سے کہا مجھے وہ جرمی والی نوکری دیدے۔ بڑے اخلاق سے ملا۔ میرے متعلق خاصا متھکر نظر آتا تھا۔
 مہینے سے انشاء اللہ میں ہمہ گ میں کام شروع کر دوں گی بشہر زاد لاپتہ ہے۔ شاید امریکہ چلی گئی۔ باہر برون ہو
 کی طرح گر رہی ہے۔ پرسوں کرسمس ہے۔ میرے ساتھ کرسمس منانے والا کون ہے۔ چچا سارتر نے سچ کہا
 ہے۔ جہنم دوسرے لوگ ہیں HELL IS OTHER PEOPLE

کرشن چتر دشی میں — اندھیری رات میں ایک بار میں دیپالی کے ساتھ پد پاری تھی۔ وہاں دیپالی
 نے ہم سب کے نام کے چراغ جلا کر تپوں کی کشتیاں بنا کر ان میں رکھے تھے اور ان کو پانی میں چھوڑ دیا تھا۔ وہ
 چراغ پانی پر بہتے کچھ دور جا کر گھب اندھیرے میں کھو گئے تھے۔

ریحان الدین احمد رسنا ہے۔ کلکتہ سے ڈھاکے واپس چلے گئے۔ انڈیا میں داں زیادہ نہیں لگی۔
 اب واپس ڈھاکہ میں بھی منسٹر نہ ہو جائیں تو میرا نام بدل دینا۔ لوگ پرسنٹی پیج کی بات کرتے ہیں۔

”اور میں تو ایسی رخصت تھی کہ کتوں بلیوں بے عقل چڑیوں تک کی دلازاری نہ کرتی تھی۔ لوگوں
 نے مجھے اتنے دکھ کیوں دیئے؟“

“MUSIC IN WHERE YOU HEAR IT”

گارمنٹ فیکٹری میں میری سیکھ رشتی کارمنٹ کو در بڑے جذبے سے گایا کرتی تھی۔ آگ بار جو تری
 در آوے۔ وہ بھوساگر توں تر جاوے۔ مین آجاء شاشن والیا۔
 جانے وہ ہے بھی کہ نہیں۔ اب ذرا ذرا شبہ ہو چلا ہے

“LOVE IS THE STATE

OF TOTAL SECURITY

NON-LOVE IS THE

STATE OF TOTAL ABSENCE”

ڈیر گڈلک ڈائری۔ کل مقبول آیا تھا۔ بہت دیر بیٹھا۔ کہنے لگا۔ میوز سلطان پیدائشی IMBEC ہے چچا کی لڑکی تھی اس لئے نو عمری میں اس سے شادی کر دی گئی تھی۔ اسی وجہ سے اس کے ساتھ کبھی زیادہ نہیں رہا۔ اب تک وہ اپنی بزنس پھیلانے میں مصروف تھا۔ اسلام میں چار نہیں۔ کیا میں؟

”ہاں“ میں نے جواب دیا۔

”میں جلد سب معاملات طے کرتا ہوں“

”وہ بارنڈوالا مکان۔۔۔۔۔؟“

”اس سے زیادہ بڑا اور زیادہ شاندار گروہ فرا سکوار میں۔“

اس کے بعد سے وہ پھر غائب ہے۔۔۔۔۔ اوما نچی رہے۔ افسوس کہ یہ نافر بھی۔

میمبرگ برانچ کانپور بنجانی ہے۔ جب سے بنگلہ دلش وار چھڑی ہے کچھ طعنے دیتا رہتا ہے۔ میں چپ ہوں۔ جواب دے کر کہاں جاؤں گی۔ زمانہ انسان کو بزدل اور صفت پسند بھی بنا دیتا ہے۔ کل معلوم ہوا بول کی بہن ہینوئی اور دو بھائی سب کے سب دوسرے ”بہادریوہا“ کے ساتھ چٹا گانگ میں مارے گئے تھے۔ مقبول کا صدمے کی وجہ سے فردوس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے مجھے اپنے گھر والوں کی خیریت معلوم ہیں۔ اس کالی آندھی میں کس سے معلوم کرواؤں۔ آج صبح یہاں کے سابق مشرقی پاکستانی حال بنگلہ شیوں کا ایک گروہ میرے پاس آیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں فوراً اس دفتر میں کام کرنا موڑ دوں۔ کیونکہ مقبول پاکستانی ہے۔ میں نے کہا پہلے ہم ہندوؤں کے خلاف تھے۔ اس لیے پاکستان آیا۔ کیا مقبول مسلمان نہیں ہے؟ مگر وہ پاکستانی ہے۔ اور اگر میں یہاں کام کروں تو غدار۔ پھر جاؤں۔ دوسری ملازمت مجھے آسانی سے نہیں ملے گی۔ میرے پاس کوئی اکیڈمک کوئی فیکشن نہ ہے۔ میں نے محض رقص میں مہارت حاصل کی تھی۔ میرے ہم وطن بڑھکر کر چلے گئے۔

آج صبح بنجانی میمبر نے مجھے خود ہی فونٹس دیدیا۔ میں نے مقبول کو ٹرنک کال کیا۔ وہ کراچی گیا ہوا۔ اب میں پھر ڈول پر جاتی ہوں۔

ہندو بنگالیوں کے ہاں کالی اور مہادیو کا تصور لرزہ خیز ہے۔ تخریب سستی۔ قہر۔ بلا۔
 سینکڑوں صکار خون۔ قیامت۔ دیہالی گی بھو بھی بھوتارنی دیہی چندر گنج میں بڑی عقیدت سے
 جھوم کر ایک ہندی کیرتن گاتی تھیں۔

اگر دم بگرو دم بابے ڈمرو۔ ناچے سدا شو جلت گردو

برہما ناچے دشو ناچے ناچے ہادیو

کھپڑے کے کالی ناچے ناچے چاروں دیو

کھپڑے کے کالی ناچے۔ کھپڑے کے کالی ناچے۔

نذر الاسلام کو کالی کے اس تصور نے کتنا فینسی نیٹ کیا تھا۔ کھپڑے کے

آتش نواز نذر کا بنگال اس وقت آگ اور خون میں ڈوب گیا۔ یہ جملہ بھی ڈیر ڈاری ایک کلا

ن چکا ہے۔ اور کلیشے میں تبدیل ہو کر الفاظ اپنی معنویت اور اہمیت کھود دیتے ہیں۔

چار سال گذر گئے۔ چار سال سے میں منتظر ہوں۔ شاید ایک دفعہ مقبول کے دل میں پھر شکی آجائے۔

دروہ یاد کر لے۔ لیکن اب ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ وہ خود گرد و نزا سکواڑ میں منتقل ہو چکا ہے۔ میں یہاں آ

نک میں شہرہ شہزادی ترین نوکریاں کرتی پھر رہی ہوں۔ مزدور طبقہ کے ترکوں اور ایشیائیوں کی بھڑ میں شا

ہم وطن اعلیٰ مرتبت بنگلہ دیشی یہاں ملتے ہیں کئی کترا کے نکل جاتے ہیں کہ شاید میں ان سے امداد کے لئے کہو

نیاہہ ترمی جنریشن والے تو مجھے پہچانتے ہی نہیں۔ انہوں نے میرا نام تک نہیں سنا۔ پرانی نسلی والوں کے

میں اب ایک EMBARRASSANT ہوں۔ چند ایک نے مجھے سڑن مشہور کر دیا ہے۔ کیا واقعہ

میرا اگر ایک آپ ہوتا جا رہا ہے، برتن دھو چکنے کے بعد رات گئے تک، جب تک ریسٹوران خالی نہیں ہو

ایک کونے میں تنہا بیٹھی مڑک کو تکتی، لگا تا سگریٹ پتی مغربی پوشاک میں ملبوس سائولی عورت۔ خالص

انتظار۔ کچھ نہ ہونے کا انتظار۔ کیا مقبول اب بھی سامنے مڑک کے دھندلے میں سے نمودار ہو سکتا ہے؟

ناممکن۔ اب یہ کیسے ممکن ہے۔

اسی طرح میں ایک روز ایک گوشہ میں بیٹھی سیاہ قہوہ پی رہی تھی۔ ایک خوفناک بوڑھے گلف

عرب نے دور سے مجھے نوٹوں کی گڈی دکھائی۔ اس رات سے میں نے طعام خانے میں بیٹھ کر مڑک کو بگڑ

رات آیتے میں مجھے اپنا عکس نظر نہیں آیا۔

گل میں فرینک فرٹ جا رہی ہوں۔

فرینک فرٹ۔ ۳۰ جنوری۔ آج میں نے بنگلہ میں ایک ایسا سیاہ پوش FUGUE لکھا ہے کہ ارتقا
 ہم دیکھ لے تو چلو بھریانی۔ INDIAN MODE PURAVI - SAD EVENING MEL^{ODY}۔
 OVERTUR۔ وہ دیکھو دریا سے کہہ اٹھا۔ غبار تاروں کا اڑ رہا ہے۔
 BAS۔ اکھنڈ رول کے دھند لکوں میں الم کے غنی پکار تے ہیں کہ وقت نے صرف غم دیا ہے کہ وقت
 نے صرف۔ وقت نے۔

POIN۔ ہمیں یقین تھا کہ روز فردا کرن کرن دل میں آجے گا۔ کیا کرے گا جہاں کو روشن۔
 COANTERPO۔ الم کے ساتھی سیاہ کپڑوں میں، بیدلی کے غم اٹھائے یوں نوحہ زن ہیں یہ وقت
 ب و بلا ہے آؤ۔ جھکاؤ سر، آنسوؤں کے دریا بہاؤ یہ وادی غم ہے۔
 BAS۔ جنازے والیں گھر والی کو آئے۔ جنازے والیں جنازے والیں

بکواس۔ مور بڑ بکواس۔ اد۔ کے۔ میں MODE بسنت میں موسم بہار کا سیلے کر لو گراف کرتی ہوں
 سخت کر رہی سخت کر رہی اسی طرح زندہ رہنا ممکن۔
 یہ جتنے لوگ سامنے ہم بولتے اسے اس پر اس وقت چل رہے ہیں، یہ دراصل کسی قبرستان، کسی
 یوریم کی سمت قدم بڑھتا رہے ہیں۔ جتنے لوگ زندہ ہیں سب POTENTIAL لاشیں ہیں۔ میرے

اس میٹے ہاؤس میں جتنے لوگ مقیم ہیں سب فانی۔

۲۴ جنوری۔ فرینک فرٹ میں کام نہیں بنا۔ واپس ٹیمپرگ۔

اب دریا اور سمندر برف سے ملتے ہیں۔

اللہ۔ میں ترے اسرار سمجھنے سے انکار کرتی ہوں میں تیرے قبر اور ترے جلال اور تیرے غضب۔ آگے ایک ذلیل کتیا کی طرح لرزاں ہوں۔ سزائے موت کے قیدی کے مانند جو جلاد کی دستک کا منتظر ہو خداوند میں تیرے سامنے حاضر ہوں۔

میرادل۔ جو کالی کا مندر رہے جس میں خلقت اٹاٹوٹ گھسی ہوئی ہے۔ جس کے تنگ صحن بجزری کے پتوں کا سر کھڑی سے جدا کیا گیا ہے۔ کالی کی تن سُرُخ آنکھیں سامنے دیکھ رہی ہیں جدھر جہنم ہے۔ کالی کی صورتی کلکتہ کی کالی ساڑی میں سوتلے سوسال سے زمین میں آدمی دھنسی ہوئی ہے۔ آدمی دفن ہے۔ عورت کی طرح جو ہمیشہ آدمی دفن رہتی ہے۔ اور کالی کے مندر کے فرش پر کتوں کے پتے لڑھکتے پھر رہے ہیں۔ عورتیں بچروں کا سُرُخ سُرُخ گوشت کاٹ رہی ہیں۔ میرادل سونا گاچی کی تاریک گلی ہے جس میں میرا آرزو میں میری پشمانیاں میری حیرتیں پاندڑے لمبی پتی ہستی ساڑیوں میں، کونوں کھدروں میں، غلیظ دیوای سے لگی کھڑی ہیں اور آنے والوں کو تک رہی ہیں۔ ہر آرزو یہ سوچتی ہے۔ اب کا آنے والا کتنی لائے گا۔ اس گلی سے نکال لے جائے گا۔

اب سامنے دروازے مقفل ہیں۔

گلی تو چاروں طرف سے بند ہوئی۔ میں ہری من کیسے جاؤں۔

جب فون کی گھنٹی بجتی ہے دل لرزتا ہے۔ شاید مقبول نے فون کیا ہو۔ شاید شہر زاد نے فون کیا ہو۔ اس لمحے سے میری عقوبتوں میں اضافہ ہوگا۔ میرا ان دیکھا عقوبت رسان مجھے مرتے دم تک کوڑا مارتا رہے گا۔ خداوند اتو جو رحیم و کریم ہے تو نے مجھے اس لئے پیدا کیا کہ میں اس طرح زندہ رہوں۔ اور بہانے کس طرح مروں گی۔ میری زندگی میں او خدا نے ذوالجلال کو خوب جانتا ہے کہ بیشتر وقت ایسے اُسے ہیں جب میں نے کہا ہے یہ میری زندگی کا بدترین خوفناک ترین لمحہ ہے۔ اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ ابھی بھی اس سے کہیں زیادہ بُرے وقت آنے باقی ہیں۔ میرا خدا میرے دشمنوں کے سامنے میرا سر جھکا لیا۔ ڈیر بیڈلک ڈائری۔ میرا کریک آپ ہوتا جا رہا ہے۔ کیا مجھے پرسیکیوشن کو میڈیکس ہو گیا ہے

مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں —
 اوما بھی رے۔ اپنی بتوار الگ رکھ دو۔ تمہاری ناؤ ٹوٹ چکی۔ جانے کا وقت آگیا۔

”آخری نقطہ نظر کے آگے اور کوئی منظر نہیں ہے۔“

دوسرا پارٹ ایک۔ میں نے ریحان الدین احمد کی بہن راجہ آپا کو ان کے ڈھاکے کے پرانے پتے پر خط لکھا ہے۔ کہ اگر میں یہاں سرچاؤں تو میری غائبانہ نماز جنازہ ڈھاکے کی کسی مسجد میں ادا کروادیں۔ کیا یہاں سب بد باطن ہیں بھرتی ہری نے لکھا تھا معصوم انسانوں کے لئے ہر جگہ بد باطن انسان موجود ہیں۔ سانپ کی طرح ایک آدمی کا کان چاٹنے کے لئے دوسرے کو ختم کر دیتا ہے۔ برے انسان بستی سے بلندی کی طرف ترقی کرتے ہیں، جس طرح شقائق پانی سانپ کے منہ میں پیچ کر زہر بن جاتا ہے۔ اسی طرح معصوم آدمی کے الفاظ پر معاش کے منہ میں پیچ کر زہر بن جاتے ہیں۔ میں بد معاشوں کے نشتر کو ضبط کر کے ہنسا ہوں۔ کب تک؟ کب تک بھرتی ہری؟

کہیں میں نے یہ بھی پڑھا کہ دنیا THERMODYNAMICS کے دوسرے اصول پر عمل کر رہی ہے۔ کنفیوژن بڑھ رہا ہے۔ نظام عالم ختم ہو رہا ہے۔ دنیا اسی طرح بہت جلد نیست و نابود ہو جائے گی۔ مہاج سرد پڑ جائے گا۔ مذہب کہتا ہے قیامت آئے گی۔ شاعر کہتا ہے۔ نہیں سب کچھ باقی رہے گا۔ انسانیت زندہ رہے گی۔ اللہ جانے۔

میں بہت وقار سے مرنا چاہتی ہوں۔

دکھ سکھ۔ جنون اور صبحِ الدماغی۔ محبت اور نفرت۔ جنگ اور امن۔ غربت اور امارت۔ شکست اور فتح۔ خرافات اور رذالت۔ گناہ اور معصومیت۔ زندگی اور موت۔ سب میں فقط بال برابر کافرق ہے۔ بل کی بل میں انسان ادھر سے ادھر ہو سکتا ہے۔

ڈرگڈلک ڈائری۔ کل رات میری بیٹی شہر زاد کی شکاگو سے ٹرنک کال آئی میں گھر پر نہ تھی۔ آج

دہ پھر فزون کرے گی۔ بہت دنوں بعد اس کی آواز سنوئی گئی۔ میں بے انتہا مسرور

(نامم)

۳۹

شہر زاد کرستینا بلمونٹ

ہمبرگ - ۱۶ جون

ڈیر مسز سین۔ آپ مجھے نہیں جانتیں لیکن میں نے اپنی ممتی سے آپ کا ذکر بہت
مستنا ہے۔ آپ کو شاید اخباروں سے معلوم ہوا ہو۔ میری والدہ مادام یاسمین بلمونٹ ایک حادثے کا
شکار ہو گئیں۔ ایلب کے کنارے جاری تھیں پاؤں پھسل گیا۔ میرا ذاتی خیال ہے وہ خود دریا کے
اندھ چلی گئیں۔ میں آپ سے واقف نہیں۔ ممتی سے خاصی واقف تھی۔ میرا ذاتی خیال ہے آپ جنگو۔ گانڈو
مروجنی نائیڈو۔ ہنر و غیرہ کے پرستار لوگ خاصے کنفیوژڈ اور بھولے تھے۔ آپ لوگ اب COPE
نہیں کر سکتے۔ COPE تو میں بھی نہیں کر رہی ہوں لیکن مجھے کوئی دعوے نہیں ہیں۔ آپ لوگوں کو (ممتی
سمیت) بہت دعوے تھے۔ میں جانتی ہوں میں ایک تیرتا ہوا تنکا، ہوا میں اڑتا تو پائر یا جیونی یا کچھ
کی طرح بے بضاعت جاندار ہوں۔ زمانہ درمکان میں میری کوئی حیثیت نہیں۔ حیات انسانی بالکل مہمل اور
لا یعنی ہے۔ یقیناً آپ کہیں گئی میرے منفی یا روحانی خیالات مغربی یورپین ڈیکسٹنس کا نتیجہ ہیں۔ یوں ہی سہی۔
آپ لوگوں کے مثبت، صحت مند، اعلیٰ روحانی خیالات کا کیا نتیجہ نکلا۔ بات یہ ہے مسز سین کہ میں چوبیس سال کی
عمر میں آپ سے اذرا پٹی بے چاری رو مینٹک غمزہ آئیڈلیٹ دکھی ممتی سے کہیں زیادہ ہوشمند، تجربہ کار بلکہ
خبردار ہوں۔ دنیا کا کوئی تجربہ بوجھے۔۔۔ ذہنی۔ روحانی جسمانی۔ وہ میں کر چکی ہوں کسی صومالی، گرو، سرکٹ
یا ذکر کچھ میں وہاں جا چکی ہوں۔ کسی خطرناک سے خطرناک منشیات کا نام لیجئے۔ خاکسار اس سے بہرہ ور ہو چکی
ہے۔ اخلاقیات کا آپ لوگوں کا نسخہ سیکارنا بت ہوا۔ ممتی کے ساتھ ٹریڈی یہ ہوتی گردہ در رہے کی تہذیب سے
نی گئیں۔ بحال، مسلمان، پاکستانی ہوتے ہوئے انہوں نے مغربی رو دیتے اپنا ناچا ہے۔ اندرونی روحانی تصادم
نہید تھا۔ اسی کی تاب نہ لاسکیں اور ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ اب میں آپ کو اصل وجہ بتاتی ہوں وہ کیوں مریں۔

پچھلے بیس بائیس سال سے مغرب میں کافی تنگی ترشی سے گزر کر رہی تھیں۔ مختلف کارخانوں میں مزدوری۔ قص کا انٹرمنشل کیریئر سنانے میں ناکام رہیں۔ کیونکہ ڈاکٹر کی عمر دس سال سے زیادہ نہیں ہوتی۔ صاحب اور ایو بیسوں نے مٹی کو قبل از وقت کمزور اور بوڑھا کر دیا۔ دل کا عارضہ لگ گیا لیکن اوہ اس وجہ سے مرے کہ کچیلے دنوں میں نے ان کو شکاگو سے فون پر مطلع کیا کہ میری تصویر وائے کے سنٹر اسپرڈ پر چھپنے والی ہے میرے لئے یہ بڑے فخر کی بات تھی۔ بہت کم لڑکیاں خوش نصیب ہیں جن کو یہ اعزاز میسر ہو۔ میں نے ان کو بڑی مسرت کے ساتھ شکاگو سے یہی کہنے کے لئے ٹرنک کال کیا جواباً وہ خوب چنچیں چلائیں اور ریسورپٹ بخ دیا۔ چند روز بعد مجھے اُن مادرے کی خبر ملی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کپڑے پہننے اور اتارنے اور جسم کی اٹھائی کو آپ نے اتنی شدید اہمیت کیوں دے رکھی ہے۔ جنس کے بارے میں یہ سارے بے معنی اور لغو۔ یے میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ بہر حال میں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میں اب اچھی خاصی کامیاب لہجوں۔ اور اب تک ہر نسل اور قوم کے اتنے آدمیوں کے ساتھ سوچتی ہوں کہ ان کی گنتی مجھے یاد نہیں۔ اور مٹی بے چاری محض ایک مدد جیرلڈ ایڈرین بلونٹ سے شادی کر کے بقیہ عمر احساسِ جرم میں مبتلا رہیں کہ جس شخص سے ان کا نکاح غلط سلط پڑھا دیا گیا تھا۔ وہ تین سال اس کے ساتھ رہیں۔ میرے والد سے علیحدگی کے بعد مجھے یقین ہے مرحوم نے نہایت پاک دامن زندگی گزاری ہوگی۔ بے صرف، بے کار، بے معنی زندگی۔ کتنا اہول وقت ضائع کیا بے چاری نے۔ جوانی واپس نہیں آتی۔ انسان دنیا میں صرف ایک بار ہی آتا ہے۔

دوسرا "احساسِ جرم" مٹی کو یہ تھا کہ انہوں نے اپنی اجازت سے مجھے رومن کیتھولک بنوا۔ یہ سب میں آپ کو اس لئے لکھ رہی ہوں کہ میں پرسوں شکاگو سے یہاں آئی۔ ان کے کمرے میں ان کے نے سے ایک ڈائری برآمد ہوئی کئی سال پرانی ڈائری ہے جس میں وہ وقتاً فوقتاً لکھتی رہی تھیں۔ سبک۔ کہیں کہیں انگریزی۔ اس میں آپ کا نام اور پتہ بھی درج ہے۔ نہ مجھے بنگلہ آتی ہے نہ اردو۔ کی پرانی دوست تھیں لہذا یہ بے چاری المناک ڈائری میں آپ کو بھیج رہی ہوں۔ میں امید کرتی ہوں اسے مٹی کی یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھنا پسند کریں گی۔ میں ہوں آپ کی مخلص؛

شہر زاد کرستینا بلونٹ

P.S. معلوم میرے والد کہاں ہیں۔ سنا ہے لندن میں Gay Lib تحریک کے آرگنائز

شامل ہو گئے ہیں۔ ان سے آج تک ملاقات نہیں ہوئی۔ میری داری کا انتقال ہو چکا ہے۔
یہ مقبول احمد خاں کون صاحب ہیں۔ ان کو گولی مار دینی چاہئے۔

P.P.S. آپ کی نسل کا دو غلامین اور اخلاق کے دو ہرے معیار حیرت انگیز ہیں۔ آپ لوگ

ندن آکر جوق در جوق "HAIR" اور "OH! CALCUTTA!" دیکھتے ہیں اور پھر ہر

لیاں دیتے ہیں۔ ہم نے خود کو برائی زنجیروں سے آزاد کر لیا ہے۔ شاید اس وجہ سے آپ ہم سے

لٹے ہیں۔ معاف کیجئے۔ میں یہ سب آپ کو اس لئے لکھ رہی ہوں کہ میرے بچپن میں می اکثر آپ کے

بشن مشال دے کر مجھے لیکچر ملایا کرتی تھیں۔ آپ کیسی بڑی انقلابی تھیں۔ جان پر کھیل کر حصول

ادی کی جدوجہد کی۔ کتنا اعلیٰ کردار تھا آپ کا۔ اہا ہا۔ آپ کی حاصل کی ہوئی آزادی ایسی

نی کہ خود آپ ہی کو تارک الوطن ہونا پڑا۔ اور آپ کے انقلابی بلند کردار پر ورجان الدین احمد

لو بھی دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ لندن میں ملتے ہوئے کلب میں نظر آئے تھے۔ مخالف ملک کے دو منسٹر

تھے۔ سب بیٹھے ایک ساتھ شراب پی رہے تھے۔ صبح کو کانفرنس ہال میں ایک دوسرے کے خلاف

لڑے بیان دیئے۔ جن کے اثر سے دونوں ملکوں میں مزید خون خرابہ ہوا۔ معصوم غریبوں کی جائز

گیس۔ اس سے پہلے آئے تھے می نے ملنا چاہا صاف مال گئے کہ وقت نہیں ہے۔ اگر می کوئی اہم

ہستی ہوتیں دوڑ کر ملتے۔ سیک۔ سیک۔ سیک۔ یہ آپ لوگوں کے دو ہرے معیار تھے۔ مجھے

پ کی نسل نے بہت ڈزا لوتھن کیا ہے۔ مسز سین۔ اور اگر ہم لوگ آپ لوگوں سے بغاوت کر کے

DRUGS اور سوامیوں کے ریکٹ میں پناہ ڈھونڈتے ہیں تو آپ کیوں متعجب ہیں؟ آپ

نے امن کے لئے کام کیا تھا، اصل عالمی امن تو ہم چاہتے ہیں۔ مسز سین۔ اگر تو جوان لوگ

فلوور چٹلر بن گئے آپ کی بنائی ہوئی دنیا بہت بھیانک معلوم ہوئی۔ وہ اس سے علیحدہ ہو گئے۔

امید ہے آپ میری اس صاف گوئی کو معاف کریں گی۔ ادم شانتی شانتی شانتی۔

شہر زاد

۴۰ سوامی آتم آنند شنکر پرمی

روم ایر پورٹ پر ایک نوجوان سفید فام سوامی جی ترشول اور جھولا سنبھالے ساتھ ساتھ چلتے
انہیں پر سوار ہوئے۔ اور میٹ پر مسز سین کے برابر بیٹھ گئے۔ شوا ایشوا۔ انھوں نے لمبا سانس لے کر
ما۔ اور پھر مالا جیسے لگے۔ مسز سین نے تعجب سے ان کی سنجیدہ صورت کو دیکھا۔ ایسا نو عمر لڑکا اور
بکرانا نہیں جانتا۔

مسز سین نے دوبارہ اس کی شکل پر نظر ڈالی۔ ذرا مانوس معلوم ہوئی۔ مسز سین کو اپنی طرف
رد بکھتا پا کر سوامی جی نے جھولے سے اپنا تبلیغی لٹریچر نکال کر ذرا دہشتی سے اُن کی گود میں سرکا دیا۔

”معاف کرنا بیٹے تمہارا کیا نام ہے؟“

”سوامی آتم آنند شنکر پرمی۔“ لڑکے نے نہایت متانت سے جواب دیا۔

”بہنیں بیٹے۔ اس سے پہلے کا نام؟“

”مجھے پہلے کا نام یاد نہیں۔ میں اپنی پہلی زندگی بھول چکا ہوں۔“

”او۔ آئی سی۔ انھوں نے گورے چھوڑ کر کوئی نظر بھر کے دیکھا۔ یہ شکل کس کی تھی۔ کس کی تھی

س بار لو۔ آئی سی ایس۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ڈھاکہ۔ شاید وہ ہو۔ مسز سین خاموش رہیں۔

توقف کے بعد انھوں نے گھڑی دیکھی اور بولیں۔ ”ہم لوگ کتنی جلدی ایسٹھنر پنچ جائیں گے۔ سائینس

رتی کمال ہے۔“

”سائینس۔؟ پراجین کال میں ویمن اڑتے تھے۔ اور مہا بھارت کے نالے میں ٹیلی ویژن

دھو گیا تھا۔ انگریز ہندوؤں کی قدیم کتابیں چرا کر لے گئے اور ان کی بنیاد پر اتنی ترقی کر لی اسے کہ کچھ روپی

ہیں چاند پر پہنچ گئے۔ یہ جھوٹ ہے۔ چاند پر کوئی نہیں پہنچ سکتا۔“ سوامی جی نے کہا۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“

”ایٹھنر۔ وہاں آئسٹم قائم کروں گا۔ پھر انڈیا۔ ہر دو اور۔ نارڈ شوا کا شہر۔“

”اٹھیا جا رہے ہو تو قحط زندگان میں کام کرو۔ آج کل وہاں خشک سالی ہے۔“

”قحط زندہ لوگوں کو چاہئے کہ زمین گوڈی پو جا کریں۔ تاکہ وہ پانی برسائے۔ ہر ہر مہاراجا۔“

”تم کو چاہئے بیٹے کہ تم رام کرشنا مشن والوں کی طرح خدمت خلق کرو۔ ہندوستان میں بڑی

غربت ہے۔“

”غریب لوگ ہمارے شکر پریم فاؤنڈیشن کے قائم کئے ہوئے مندروں میں آکر پرستاد رکھا سکتے ہیں۔ لڑکے نے جواب دیا۔

”دیکھو بیٹے۔ میں بھی شکتی۔ ہمارا کالی کی پیارن ہوں شاید شکر بھگوان کی مرضی تھی کہ تم

مجھے اس طرح ملو۔ اس لئے میری بات دھیان سے سنو۔ شاید میں تمہارے والد سے واقف ہوں۔ کیا تم انڈی سول سروس کے مسٹر چارلس بارلو کے لڑکے ہو؟

گودا سنیاسی چونک پڑا۔ پھر اس نے زیادہ مضبوطی سے آنکھیں میچ لیں۔ چہرہ سخت کر کے جواب دیا۔ ”او۔ کے۔ چارلس بارلو۔ لیکن میرے لئے وہ ایک اجنبی نام ہے۔ میں اُن سے دس سال سے نہیں

ملا۔ وہ میرے والد نہیں دادا ہیں۔ میں اُن کے بڑے بیٹے ٹاس بارلو کا لڑکا ہوں۔“

دقت اتنی تیزی سے گزر گیا کہ ٹھکانے کے جوان سال حاکم اعلیٰ چارلس بارلو! اور اس کی بیٹھری

طور پر حسین ہوئی والٹ کا بارلو کا پوتا اتنا بڑا ہے کہ سوامی بے چارے۔

”بیٹے اگر تم۔“

”شو۔ شو۔“ ”میں آپ کا پوچھنا چاہتی ہیں۔ آپ کو کیا دلچسپی ہے؟“ سوامی شکر پریمی نے

درستی سے کہا۔ ”میرے گریڈ پانچ چارلس بارلو آسٹریلیا میں ہیں۔ ان کی بیوی میری دادی لندین میں جرمن بیماری کا نشانہ بن گئی تھیں۔ اب تک دوبارہ جنم لے کر بھی دوبارہ مر چکی ہوں گی۔ کیا معلوم میرے والد

ٹام بارلو بھی مر چکے ہیں۔ میری پوچھ بھی کیل بارلو شاید زندہ ہیں۔ مجھے پتہ نہیں۔ میں اور میری بہن بچے تھے جب ڈیڈ اور می کی طلاق ہو گئی تھی۔ میں ایک غیر اخلاقی زندگی گزارتی ہیں۔ انہوں نے ہماری کبھی پرواہ نہیں کی۔

گریڈ پانچ چارلس بارلو نے آسٹریلیا میں دوسری شادی کر لی تھی۔ ان کا ایک لڑکا ہے۔ میرا سوتیلی چچا چرڈ۔

اس نام کا گریڈ پانچ نے اپنے مرحوم بھائی ونگ کمانڈر چرڈ بارلو کے نام پر رکھا تھا۔ جو سیکنڈ ورلڈ فائر

جرمنی پر بمباری کرتے ہوئے مارا گیا تھا۔ یہ چرڈ سنڈنی میں ٹیٹریڈ ٹیکورٹر ہے۔ اور گودا GAY۔ میری

مورہولندن میں ایک لڑکین کلب چلاتی ہے۔ میری والدہ ایک رئیس زادی ہیں۔ ایک فریج جگ لو کے ساتھ
یہ آف فرانس میں رہتی ہیں۔

شکر ہے وہ تو نارمل ہیں۔ مسز سین نے دل میں کہا۔

”مجھے اس دولت عیش و عشرت، کامیابی، گناہ آلود دنیا سے، جو ہوں کی دوسرے نفرت ہو گئی

ایا ہے۔ میں سنیاں لے چکا ہوں۔ مٹی آپ کو کہاں ملیں؟“

”تمہاری مٹی مجھے نہیں ملیں۔ میں پورٹ آف اسپین میں رہتی ہوں۔ میرے شوہر ہیرسٹر ہیں۔ پچھلے

ہ ایک سرکاری مقدمے کے سلسلے میں پرتھ گئے تھے۔ میں بھی ساتھ گئی تھی۔ بحیثیت انڈین سٹریٹ

بزنس پر میرا اثر و یو لیا گیا تھا۔ تمہارے دادا نے وہ پردہ گرام دیکھا اور پتہ لگا کر یہاں سے ہوٹل ہم

نے لے۔ ہمیں اپنے شیش فارم پر لے گئے۔ وہ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔ مجھ سے مل کر بے حد

ہوئے جیسے میں ان کی باتوں کی کچھڑی ہوئی رشتہ دار ہوں۔ حالانکہ ہندوستان کی جنگ آزادی

نے میں وہ مجھے اپنا سب سے خطرناک دشمن سمجھتے تھے۔ اب وہ اتنے اکیلے تھے۔ تنہا اور ضعیف۔

ہوں نے مجھے بتایا تھا کہ بنگال سے آسٹریلیا آکر انہوں نے ایک امریکن لڑکی سے شادی کر

۔ اس سے طلاق ہو گئی۔ اس امریکن بیوی سے ان کا لڑکا سڈنی میں رہتا ہے۔ مگر ان سے نہیں

شرارہ لوتھم سب کو بہت یاد کرتے ہیں۔ صحت گر چکی ہے۔ تم لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ

بن کر تم سب ان سے ایک بار ہی مل آؤ۔؟ ان کا پتہ لکھ لو۔“

لوکار دراکش کی مالا جیتا رہا۔ ”ان کو اپنا کرنا بھگتا ہے۔“ اس نے سرد مہرے سے کہا۔ ”ایک سنیاں

خون کے رشتے بے معنی ہیں۔“

مسز سین نے جھنجھلا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور ایتھنٹرک اس سے بات نہیں کی جب

ایر پورٹ پر اترنے کے لئے نیچا ہونا شروع کیا سو امی آتم آئندہ شکر بری نے اچانک

کو مخاطب کیا۔ ”میرا سوتیل چچا رچرڈ بارلو جو سڈنی میں انیٹریٹڈ بیکو ریٹر ہے مجھے ابھی چند

پیرس میں ملا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ایک نیا ہوٹل سجانے کے لئے اسے ہنگل دیش ڈھاکہ بلایا

اگر اتفاق سے آپ کی دہاں اس سے ملاقات ہو تو اس سے کہئے گا کہ میں اگلے مہینے کی پندرہ

بعد ہر دو دن میں ہوں گا۔ یہ رشی کش میں میرے آخرم کا پتہ ہے۔“ اس نے اپنا کارڈ سرکایا۔

”اس سے کہنے گا مجھ سے وہاں آن کر مل لے۔ میں اُسے راہ راست پر لانے کی کوشش کروں گا۔ وہ دایہ
 حال میں بری طرح پھنسا ہوا ہے۔ اور آپ بھی کبھی رشی کش آئیے۔ شوا۔ شوا۔“
 طیارے نے لینڈ کیا۔ سوامی جی مسافروں کی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ ایرپورٹ پر اتر کر
 ہجوم میں ان کا جھنڈا اور ترشول کچھ دیر تک نظر آتا رہا۔

جل گھر

ڈھاکہ ایرپورٹ پر یاسمین مجید یادگار کیٹی کے اراکین ہمارے بھول لئے منتظر تھے۔ شریتی دیپالی،
 بنگلہ دیش کی ایک قابل فخر بیٹی، مشہور مفید، بنگلہ دیش کی دوسری قابل فخر بیٹی، نامور رقاصہ اور شہ
 مرحومہ یاسمین بلونٹ کی یاد میں منائے جانے والے تہذیبی جشن کے لئے اتنی دور جنوبی امریکہ سے
 کی گئی تھیں۔ مرنے کے بعد یاسمین بلونٹ ”عظیم شاعرہ“ بھی قرار دیدی گئی تھی۔ واہ۔ جب وہ
 تھی پچیس برس پر دیس کی فیکٹریوں میں مزدوری کر کے، فاقے کر کے، لیسٹورانوں میں برتن دھو
 رشتے داروں اور ہم وطنوں کی گالیاں کھانے، ایڑیاں رگڑ رگڑ کے، سرد بے رحم دیا میں ڈوب کر
 اب اس کے نام پر بین الاقوامی تہذیبی جشن منایا جا رہا ہے جس پر لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ خرچ
 گا۔ یادگار کیٹی نے مسز سین کو آمد و رفت کا ایر ٹکٹ پیش کیا تھا۔ جسے لینے سے انہوں نے انکار کیا۔ یہ
 بڑا GHOULISH آسپی سفر تھا۔ وہ اپنے سورگیہ پتا ڈاکٹر بنوے چندر مرکار اور سورگیہ پھوپھی
 بھوتارنی دیسی کی راکھ ساتھ لائی تھیں کہ ان کی وصیت کے مطابق اسے ہر دو ارے جا کر گنگا میں
 دیں۔ یہ شاید خود دیپالی سین کی طون کی آخری وزٹ ہو۔ جلد شاید خود ان کا بلا واسطہ آخرت کا آجا
 سنسار میں کافی تورہ لیں۔

”آپ کے لئے انٹر کونٹینٹل میں انتظام کیا گیا ہے۔“ استقبال کیٹی کے سکرٹری نے کہا۔ ان
 آئے ہوئے فکلا بھی وہیں ٹھہرے ہیں۔ یا آپ کسی دوست کے ہاں قیام پسند کریں گی؟“
 اب ایک وردی پوش شو فر آگے بڑھا۔ ”میم صاحب“ وہ دانت نکوس کر بولا۔ ”نواب“

جمہد منزل سے گاڑی بھجوائی ہے۔ خود تشریف نہیں لاسکے۔ آج صبح اخبار میں آپ کا نام دیکھا حکم دیا
تین گاوڑاں جا کر آپ کو لے آؤں۔ چلے۔" دیپالی نے استقبالیہ کمیٹی سے منعت چاہی۔ شو فر کے
تیز تر جلتی باہر آئی۔ شو فر نے ایک سفید مرسیڈیز کا دروازہ کھولا۔

نواب صاحب بچا رہے اب کتنے ضعیف ہو گئے ہوں گے۔ بد توں سے اس عائدان کی خیر خبر معلوم
ل۔ ڈھاکہ اور پورٹ آف اسپن میں بہت بڑا فاصلہ ہے۔ جو محض ایرسٹرز کے ذریعے نہیں پاٹا جاسکتا۔
۱۹ء میں وہ پچھلی مرتبہ یہاں آئی تھی۔ اگلے سال اکمل کے مرنے کی خبر معلوم کر کے بھی جہاں آراء کو خط
نے کی ہمت نہیں پڑی تھی۔ اب اتنے برسوں بعد ان سب سے ملنے کی خوشی اور اضطراب سے اس کا دل
رکنے لگا۔

مرسیڈیز ڈھاکہ کی سمت رواں تھی۔

"سب لوگ کیسے ہیں؟" اس نے شو فر سے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہیں۔" اُس نے جواب دیا اور انہماک سے کار چلانا رہا۔ وہ لڑکا سا تھا۔ شاید جمہد
ل میں بنایا ملازم ہوا تھا۔ اس وجہ سے اسے اپنی اہمیت کا بہت احساس معلوم ہوتا تھا۔ اس کی گردن
پچھلے حقے پر زخم کا گہرا نشان تھا۔

دیپالی نے آنکھیں بند کر لیں اور سوچتی رہی۔ جہاں آراء کا سامنا کس طرح کروں۔ اکمل کی تعزیت
الفاظ میں کروں۔ اکمل کو مرے بھی اتنے برس گزر گئے۔ جہاں آراء اب اپنے پوتے کے سہارے
نا رہی ہوگی۔ ممکن ہے سہو نے دوسری شادی کر لی ہو۔ اس نے دل ہی دل میں تعزیت کے جملہ کی
سل شروع کی۔ پھر دل کڑا کر کے آنکھیں کھولیں۔ چاروں طرف شہر تھا اور یادیں بندوق کی
دن کی طرح بوجھار کر رہی تھیں۔ یادیں LAND MINES کی طرح دخی تھیں۔

"میم صاحب گانا سنئے گا۔؟ بنگلہ دیش ریڈیو۔" ڈرائیور نے کہا۔ اور ریڈیو کا سوئچ آن کر دیا۔
کی ٹھاناکا گیت۔ بھٹیالی ختم ہو رہی تھی۔ اب نذر لگتی شروع ہوئی۔ بد روہی۔ کہہ دے لے
ہمیں سر بلند ہوں۔ اتنا بلند کہ ہماری چوٹی بھی میرے آگے سرخوں۔ کہہ دے لے پیادہ کہ اس وسیع
ن کو جیر کر چاند سورج ستاروں کو توڑ کر جنت بھرخ دہا کر آسمان سے ٹکرا کر میں سارے عالم کے
بتم حیرت بن گیا ہوں۔" نوجوان ڈرائیور نے مرکز اطلاع دی: "میم صاحب۔ ہم بھی بہت لڑا۔"

گانا جاری رہا، میں سرکش بسٹلڈل آتش نوار قیامت کا دوست طوفان تباہی دمشت ہور
 دنیا کے لئے سراپا ہلاکے۔ میں ہر چیز کو چکن چور کر دیتا ہوں۔ اصول شکن۔ بربادی کا دیوتا۔
 وہ بے اختیار خود بھی اس کے ساتھ ساتھ گانے لگی اور پل کی پل میں اپنے کالج کے زمانے میں خواہ
 پہنچ گئی۔ جب وہ اور ریمان اور روزی ہنری اور محمود الحق اور حیوتی سب مل کر خوش و خوش سے یہ گید
 گاتے تھے۔

اُسے یہ بھی نہ چلا مرسیڈیز ارجمند منزل کی برساتی میں کب پہنچی۔

ایک پاگل سی عورت جھپڑے سفیر بال بکھرائے برآمدے کے ایک در میں بُت بنی کھڑی تھی دیا
 کو کار سے اترتا دیکھ کر فوراً اندر بھاگ گئی۔

ایک ملازم نے آکر اسباب کار سے اتارا۔ دیپالی اندر گئی۔ ارجمند منزل سنان پڑی تھی۔ جہاں آ
 — جہاں آرا — پکارتی وہ زنا خانے میں پہنچی۔ وسطی تالا بھی خالی پڑا تھا۔ دیپالی اوپر جانے کے
 لئے منتقش جو بی زینے کی طرف مڑی ہی تھی کہ وہ دیوانی عورت بھاگتی ہوئی اندر آئی اور اس کی ٹانگوں
 پرٹ کر آ۔ آ۔ آ کرنے لگی۔

”مالا۔ میم صاحب کو تنگ مت کر۔“ ملازم نے جو اسباب اٹھائے پیچھے پیچھے آکر اٹھا
 جھڑک کر کہا پھر ہمان کو مخاطب کیا۔ ”میم صاحب۔“ جب سے سب لوگ مارا گیا، آلا پاگل ہو گیا
 اور گونگا بھی ہو گیا ہے۔“

”کو کون — مارا گیا — ؟“

”سب جنے۔ میم صاحب۔ بڑے نواب صاحب۔ نیرمیاں۔ اُن کا بی بی بچے۔ جہاں آرا
 بی بی۔ ان کا بہو اور پوتا۔ سب مارا گیا۔ آدھی رات کے ٹائم۔ سب بندوق کا نشانہ بنا۔ یہی کوٹھی کے اندر
 آلا نے سب کو مارتے دیکھا۔ جب سے یہ گونگا ہو گیا۔“

دیپالی کی آنکھوں کے سامنے ایک کونڈا سا پکا۔ وہ اپنی جگہ جم کر رہ گئی۔ پھر کھڑے کھڑے زور سے
 لہڑی۔ پھر اس کی ٹانگوں نے جواب دیا۔ داغ سننایا۔ سارے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ آنکھوں کے
 سامنے موغ اندھیرا تیرا۔ وہ دھم سے فرش پر بیٹھ گئی۔ کہہ دے اے نوجوان — جو اندر میں جنت دوزخ
 دکھا کر۔ عرش سے ٹکرا کر سارے عالم کے لئے مجتہ حیرت۔ اُس نے وحشیوں کی طرح چاندوں طرف دیکھا

مند لٹھے چپ رہی۔ پھر دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کیا۔ اس کے بال بکھر گئے۔ روتے روتے اس نے غموں
 یا کہ وہ انسان نہیں ہے۔ وہ درندوں سے بھرے جنگل کا ایک جانور ہے۔ جس کے بھٹ کے باقی جانور
 دوسرے زیادہ خوفناک حیوان اگر چہ بھاڑ گئے ہیں۔ امدان کی لاشیں گدھ کھا چکے ہیں۔ اور سنان صحر
 ریت نے ان کے ڈھلپٹے بھی غائب کر دیئے ہیں اور وہ گیدڑ کی طرح پنجوں سے زمین کھرچتی ان کو یاد کر
 رہی ہے۔ پھر اس نے جنگلی بلی کی طرح رونا شروع کیا۔ اس کی آواز سن کر اجنبی شکلوں والے نوکر
 اگر دروازوں میں نمودار ہوئے۔ مالا اور زورے آ۔ آ۔ آ۔ کرنے لگی۔ جس طرح ایک نا سمجھ بچہ
 سر بچتے کو روتا دیکھ کر ہمدردی میں خود بھی رونے لگتا ہے۔ مالا نے دیپالی کو آنسو بہاتے دیکھ کر آنسوؤں
 جھڑی لگادی۔

دفعتاً دیپالی چپ ہو گئی۔ آنکھیں خشک کیں۔ اور سپاٹ آواز میں کہا۔ ”مجھے بڑے نواب صاحب
 پاس لے چلو۔ ان کو اطلاع کر دو۔ میں آگئی ہوں۔“

”وہ بھی مارا گیا میم صاحب۔“ ملازم نے جواب دیا۔ دیپالی نے فرش پر رکتہ مارا۔ ”اس بدلعاش
 وٹے کیسے ڈرا بیور نے کہا نواب صاحب نے ایر پورٹ کار بھجوائی ہے۔ نواب صاحب نے۔“
 ”چھوٹے نواب صاحب نے۔ میں ان کو بلا کرتا ہوں۔ وہ ابھی آتے ہوں گے۔ باہر گئے تھے۔
 آتے ہوں گے۔ میں ان کو خبر کرتا ہوں۔ دھیرج رکھئے میم صاحب۔ نیا زیمیاں میم صاحب کے لئے ایک
 بٹھڑا پانی۔ جلدی۔“ دوسرے خدمت گار نے گھبرا کر کہا اور لپکا ہوا باہر گیا۔

دیپالی اب ایک نیم جان کو کر اسپینل کی طرح فرش پر سرنگوں بیٹھی تھی۔ اس کے آنسو بوریوں کے کنارے
 رواں ہو گئے۔ آہ اس کے نزدیک آکر اکڑوں بیٹھ گئی۔ دیپالی نے آنسوؤں کی چلیں میں سے اسے دیکھا۔ اور پوچھا
 ”آہا کی پرانی وفادار خادمہ مالا۔ وہ اب اپنی دیوانگی میں لکڑی بگنے کی طرح ہنس رہی تھی۔ ان دونوں غور توڑ
 زندگی کا، دنیا کا انجام دیکھ لیا تھا۔

چند منٹ بعد دیپالی نے سر اٹھایا۔ صدمہ دوازے پر آہٹ ہوئی۔ ”اٹھ میں“ فائو فائو فائو“
 اسنے لے کر میا سوٹ پہنے ریحان الدین احمد دہلیز پر کھڑے تھے۔

نواب قمر الزماں چودھری کے بھانجے۔ ارجمند منزل کے نئے مالک۔ شہید نواب کے واحد قانونی وارث
 م میں زندہ بچے تھے۔ ارجمند منزل کے موجودہ نواب۔

دیپالی نے سرزور سے جھکا۔ اور آنکھیں لیں کالی جگت کے چوراہے پر بیٹھی بتگیں بناتی ہے۔ بتگیں بنا
ہے۔ بتگیں اڑاتی ہے۔

بچ کے بعد ریحان کا دلے کر پاٹ کی فیکٹری چلے گئے جو نواب قمر الزماں اور ان کے فرزند نیر الزماں مرحوم
کی فیکٹری تھی جس کے اب وہ مالک تھے۔ زہرہ دیپالی کو آرام کرانے اور پرسیدہ دم میں لے آئیں۔ یہ جہاں آئے
مرحومہ کا بیڈروم تھا۔ دیوار پر آئینہ نورس یونیفارم میں ملبوس شہسباز اکمل مرشد زادہ اور اس کی بہن کی تصویر
لگی تھی۔ یہ پائلٹ آفسر اکمل مرشد زادہ ستمبر ۱۹۷۱ء میں پاکستان کی خاطر لڑتے ہوئے مرا تھا۔ دیپالی کا سر
گھومنے لگا۔ وہ درپچے کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ جس کے نیچے تالاب اور ”وکریم آدتیہ کاراج سنگھ اسر
نظر آ رہا تھا اور گلاب خاص کا درخت۔

دوسری مسہری پر بیٹھی زہرہ اوارائے کی شکایتیں کر رہی تھی۔

”اُمادیدی نے میرا نام میں دم کر رکھا تھا۔“ پان بناتے ہوئے اس نے کہا۔ ”وہ بالکل سٹھیا لگی بہو
جس طرح وہ بلوئیدیر جا کر لاوارث بیویوں کتوں کو کھلاتی تھیں ان کا خیال تھا ریحان صاحب اور بہو
بھی ان کے پالتو جانور تھے۔“

”ریحان کے متعلق ساری عمر ان کا یہ رویہ رہا۔“ دیپالی نے غیر شخصی انداز سے کہا۔ اب اس
لمحے وہ محض ایک دور کی تماشائی تھی۔

”جی ہاں۔ ہمارے لڑکے فرقان کو بھی انہوں نے ہی میرے خلاف بھڑکایا۔ وہ DRUGS
کھانے لگا۔ گھر سے نکل گیا۔ ہتی بن گیا۔ پھر یہیں معلوم ہوا کہ وہ ڈھاکہ آ گیا ہے۔ ریحان صاحب بیٹے کو سید
چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا چلو ہم بھی کلکتہ کو خیر یاد کہتے ہیں۔ ڈھاکہ واپس جا کر نئی زندگی شروع کر سیکے
ساری عمر گزارنے کے بعد شاید اوارائے ان کی سمجھ میں بھی آگئی تھیں۔ ۱۹۷۱ء میں ہم لوگ ایسٹ پاکستان
آ گئے۔ ریحان نے کھانا میں بزنس شروع کر دی۔ وہ بنیادی طور پر سیاسی آدمی ہیں۔ پھر پولیٹیکس میں آ
پڑے۔ عوامی لیگ۔ شیخ مجیب الرحمن۔ وہ سب چکر لڑ کا لیو نیورسٹی میں داخل ہو گیا۔ مدھر گیا۔ پھر

۱۰ اٹھارہویں صدی کے بنگالی شاعر رام پرشاد سین کا ایک گیت۔

صاحب نے اسے آگے پڑھنے کے لئے لندن بھیج دیا۔ ہم لوگ اپنا سارا روپیہ کلکتہ سے کسی ترکیب سے یہاں لے آئے تھے۔

اس کے بعد جو ہوا وہ آپ کو معلوم ہے۔ فرقان لندن میں تھا۔ زندہ بچ گیا۔ اب باپ کے ساتھ بڑنس کچھ بھال کرتا ہے۔

”جب ارجمند منزل پر حملہ ہوا ہم لوگ کھلنا کے ایک گاؤں میں چھپے ہوئے تھے۔ ارجمند منزل کا یہ گھرانہ شیخ مجیب کا حامی بن چکا تھا اور جو کچھ ہوا کیوں اور کس طرح یہ لوگ مارے گئے وہ ریحان پتختہ آپ کو بتا چکے ہیں۔“

”ہاں۔ میں اس کی تفصیل نہیں سنا چاہتی۔“ دیپالی نے مضبوطی سے جواب دیا۔ ریحان نے کسی باطل طریقے سے اس قتل عام کا تذکرہ کیا تھا۔ پھر اس نے خود کہا تھا جب لاکھوں اکٹھے مارے جائیں غ ماؤں ہو جاتا ہے۔ افراد کی موت کا اتنا شدید صدمہ ذہن پر نہیں رہتا۔ مرگ ابنہ واقعی ایک شہنشاہ کی کسی بھی قتل عام کے پسماندگان کی نفسیات ہو سکتی ہے۔“ لیکن اتنا کہنے کے بعد ریحان خود بھڑک اٹھ کر رونے لگے تھے۔

ریحان کی بہن رابعہ اور اس کا شوہر اور چھوٹے بچے ریفیو جی بن کر کلکتہ چلے گئے تھے اور وہاں پلے تھے۔ رابعہ کی بڑی لڑکی ناصرہ نجم اسکر کلکتہ جانے کے بجائے ایک گوریلا دستے میں شامل ہو گئی تھی بہت دنوں تک غائب رہی تھی۔ آزادی کے بعد بھی ہتھیار ڈالنے پر راضی نہیں تھی۔

”میں نے اس لڑکی کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ انتہا پسند دل سے جا ملی تھی، بڑی آفت میں پھنسی۔“
 ماہیہ دل کے گردہ سے الگ کر دیا۔ اسکا رشپ دلو اکرا اعلیٰ تعلیم کے لئے ماسکو بھیجا یا۔ فرنیڈ شپ درستی میں پڑھ کر آئی۔ مگر ماؤسٹ بن گئی۔ یہاں کالج میں لیکچرر ہو گئی۔ اب وہ مجھ سے نہیں ملتی۔
 بے خلافت بکیتی پھرتی ہے۔ نہ جانے یہ نوجوان کیا چاہتے ہیں۔ یہ بڑی احسان فراموش سی نسل ہے۔“
 بان نے نواب قمر الزماں کی آواز میں دیپالی سے کہا تھا۔ اسے ناصرہ نجم اسکر کی تلخ گفتگو یاد تھی جب وہ نو سال قبل اس سے یہیں ملی تھی۔ اب ریحان نے اپنی مرسیدیز میں بیٹھ کر زرائع گنج جا چکے تھے۔ ان کا ٹائٹلش مود شاعر بٹیا فرقان اپنا پروگرام تیار کرنے میں دیرین سمنہ چلا گیا تھا۔ نوکر چاکر شاگرد پیشے میں تھے۔
 پھر قیلولے کا۔ سیٹھا کا وقت۔

”ایک بات سنو زہرہ۔ گویا تمہاری خوش قسمتی تھی کہ تمہارے مفلس باپ زلیخہ دہرائے کی موٹر کے نیچے آکر مرے اور بطور نثانی تم سے ریمان نے بیاہ کیا۔ اور یہاں قتل عام ہوا اور تم ارجبند منزل کی ماں بنیں۔ زہرہ خدا کے لئے چپ ہو جاؤ۔ اور مجھے سونے دو۔“

”آ۔ آ۔ آ۔“ مالا نے دہرایا۔

یہ ارجبند منزل ایک بھوت گھر ہے۔ کہتے ہیں جو لوگ اچانک اور بھیانک طریقے سے قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ ان کی آتمائیں ان ہی جگہوں پر منٹلاتی رہتی ہیں۔ کیا ان سب کی آتمائیں مجھے دیکھ رہی ہوں گی۔ ایک وز شام کے وقت وہ میٹرھیاں اتر کر پائیں بلغمیں آگئی۔ اوپر جہاں آرا درجہ کے کمرے کا دریاچہ روشن تھا۔ جس پر اب زہرہ موجود تھی۔ اور اسی تخت پر بیٹھی مغرب کی نماز پڑھ رہی تھی۔

جہاں آرا تم کو بھوسا گھر سے پار اتر گئیں مگر میں تم سے کتنی شرمندہ ہوں۔ اس فیکٹری کا مالک اور اس گھر کا خاندان دہرائے کی خاطر ریمان نے تم کو ٹھکرا دیا تھا۔ تم نے ایک غلط آدمی کے ساتھ زندگی جہنم میں گزار دی۔ اپنے بیٹے کی موت کا غم اٹھایا۔ پھر خود سید زہری سے بے قصور قتل کر دی گئیں۔ اور آج اسی گھر میں وہی ریمان دران کی بیوی نئے نواب اور بیگم کی حیثیت سے براجمان ہیں۔

مایا تیرے کھیل۔

وہ ٹہلتی ہوئی جلے گھر کی طرف چلی گئی۔ جس کا دروازہ باغ میں کھلتا تھا۔ گواڑ چوڑے کھیلے پڑے تھے۔ وہ اندر گئی۔ تپتی جلانی۔ سامنے دیوار پر ایک بڑی سی تصویر روشن ہو گئی۔ پارسی تھیسٹر۔ دھرم تلک اسٹریٹ۔ کلکتہ۔ لندا ور مہتمم فوٹو گراف۔ ماسٹر مصطفیٰ۔ سراج الدولہ ٹانگ کا ہیرو۔ مس تنکوری داس دی سنگر۔ مس داداس۔ سسلا ٹانگ کی ہیروئن۔ ایک بڑی روغنی پورٹریٹ۔

نوابزادہ فخر الزماں چودھری۔ اسے یاد آیا۔ یہ ریمان کے نانا تھے۔ نواب قمر الزماں کے جو انرگ چچا۔ انہوں نے تھیسٹر کے شوق میں اپنے حصے کی جائیداد اڑا دی تھی۔ یہ ان کا جلد گھر تھا۔ اس میں نواب زادہ صاحب بعد دست دیپالی کے ٹھاکر دادا بھی سنا ہے اگر گایا بجایا کرتے تھے۔ پرانے ارستو کرٹیک بنگال کے تھیسٹر پرست ڈسکو! ارجبند منزل کے اس جلے گھر میں ساما سا زو سامان اسی طرح موجود تھا۔ الماری میں ”شاہجہاں“۔ ”سراج الدولہ“ کے کرم خوردہ چوغے۔ نقلی تاج۔ تلواریں۔ بالسرہاں۔ سینیریں کے پردے لپٹے ہوئے

ایک طرف رکھے تھے۔ ہال کے چوبی فرش پر گرہ جمی ہوئی تھی۔ کونے میں جا لے۔ سرخ اور سفید کٹاؤ کے کام کا جھاردار پنکھا۔ چھت گیریاں نواز زادہ میٹر الزماں کی شادی کے دنوں میں اسی کمرے سے نکال کر نواز زادہ فخر الزماں مرحوم کے تصنیف کردہ ادبیر ”راجہ بھوج“ کا سنگھ آسن تالاب کے کنارے رکھ دیا گیا تھا۔ جس پر راجہ منزل کی بیگمات اور صاحبزادیاں بیٹھ کر خوش گپیاں کرتی تھیں۔

دیپالی جلسہ گھر سے باہر آگئی۔ اندر بہت جس تھا۔ اور وحشت۔ باہر پر فضا باغ میں ”وکر کم آرتیہ کا سنگھ آسن“ اب بھی موجود تھا۔ گوشتیں برساتوں کی وجہ سے گل چکا تھا۔ اس کی مورتیوں کے رنگ اڑ گئے تھے۔ اس کے جنگلوں میں اٹھائیس^{۲۸} چھوٹی چھوٹی چوبی مورتیاں لگی تھیں۔ چار بڑی چوبی مورتیوں کے سروں پر تخت کھڑا تھا۔ زیادہ تر مورتیاں بالکل شکستہ ہو چکی تھیں۔ سنگھ آسن تیسری کی دیو لوک سے جلا وطن اسپریشیں!

گلاب خاص کے نیچے نیچ کر وہ تخت کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

ایک مرتبہ، گرمیوں کی ایک معطر شام جہاں آرار نے ذکر کیا تھا۔ ”دیپالی۔ ہمارے چھوٹے دادا جاک نواز زادہ فخر الزماں جو دھری اللہ جنت نصیب کرے۔ انہوں نے ”راجہ بھوج“ کا ادبیر اخوند کپور کیا تھا۔ راجہ بھوج کا پارٹ بھی خود ادا کرتے تھے۔ تمہارے ٹھکانہ دادا راجہ اندر بنتے تھے۔ کلکتے کی ایکٹریسز آکر رہتی اور اردشی کے پارٹ گاتی تھیں۔“

اُس شام منہ چڑھی خادمہ مالا حسب معمول تخت کے پاس گھاس پر بیٹھی تھی۔ یاسمین اور رندری بھی آئی ہوئی تھیں۔ جہاں آرار نے حکم دیا۔ ”مالا۔ راجہ بھوج کا قصہ کر۔“

”ارے بی بی۔ ہندو لوگ بولتا ہے کہ دیو لوک میں تیس^{۳۲} ٹھکانے ہیں۔ ایک رندز انہوں نے شیوجی پر برسی نظر ڈالی۔“

”گڈ گوڈ۔“ دیپالی اور سب لڑکیاں کھلکھلا کر ہنسیں۔

”مادہ نطف کیلاش اور ماؤنٹ اولمپس واقعی بہت دلچسپ جگہیں رہی ہوں گی۔“ یاسمین نے کہا۔

”تو بی بی! پارونی دیسی بن گئیں! انہوں نے شراب دیا کہ اسپریشیں بے جان مورتیاں بن کر راجہ اندر کے تخت

میں لگ جائیں۔“

”تو وہ جادو کے سیب کا کیا معاملہ تھا۔“ آخر آزاد نے پوچھا تھا۔

”عورت مرد کی بے دہائی۔ بی بی۔“ ملا نے پان چلے ہوئے اطمینان سے جواب دیا تھا۔
 اچین کا راجہ بھرتری ہری اپنی بیوی پر عاسک تھا۔ اسے ایک جوگی نے امر جیون یا نے کا سیب دیا۔ اسے کھاؤ
 دامر ہو جاؤ۔ وہ راجہ نے اپنی بی بی انگ سینا کو دیا۔ انگ سینا نے اسے اپنے عاسک سائیس کو دیدیا۔
 سائیس ہمارائی کو چل دیتا تھا۔ اور اپنی پریمیکا الگ رکھتا تھا جو محل کی داسی تھی۔ وہ داسی بھی سائیس کو دھوکا
 دیتی تھی اس کا معسوک ایک گوالا تھا۔ داسی نے وہ سیب گوالے کو دیا۔ گوالا بھی داسی کو دھوکے میں رکھتا تھا
 اس نے اپنی معسوک کو وہ سیب دیا جو اُپلے جیتی تھی۔ وہ منہر سیب ٹوکرے میں اُپلوں کے اوپر رکھے چلی جاتی
 تھی۔ راجہ بھرتری ہری جنگل میں شکار کھیلنے آیا اُس نے اسے دیکھ لیا۔ اپنی رانی انگ سینا کی بے دہائی سے اس کا
 دل ٹوٹ گیا۔ تو وہ اپنے بھائی بکرم جیت کو راج پاٹ سوپ کر سنایا لے لیا۔“

لڑکیاں مہوت ہو کر یہ اسطوری داستان سن رہی تھیں۔ آلا کہے گئی۔ ”پھر راجہ بکرم جیت کو ایک
 نترک جوگی شمشان گھاٹ لے گیا۔ وہاں بیتال درختوں کے لٹے لٹکے ہوئے تھے۔ اور ایک بیتال راجہ کے
 کندھے پر بیٹھ کر اسے کہانی سناتا تھا۔ پھر بکرم جیت جو تھے رہے اور آدھوشی کے نچ کے مقابلے میں جج بنے
 جج بنے ان کے پھیلے سے خوش ہو کر راجہ اندر نے اپنا تخت ان کو بخش دیا جس میں دو ہی تیس مورتیاں
 لگی تھیں۔“

لڑکیوں نے غیر شعوری طور پر اس نقلی اسطوری تخت پر نظر ڈالی اور انھیں محسوس ہوا جیسے وہ
 خود اس دیو مالائی راج سنگھاسن پر موجود تھیں۔

”اور بکرم جیت کے مرنے کے بعد اس جیسا لائق راجہ کوئی نہ ہوا۔ تو اس سنگھاسن کو دفن کر دیا گیا اور
 مدیوں بعد راجہ بھوج نے اسے کھیت مید سے کھود کر نکلوایا۔“ جہاں آزاد بولی۔ ”اور جب وہ راجہ اس
 تخت پر بیٹھنے کے لئے بڑھا تو ایک مورتی نے آواز دی۔ اس تخت پر وہی بیٹھ سکتا ہے جو راجہ وکرم آدھیا
 سنی اور فیاض ہو۔ اس طرح راجہ بھوج تیس مرتبہ تخت کی طرف بڑھے اور ہر مرتبہ ایک ایک مورتی نے لٹکار کر
 ان کو وکرم آدھیا کے اوصاف کے متعلق کوئی قصہ سنایا۔ دفائش۔ اصول پرست۔ راست باز۔ بہادر۔

جمل۔ یہ۔ وہ۔“

تب یاسین نے کہا تھا۔ ”آئیڈیا۔! آپ کے چھوٹے دلوانے اوپر لایا تھا۔ میں اس کا بیٹے بناؤں

گئی۔ اور پتہ ہے اس راج سنگھاسن کی اصل معنویت کیا پیش کروں گی۔؟ پھر اس نے بڑی ڈرامائی انداز میں کہا تھا۔ ”یہ سنگھاسن دراصل ہے۔ عاقبت کا دل۔“ اور آپا اس وقت یہ فرض کیجئے کہ ہم چاروں آپا، روزی آپا، دیپالی دی اور میں اس کی چاروں بڑی سورتیاں ہیں۔ اور کوئی راجہ مجھ اس تخت پر بیٹھنے کے لئے آئے تو ہم اسے لٹکا دیتے ہیں۔ ٹھہرو۔ تمہارے اندر یہ۔ یہ۔ اوصاف ہیں۔؟“

دیپالی نے آنکھیں میس۔ جہاں آرار اور یاسمین کے بھوت غائب ہو گئے۔ سامنے تالاب کی منڈیر پر گونگی۔ آلا چپ چاپ بیٹھی اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکتے جا رہی تھی۔ دیپالی نے غیر ارادی طور پر نظریں ادا پراٹھائیں۔ تالاب خاص کی شاخوں سے کیا بیتال الٹے لٹکے ہوئے تھے؟ دور ڈرائیو پر کار آکر رکی۔ ریمان کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی ملازم سے پوچھ رہے تھے۔ امریکا والی سین میم صاحب کہاں ہیں؟ کسی نے جواب دیا ”باگ میں۔“

نورکش باگ میں بہار کی آگ میں
بھرے دل داگ سے درد دل زور۔ رنگیلا کوٹور
آؤ۔۔۔ آؤ۔۔۔ پیارے۔۔۔

مکاتب خاص کے نیچے نوکیاں نڈل کائیت کھڑی ہیں۔ یاسمین کٹھ پتلی کی طرح گردن ہلا کر نئی پوری رقص میں مصروف ہے۔ جہاں آرار اور دیپالی نوابزادہ نیر الزماں کی بری کے جوڑے بخت رہی ہیں۔

وہ گھاس کو قدموں سے ریتنا آکر ایک فضول خیال کی طرح اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بن مالی۔ بن مالی۔ سندھیا کال آج تم کہاں سے آتے ہو۔
”بیٹہ جاؤ ریمان۔“

وہ اپنے نانا نانا بڑا دھنر الزماں کے بنوائے ہوئے فرضی راجہ آندر کے نقلی تخت پر بیٹھ گیا ہاجانک دیپالی کا جی جاہا اسے لٹکا دے۔ ٹھہرو تم اس پر نہیں بیٹھ سکتے۔ ریمان نے ایک سگریٹ سٹکایا۔ ”معاذ کرنا آج فیکٹری میں

پر ہو گئی۔

”بلکہ دلش کی تعمیر نو میں مصروف ہو؟“

وہ چہیں رہیں ہو کر دوسری جانب دیکھنے لگا۔

دفعۃً دیپالی کو محسوس ہوا اور پرہیزگاری میں سے جہاں آرا جھانک رہی ہے اس نے غصہ سے زہرہ تھی۔ میگ زہرہ ریحان الدین احمد۔ مجھے ہیوس میٹن نظر آنے لگے ہیں۔ مجھے اس چھاپا لوک راز جلد بھانگنا چاہئے۔ محفوظ۔ دور افتادہ پورٹ آف اسپن، پرسکون، غیر جنگل شہر ہر سڑک میں، خوش باش برازیلین بھانجہ ماریا روزینا۔ ایٹ انڈین ملازمہ سٹریس سڑک، نیگرو بلر ایلیاس۔ ری اصل، راحت بخش آرام دہ دنیا ہے۔ بیتا لول کے اس مرگھٹ سے اتنی مختلف رہاں ہر ہر قدم پر مال ایک ایک پرانا تھمہ دہرائے جا رہا ہے اور جنات کافولیں مسلسل پوچھ رہے ہیں۔ اور سناؤں؟

اول۔؟ اور سناؤں۔؟

ریحان نے بھی نظریں اٹھا کر جہاں آرا کے کمرے کے درپے کو دیکھا۔ دیپالی پر نظر ڈالی اور آنکھیں جھپکایں۔ ”مالا۔۔۔ مالا برابر آ۔۔۔ آکر کے مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس کی بات فیر نہاں سے چلی جاؤں گی۔“

”ہاں۔ کاش میں بھی اس کی بات سمجھ سکتا۔ کاش ہم سب ایک دوسرے کی بات سمجھ سکتے۔“

دیپالی۔ جہاں آرا۔ یاسمین حمید۔ تین عورتوں میں سے بد بڑی بڑی طرح ٹوٹیں۔ دیپالی نے آدیتھ کے سنگھاسن کی ایک مودتی بڑا تھ رکھ کر دل میں کہا۔

پالکی چولے۔ پالکی چولے ہو ہو۔ وہ آہستہ سے گنگنا نے لگی۔

”دیپالی۔ میں نے آج سے پچیس سال قبل تم سے آخری بار گانا سنا تھا۔ چند سنگ کے بھاگ پر ہی طرح گوھوے کے وقت۔“

”سنا ہوگا۔ مجھے یاد نہیں۔ ریحان تم نے۔ تم نے اتنے شرمناک سمجھوتے کیسے کر لئے۔ کلکتے میں رہیاں بھی۔“ وہ غم و غصے سے جھنجھلا کر رہ گئی۔

”سمجھوتہ! کیا تم نے نہیں کیا؟ کیا تم نے پورٹ آف اسپن میں سمجھوتہ نہیں کیا؟“

”میں نے اپنا ضمیر نہیں بیچا۔“

”یہ بات تم کہہ سکتی ہو۔“ وہ بھی ہنسنے لگا۔ عمر رسیدہ لوگوں میں قوت برداشت کم ہوجاتی ہے۔
 ”اچھا۔ چلاؤ نہیں۔ لوگ سنیں گے تو کہیں گے دو جھپٹی بڑھے بڑھیا کیوں لڑ رہے ہیں۔“
 ریمان نے تھلا کر سگریٹ اپنے بوٹ کے نیچے کچلا۔

”یہاں اتنی خونریزی ہوئی اور نتیجہ کیا نکلا؟ مغربی پاکستان سے آئی ہوئی بورڈ رازی کو محال کرا
 ئی مقامی بورڈ رازی نے اس کی جگہ لے لی۔“

”شٹ اپ۔ یو آر اے سی اولڈ وومن۔ یہاں کے حالات سے واقف نہیں۔ آجاتی ہیں مارکا
 یہاں نصیحتیں کرنے۔“ ریمان نے ہنسا کر جواب دیا۔

”تم کسی پاگل خانے گئے ہو؟“ اس نے ذرا تیز آواز میں کہا۔ ”میں ایک مرتبہ اپنے شوہر لکت
 ساتھ ایک پاگل خانے گئی تھی۔ بلزبل کک ٹھہریں۔ وہاں ایک آدمی خود کو چار دانی سمجھتا تھا۔ دو
 کہہ رہا تھا میں جیزس کرائسٹ ہوں۔ ایک عورت کا خیال تھا وہ مگر بچہ ہے۔ ایک عورت کو یقین تھا کہ
 گرینڈ فار کلاک ٹکٹل چکی ہے۔ وہ مستقل ٹک ٹک ٹک کر رہی تھی۔ اسی طرح۔۔۔ رونو۔۔۔
 سب اپنے آپ کو وہ سمجھتے ہیں جو ہم نہیں ہیں۔“

”معلوم ہے۔ اب آپ بہت عقلمند ہو گئی ہیں۔ مجھے درس دے رہی ہیں۔“

”رونو۔ ایک قہقہہ سناؤ؟“ دیپالی نے غیر ارادی طور پر سٹگھاسن کے پایوں کی بات مانہ
 مورتی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”جب ہم لوگ نئے تھے پورٹ آف اسپن پیچھے۔ چھوٹا سا ایک مکان کرائے پر
 لگی کے سوے پر ہمارے سامنے ایک خوبصورت دو منزلہ ٹورس ڈھنگ کا مکان تھا۔ اس کے نچلے برآمدے
 اب بڑک دو درانی صوبت بڑھیاں برف جیسے سفید بال، روکنگ چیمیز پر بیٹھی ننگ کیا کرتی تھیں۔ جتنے
 پادری اور ننان کے ہاں آتی جاتی رہتیں۔ وہ پابندی سے چربچ جاتیں۔ پاس پڑوس کے غریبوں کی ادا کرتی تھیں
 بڑی دھوا تا سادھوی ٹوریں تھیں۔“

”دونوں بڑھیاں روز صبح دس بجے ٹیکسی پر بیٹھ کر بازار جاتیں ان کا نیگرو باورچی ایک بڑا سا قہقہہ
 لے کر ساتھ جاتا۔ واپسی پر اس کا قہقہہ سامان سے بھرا ہوتا۔ ایک روز میں نے سوچا۔ میں اس جگہ اجنبی ہوں
 میں بھی ان کے ساتھ سبزی ترکاری کی ان دوکانوں پر جاؤں گی جہاں سے اچھی چیزیں مل سکیں۔ کئی در
 کل گئے۔ میں ان فرشتہ صفت بڑھیوں سے نہ مل سکی نہ ان کے ساتھ بانٹا جانے کے لئے طے کر پائی۔ ایک

جب وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہوئی تو ٹیکسی میں نے سوچا دوسری ٹیکسی لے کر میں بھی ان کے پیچھے سی جوں رہیں پہنچ کر ان کے ساتھ ہی خریداری کروں۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا اس دوسری گاڑی کے پیچھے پیچھے چلے۔ "میری ٹیکسی مارکیٹ سے گزر کر واٹر فرنٹ کی طرف چلی۔ اگلی ٹیکسی ایک ہوٹل کے سامنے جا کر جس اندر سے جہازی ملاح نکل رہے تھے۔ ڈرائیور نے ذرا حیرت سے مجھے دیکھا۔ وہ دونوں بڑھیاں اپنی گاڑی اتر کر ہوٹل میں داخل ہوئیں۔ برآمدے میں دس بارہ ٹالوٹر لڑکیاں صوفوں پر ایک قطار میں بیٹھی کھنگریٹ پی رہی تھیں۔ میں تعجب سے ٹیکسی میں بیٹھی دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد وہ بڑھیاں باہر آئیں۔ نیگرو بادورچی تھیلا اٹھائے کھڑے تھے۔ دونوں اپنی ٹیکسی میں بیٹھیں اور واپس چلی گئیں۔ ڈرائیور نے ایک قبضہ لگا یا اور ہللا۔ میں آپ ابھی شاید نئی نئی آئی ہیں۔ آپ نہیں جانتیں۔ یہ دونوں بڑھیاں پچاس سال پہلے یہاں کی مشہور طوائف تھیں۔ دونوں نیاور کینز سے یہاں آئی تھیں۔ اب اس ہوٹل کی مالک ہیں۔ روز صبح اگر کچھ عرصے قحبہ خانہ کی آمدنی سب کتاب کرتی ہیں اور رات کی آمدنی کے نوٹ اس تھیلے میں بھر کر لے جاتی ہیں۔ اور آمدنی کا زیادہ حصہ مت خلق پر خرچ کرتی ہیں۔ بڑا بڑا پارٹی لوگ جب یہاں آتا ہے ان کے یہاں ہی ٹھہرتا ہے۔

"جب میں گھر واپس پہنچی۔ وہ دونوں اطمینان سے روکنگ چیرز پر بیٹھی بائبل پڑھ رہی تھیں۔

"تورو نو۔ اکثر لوگ دوغلی زندگیاں گزارتے ہیں تم ماوزیل مارسیل اور مادوزیل ماری نہیں۔

تم وہ نیگرو بادورچی ہو جو وہ تھیلا اٹھا کر ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ تم بھی شامل ہو۔"

"کیا تم شامل نہیں ہو۔ کیا تم کو ویسٹ انڈیز ہجرت کے بعد ایک دو ہفتہ بیسٹرس سے شادی کر کے لائوی گورنر جنرل کے ڈنر میں جانے کے بجائے پلانٹیشنرز کے مزدوروں میں انقلابی تحریک کی تنظیم نہیں کرنی بنے تھی؟ تم نے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ تم تھک چکی تھیں یا ڈز الوٹرن جو چکی تھیں یا اب تم بھی آلام اور آسائش خواہاں تھیں۔ چراغ مسلسل جلانے رکھنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اب تم محض زبانی یا تحفظی ہمدردی ناہور لوگوں کی بے انصافی اور بے ایمانی پر خفا ہوتی ہو۔ مگر تم بھی شامل ہو چکی ہو۔ مسلسل علیحدہ رہنا بہت ہے۔ جو علیحدہ رہتے ہیں ان کو سسکی یا غصیلی یا بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔

"میں نے اخباروں میں تمہارے شوہر کا نام ایک دوبارہ دیکھا ہے۔ وہ اس جزیرے کی سیاست میں حصہ لے رہے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ وہ ایک دن وہاں کے وزیر اعظم ہو جائیں اور تم پر ان کے مندرجہ ذیل ہیں۔ اس وقت دیہاتی میں تم سے ملنے آؤں گا۔ اور تم سے پوچھوں گا تم کتنی آزاد ہو۔ تمہارے لیے جو بری کی میز پر رکھے ہو

میں تک ہیں جن پر زندگی نے اپنے تجربے کئے۔“

”لیکن ہماری طرح سب ہی تو بوجے نہیں نکلے۔“ دیپالی نے دفعتاً بڑی کمزور آواز میں کہا۔ ”بہت ہیں جنہوں نے اب تک چراغ جلانے رکھا ہے۔“

”آل لک ٹو دیم۔“ ریمان نے سگریٹ تالاب میں پھینکتے ہوئے جواب دیا۔

۴۲۔ ناصرہ نجمہ اسمرقادی

روشنی سے گزرتی ایک اداس صورت لڑکی آہستہ آہستہ چلتی آکر تالاب کی منڈیر پر بیٹھ گئی۔

”آداب ماموں جان۔“ اُس نے ریمان کو سلام کیا۔

”جیتی رہو۔“

”آداب دیپالی ماشی۔“

”جیتی رہو۔ آؤ۔ یہاں بیٹھو۔“ دیپالی نے تخت کی طرف اسے بلایا۔

ریمان نے ذرا رکھائی سے دیپالی کو مٹی طلب کیا۔ ”یہ میری بہن راجو کی بیٹی ہیں۔ میں ناصرہ قادری سے ان کا ذکر کر چکا ہوں۔“

”ماموں جان پودا نام بتائیے۔ جیسا آراء لہر حرم نے میرا نام ناصرہ نجمہ اسمرقادی رکھا تھا۔ اور میں ماشی سے مل چکی ہوں۔ جب یہ پچھلی بار یہاں آئی تھیں۔ سن جو سنہ میں۔ اکمل کی شادی۔ اکمل کی۔“

کی آواز ڈوب گئی۔

”مجھے خوب یاد ہے۔ کسی تو ناصرہ۔؟“ دیپالی نے مجھے ہوئے سمجھے میں کہا۔

”آج مجھے معلوم ہوا کہ آپ ویسٹ انڈیز سے آئی ہوئی ہیں۔ سوچا مل آؤں۔“

”بہت اچھا کیا۔ مجھے بہت خوشی۔ بہت خوشی۔ آج کل کیا کرتی ہو؟“

”پہلے جنگ آزادی میں لڑ رہی تھی اب ایک گریڈ کالج میں پولیٹیکل سائنس پڑھاتی ہوں۔ اسی کالج

آپ نے اور جہاں آراء حال نے پڑھا تھا۔“

”تم جنگ آزادی میں لڑیں۔“ دیپالی نے گویا خود ایک اسٹیٹمنٹ دیا۔

”جی ہاں۔ جب پچھلی مرتبہ آپ یہاں آئی تھیں بسن چونسٹھ میں۔ پاکستان ایر فورس کے پائلٹ آفیسر اگل مرشد زادہ کی شادی میں شرکت کے لئے۔ اسی تخت پر اسی طرح ایک شام میں نے آپ سے کہا تھا۔ گو ہم مغربی پاکستان کی زیادتیوں کے خلاف یہ کفر یا کفر پاکستانی ہیں اور پاکستان کی حفاظت کے لئے کھڑے رہیں گے۔“ وہ تلخی سے ہنسی۔

”نامرہ۔ تمہاری والدہ رابعی ہیں؟“ دیپالی نے ٹھکی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

”میرے والدین بھارت میں۔ میرے ماموں جان بھی جیسا کہ آپ ملاحظہ کر سکتی ہیں۔ بکیر و عافیت ہیں۔ اس نے ریمان پر ایک حقیر آمیز نظر ڈالی۔

یہ لڑکی ریمان سے کس حد تک متنفر ہے۔ اور وہ خاموش بیٹھا رہا۔ شاید وہ اس منہ پھٹ، منہ زور، تلخ مزاج، بد زبان نئی پڑھی سے ہانپا ہوا تھا۔ ان سے خائف تھا۔ یا اس کا ضمیر مجرم تھا۔ دیپالی کو وہ وقت بڑا ہی دشت انگیز معلوم ہوا۔ مجھے یہاں سے بھاگنا چاہئے۔ سیاسی گفتگو کو ٹال کر وہ کچھ دیر تک نامرہ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔

اسکوڑکی گڑ گڑا ہٹ۔ فرقان نے اسکوڑا کر سنگھاسن کے بالکل قریب روک دیا۔ ”کیا اڈا ہوا ہے؟“ اس نے خوش دلی سے پوچھا۔

”ہاں۔ تمہاری ہی کسر تھی۔ آؤ۔“ نامرہ بولی۔

فرقان، دیپالی نے پہلی بار غور سے دیکھا اپنے انداز اور پال ڈھل میں باپ سے بہت مختلف تھا۔

”یہ پہلے بھوکے پیڑھی کے ہمدرد شاعر تھے اب پیٹ بھری پیڑھی کے لیڈر بننے والے ہیں۔“ نامرہ نے کہا۔

فرقان نے اسکوڑ پر بیٹھے بیٹھے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے۔ ”شانتی! شانتی!“ اس نے ہنس کر کہا۔

”شٹ اپ! بگس خوننی میسی فیسٹ۔“ نامرہ نے تلخی سے جواب دیا۔ ”معاف کیجئے گا دیپالی دی۔“

ہم لوگ ایک بہت بڑے آگ اور طوفان سے ہو کر گزر رہے ہیں جس کے مقابلے میں آپ لوگوں کی برطانیہ کے خلاف

جدوجہد اور تقسیم ہند کی خونریزی ایک پلنگ تھی۔“

”شاید یہ ہماری خوش فہمی تھی۔“ دیپالی نے عجز سے کہا۔ ”ہم سمجھتے تھے نذر الاسلام کے درد ہی ہم ہی لوگ تھے۔“

”ہم نے بڑی تباہی دیکھی۔ PACIFIST کے بھیس میں کیا لوگ خود سے سمجھوتے نہیں کرتے؟ امن پسند کا ضمیر

کیا کہتا ہے؟ "ناصر نے پوچھا۔" انتخاب کیا ہونا چاہئے؟ امن پرستی یا فلسطینی مجاہد؟ امن یا آپ کے کسلائیٹ؟
 "یہ ایک بنیادی سوال ہے۔ تم شاید اب بھی ہتھیار نہیں ڈالنا چاہتیں۔ تم شاید ٹائیگر صدیقی کو آئیڈیلائز
 کر رہی ہو۔ تم مسلسل سپیم انقلاب کی بات کرتی ہو۔ ناصر وہ آپا تم بہت MIXED UP ہو۔" فرقان نے
 اطمینان سے کہا۔

"یہ ایک بنیادی سوال ہے فرقان احمد۔" ناصر چمک کر بولی۔ "کسی دوسرے کو MIXED UP
 کہنا اوجھا ہتھیار ہے۔ دیپالی ماشی۔ یہ سارا خاندان۔" اس نے ارجمند منزل کی طرف اشارہ کیا۔ "اور ہزاروں
 لاکھوں ارے گئے۔ میں نے مرگ انہو دیکھا۔ میں نے ٹاکے مذہب کاروں دیکھا۔ میں نے بنگالی پنجابی کی نفرت اور بنگالی
 بیماری کی نفرت کا سامنا کیا۔ سیاسی لیڈر کاروں دیکھا۔ فرقان احمد! جس وقت ہم یہاں مشین گنوں کا سامنا کر رہے تھے
 تم اپنے باپ کے پیسے کی بدولت لندن میں مصروف عیش تھے۔" وہ دیکھان کو اس طرح نظر انداز کر رہی تھی جیسے وہ
 اس جگہ موجود ہی نہ ہوں۔ چند منٹ بعد وہ اٹھ کر نزدیک روش پر شہنہ لگے۔ دیپالی نے ذرا بے آرامی سے پہلو بدلا۔
 دیوانی مالا جو اس دوران میں کوشی کے اندر جا چکی تھی۔ دوبارہ کھپتی کی طرح سڑاٹا آ کر سنگھاسن کے قریب تالاب
 کی ایک سیڑھی پر بیٹھ گئی اور بھٹی بھٹی خالی خالی نظروں سے ان تینوں کو دیکھنے لگی۔

اب ناصر فرقان سے کہہ رہی تھی۔ "سومنزم اور QUIETISM اور امن پرستی بڑے خوبصورت الفاظ
 ہیں لیکن تمہارے دلیمین اور سال پیئر اور جرمی نیٹھم آج تک ایک ہندو کی گولی نہ روک پائے۔ گاندھی نے جرمو
 یہودیوں سے کہا تھا ہٹلر کے مقابلے میں انہسا استعمال کریں۔ ہا ہا ہا۔ جب یہاں ڈھاکا گھبرا ہوا تھا اس وقت میں دلیم جیم
 اور برٹریڈ رسل کی دہائی دیتی؟ اور تمہارے جارج فاکس کی۔؟ اور تمہارے ٹالسٹائی کی؟"

"ایمرسن۔ جانتی ہوں ناصر آپا ایمرسن نے کہا ہے کہ جگہ میں دلچسپی ایک کچے اور امپجور ذہن کی علامت ہے
 ایک آدمی کے قتل کی سزا چھانسی ہے مگر ہزاروں لاکھوں قتل کر دئے جاتے ہیں۔ ان کے قاتل قومی ہیرو اور جانا باز
 اور مادر وطن کے سچوت کہلاتے ہیں اور پھر ایک اجتماعی قتل کو ناجائز قرار دینے کے لئے ایک اور اجتماعی قتل کہہ
 جاتا ہے۔ ہم بنگالیوں کو ایک کمزور رو میں شک شعر پرست بودی قوم سمجھا جاتا ہے مگر ٹیٹو تیر سے لے کر ٹرڈ سٹ
 موڈ منٹ تک اور جب سے مکتی بانہی اور کسلائیٹ تحریک تک سب سے زیادہ تشدد دیہیں ہوا ہے۔ فرقان نے کہ
 "اچھا۔ تو میں تم سے ایک سوال کرتی ہوں۔" ناصر نے جوش سے بات کی۔ "آئین اسٹائن بڑے امن
 تھے کیا اگر وہ اس وقت زندہ ہوتے تو اسرائیلی EXPANSIONISM کے موافقت نہ کرتے؟ مزدور

غرب کے جتنے یہودی جتنے زیادہ عالم فاضل اور ہیروئنسٹ ہیں اتنے ہی زیادہ وہ فلسطینیوں کے مخالف ہیں۔

”مغرب میں تھوڑے سے یہودی اٹلکچوئیل اعتدال پسند بھی ہیں۔“ دیپالی نے پہلی بار بحث میں حصہ لیا۔ وہ ایک بہت بعد اس مانوس خالص بنگالی ”اڈے“ میں شریک تھی۔ مگر اس زبردست جزیئن گیپ کا بھی اسے شدید احساس تھا جو اس وقت اس کے لورن دونوں کے درمیان حائل تھا وہ ان سے بحث کرتے ہوئے ذرا جھجکتی تھی۔ غالباً ڈٹ آف ڈیٹ ہو چکی تھی۔ ماضی کے ”اڈوں“ کا پرانا ساتھی ریخاں اپنے خیالات میں کھویا ڈور ردشن پر ٹپنے میں عروفت تھا۔ اودہ بھی اب اس کا ساتھی نہ رہا تھا۔

”ہرزہنی ودیہ نکاس کی پیداوار ہے۔ امن پرستی سے بھی چند طبقوں کا فائدہ ہوگا۔ آپ پہلے فیکٹری اور بیجائیے اور پھر امن کا پرچار کیجیے۔“ بھونے اپنے ماموں اور ماموں زاد بھائی پر کھٹی چوٹ کی۔ فرقان خوش دلی سے ہنساتا۔ ”اور اب شاید تم مذہبی بھی ہوتے جا رہے ہو۔“ ناصر نے کہا۔

”مذہب میں امن کی اصل روح ہے۔“ فرقان نے سنجیدگی سے جواب دیا

”یقیناً! دیپالی آٹھی۔ آپ کو کچھ اندازہ ہے۔ سی۔ آئی۔ اے نے سوامیوں کے ذریعہ کتنا بڑا جال آدمی ستا میں پھیلا دیا ہے؟“

”ناصرہ آیا۔ ڈونٹ بی ڈانٹ“ فرقان نے برطانوی لہجے میں کہا۔ ”کسی کو چھینک آئی اور تم نے کہا یہ سی۔ آئی۔ اے کی کارستانی ہے۔“

”اور وہ کتنے کامیاب ہیں“ ناصرہ کہتی رہی۔ ”وہ ایک موٹا مسخرہ بال لوگی جو امریکہ میں ہے۔ ایک مشہور لیٹرن نو جوان انقلابی، نیولفٹ کالیڈر اس کا چچا بن گیا کیا نام اس کا میں نام بھول رہی ہوں اور جملہ بننے کے بعد اس نے پریس کو بیان دیا۔ — THE REVOLUTION IS OVER BABY!“

”ناصرہ آیا۔ بات یہ ہے کہ اب یسوع بھی میرا ہوسے اور حسین بھی اور حسین کی نسل کے آٹھوں QUIETIST نام۔ وہ اصل QUIETIST تھے اور حشٹی صوفیاء۔“

”افیم کا تم پر پوری طرح اثر ہو چکا ہے۔“ ناصرہ نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”مذہب کی امن پرستی! مغرب میں دونوں طرف کی فوجوں کے ساتھ فوجی پادری جاتے ہیں۔ ایک ہی خصلت سے فتح کی دعا مانگتے ہیں جو دونوں طرف کے مرنے والوں کے لئے ایک ہی خدا اور اس کے بیٹے سے جنت طلب کرتے ہیں۔ انڈیا پاکستان کی جنگوں میں ایک طرف کے جوانوں کی تصویریں ساتھ لے جاتے ہیں۔ سمت سری اکال کے نعرے لگاتے ہیں۔ دوسری طرف نعرہ نکلیں اور نوٹس“

اور یہاں تو سن اکتیس دو دہائیوں طرف اسلام ہی اسلام تھا۔ "ناضرہ چپ ہو گئی۔ پالش کے نیچے گہریاں نقشہ ہیں
تھیں۔ سلتھن اپنی سرخ کنول کھلتے تھے۔ دیپالی کو خیال آیا الیر کا میونے کہا تھا۔ انسان کے مسلسل بہم
سوالات اور کائنات کی مکمل خاموشی۔

ناضرہ پھر گرج کر لوئی۔ کبھی چرچ آف انگلیٹنڈ نے یا یو یو پ اور امریکہ کے قومی کلیساؤں نے ان جارجانہ
لڑائیوں کو ڈناؤنس کیا جو ان کے لوگوں نے ساری دنیا میں لڑیں؟ پچھلی جنگ میں پوپ نے ناسیوں اور
فسطائیوں کو ڈناؤنس کیا۔؟ اور یہاں تو۔۔ ہمارا یہ پورا دیس ہی مولویوں کا دیس ہے۔ پاکستان کے
علماء نے اس جنگ کو ڈناؤنس کیا؟ دونوں طرف ایک سے ایک بڑے مولانا موجود تھے۔ یاسمین خاں موجود کی
مثال پیش کر دیں۔؟

"کیا مثال۔؟" فرقان نے اب ذرا دھیان سے پوچھا۔

"یاسمین خاں، شاید تمہاری پیدائش سے بھی پہلے ولایت چلی گئی تھیں۔ سگن گیجے کے مولانا مجید اللہ
کی بیٹی۔ پہلے انہوں نے قصہ اپنا کیریر بنایا۔ پھر انہوں نے ولایت میں ایک انگریز فیشن ڈیزائنر سے شادی
کر لی۔ مولانا مجید اللہ نے ان کو عاق کر دیا۔ حکم صادر کیا کہ کبھی ان کو اپنی شکل نہ دکھائیں۔ یاسمین خاں کے
اپنے لاشعور میں مولویت رچی ہوئی تھی ان کو معلوم تھا کہ انگریز فیشن ڈیزائنر جرنل ایڈرین بلونٹ سے
ان کا نکاح قطعی ہو گئی تھا ایک FARCE ایک پاکستانی نقلی مولوی صاحب، جو دراصل ایک دوست
تھے اور گواہ لوگ سب نشے میں آؤٹ۔ تو احساس جرم نے یاسمین خاں کو رستا نا شروع کیا۔ پھر اپنی لڑکی کو
اپنی اجازت سے محبوس انہوں نے عیسائی بنوایا۔ پھر وہ لڑکی نیوٹن ڈال بن گئی۔ یاسمین خاں کو ان کے احساس جرم
نے مار ڈالا۔ ان کا ضمیر ان کو کھا گیا۔ ٹھیک۔؟ مجھ کو یہ سب اس طرح معلوم ہے کہ جب ان کو دوسری
بار ویسٹ جرمنی میں ہارٹ ایٹک ہوا انہوں نے امی کو بڑا اندوہناک خط لکھا تھا۔ مفصل۔ اور آخر میں لکھا
تھا کہ رابعہ آپا اگر میں برطانیہ میں مرجاؤں یہاں نہ جانے میری لاش کا کیا حشر ہو۔ میری موت کی اطلاع پر
ڈھلک کے کسی مسجد میں میری غائبانہ نماز جنازہ ادا کروا دیجئے گا۔ اچھا تو مولویوں نے یاسمین خاں کو محافظ نہ
کیا۔ لیکن جب یہاں کی ہزار ہا لڑکیاں ریپ ہوئیں۔ سینکڑوں کو مجبوراً طوائف بننا پڑا تو عالم اسلام کے کسی
مولوی نے کچھ نہ کہا۔" ناظرہ چپ ہو گئی۔ اس کا چہرہ تہمتار ہا تھا۔

یہ لڑکی اصل باغی ہے۔ بد روپی۔ ہم لوگ شاید اس حد تک باغی نہیں تھے۔ دیپالی نے سوچا۔ دودھری

”اُد آپ کو معلوم ہے دیپالی ماٹھی۔ لوگوں کو کس طرح مارا گیا؟ ان کو اسپتال لے جاتے تھے وہاں کمری
رہ کر ان کے جسم کا سارا خون نکال لیا جاتا تھا۔“ دفعتاً وہ زلمو قطار روٹنے لگی۔

AND WOMEN MUST WEEP

AND WOMEN MUST WEEP

دیپالی نے دل میں دہرایا اور خود اپنے آنسو پونچھے۔

”تو پھر کیا میں نہ ماتی۔“ میں نے بھی کو میلا میں اپنے پستول سے ایک پنجابی فوجی سپاہی کو گولی باردی۔ اور
جانکنی کا کرب، اس کا ترپنا اور اس کا مرتا ہوا چہرہ۔ مرتا ہوا چہرہ مجھے براہِ خواب میں دکھائی دیتا ہے۔
”کیا کرے۔ انسان کہاں جائے؟ کس طرف جائے۔“ اس نے آنسو خشک کرتے ہوئے پوچھا۔
”ناصرہ آیا۔“ فرقان نے آہستہ سے کہا۔ ”میں نے لندن میں ایک بہت بڑی بھائی فلم دکھی تھی۔
فیر انٹی وار فلم PATHS OF GLORY پہلی جنگ عظیم کے متعلق اس جنگ کے زمانے کا ایک
ایلی مارلین دونوں طرف مقبول تھا تو دیپالی آٹھی۔ اتحادی سپاہی ایک جرمن لڑکے کو پکڑ لاتے ہیں اُد
سے ایلی مارلین گواتے ہیں۔ اور گاتے گاتے وہ رونے لگتی ہے۔ اور سپاہی خود بھی جذباتی ہو جاتے ہیں۔ اُد پھر
ایک۔ شاید نو عمر بھائی سپاہی ہے جو بہت خوفزدہ ہے۔ اور وہ مورچہ چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔
سے پکڑ کر واپس لاتے ہیں۔ بھگوڑے کی سزا موت ہے۔ وہ بیمار پڑتا ہے اسے فیلڈ ہسپتال میں داخل
ہیں۔ اس کا علاج کرتے ہیں۔ جب وہ ذرا بہتر ہوتا ہے اسے اسٹریچر پر ڈال کر میدان میں لاتے ہیں۔ پھر
فوجان کو ایک کھمبے سے باندھ دیتے ہیں۔ اور پھر فوجی قانون کے مطابق اسے گولی مار دیتے ہیں۔“
ریحان واپس آچکے تھے اور گلاب خاص کے نیچے کھڑے یہ قہقہے سن رہے تھے۔ اہوں نے آہستہ سے کہا۔
”میں بھی بھگوڑا ہوں۔ ناصرہ۔ تم۔ اور دیپالی تم۔ میرے لئے جو سزا چاہو تجو بر کرو۔“

بڑا دھشتناک سناٹا چھا گیا۔ شام کی ہوا میں جھاو کی نازک ڈالیاں سرسرا رہی۔
ناصرہ نے سر اٹھا کر پہلی بار ذرا نرمی سے اپنے مضمحل ماموں پر نظر ڈالی اور دھیرے سے ہب ”لیکن ماموں
کیا روسی افواج ا رپورٹ کے عوامی محاذ والوں کی سرفروشی کے بغیر فسطائیت کو سہارا جاسکتا تھا؟
عی جنگ بھی جرم ہے؟“

”یہ سنا لائقا ہی ہے؟“ باپ کے بجائے فرقان نے جواب دیا۔ ”البر کا میون نے جنگ کے فوراً بعد

لکھا تھا کہ کسی ایسی سچائی کو منظور کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں جس کی رو سے بالواسطہ یا براہ راست کسی کی زندگی کی قربانی کا مطالبہ کرنا پڑے۔ کیونکہ اس وقت دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد دنیا ٹوکیر میں داخل ہو چکی تھی۔“

اوپر جہاں آڈار کے میڈروم کی کھر کی کھلی۔ تیز روشنی کا راستہ ساتالاب تک بن گیا۔ زہرہ نے دیر میں سے جھانکا۔ پھر اس نے آواز دی۔ ”اڈا ختم کرو۔ کھب سے یاسین یادگار کیٹلی دلے کا خون آیا ہے۔ وہاں نوکھن کا ڈر پر انتظار کیا جا رہا ہے۔“

”آ۔ آ۔ آ۔“ تالاب کی سیڑھی پر بیٹھی گوگلی مالا بڑائی۔

۴۳

ریچرڈ بارلو

ڈنر کی طویل میز پر بہت بڑھیا دلایتی کھانا سرو کیا جا رہا تھا۔ ہال کے ایک کونے میں پھولوں سے سجی یاسین بلونٹ مرحوم کی تصویر رکھی تھی۔ شہر کے اہم افسرکچوں میں اخبار نویس، ادیب، چند و دربار اور باقی نئی دولت مند بنگلہ دشی اہم کلاس کے مرد اور عورتیں چھری کاٹھوں سے کھانے کھاتے ہوئے مصروف گفتگو۔ تاریخ کے اسباق سے انسان کی نصیحت حاصل نہ کرنے کا نام تاریخ ہے۔“ بھری مقاب پھیلیوں اب بھی چھپتا مار رہے ہیں۔

کھانے کے بعد وہ سب جا کر ایوان نشست میں بیٹھ گئے۔ ریمان الدین احمد بشارت اسکن کی سٹیروائی چوڑی چارپا بجامہ سلیم شاہی جوتے، سلوڈ گروے بالی، پہلے سے زیادہ ہیڈ سم نظر آ رہے تھے۔ اس جگہ جگمگاتے مجمع میں اب بھی بیرونی ہوئے تھے۔ اہم کامیاب، دو لختند۔ کل صبح ارجمند منزل۔ بریکفا سٹکی میز پر وہ صاف گوتی سے کہہ رہے تھے۔ میری موجوداتی کی روح خوش ہوگی جن کے ساتھ ا۔ تانیا نے بے لطفائی کی تھی۔ ان کی جائداد ہڑپ کر کے ان کو ایک غریب کسان سے بیاہ دیا تھا۔ مگر قدرت۔ اب ان کے ساتھ انصاف کیا۔ وہ یہ سن کر بھی بھگتی رہ گئی۔ انسان کا ذہن، انسان کا دل و دماغ قطعاً نا فہم ہے۔ انہوں نے کہا تھا۔ دیکھو میں نے مدتوں پہلے متحدہ بنگال میں جو تیاں جٹیاں۔ جیل کاٹے پھر

بنگال میں۔ پھر جب مجھے وہاں اور یہاں چانس ملائیں اسے دونوں ہاتھوں سے قبول نہ کرتا؟
 شام نامہ رونے لگا تھا فرقان بھوکی پیڑھی کا شاعر بننے جا رہا تھا اب وہ اس ہیٹ بھری پیڑھی کا لیڈر ہو گا۔
 کھانا نہایت لذیذ تھا رکتب کے چیف شیفت نے بہترین فرانسیسی دشین تیار کی تھیں وہ سپالی نے دوبارہ
 سوچا اس "جشن یاسمین بلونٹ" پر کتنا بے تحاشہ روپیہ خرچ کیا گیا ہو گا۔ جبکہ خود یاسمین نے برسوں در در کی
 ٹھوکریں کھائیں اور کارخانوں میں مزدوری کی۔

سیاہ چاند پہاڑ کی چوٹی سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ یاسمین ہم کیسکی کا پھول تھیں جس نے سانپوں کو
 اپنی اور کھینچا۔ زندگی کے سانپ ہمیں ڈس گئے۔

اس کے قریب ایک گردنیا کپتان اور بنگلہ دیش کی سیاست پر تبادلہ خیالات کر رہا تھا۔ "ہم نے یہ کیا۔
 انہوں نے یہ کیا۔"

انگریز یا فرانسیسی یا جرمن کہتے ہیں۔ ہم نے یہ جنگ لڑی۔ ہم نے وہ فتح حاصل کی۔ ہم نے فلاں ایکٹ
 پاس کیا۔ اس سب کو ٹینٹ کی ہسٹری میں "ہم" کہیں نمودار نہیں ہوتا۔ مغلوں نے یہ کیا۔ ہندوؤں نے
 یہ کیا۔ پہلے اڈیا اور پاکستان الگ الگ "ہم" تھے۔ اب بنگلہ دیش اور پاکستان الگ الگ "ہم" ہیں۔
 اچانک اس نے خود کو کہتے پایا: "اگر حیدر صاحب نے پاکستان بنایا ہوتا تو آج بنگلہ دیش
 بھی نہ ہوتا۔" پھر وہ خاموش ہو گئی۔ اودوہ سوچنے لگی۔ "مدرانڈیا" کا تصور بھی باقی ہندوستان کے قوم
 پرستوں کو دہشت پسند ہندو بنگالیوں نے دیا تھا جو تحریک پسند کالی کے روپ میں شکیں کی پوجا کرتے تھے اور
 دیوی ماں کے قدیم دراوڑی تصور کے پرستار تھے۔ اور ان اولین دہشت پسندوں میں جن کو انگریزوں نے
 ٹرےسٹ کہا اور ہندوستانیوں نے انقلابی۔ کافی اینٹی مسلم بھی تھے۔ اور بنکم چندر کا آئندہ دشمن ان کا
 آدرش تھا۔ اور "مجھرا لوگ" کی سیاست اور "مسلم اشراف" کی سیاست کے CROSS-CURRENTS
 نے پاکستان بنایا۔ اور پاکستان کی سیاست نے بنگلہ دیش۔ اور انفرادی طور پر مختلف لوگوں کی شخصیتوں
 اور کرداروں اور مزاجوں اور اعمال و افعال کے CROSS-CURRENTS کے اثر سے افراد کی اور قوموں کی
 زندگیاں بنی اور بگڑتی ہیں۔

وہ جھجھلا کر سامنے دیکھنے لگی جہاں آکر سٹراٹج رہا تھا۔ اور فلور پر ریحان الدین احمد کا کیمبرج پلٹ
 پڑا فرقان بھڑٹا نوی سفارت خانے کی ایک لڑکی کے ساتھ معروف رقص تھا۔ اس لڑکے کی تازہ ترین ذہنی

جدید، عصری مغرب کی نوجوان نسل کے ذہنی ردیوں نے کی تھی۔ وہ برطانیہ اور فرانس کے "نیولٹ" اور طلحہ علی کے دور کے بعد کی پروڈکٹ تھا۔ کیا اس امن پرست اٹھکچوئیل فرقان احمد کو معلوم ہے کہ ایک زمانہ میں انقلابی نظیہ کھنکھنے کی سزا کا لاپانی تھی؟ کیا ہم پرتالیخ کے دروازے بند کر دئے جائیں گے۔ میرے چچا دیش چندر سرکار بھانسی کے تختے پر کیوں لٹک گئے؟ ان کا نام اب کسے یاد ہے؟ یا اشفاق اللہ کا؟ اور اس باغی ناصرہ نجم السحر کا کیا ہوگا؟ کیا بہت جلد وہ خود بھی اپنے موجودہ خیالات کو ترک نہیں کر دے گی؟ کیا کسی ایسے نئیے کے BACKLASH کے طور پر کھڑی نیا روئے نمودار نہیں ہوگا؟ ناصرہ کب تک باغی رہ پائے گی؟ جب انقلابی مسلسل ایک دوسرے کو REVISIONIST کہہ رہے ہیں جب خود انقلابی اعتدال پسندوں کو انتہا پسند ایک ESTABLISHMENT بلکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور جب لیڈروں کے ذاتی کرداروں اور ان تعصبات، کمزوریوں اور ان کے مزاجوں اور اعصابی کیفیتوں کا اثر ان کی رہبری پر پڑتا ہے؟ یا انٹیک جو مسافر بردار طیارہ اڑاتا ہے۔ اس کی صحت اور اعصاب کا برابر موازنہ کیا جاتا ہے۔ مگر لیڈر کی ذہنی اور اعصابی صحت کو بالکل نظر انداز کیا جاتا ہے۔

ہم لوگوں نے، ہماری جرنیشن نے کیا کیا۔؟ اب ایسا لگتا ہے کہ ہم لوگ چچا ٹیکر تھے راستے کے کنارے کھڑے انگوٹھے دکھا رہے تھے۔ ایک کار کی اس نے لفٹ دے کر ماسکو سپنچا دیا۔ دوسری کار کی اس نے واشنگٹن۔ کچھ لوگ اونٹ پر بیٹھ کر مکہ مدینہ واپس گئے۔ کچھ میل گاڑی پر بیٹھ کر بنارس۔ میرے لئے جو کار کی وہ ذرا آگے جا کر ہی فیل ہو گئی۔

بنگال کی دلشومیت میں ہر مرد کرشن اور ہر عورت رادھا کی تصویر ہے۔ گو اس کو ایہ بات معلوم نہیں۔ تو کیا ریمان کرشن تھا اور میں رادھا۔؟ لوکین میں میں ہی سمجھا کرتی تھی۔ ابھی گرمیاں آئیں گی اور یہاں میرے اس پیارے حسین دیس میں قدم کے دل کی شکل والے پتوں میں زرد پھول کھلیں گے۔ لاکھ کے پیڑ پھولوں سے لد جائیں گے۔ سلطانہ چنپا مہکے گی۔ برسات آئے گی۔ ساگوان کے سفید پھول۔

"آپ، مجھے مسٹر ریمان الدین احمد نے بتایا کہ برطانوی راج کے خلاف بنگال کی انڈر گراؤنڈ انقلابی تحریک میں شامل رہ چکی ہیں۔" ایک صحافی نے قریب آکر بیٹھتے ہوئے اس کا سلسلہ خیالات منقطع کر دیا۔ "کل صبح میں آپ کا انٹرویو لے سکتا ہوں۔ مع تصویر۔؟"

"ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ چلے جائیے میرے پاس سے۔" اس نے تقریباً چلا کر دشت سے جواب دیا۔

نک کہ اس کی طرف دیکھنے لگے۔

آئی ایم سوڈی مسز سین۔ ”صحافی نے نرمی سے کہا اور وہاں سے ٹل گیا۔

”عجیب بد مزاج بڑھیا ہے۔“ اس نے باہر جا کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔

اب گلیوش ڈانس پر تقریریں شروع ہو چکی تھیں۔ مادام یاسمین بلونٹ مرحومہ کو خراج عقیدت وضع تھا ان کے فن کی عظمت پر روشنی ڈالی جا رہی تھی۔ ابھی اس سے بھی تقریر کرنے کے لئے کہا اس آخر اسی مقصد کے لئے اسے آئی دور ویسٹ انڈیز سے مدعو کیا گیا ہے۔ عجیب بات تھی۔ اس سے میں آج تک کسی نے گانے کے لئے نہیں کہا تھا۔ شاید لوگ یہاں کب کے بھول چکے تھے کہ وہ عباس لڑیں شاگرد تھی۔ کہ ایک زمانے میں اس کے ریکارڈ گھر گھر بچتے تھے۔ کہ وہ آل انڈیا ریڈیو ڈھاکہ سے گاتی تھی۔ وپاکستان ڈھاکہ بنا اور اب ریڈیو بنگلہ دیش۔ آواز کی لہریں۔

ریحان نک نے یادگار کیٹی والوں سے نہیں کہا تھا کہ وہ تقریبات میں کسی روز اس کے گانے کا پروگرام ہیں۔ ہر طرف عجیب کنفیوژن تھا۔ ریحان اب بائی فنانس کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ ناقابل یقین! وہ ہال کے ایک کونے کی نشست پر جا کر بیٹھ گئی۔ اب ایک اور نوجوان اس کی طرف آیا۔ جھک کر ہم کو معلوم ہوا ہے کہ آپ کے پاس مادام یاسمین بلونٹ کی ڈائری ہے۔ کیا آپ اسے ہمیں عنایت کریں گی؟ بڑے شاندار طریقے سے کتابی صورت میں چھپوائیں گے۔ وہ ایک ادبی شاہکار ہو گا۔“

دیپالی کا چہرہ طیش سے سرخ ہو گیا۔ اُس نے زہریلی نظروں سے نوجوان کو گھورا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بڑی جواب دہانہ اور تیز تیز جلتی ایوان نشست سے باہر نکل آئی۔ اور برآمدے کے آخری در میں جا کر کھڑی ہو ماضی جاننے کے درختوں پر پونم کا چاند نکل آیا تھا۔ وہ چاند بھی بہت پشیمان معلوم ہوتا تھا جس طرح ان تھی۔ اور اندر سے دل ہی دل میں ریحان نام تھا۔ اور اور یاسمین تو اتنی کھٹکتی تھی کہ اس دنیا ہی سے نکلی تھی۔

در کے نزدیک کبھی چھوٹی میز پر ایک سفید فام نوجوان تنہا بیٹھا ڈنر کھا رہا تھا۔ ایک خاتون کو کھڑا دیکھ کر مغربی تہذیب کے مطابق تعظیماً وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

”اندر اتنا ہجوم ہے کہ میں گھبرا کر باہر آگئی۔“ دیپالی نے کھوکھلی آوازیں کہا۔ ”اس عمر میں انسان زیادہ بڑا کاہل و اشتہت نہیں کر سکتا۔ میں بہت دور سے آئی ہوں۔ ویسٹ انڈیز سے۔ یہاں بیٹھ جاؤں

”شیور۔ میم۔“

وہ مقابل کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”میں کرسٹوفر ٹیگرٹ ہوں۔ میں یہاں سیر کے لئے آیا ہوں۔ اس وقت بچے ایک دوست کا انتظار

ہوں۔ اب تک نہیں آیا۔ اے لیجئے وہ آ رہا ہے۔“

ایک اور سفید فام سنہرے بالوں والا نوجوان لمبے لمبے ڈگ بھرتا اگر مزے کے قریب کھڑا ہو گیا۔

”رجرڈ بارلو۔“

”سنزین۔“ ہاؤ ڈو یو ڈو۔“

”ہلو۔“ سنزین نے کان کھڑے کئے۔

”یہ واقعی بہت مختصر دنیا ہے۔ میں تمہارے والد کو جانتی ہوں اور تمہارے بھتیجے چند روز

ایٹھنز کے راستے میں ملی۔ تمہارا سوتیلا بھتیجا سوامی آتم انڈسٹریز پر گیا۔“

”اوہ۔ آتم انڈسٹریز کی گئی گائے۔“ ڈگ بارلو نے شفقت سے مسکرا کر سر ہلایا۔

”وہ اگلے مہینے رشی کشیش میں تمہارا انتظار کرے گا۔“ سنزین نے کہا۔

ڈگ کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ اٹھائیس سال کی عمر میں کامی

انٹرمیڈیوٹریئر بن چکا تھا۔ مگر زندگی سے مطمئن نہ تھا۔ اس کے دوست کرسٹوفر نے اس کے لئے میرے

کا آرڈر دیا۔ ڈگ نے کہا۔ ”آرکھرو لیسکر نے کہیں پر لکھا ہے کہ اتفاقات کا سلسلہ عقل چکر اڑیتا ہے۔“

دیکھئے سنزین۔ آپ کی میرے بھتیجے اور مجھ سے ملاقات !

”سہمی زندگی اتفاقات کا ایک طویل سلسلہ ہے۔“ دوسرے انگریز نوجوان کرسٹوفر ٹیگرٹ۔

بہت زیادہ ذہین معلوم نہ ہوتا تھا۔ فلسفیانہ انداز میں اظہار خیال کیا۔

میرے نے پھلی کی ڈش ملا کر رجرڈ بارلو کے سامنے رکھی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں سبزی

چکا ہوں۔ میرے لئے سلاڈے آؤ۔“ یہ ٹھٹھکی۔ اس نے دیپالی کو مخاطب کیا۔ ”کیا معلوم میری مرحو

پھو بھی مس ایلس بارلو یہ پھلی رہی ہوں۔ وہ گارڈن میں خشری تھیں۔ اور لان کی بھی پھو پھیاں۔ میری

گریٹ نکٹ۔ خشری قبل بارلو سیتاپور میں پیضے سے مرے۔ اور مس ہاؤ بارلو چینی میں مشن چلاتی تھیں۔

باکسٹریڈاؤٹ کے دوران جینیوں نے مار ڈالا۔ آنٹ ایلس کو کاروبار میں کیونسلٹ قبائیلوں نے قتل کر دیا۔

اپنے خیال میں شہید ہوئیں۔ اس وقت اردو پہلے پراگائے نور کے ہائے پہنے یسوع مسیح کے سامنے
میں گا ہی ہوں گی۔ میٹھوڑ سٹ محمد۔

THERE IS A HAPPY LAND

FAR FAR AWAY

WHERE THE SAINTS IN GLORY

STAND BRIGHT BRIGHT AS THE DAY."

وہ لگنا لگا۔ وہ متواتر شراب پی رہا تھا اور اس کا عرق آلود چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ منتر میں
یہ آسٹریلیا میں بھی اسکول میں یہ حمد گایا کرتا تھا۔ لیکن یہی لینڈ کہیں نہیں ہے۔ یورپ، امریکہ،
تھان، بنگلہ دیش، انڈیا، پاکستان۔ کہیں نہیں۔ اور میرا سوتیلہ بھتیجا سوامی آٹم آئنڈ شکر کری
ہے ہم سب اپنی اپنی کرموں کا پھل۔ کھاد ہے ہیں۔ اور اپنے سنسکاروں کے مطابق میری بے چاری
نا چھوڑا خشک مزاج مجھ و مقدس آئنٹ ایلس دوسرا جنم لے چکی ہوں گی۔ تو کیا پتہ وہ اس ٹھٹھکی کی جوت میں
لنگال کے ایک دیہا میں پیدا ہوئی ہوں۔ اور وہ ٹھٹھکی اب اس پلیٹ میں میرے سامنے تلی ہوئی رکھی ہو۔
بے چاری آئنٹ ایلس بارلو کو کس طرح نوش کر سکتا ہوں۔ ۱۱۱۱۱۱

اب اس نے کرسٹوفر ٹیگرٹ کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے پکارتے لگا۔ دیپالی دفعتاً شدید کراہت
ماٹھ دوسری طرف دیکھنے لگی۔ ڈک بارلو کہتا رہا۔ "سز سین۔ میم۔ گوئیں۔ 81 ہوں مگر کچھ کرسٹوفر
نہت ہے کہ تھام دو لوں شادی بھی کر لیں۔ آپ کو ہتھ ہے GAY شادیاں اب کافی ہونے لگی ہیں۔"

کرسٹوفر ٹیگرٹ نے شراب زیادہ نہیں پی تھی اور اپنے ہوش و حواس میں تھا۔ وہ دیپالی سین کے سامنے
پکڑ کر سرخ ہو گیا۔ اندر ہال میں یا سین بلونٹ مرحومہ کے متعلق تقریریں جاری تھیں۔ دیپالی نے کہا۔ "اچھا
نٹ۔ اب میں چلتی ہوں۔"

ٹوک نے دہرایا۔ "کیا پتہ اس پلیٹ میں آئنٹ ایلس بارلو تلی ہوئی رکھی ہوں یا گریٹ آئنٹ سیل ان کو
SIZZLER پرتا گیا ہو۔ چھن چھن چھن۔ ہم سب SIZZLER پر تلے جا رہے ہیں۔ آپ بھی میں بھی
ب۔ میں۔ 81 ہوں۔ اگر میرے بنگال سولین امپر پلیٹ بارلو ہنز گول کو اور نا سو گریٹ گریٹ فادر
یڈورڈ بارلو احمد میرے چچا بنگال کماڈر رچرڈ بارلو کو جن کے اسم گرامی پر میرا نام رجسٹرڈ ایڈرڈ بارلو رکھا گیا۔

معلوم ہو جائے اور میرے خاندان کی ان نامور موجودہ مشنری خواتین میں مثلاً، بیبل، آڈ، آلیس کو معلوم کہ چارلس بارلو آئی۔ سی۔ ایس کا ایک پوتا جیمز و سوامی بن گیا اور جیمز بارلو کا ایک پوتا، چارلس بارلو کا gay۔ تو ان کی قبروں کے اندر۔ قبروں کے اندر بھونچال آجائے گا۔ مسز سین آپ اب بھی ہیں۔ ہم now جنریشن والے صاف گو لوگ ہیں۔ ریا کاری آپ لوگوں کا اور آپ کے پرکھوں کا تھا۔ میرے بار تو بزرگ اور ان کے ساتھی جب MERRY انگلینڈ کے پبلک اسکولوں میں پڑھتے بھی gay ہو کر رہتے تھے۔ مگر اوسکو وائیلڈ کو پرسیکیوٹ کرتے تھے۔ لیڈی جیٹریز اور ممنوع تھی خواتین وہی سب کرتی تھیں۔ آپ بہت جاذب نظر خاتون ہیں۔ میں۔ 81 ہوں۔ کیا آپ محض HERO ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو صد مرہ پہنچایا۔ آپ غالباً ایک CLOSET CASE وہ جلدی سے اٹھ کر تیز قدم رکھتی واپس کلب کے اندر چلی گئی۔

۴۴

آتما رشانہ۔ ۹

ہنگلہ دیش بھان سے ڈم ڈم پر اتر کر وہ سیدھی ریلوے اسٹیشن گئی۔ پھر ڈکلاس کا ٹکٹ لیا۔ ۱۰ کے تیس سال بعد کے ہندوستانی عوام کو قریب سے دیکھنا چاہتی تھی۔ ٹرین نکلتے سے نکلی۔ پرانے ٹھکوں اور اینٹ انڈیا کمپنی کے کافی آلود و منزلہ بنگلوں کے برابر سے گزرتی۔ بولپور روانہ ہوئی۔ مقابل کی سید ایک بوڑھی بنگالی بیوہ بال حنڈائے سفید موٹی دھوتی کے آنچل سے سر ڈھانپے اکڑوں بیٹھی تھیں۔ انہماک سے کدو کے بیج نکال رہی تھی۔ نوکیلی مونچھوں والا ایک تنومند لباس ترکھا پور بی بھیا گلے میں تہ پہنے اپنی چار سالہ بچی کو گود میں بٹھائے کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ بچی کی مانگ میں گہرا سید ورج چائیلڈ میرج اب بھی موجود ہے۔ اسے یہ دیکھ کر دھکا سالکا۔ کونے میں تین طالب علم ایک سیاسی میں مصروف تھے۔ پھر انہوں نے اکتا کر ایک ساتھ لمبی جمائی لی۔ دوسرے کونے میں ایک بد صورت مارو عورت کارچوبی نائیلون کی گلابی ساری کے آنچل کا گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی تھی۔ ایک اندھا دلشون بھکا ایک تارہ بجاتا بھیکا مانگتا کو ریڈور میں سے گزرتا دے تے میں آیا۔ اور مادھو آچار یہ کا مدھر اشتک اللہ اپنے لگا

دے جانے کیا کر رہے ہوں گے۔ وہاں اس وقت نہ جانے کیا بجا ہو گا۔ ادھر۔ اب یہ سوچنے میں کون سرگمیا
 کہ اس وقت وہاں کیا بجا ہو گا۔

بے رونق ڈانٹنگ ہال میں جا کر اس نے بڑبڑہا کھانا کھایا۔ ہدیزہ کھانا۔ بے نیلے لوگ۔ پہلی بار اسے
 احساس ہوا جنوبی امریکہ میں اٹھا۔ کچھ سال گزرنے کے بعد وہ اس جگہ کے لئے اجنبی ہے۔

صبح تیز دھوپ میں وہ اپنی پرانی مادر در سگاہ پہنچی۔ بے رنگ۔ بے رونق۔ معمولی نوعری میں یہ جگہ
 خوابستان معلوم ہوتی تھی۔ شانتی کی عین کاروانس! علم و فن اور آدیشوں کا گہوارہ! وہ ادھر ادھر تھی۔
 ٹیگور کے مکان کا چکر لگایا۔ واپس گیسٹ ہاؤس جا کر کھانا کھایا۔ سوئی۔ شام کو پھر باہر نکلی۔ یہ جگہ اس
 کے لئے اجنبی تھی۔ قحب! بیدی کے ساتھ اس درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گئی جہاں وہ اپنے طالب علمی کے زمانے
 میں بیٹھا کرتی تھی۔ جہاں ہمارے ہیوسیندنا تھے ٹیگور کو اچانک عرفان حاصل ہو گیا تھا۔

آمار پرانی آرام

سوریز آئند

آمار شانتی

غلط۔ بالکل غلط۔ سب فراڈ ہے۔ کیسا عرفان۔ اور کس چیز کا۔

تنے کی اوٹ میں چند لڑکیاں باتوں میں مصروف تھیں۔ وہ ایتنا بھپن اور دھڑکنے کا تذکرہ کر رہی تھیں
 سامنے فلم قیصر اسٹارڈسٹ اور اسٹار اینڈ اسٹائیل رکھے تھے اور ایک ٹرانز سٹر۔

یہ برصغیر ایک ایسا خلا ہے جس میں معلق لوفوان ٹرانز سٹریپر فلمی گیٹ سن رہے ہیں۔ ناصرہ نجم الحسن اور
 اس کے جیسے لوفوان شاید بہت جلد اب ان تینوں ملکوں میں انوکھے سمجھے جائیں گے، آؤٹ سائڈرز۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ گھنٹوں پر ہاتھ رکھ کر ذرا دقت سے اٹھی۔ سبزے پر سے گذرتی بھانک کی سمت
 بڑھی۔ کلاہیوں کے باغ میں مہاتما بدھ کا مجسمہ نظر آیا۔ سارا مجسمہ مٹی کا تھا۔ پاؤں بھی مٹی کے تھے۔

شام ہو گئی اور سال کی آئیو کے پرے سنخمال پر گنے کے کسان درختی لئے اپنے گاؤں کی طرف جا رہے
 تھے۔ کنول اور فصل اور دھنک کے دیوا! سورہ درن پر تھوی! تو کہ بیج ہے اور درختی اور ہمارا لہو۔ اور
 ہمارا دل اور ہمارا گھر۔ تیری تقدیس ہم نے جھانجھ اور بانسری بجا کر کی۔ وہ جھل کی طرف بڑھی۔

چاند نکل آیا۔ کچھ پھرے شام۔ کچھ پھرے۔ دور ایک گول سفید سادھی چاندنی میں

بند رہی تھی چاروں طرف سے بند کسی مٹھ کے جسہ خانے کی طرح بیتناک گول سما دھی۔ سفید نیپا سا بند۔ پھیلے کسی زمانے میں سستی ہونے والی کسی مظلوم بے چاری کی خوفناک یادگار۔ دیپالی نے اپنی بیشانی سے پسینے کے قطرے پونچھے۔ درمشت زندہ وہ تیز قدم اٹھاتی کچھ سے باہر نکلی اور شرک پر چلنے لگی۔

بولپور کے میٹڈ ٹوم کارخانے میں باہر اسی مسلمان بنگالی جولاہے کرکھوں پر ساریاں بٹھا رہے تھے۔ ان کے کرکھوں نے ڈھاکے کی ٹہل اور مرقد آباد کار شمیم بناتا تھا۔ "بھور بھے کر گھے پر بیٹھے، رات پڑے کر گھے پر بیٹھے" در کے پردے ایسے رنگ والی ساریاں بننے والے۔ کسی ہمارا جھکاری کے بیاہ کے لئے ساریاں بننے والے۔ ولاہے۔ او میاں جولاہے۔ "سروجنی دیوی نے پوچھا تھا۔ "سرد چاندنی میں۔ اتنے سجدہ، گھبرے، یا بٹتے ہو میاں جولاہے؟

"شاعرہ! پروں جیسا، بادل جیسا سفید، کسی مرنے والے کا قصہ بنتے ہیں ہم۔ دلہن کی سرخ ساریاں۔ موت کا سفید کھن۔ تانا بانا۔ زندگی اور موت۔ سکھ اور دکھ۔ نیکی اور بدی۔ امن اور تشدد۔ بچان اور جہاں آزار۔ یاسمین اور شہر زاد۔ فرقان اور ناصرو نجم السحر۔ چارلس بارلو اور سوامی آتم آنند۔ امدی ہرجی اور رادھیکا سانیال۔ ریمان اور منہرہ۔ ریمان اور دیپالی۔ گوری۔ میں نے کہا ہے تے اٹاب کھول ہے۔ اور سبزی باڑی بنائی ہے۔ میں تمہارے لئے سیندھ کی ڈبیا اور ڈھاکے سے سینا کی بڑیاں لاؤں گا۔" یاسمین ایک بار کہہ رہی تھی وہ ایک مدد اپنا ٹروپ بنائے گی۔ اور مولوی حشیم الدین کے کشتی کا تار ماٹھ کا سیلے تخلیق کرے گی۔ "دیکھو ہم نے اس کتاب پر سروجنی دیوی سے دستخط لئے ہیں۔ سے سنبھال کر رکھنا۔" دیپالی دیدی میں نے اور جند منزل کے جلسہ گھر میں سروجنی دیوی کے پانکی بردار کا سیلے شیش کیا۔ سبج پانکی چیلے۔ پانکی چیلے ہو۔ ہو۔ "میری ان کی پریت پلائی ان بن۔ کل یاد ہاں بٹھادے تال ہی بیٹھوں۔ بچے تو بیک جاؤں۔ ارے وہ تو دھنک کی طرح غائب۔ چاند بچہ یا۔ چاندنی بچھ گئی۔

"آدھی رات کا جنگل جہاں ستیہ پرندوں کی آواز میں چہکا اور محبت ستاروں میں جھلملائی اور شام کی ریوں کے روپ میں بھی۔" خزانے لگایا۔ الم کے دل پر برستی شفق بادلوں پر پھیلی۔ دھان کے گٹھوں کے سہرے طوفان کو تیز آندھی نے بادل کی طرح اٹھایا۔ ہوائے مجھے آواز دی۔ تم سب کے بھائے غرابان

پتوں کی طرح بکھر گئے۔ ”سانپ ایفون کے پھولوں میں خوابیدہ اور جگنو خاموش چپے کا راستہ روشن رہے ہیں۔“ بکھل کے ایک قدیم کوئی نے کہا تھا۔ ”ہوائیں جنگلی کے مندر میں رقصاں ہیں اور غاموش کھا دیوتاؤں کو عود لوبان چڑھا رہی ہیں۔“ شہزادی زیب النساء — نہیں — بیگم جہاں آنا درمندا لعل پھول بن میں چھپی کچھ کہہ رہی ہے۔ مگر اس کے الفاظ میری سمجھ میں نہیں آتے۔ جہاں آرا اور یاسمین اور گولگی مالا تینوں کائنات کے جلمہ گھر میں پردے کے پیچھے سے مسلسل چلائے جا رہی ہیں۔

- OFF - STAGE

اب صبح کا نارنجی ویشویراگی سورج کا لوٹا ہاتھ میں لئے دریا کی اور بڑھ رہا ہے۔ وہ نیلوفر جو گئے والے بہاروں میں کھلیں گے۔ وہ ستارے جو آنے والی راتوں میں جگمگائیں گے۔ وہ یا تری جو مستقبل کے مہما کی سمت بڑھیں گے۔ پتوں کی ہبک میں ساوتری کا الم اور سیتا کی دفا اور رادھا کا ہشت اور شکلا کے آنسو اور دمنتی کا خوف پوشیدہ ہے۔

شاعر نے کہا۔ اور زرد پھول جو بہار کے قدموں کے گھنگر وہیں۔ اس نیم تاریکی میں کسی پہلنے خول کے چمکیے بھوت معلوم ہو رہے ہیں۔ آسمان کی منڈیر پر ستاروں کے دیئے جل رہے ہیں۔ بادل نڈکاؤں کی طرح آسمان کے دلیا پر سے گزرتے جا رہے ہیں۔

بولپور ریلوے اسٹیشن کے سامنے مسجد کے نیچے برگد تلے ایک مسلمان بوڑھی اندھی بھکارن اللہ پکار رہی ہے۔

”زندگی کا میلہ جو ابدیت کے میلے کی سمت رواں ہے۔ ایک بوڑھی فقیرنی مسلسل کلمہ پڑھتی رہے۔ وہ بارش اور دھوپ میں بیٹھی افلاس اور بھوک اور دکھ سے معروف گفتگو ہے مگر رنشاں دنیا اس پکار سننے یا نہ سننے اس کا ایمان اس کی حاجت اور مصائب سے زیادہ صاف شفاف ہے۔ لا اللہ الا اللہ الرسول اللہ“ سروجنی دیوی نے کہا۔

ریلوے اسٹیشن کے سامنے رکشاؤں کا ہجوم۔ مہنس کھد قوق علی حسین اسے اپنی رکشا پر گھسیٹاؤ۔ سے لایا ہے۔ ”دیدیا اب کب آئے گا۔؟“ وہ بغاشت سے پوچھتا ہے۔

”معلوم نہیں۔“ وہ جواب دیتی ہے۔

سامنے مسجد کے زیر سایہ برگد تلے، بوڑھی اندھی بھکارن لوگوں کے قدموں کی چاپ پر دھیان سے بیٹھی ہے۔

۴۵ ونگالہ راگنی

علی پور روڈ کلکتہ اپنی کوٹھی کے برآمدے میں روکنگ چیر پر بیٹھی کھاری ادمارائے بالکل اپنی مرحومہ والوں پر قوی قوتش رائے معلوم ہوئیں۔ وہی غصیلہ چہرہ۔ وہی تھڑیاں۔ بایں ہاتھ میں بڑے سے زرد کی وہی انگشتری درمال۔ برت جیسے سفید بال۔ بالکل کوئی بیوہ مہارانی۔ راج مانا۔ پہلے جتنی موٹی تھیں بیاری کی وجہ ب اتنی ہی دہلی ہو گئی تھیں۔

وہ اپنے پوڈ لڑکوں کو ناشتہ کروا رہی تھیں۔ باغ میں چند کالے کلوٹے شنگے یورپی بچے کھربے لئے گھاس کھودنے مروت تھے۔ چالیس سال قبل ووڈ لینڈز۔ رونا۔ ڈھاکہ میں بھی یہی منظر تھا۔ کون کہتا ہے کہ دنیا بدل گئی۔ یا پوش انقلاب آگیا۔ یا کسٹمٹ تحریک چلی۔ اور وہی اوٹو کریک اسٹو کریک ٹاڈا دیسی۔ بے کالی والی۔

”نوشکار ادا دیدی۔“

”نوشکار۔ کیسے آئیں۔“ اب وہ زیادہ کوششیں ہو گئی تھیں۔ دیپالی نے بنگلہ دیش اور انڈیا آنے کا

بدلتایا۔

”تم کو معلوم ہے۔ میرا بھائی نریندر و شراب پی پی کر مر گیا۔ ریمان مجھے چھوڑ کر بنگلہ دیش چلا گیا۔“ ان کی جھجھری آواز بھرا گئی۔ ریمان کی وجہ سے ان کی زندگی کتنی بڑی ٹریجڈی رہی۔ دیپالی سوس کیا۔ وہ خود کنارے پر کھڑی ہو گئی پھلکی تماشائی ہے۔

”ریمان اپنی روش میں واپس گیا اومادی۔ ایک وقت آتا ہے جب انسان محسوس کرتا ہے کہ ایک موہوم ہندو تھادی ادم ارامی سے بہتر ہے کہ انسان اپنی جڑوں میں واپس چلا جائے۔“

”کیا وہ تم سے یا مجھ سے شادی کر لیتا تو کلچر CLASH کا سامنا کرتا؟“

”شرع میں نہیں۔ مگر آخر میں۔ بڑھاپے کی طرف بڑھتے ہوئے انسان کو اپنے ہندوئی گہوارے کی

تہہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی ماں کی تہذیب کا متلاشی ہوتا ہے۔“

”کیا ارجمند منزل اس کا گہوارہ ہے؟“ اودادی نے آگ بگولا ہو کر پوچھا۔ اور غصے سے ہاتھ کرکھانے لگیں۔

”فابا۔ ایک حد تک۔ ارجمند منزل بھی۔ اور زہرو بھی۔“ دیپالی نے اطمینان سے جواب دیا۔
 میں لڑکھن سے ان سے ڈرتی آئی ہوں۔ اب میں کیوں ڈروں۔ اب یہ میرا کیا بگاڑ سکتی ہیں۔ اب یہ۔
 Bully نہیں کر سکتیں۔ اب میرے بال بھی سفید ہو چکے ہیں۔ ادا اب ریحان الدین احمد بھی درمیاں
 نہیں ہے۔ ڈاکٹر بنوئے چند سرکار۔ اور۔ اور۔ ایک لخت اسے ایک انتہائی کمینہ خیز
 کیا۔ اب ہم ادمارائے سے زیادہ دو لہندہ ہوں۔ پورٹ آف اسپین میں میرا کوئی نیشنل ڈولیفٹ نہ
 کم شاندار نہیں۔ تو رعب کس بات کا۔؟ کرسی پر آگے کو جھکی کھانسی ہوئی کھجور کی طرح سوکھی جبر
 اودارائے بید تابل رحم ادا مھکمہ خیز معلوم ہوئیں۔ کیا ہیں ان سب کو معاف کر دینا چاہئے۔ جنوں۔
 ہمیں اذیتیں پہنچائیں؟ کیا یا ہمیں نے بھی معاف کر دیا تھا؟ شوا۔ شوا۔

”میں نے ریحان کو ہر حال میں دیکھا اور اس کا ساتھ دیا۔“ اودا کھانسی کھانسی کر کہہ رہی تھی۔
 ”جنگ سے پہلے کے لندن میں طالب علم۔ ڈھلکے میں باؤل فقیر کے بھیس میں انڈر گراؤنڈ افسلابی۔
 آدش وادی۔ رومیٹک۔ پارٹیشن کے بعد کلکتے میں سرگرداں پریشاں حال۔ پھر کامیاب ایڈر۔ چند
 غٹر۔ اور اب تم اسے بنگلہ دیش کا نیا ٹائی کوئن دیکھ کر آرہی ہو۔ اب وہ مجھے مدتوں خط بھی نہیں لکھ
 پچھلے دنوں اس کا امن پرست شاعر لڑکا کلکتہ آیا تھا۔ میں نے ٹیلی ویژن کے ٹوٹھ پروگرام میں اسے دیکھا۔ مجھ سے
 ملے تک نایا۔“ اچانک انہوں نے پیتر ابل کر کہا۔ ”دیپالی۔ تم بہت خوش قسمت ہو۔ تم مجھ سے ہمیشہ باز
 لے گئیں۔“

”آپ کا ایسا خیال ہے اودادی؟“ اس نے سکون کے ساتھ کہا۔ معلوم ہوتا تھا محمد آن اسپورٹنگ
 اور موہن بنگان کے فٹ بال میچ کے خاتمے پر دو خواتین کھیل کے متعلق تبادلہ خیالات کر رہی ہیں۔
 الم ایک حبیب سیاہ پرند کے مانند اڑتا ہوا آیا اور مڑھکا کر پھپھلا کر ان کے نزدیک بیٹھ گیا۔
 میرہ حاضر ہوا۔ ”مس صاحب۔ گاڑی تیار رہے۔“

”چلو۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔“ اودارائے نے دیپالی سے کہا۔
 وقت کا کپالک کھوڑوں کی مالا پہنے۔ عصا میں گھٹیاں اور جھنڈیاں لگائے آگے چل رہا ہے۔

”کلب —؟“

”نہیں۔ مندر۔ مآں کے مندر۔“

اُومارائے پہلے لاندھب تھیں۔ اب مذہبی ہو گئی تھیں۔ برہمہ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اور ایک جیانک۔ بے جان، گروٹسک مورتی کی پرستش کرنے کے لئے ہمارے تھیں۔ ان میں اور جاہل بھوتارتی دیوی میں ندگی نے کیا فرق باقی رکھا۔

وہ دونوں برآمدے کی مرمریں میڑھیاں اتر کریر کار میں بیٹھیں۔

”کالی گھاٹ —؟“ شو فرنے دریا نت کیا۔

”نہیں۔ سیلور۔“ مانکن نے جواب دیا۔

سیلور مٹھ کے ایک مرمر میں ہل میں درگاکا بڑی مورتی کے سامنے سندھیا کی آرتی اتاری جا رہی تھی۔ براحاٹے میں چند تک دھاری یورپین اور امریکن سنیاسی ٹپلے پھر رہے تھے۔ بھاٹک پر کالی کی خوفناک ویریں بک رہی تھیں۔

پوجا کے بعد وہ دونوں باہر آئیں۔ ایک طرف درختوں کا جھنڈ تھا۔ ڈالیوں پر بندر جھول رہے تھے۔ باپڑ کے نیچے گھنے سیاہ بالوں کا جوڑا کپٹی پر بنائے ایک یوگنی دھیان میں محو آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔

نھیروی اور ”بادلوں کو کھینچنے والی“ میگھ رننی راگنی کے مانند رنگالی یا بنگالی بھیروراک کی ایک قدیم پراچین بنگال کی راگنی ہے۔ سارے راگ راگنیوں کی طرح اس کے ”نادا یا روپ“ سے علیحدہ اس دیوتا یا روپ ”یا سائیکلک پیکر کا بھی تصور کیا جاتا ہے یوں کہ بن گالی راگنی شتو کی ایک یوگنی ہے جو گھنے باہنی گٹی کے سامنے ایک مرگ جھالا پر بیٹھی ہے۔ درختوں پر بندر اور مرگ جھالا کے پاس ایک شیر ہو جوتا۔ سیلور مٹھ کے کنج میں بیٹھی یہ بنگالی۔ راکن بنگالی راگنی نہیں تھی۔ کوئی معمولی کمزور عورت تھی جس نے شاید

لہو ملو مسائل سے تنگ آکر یہ بیوہ ہونے کے بعد سنیاسی لے لیا ہو گا۔ یا وہ بال و دھوا تھی یا کیا پتہ وہ سچ رہے ہو۔ دیپاتی نے حیرت سے سوچا۔ وہ اور اُومارائے کنج سے گذر کر ایک سنان جمن میں داخل ہوئیں۔ بھی مکمل سنا تھا۔ وہ ایک منڈیر پر بیٹھ گئیں۔ اُومارائے نے اپنی سینڈل نیچے گرا دیں۔ پاؤں منڈیر پر۔ مراقبہ کے انداز میں بیٹھ گئیں۔ دیپاتی نے بھی اپنے سینڈل نیچے گرائے پاؤں منڈیر پر سمیٹ لئے۔ ان

دونوں کے جوئے سنگی، سپاٹ زمین پر اِدھر اُدھر پڑے نہایت مضحکہ خیز اور قابلِ رحم معلوم ہوئے۔ دیبا نے سراٹھا کر اِدھر دیکھا۔ ایک لنگور درخت کی شاخ پر بیٹھا اسے بڑے غصے سے ملاحظہ کر رہا تھا۔

”کال راتری!“ دیپالی نے ہنس کر کہا۔

”کون۔۔؟“ اودا دلپوی نے چونک کر دریافت کیا۔

”کوئی نہیں۔“ دیپالی نے ذرا کینے پن سے کہا۔ ”کال راتری۔ شو کے گھر کا ایک بھتیجا۔ لنگور

دب میں۔ آپ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ غائب ہو گیا۔“

اس دھتھناک عبورے کو اڈرینگل میں چاروں طرف آنجنانی مٹھ دھاریوں کے خالی قبرے بہت اسرار معلوم ہو رہے تھے۔ ان کے خالی پلنگوں کے اِدھر ان کے کھڑاؤں رکھے تھے۔ ہم اپنے جوتے دنیا ہی میں؟ جاتے ہیں۔

سانے چوڑا دریا بہہ رہا تھا۔ دریا کالی اور بھیرو کے دس دس ہاتھوں کے ماتھا نہیں پھیلائے؟ کی سطح پر بہہ رہے ہیں۔ نردان کی کیا ضرورت ہے۔ کسی نے کہا تھا۔ پانی پانی میں مل گیا۔ میں شکر کھانا نہیں شکر کھانا چاہتا ہوں۔

اس کی یاد خوشبو کا بیس بدل کر ہزاروں میل دور رہین ٹری کے سائے میں ٹری ٹاپ ناؤس کے بھی پہنچے گی۔

اودنگین ناؤ دانے مانجھی۔ تو جوار کے ساتھ آیا۔ بھاٹا کے ساتھ۔ شہد جیسے جیت مہنے میں کوٹلیں گے پوس کی چاندنی میں چھیرے پھل پکڑنے لگے۔ پُشپ بن میں بھنورے گونجے۔

محبت کی باؤلی نوکا خشکی پر بھی چلتی ہے۔

غلط۔ بالکل غلط۔

ایک قتل کر دی گئی۔ ایک نے خودکشی کر لی۔ ایک جلاوطن ہے۔

اور اودارائے برگد تلے منڈیر پر بیٹھی سر جھکائے آہستہ آہستہ دھونکنی کی طرح کھانس رہی ہیں۔

قہرناک کالی۔ قہرناک۔ رحیم۔ مادرِ عظیم۔ تیری قربان نگاہ میں میں نے پودینے کی پتیوں اور

چادل اور موت اور زندگی کے نذرانوں سے انجلی سبائی۔ اُجا ہوا توئی۔ میں تیرے لئے کلیاں اور جنگل کی۔

لے کر آئی ہوں۔ اچھا پاروتی۔ سارے سکھ اور سارے دکھ تیرے لئے۔ گری جانجھوی۔ درختوں نے سرسرا

برایا۔ ڈایاں آدمیوں کے ہاتھوں کی طرح بنے گئیں۔ شیل پتیری بخاشا بکائی دھکا۔ مہری دھہر۔ دختر کوبا۔ جب رام پر خاد سلیم ماں ماں پکارنے پکارنے ماجر آگئے تھے تو انہوں نے کہا تھا۔ ماں۔ ماں مت رو۔ پتہ نہیں وہ مر چکی ہے۔ درد آتی کیوں نہیں۔

ادو مارائے اپنی دولت اور اپنے پود لڑ اور اپنے ملازمین کی دوسرا فقہ میں دنیا میں بالکل تنہا تھیں۔ اچانک انہوں نے سراٹھا کر بڑے اضطراب سے کہا۔ ”مجھے کوئی ابھی خبر سناؤ۔ میری زندگی۔ ابھی خبریں بہت کم ہیں۔“

”ابھی خبریں میرے پاس بھی بہت زیادہ نہیں ہیں۔ ادا دیدی۔“ دنیا پالی نے کہنے پر سے جواب دیا۔ دو بوڑھی بیاں تھیں جو ایک سنسان گلی میں برگد تلے اپنے اپنے پیچھے تیز کئے ایک دوسرے کے مقابلے پر وجود تھیں۔ چند لمحوں بعد دنیا پالی نے کہا۔ ”جہاں آوارہ اپنے سارے خاندان کے گولی سے اڑادی گئی۔“

”اد کوئی بُری خبر سناؤ۔“

”یا حسین حمید نے خود کشی کر لی۔“

”اور۔۔۔۔۔“

”ادو اس سے پہلے جہاں آوارہ کی چھوٹی بیٹی تھی، ہوائی جہاز کے حادثے میں ہلاک ہوئیں۔ آپس کے بازوؤں پر جھانڈ کر ان کی لاشوں کا پتہ تک نہ ملا۔“ وہ ایک مردہ خانہ کے سرید چوکیدار کی طرح اب ذرا تفصیل سے بیان کرنے لگی۔ ”اور جہاں آوارہ جب ماری گئی اس کے خون کے چھینٹوں سے سدا کر جلال ہو گیا اور اسے بھی مکمل کر دیو اسے چپک گیا۔ ادو اب قمران ماں کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے۔۔۔“

”اور کوئی بُری خبر سناؤ۔“

”میرے بابا۔ آپ کے سابق ہینڈ کم منیگر تھے جو چند سرکار کیسر سے مرے۔ بہت سخت تکلیف ہے جان نکلی۔ آخر وقت میں ان کی شکل دیکھی نہ جاتی تھی۔ اور ان سے دو سال پہلے میری بھوپتی ہوتا تھی۔ بی اندھی ہو کر مر گئی۔ اور اتنا شدید بلڈ پریشر کہ پاگلوں کی طرح چیختی تھیں۔“

”اد کوئی بُری خبر سناؤ۔“

”اٹھا رہیں صدی کا بنگالی شاعر اور کالی بھگت۔ جس سے لیک مرتبہ ال کے گیت شاہی بجرے میں سفر تے ہوئے فواب سراج الدولہ نے بھی سنے تھے۔“

”اور۔۔۔ آپ سامنے دیکھ رہی ہیں۔ وہ ادھر دیکھئے۔ پریتوں کے منہ سے آگ نکل رہی ہے۔ سوچی کچھ بھوت آپ کے تعاقب میں ہیں۔ اور میرے تعاقب میں۔ زمانہ مغرورانسانوں کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔“ اب تم کالی کے روپ میں میرے سامنے ظاہر ہوئی ہو۔“ اوارائے نے خائف ہو کر کہا۔

”ہم اپنی جوتیں اسی طرح جھگٹا رہیں گے۔ کالی بھی مر چکی ہے۔ سمجھ ٹھنڈا پڑنے والا ہے۔“ دیپالی سردہری سے جواب دیا۔ ”میں اپنے باپ اور بھوپھی کی راکھ لے کر ہر دور جا رہی ہوں۔ راستے کا انتہا ہے۔ سنے! انا دیپالی سیلوڑ مٹھ کے سنیا سی کیا گاتے ہیں۔ میں آپ کو سناؤں۔“ دنیا کے اس بات میں اس بیٹھی اپنی پتنگ اڑا رہی ہے۔ لاکھوں ڈوروں میں سے وہ ایک ڈور کاٹ دیتی ہے۔ اور جب پتنگ کو لے کر سیکڑاں دسعت میں پہنچ جاتی ہے تو اس ہنس کر تالی بجاتی ہے۔

۴۶ بھیروراک

آخر شب کی سیکڑاں تاریکی میں بونگ جٹ فضاے بسیط میں تیر کی طرح ٹھکتا چلا گیا۔ پھر اس کو جگ بگ کرتی روشنیوں کو گھپ اندھیرے نے نگل لیا۔ تاریکی اور آسمان میں گھرے اس فولادی پتھرے پر لگی سوا جلی آتماؤں کے ساتھ مھسور غیر اتم بے معنی دیپالی سین نے غیر اتم بے معنی یا سین بلونٹ کی ڈائری ٹٹھا جو اس کے بیگ میں محفوظ تھی۔ اسے میں واپس لے آئی۔ کس کو دوں۔ کوئی اس کا وارث نہیں۔ خود میرا دیپالا سین کا کوئی وارث نہیں۔ ہر انسان اپنا آغاز اور انجام خود ہے۔ لیکن شاید یا سین بلونٹ کی ایک وارث موجود ہے۔۔۔ نامورہ نجم السحر قادری۔ شاید۔

ٹوکیو۔ ہونو ٹوٹو۔ سان فرانسسکو۔ پورٹ آف اسپین۔ بہت لمبا سفر ہے۔ وقت کا اندھا سفر اور بیرونی۔ اور اس کے آگے پتیاں بھا کر لے جائے والے دریا کا سفر۔ اور قبر کے کیشروں کی زمین کا ساف۔ دفعتاً اسے بڑی شدید طمانیت محسوس ہوئی۔ وہ ابھی زندہ ہے۔ زندگی بڑی نعمت ہے۔

لہ مردہ خور بھوت ۴۷ سوئی جیسے بابیک مندوا لے بھوت
۴۸ رام پرشاد سین کا ایک مہین۔

اسمین نے اپنی ٹری میں ٹک بٹک لکھا تھا۔ IT WAS GOOD KNOWING YOU, WORLD!

اس کے برابر بیٹھے ہوئے امریکن نوجوان نے پوچھا۔ ”انڈین۔؟“

”اودر سیز انڈین۔ ولیٹ لنڈیز۔“

”اوہ! جمیکا۔ کنگز ٹن ٹاؤن۔؟“

”ٹری نیڈاڈ۔ پورٹ آف اسپین۔“

اچانک بڑی سُرّت کے ساتھ اسے اپنے گھر کا خیال آیا۔ اسپیش کونویل مینش۔ وسیع باغ

الہ۔ رین ٹری کا بھرمت۔ کپسویوزک۔ مشٹوس مسرتی۔ مشٹوس خیر النساء۔ قابل اعتبار غیر دلچسپ

نوہر لٹت سین۔ اس کی اپنی آرام دہ خوبصورت متمول دنیا خوش گوار موسم۔ موسیقی۔ لذیذ کھانے

سیر و سیاحت I SHOULD COUNT MY BLESSINGS اُس نے یک لخت بے انتہا

نوفز دہ ہو کر سوچا۔ ہوا میرے باپ۔ دھتی میری ماں۔ اگنی میرے دوست۔ پانی میرے عزیز۔ آسمان میرے

جانی۔ تمہارے ساتھ وہ کرشمہ ملتا ہے۔ انت سے تم کو سلام بھیجتا ہوں۔ یوگیشور نے کہا تھا۔

اور بیسویں صدی کے نصف آخر کے بنگال کی رفاہیاسمین مجید نے لکھا تھا۔ موہن پٹی نہیں۔ لکھا

ہیں۔ ہندو۔ موسم بہار کا پیلے۔ ساری کائنات کا پیلے۔

کہ اپنی ساری بدی اور ذلت اور کمینگی کے باوجود دنیا بڑی سہانی جگہ ہے۔ قابل قدر

اس نے کھڑکی سے ناک چپکا کر باہر دیکھنا شروع کیا۔ گھپ اندھیری رات۔ چند لمحوں میں صبح کا

پچ سیاہ سمندر اب نظر آنے لگا۔ اوپر سیاہ آسمان۔ تخلیق کی اولین رات۔ ہتیاک، لرزہ خیز بھرو کے

شر۔ آہستہ آہستہ۔ بہت مدھم اُجالا۔ اب میں بھیروراک کا دھیان کرتی ہوں۔ اُس نے آنکھیں

ندکیں۔ شجہ۔ سپید پوشاک۔ ششی دھر۔ گلے میں مالا۔ حلق میں زہر۔ رکت نیرہ۔ خون سی سرخ آنکھیں۔

اتوں میں جگمگاتے کسٹل۔ بھور جھپے جسے دیوتا گاتے ہیں۔ آنکھیں کھولیں۔ افق پر ملکی سی سپیدی اُچلی

تھی۔ اپنا زرخیز بھونکتا شدہ بھیرو ساری کائنات۔ اُس نے بہت آہستہ آہستہ مختلف ترگیں گنگائی

طرور کیں۔ شرو بھیرو۔ ونگاڈ بھیرو۔ آند بھیرو۔ غنہ دگی سی آگنی۔ دہ راگ کے شروں پر تیراکی۔

۱۰ نویں صدی بنگال کا شکر شاعر ۱۰ سرپرہال

پھر اس نے جنگ کر باہر دیکھا۔ اب پو پھٹ رہی تھی۔ اب مجھے تعمیرِ وراگ میں شو جہاں کی تقدیریں کرنے چاہئے۔ وہ اندر ہی اندر ایک جگہ بھی گنگنا نے لگی۔ پھر باہر نظر پڑی۔ بہت ہی خوبصورت منظر تھا۔ وہ نگاہ تک شفاوت پانی اور شفاوت آسمان۔ اس نے آنکھیں بند کیں۔ کس کا خیال کروں؟ مہاکال اور مہاکالی پر تو دھیان نہیں جتا۔ شو اور شکستی، دونوں فیل ہو گئے، اندر ہی اندر بہت سے گپٹ چیزیں بکس پر دھیان لگاؤں۔ اور کون سا راگ گاؤں۔ اندر ہی اندر بہت سے گپٹ راگ —

نیچے بحیرہ چین کی موجیں پگھل چاندی معلوم ہو رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ اُجالا بھیا۔ سورہ ٹھا کر سنبھرا نوہ ماسک پہنے جاپان کے اور پر نمودار ہو رہے تھے۔

لاکھوں برس سے سورج اسی طرح طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے۔ اور طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے اور طلوع